یادیں
پابلو نرودا کی آپ بیتی
(نوبل انعام یافتہ)
ترجمہ
انور زاہدی
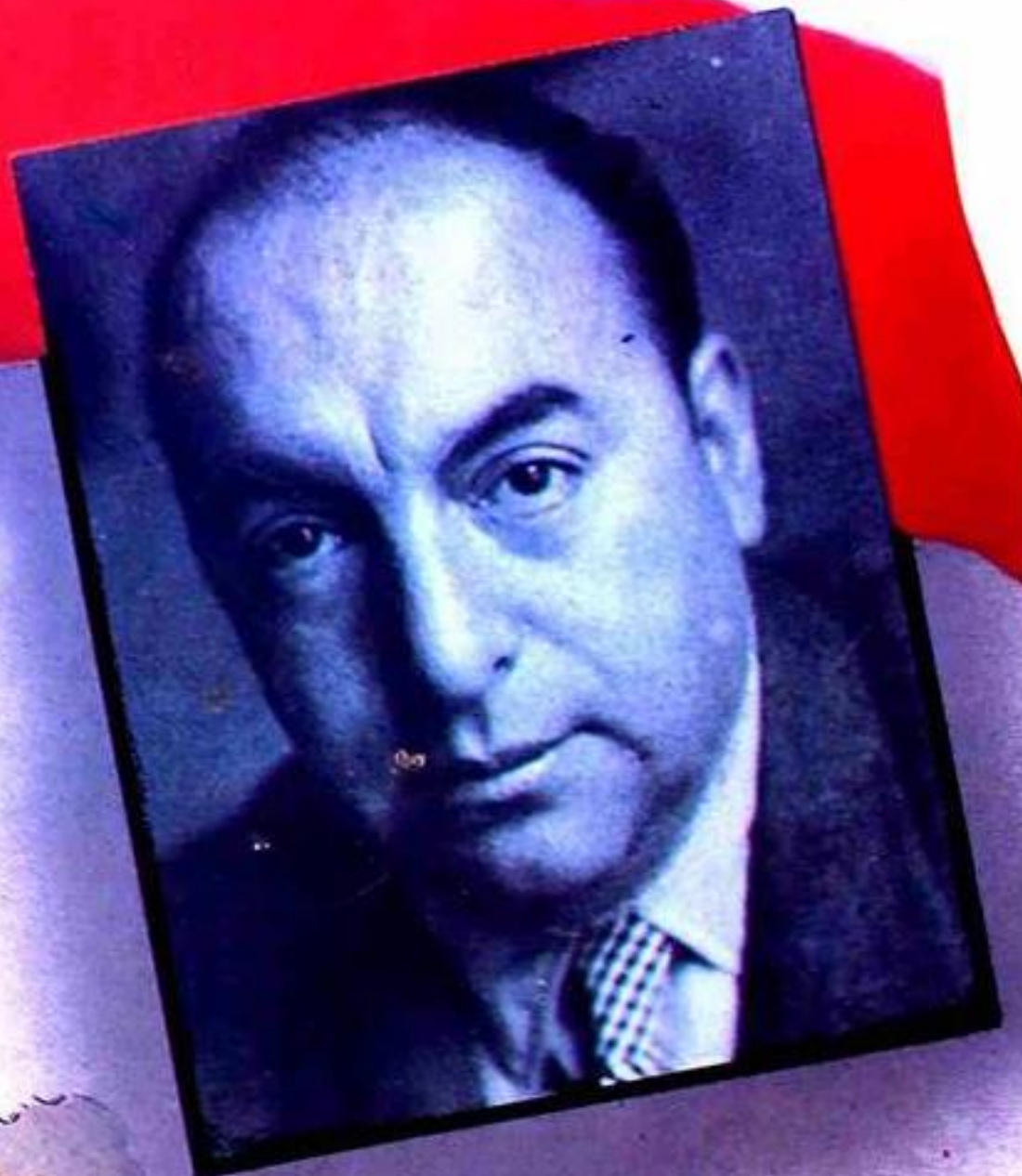
PABLO NERUDA

Noble Prize Winner

in 1971

"Memoirs"

Translated from Spanish

By: **Hardie St. Martin**

From English into

Urdu by:

Anwar Zahidi

یادیں

(پابلو نرودا کی خود نوشت)

ترجمہ ـــــ

انور زاہدی

عفراء پبلی کیشنز

۲۰ - ایف، شمع پلازہ فیروز پور روڈ، لاہور

فون نمبر: ۷۵۷۲۶۴۳

ناشر ———— مسز عفرا بخاری

اشاعت اوّل —— مئی ۱۹۹۶ء

قیمت —— ۲۵۰ روپے

سرورق —— طاہر رشید

اہتمام و ادارت ———— بشریٰ عزیز حسن، عامر فراز

مطبع ———— ٹیکنو فایش پرنٹرز شمع پلازہ لاہور
فون: ۷۵۷۲۶۴۳

انتساب

"جمہوریت کی راہ میں، استبداد کے ہاتھوں، مرنے والے لاکھوں بے گناہ
معصوم انسانوں کے نام"

ترتیب

پیش لفظ

پانی اور کیچڑ سے لت پت کمرے میں، جو کبھی ایک خوبصورت لائبیریری تھی، ایک تابوت رکھا ہے، جس میں مرنے والے کا جسد خاکی موجود ہے۔ تابوت کے نزدیک مرحوم کی بیوہ، اس کی بہنیں اور میکسیکو کا سفیر مارٹینیز کوربالا (Martinez Corbala) سوگوار کھڑے ہیں۔

کیچڑ ملے پانی میں کتابیں اور دستاویزات تیرتی پھرتی ہیں۔

ایک روز قبل فوج نے گھر کی جانب پانی کے ایک دھارے کا رخ موڑ دیا تھا جس کے باعث گھر میں ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔ بعد میں نظر آنے والی ہر شے کو فوجیوں نے بندوق کے کندوں سے توڑ ڈالا تھا۔

کوئی سرگوشی میں سوال کرتا ہے۔

"یہ کس کا تابوت ہے؟"

اسے بتایا جاتا ہے پابلونرودا کا

"کیا"

"ہاں ــــ پابلونرودا"

خاموشی سے یہ لفظ ہوا میں تیرتا ہوا باہر نکل جاتا ہے، پھر یہ نام بند دروازوں اور کھڑکیوں کو کھولتا ہے۔ ادھ کھلی دکانوں پر ظاہر ہوتا ہے ٹیلی فون کے تاروں سے نیچے اترتا ہے، رواں دواں گاڑیوں اور بسوں کو روک کر انہیں خالی کراتا ہے اور دور دراز کی سڑکوں سے روتے چیختے لوگوں کے ہجوم کو یہاں تک لاتا ہے۔

یہ نام غیض و غضب کے کسی معجزے کی مانند سانتیاگو کے غریب وفادار عوام جس میں مرد، عورتیں اور بچے شامل ہیں، دائروں کی صورت میں ابھرتا رہتا ہے۔

پابلونرودا ــــ پابلونرودا ــــ پابلونرودا

یہی وہ مقبول نام ہے جس نے لاطینی امریکہ کے ملک چلی سے ایک بین الاقوامی شاعر کی شہرت پائی اور ہسپانوی شعر و ادب کے درخشندہ ناموں میں ایک نام پابلونرودا کا اضافہ کیا۔

"یادیں" اسی عظیم شاعر پابلونرودا کی خودنوشت (Memoirs) کا ترجمہ ہے، جسے میں نے عام فہم اردو میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک ہسپانوی ناموں کا تعلق ہے، انہیں

اردو میں لکھنے کے ساتھ ساتھ انگریزی میں ویسے ہی رہنے دیا ہے، تاکہ پڑھنے والوں کو دقت پیش نہ آئے۔ ترجمہ کیسا ہے؟ اس کا جواب تو آپ ہی دیں گے، میں البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ کسی بھی خود نوشت یا سوانح عمری کو پڑھتے ہوئے مصنف کی ذات کی عظمت اکثر قاری کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور یوں اسے دریافت کے عمل سے ہٹاتے ہوئے ایک قسم کے احساس کم مائیگی کا شکار بنا دیتی ہے۔

اکثر خود نوشتوں اور سوانح عمریوں میں ذاتی بڑائی، خاندانی اوصاف شرافت اور نجابت کے ساتھ ساتھ انتہائی ذاتی قسم کے نام نہاد بہادری پر محمول قصے پڑھنے کو ملتے ہیں، جس سے قاری کسی طلسماتی دنیا میں پہنچ جاتا ہے اور انجام کار کتاب کو ختم کرنے پر وہ اسے ایک دلچسپ اور محیرالعقول داستان کہنے میں حق بجانب ہوتا ہے۔

عموماً خود نوشتوں میں ذاتی خامیوں اور انسانی کردار کی کمزوریوں اور کمینگیوں کا ذکر نہیں کیا جاتا اور اگر کوئی سوانح نگار ایسا کرتا بھی ہے تو بین السطور ڈھکے چھپے لفظوں کا سہارا لے کر اسے ظاہر کرنے کے بجائے چھپانے کی کوشش میں حقائق کو مسخ کر دیتا ہے، جبکہ پابلونرودا کی خود نوشت اس کے برعکس تیسری دنیا کے ایک غریب ملک چلی کے دور افتادہ قصبے میں پلنے بڑھنے والے ایک ایسے شاعر کی داستان حیات ہے جس میں وہ اپنی زندگی کو انتہائی معصوم انداز میں، بچپن کے اسرار پر سے پردے اٹھاتے ہوئے شروع کرتا ہے اور چھوٹی چھوٹی جزیات کے بارے میں ذکر کرتا ہوا پڑھنے والے کو اپنی اقلیم میں لے جاتا ہے۔ وہ پھولوں، جانوروں، درختوں، حتیٰ کہ پتھروں تک کو دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔ انسانوں سے مل کر متاثر ہوتا ہے، ہر نئی شے اسے تحیر میں ڈال دیتی ہے۔ وہ ایک غریب، بھوکے شاعر کی حیثیت سے سانتیاگو میں اپنی آزاد زندگی کی ابتدا کرتا ہے اور حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے پڑھنے والے کو حوصلہ عطا کرتا ہے۔ اپنے معاشقوں کا ذکر کرتے ہوئے لذت لینے کے بجائے وہ انہیں زندگی میں پیش آنے والے غیر معمولی واقعات کی طرح شاعرانہ انداز میں بیان کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ وہ اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کا ذکر ہی نہیں کرتا، بلکہ ان سے نتیجہ بھی اخذ کرتا نظر آتا ہے۔

نرودا موسموں کا عاشق ہے۔ اپنی خود نوشت میں وہ ایک جگہ کہتا ہے "میں نے پہلے پہل اپنی آنکھیں زندگی، زمین، شاعری اور بارش کے لئے کھولیں"۔ اسے فطرت کا ہر منظر، خواہ وہ ڈوبتا ہوا سورج ہو یا کسی دلدلی جنگل میں گزاری ہوئی رات، اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ چلی کی شدید بارشوں کے باوجود، وہ بارش سے اکتاہٹ ظاہر کرنے کے بجائے اسے بھی ظالم محبوب کی طرح چاہتا ہے۔ نثر لکھتے ہوئے بھی وہ اپنے طرز بیان میں شاعر کی حیثیت سے ہر جگہ نمایاں رہتا

ہے۔ یہی شاعرانہ اسلوب بیان نرودا کی خود نوشت کو دلچسپ اور خوبصورت بنانے میں ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے۔

نرودا کے ہاں موجود غیر معمولی تحیر ہی شاعر کا وہ ازلی وصف ہے جو اسے اپنے گرد پھیلی ہوئی وسیع کائنات میں واقع ہر شے سے بے شک وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، اپنی ذات کے ساتھ وابستگی پر مجبور کرتے ہوئے اظہار کی توانا قوت سے نوازتا ہے اور یہی بے پناہ قوت اس کی شاعری کو حقیقی زندگی کا ترجمان بنا دیتی ہے۔ یوں نرودا کی خود نوشت ایک شاعر کی داستان حیات ہونے کے باوجود ایک ممتاز مقام بنا لیتی ہے۔

پابلو نرودا نیفتالی ریز (Neftali Reyes) کی حیثیت سے ۱۲ر جولائی ۱۹۰۴ء کو جنوبی امریکہ کے ملک چلی کے دور افتادہ قصبے پرال میں ریلوے کے ایک معمولی اہلکار کے ہاں جنم لیتا ہے۔ جو کچھ سال بعد اپنے والدین کے ہمراہ ٹی میوکو میں زیر تعمیر ریلوے لائن پر اپنے باپ کی ملازمت کی وجہ سے منتقل ہو جاتا ہے۔ یہیں اس کے ماں باپ پہلے پہل ریلوے انجن کو دیکھتے ہیں اور اس سرد ویران منطقے کے مویشیوں اور یہاں کی نباتات سے متعارف ہوتے ہیں اور یہی وہ خطہ ہے جہاں نرودا کی شاعری پھلتی پھولتی ہے۔ اپنے بچپن کے ایک طویل سرمائی بارشوں کے موسم میں وہ اپنی پہلی نظم میں کہتا ہے۔

"کوئی شے میری روح میں حرکت میں آتی ہے
بخار، یا بھلا دیے گئے پر
اور میں نے اس آگ میں پڑھتے ہوئے
خود اپنا راستہ تلاش کیا
اور پہلی مبہم سطر رقم کی
مبہم — کسی مواد کے بغیر، مگر خالص
اصلی دانائی، کسی ایسے شخص کی
جو کسی بات سے واقف نہیں
اور اچانک میں نے دیکھا
کہ آسمانوں کے در مجھ پر کھل گئے تھے"

اس کی پرورش میں اس خطے کی بو باس موجود رہتی ہے، وہ پودوں، حشرات اور ہر جاندار شے کو، جسے وہ بعد میں تحیر کی ایک مسلسل مناجات کا نام دیتا ہے، تنہا دریافت کرنے کی حیثیت سے نظر آتا ہے۔ سولہ برس کی عمر میں، وہ تعلیم کی خاطر اپنے آبائی قصبے ٹی میوکو کو خیرباد کہہ کر سانتیاگو پہنچ

جاتا ہے۔ لیکن یہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ ایک شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت بنا چکا ہے۔ اب اس کا نام پابلو نرودا اس کی تخلیقات کا تعارف بن جاتا ہے۔

نیفتالی ریز کے بجائے چیکو سلاواکیہ کے ایک معروف ادیب نرودا کے نام کو اپنانا، پابلو نرودا کا خود کو محض اپنے ملک کا شاعر کہلوانے کے بجائے بین الاقوامی شاعر بننے کے اشتیاق کا اظہار کرتا ہے۔ جس پر وہ گزرتے ہوئے برسوں کے ساتھ مکمل طور پر قدرت پالیتا ہے۔ اور در حقیقت تمام دنیا اسے ایک بین الاقوامی شہرت کے شاعر کے طور پر دیکھتی ہے جو شاعری کے ۶۴ مجموعے تخلیق کرتا ہے اور ۱۹۷۱ء میں ادب کے نوبل انعام کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔

"نرودا کی شاعری کے بارے میں (Stanford University) کے جین فرانکو (Jean Franco) کا کہنا ہے: کہ وہ ایمرسن (Emerson) کی طرح ہر بے جان اور معمولی شے میں آنکھیں اور زبان ڈال دیتا ہے اور جیسے کہا جاتا تھا کہ (Lyncacus) کی آنکھیں زمین کو دیکھ سکتی ہیں ایسے ہی شاعر نرودا دنیا کو ایک آئینے کی سمت موڑ دیتا ہے اور اس طرح ہمیں ان تمام اشیا کو ان کے صحیح سیاق و سباق میں دکھاتا ہے۔ نرودا چاہتا ہے کہ شاعری اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے پتھر، شیشے اور لکڑی کے سکوت کی دیواروں کو گرا دے۔ لیکن اس کے باوجود وہ بنیادی طور پر محض شاعر فطرت نہیں بلکہ اس کی شاعری میں عظیم (Orphic) شعراء دانتے (Dante) ملٹن (Milton) والٹ وھٹمین (Walt Whitman) اور وکٹر ہیوگو (Hugo Hugo) کی طرح انسان اور کائنات آپس میں ایک ربط باہم سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بالکل جس طرح ہم دانتے اور ملٹن کو ان کے مذہبی افکار سے الگ نہیں کر سکتے یا ہیوگو اور وھٹمین کو ان کی جمہوری فکر سے جدا نہیں کیا جا سکتا. اسی طرح نرودا کی شاعری کو اس کی سیاسی بصیرت، انسان دوستی اور مساوات کے جذبے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا فطرت کے بارے میں نرودا کی حسی فکر لاطینی امریکہ کی ہسپانوی شاعری میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے اور اس طرح وہ خالی جگہوں کا شاعر کہلاتا ہے ــــ تنہا انٹارکٹک کا شاعر ــــ انسان سے پہلے کے امریکہ کا شاعر اور فطرت کے بارے میں یہ حیثیت اسے جنوبی امریکہ کے ملک چلی میں گزرے ہوئے اپنے بچپن کی سرحدوں سے حاصل ہوئی ہے۔

سولہ برس کی عمر میں جب وہ اپنے آبائی قصبے ٹی میوکو سے سانتیاگو پہنچتا ہے تو اس کی نظموں کی پہلی کتاب (Crepusculario) شائع ہوتی ہے اور اگلے ہی برس دوسری کتاب (La Cancion dela Fiesta) اسے فوری شہرت کا مالک بنا دیتی ہے۔ یوں سترہ برس کی عمر ہی سے وہ ایک معروف شاعر کا مقام پالیتا ہے اور چلی میں مظاہر فطرت اور عورت کو دریافت

کرنے والے شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔

وزارت خارجہ میں ملازمت کے باعث اسے چلی جیسے دور افتادہ ملک سے، جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک رنگون جاوا، سیلون میں قونصلر کی حیثیت سے گھومنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ چین، ہندوستان یورپ اور روس کے سفر کرتا ہے۔ اسپین کی خانہ جنگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، جہاں فسطائیوں کے ہاتھوں رافیل البرتی (Rafael-al-Berti) کے گھر کی تباہی اور بعد میں مشہور ہسپانوی شاعر فیڈریکو گارسیالور کا (Fedrico Garcia Lorca) کے قتل سے متاثر ہو کر وہ وہاں کی سیاست میں مداخلت کر بیٹھتا ہے اور نتیجے میں اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

یہ وہ عہد ہے، جب نرودا شاعری میں عوامی رویوں کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی شاعری کو ایک نئی جہت فراہم کرتا ہے اور اپنی ایک نظم میں کہہ دیتا ہے۔

"دھوکے باز جنرل
میرے مردہ گھر کو دیکھتے ہیں
اور ٹوٹے ہوئے اسپین پر نظر ڈالتے ہیں
ہر گھر سے پھولوں کے بجائے
جلتا ہوا لوہا بہتا ہے"

دوسری جنگ عظیم کے دوران نرودا یورپ کے مرکز پیرس میں رہتا ہے اور بین الاقوامی حالات کا جائزہ لیتا ہے۔

جنگ کے خاتمے پر نرودا چلی کی کمیونسٹ پارٹی کا رکن بن جاتا ہے جس سے اس کی فکر میں پیدا شدہ تبدیلی اس کی شاعری میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اس کے بعد سے وہ شاعری کو خواص کے بجائے انسانی رابطے کی دستاویز کے طور پر عوام کے لئے اہم سمجھتا ہے، لیکن ایک اشتراکی ہونے کے باوجود، وہ روس کی تعریف میں رطب اللسان نہیں ہوتا بلکہ چین اور روس دونوں ملکوں میں اشتراکیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات پر خاصے کٹیلے انداز میں طنز بھی کرتا نظر آتا ہے۔

اسی زمانے میں لکھی گئی اس کی طویل نظم (The Heights of Maccho Piccho) لاطینی امریکی شاعری میں رزمیہ شاعری کی معراج بن جاتی ہے۔ وہ شاعری کو ایک سماجی عمل سمجھتا ہے، لیکن یہ بات اس کے دائرہ کار پر حاوی نہیں ہوتی۔

۱۹۷۰ء میں ہونے والے چلی کے انتخابات میں وہاں کی کمیونسٹ پارٹی نرودا کو صدارت

کے لئے اپنا امیدوار منتخب کرتی ہے. لیکن بعد میں مشترکہ اتحاد کے امیدوار سالواڈور آلاندے (Salvador Allande) کے کھڑے ہو جانے پر وہ دست بردار ہو جاتا ہے۔

انتخابات کے بعد آلاندے کے دور حکومت میں نرودا کو فرانس میں چلی کا سفیر بنا کر بھیجا جاتا ہے اور اسی دوران ۱۹۷۱ء میں وہ ادب کا نوبل انعام وصول کرتا ہے۔ اس وقت تک نرودا کی شاعری کے کل ۴۴ مجموعے شائع ہو چکے تھے۔

انعام حاصل کرنے کے بعد وہ واپس اپنے وطن آ جاتا ہے اور اب ایک بیمار انسان کی حیثیت سے اپنے گھر ازلانیگرا Islanegra میں رہنے لگتا ہے۔ لیکن یہ وہ زمانہ ہے، جب نرودا کا وطن چلی خانہ جنگی کے کنارے پر ہے۔ اس اندوہناک صورتحال کے بارے میں وہ بستر علالت سے اپنی دوست اور سوانح نگار (Margarita Aguirre) کو خط میں لکھتا ہے۔

" دل ہلا دینے والی صورت حال اب میری لائبریری تک آ پہنچی ہے۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں کہ میں اس عظیم جدوجہد میں شریک ہو جاؤں "

ایک انٹرویو میں، جو اگست ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا، وہ اپنے ملک چلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

" خاموش ویت نام میں بغیر آگ اور بموں کے کیا ہو رہا ہے؟ لیکن اس کے علاوہ چلی کے خلاف ہر قسم کا اسلحہ اندرونی اور بیرونی طور پر استعمال میں لایا جا رہا ہے "

۱۱ ستمبر کو جب وہ بستر علالت پر تھا تو چلی کی بحریہ صدر آلاندے کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دیتی ہے. جس میں فوج بھی شریک ہو جاتی ہے (Lamonde) کے صدارتی محل پر گولہ باری کے نتیجے میں چلی کا صدر آلاندے مارا جاتا ہے۔

خود نرودا کے اپنے الفاظ میں

"ایک بار پھر چلی کو اس کے اپنے سپاہی دھوکہ دیتے ہیں" اور یوں پابلو نرودا جو نصف صدی کی طویل عوامی جدوجہد کو ضائع ہوتے ہوئے دیکھنے کے لئے زندہ رہا، آخر کار ۲۳ ستمبر ۱۹۷۳ء کو اس دار فانی سے کوچ کر جاتا ہے۔ چلی کا باشندہ (Neftales Reyes) مر جاتا ہے۔ لیکن لاطینی امریکہ کا عظیم شاعر پابلو نرودا زندہ رہتا ہے۔ اور ہمیں اس کی مشہور نظم کی بازگشت ایک بار پھر سنائی دیتی ہے۔

"دھوکے باز جنرل
میرے مردہ گھر کو دیکھتے ہیں
ہر گھر سے پھولوں کی جگہ
جلتا ہوا لوہا بہتا ہے"

انور زاہدی
اسلام آباد

"اس خود نوشت یا یادداشتوں میں، یہاں وہاں خالی جگہیں ہیں اور کبھی کبھار یہ بھلا دی جاتی ہیں، کیونکہ اسی کا نام زندگی ہے۔

خواب کے وقفے، ہمیں کام کے دنوں میں حوصلہ بخشتے ہیں۔ بہت سی چیزیں جو میرے ذہن میں ہیں۔ یاد کرتے ہوئے دھندلا جاتی ہیں۔ وہ شیشے کے ان ریزوں کی طرح، جنہیں جوڑا نہیں جاسکتا، مٹی میں مل چکی ہیں۔

خود نوشت لکھنے والا ادیب، جو یاد رکھتا ہے۔ وہ نہیں، جو شاعر کو یاد ہوتا ہے ممکن ہے اس کی زندگی کم رہی ہو، لیکن اس نے تصویریں زیادہ اتاری ہوں اور وہ انہیں تفصیل سے ہماری خصوصی توجہ کے لئے دوبارہ تخلیق کرتا ہے۔ شاعر ہمیں بھوتوں سے بھری ایک گیلری، جو اس کے وقت کی تاریکی اور آگ سے لرزاں ہو، عطا کرتا ہے ____

شاید میں صرف اپنی ذات میں زندہ نہیں رہا۔ شاید میں دوسروں کی زندگی جیا ہوں۔

جو کچھ میں نے تحریر میں ان صفحات پر چھوڑا ہے۔ ان پر ہمیشہ خزاں آئے گی۔۔ جیسے خزاں کے کنج میں یا انگوروں کی فصل کاٹنے کے دوران ____ اپنی موت پر زرد پتے گرتے ہیں اور انگور، جو نئی زندگی کو مقدس شراب میں پائیں گے۔

میری زندگی، وہ زندگی ہے، جو ان تمام زندگیوں سے مل کر جمع ہوئی ہے ____
شاعر کی زندگیاں ____"

پہلا باب

دیہاتی لڑکا

چلی کا جنگل

آتش فشاں پہاڑوں کے دامن میں برف پوش چوٹیوں کے قریب وسیع و عریض جھیلوں کے درمیان، مہکتا ہوا چلی کا پر سکون گھنا جنگل..........

میرے پاؤں مردہ پتوں میں دھنستے ہیں، ایک نازک ٹہنی تڑختی ہے، دیو قامت رالی کے درخت اپنی انتہائی بلندیوں کے ساتھ نمایاں ہوتے ہیں۔ ایک پرندہ سرد جنگل سے ہوتا ہوا اوپر سے گزرتا ہے وہ اپنے پروں کو پھڑپھڑاتا ہے اور سورج سے محروم شاخوں میں ٹھہر جاتا ہے اور پھر اپنی مدھر آواز میں بانسری سے مشابہ لے میں گاتا ہے..............

لارل کی جنگلی مہک، چھپی ہوئی بولڈو پود کی خوشبو، میرے نتھنوں میں داخل ہوتی ہے اور میرے پورے وجود میں چھا جاتی ہے۔ گیوٹی کاز کے سایہ رس میرا راستہ روکتے ہیں..............

یہ ایک عمودی دنیا ہے، پرندوں کی دنیا، پتوں کی افراط

میں ایک چٹان پر ٹھوکر کھا کر رکتا ہوں، ادھ کھلے گڑھے کو کھودتا ہوں۔ سرخ بالوں سے ڈھکی ہوئی ایک بڑی مکڑی ایک بہت بڑے کیکڑے کی مانند بے حس و حرکت مجھے گھورتی ہے۔

ایک سنہری بھنورا اپنا بدبو دار سانس چھوڑتا ہوا گزرتا ہے اور اس کی شاندار قوس قزح کے رنگ بجلی کی مانند غائب ہو جاتے ہیں۔

چلتے چلتے میں فرن کے جنگل میں سے گزرتا ہوں، جس میں ہر پودا میرے قد سے بلند ہے فرن کے ان پودوں کی سبز سرد آنکھوں سے ساٹھ آنسو میرے چہرے کو دھوتے ہیں اور میرے

پیچھے ان کے پنکھ کافی دیر تک ہلتے رہتے ہیں.........

گلے ہوئے درخت کا ایک تنا کیسی عجیب دولت ہے!

سیاہ اور نیلی سانپ کی چھتریوں نے اسے کان دے دیئے ہیں، جنگلی سرخ بیلوں نے اسے موتیوں سے چھپا رکھا ہے۔ دوسرے سب پودوں نے اسے اپنی داڑھیاں ادھار دے رکھی ہیں اور ایک سانپ گلے ہوئے تنے میں سے اچانک سانس کی طرح باہر نکلتا ہے بالکل جیسے مردہ تنے کی روح اس سے جدا ہو رہی ہو۔

دور ایک طرف ہر درخت اپنے ساتھیوں سے الگ کھڑا ہے۔ وہ سب رازوں سے بھرے جنگل کے قالین پر لہلہاتے ہیں۔ ہر ایک پودے کے پتوں کا انداز جدا ہے بالوں کی طرح ریشمی اور باریک، ہلالی، تیروں کی طرح نوکیلے بالکل جیسے قینچی کی مدد سے کاٹے گئے ہوں، ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہلتے ہوئے

ایک تنگ گھاٹی ــــــ نیچے بلور جیسا شفاف پانی پتھروں پر سے پھسلتا ہوا ایک لیموئی رنگ کی چمکدار تتلی پانی اور روشنی کے درمیان ہوا میں رقص کرتی ہوئی گزر جاتی ہے ــــــ نزدیک ہی لاتعداد کیلیسولیراز اپنے پیلے سر پذیرائی کے انداز میں ہلاتے ہیں ادھر بلندی پر لیپاجیریا کے پھول جادوئی جنگل کی رگوں سے قطروں کی طرح لٹکتے ہیں

سرخ پھول خون کا پھول ہے ــــــ سفید برف کا پھول

ایک لومڑی سکوت کو بجلی کے کوندے کی مانند توڑتی ہے اور تمام پتے خوف سے کپکپا اٹھتے ہیں۔ لیکن سکوت پودوں کی قلمرو کا قانون ہے

بمشکل سنی جانے والی کہیں دور کسی وحشی جانور کی چیخ، چھپے ہوئے پرندے کی اچانک چبھتی ہوئی مداخلت، نباتاتی دنیا اپنا دھیما رقص جاری رکھتی ہے تاوقتیکہ کوئی طوفان تمام دنیا کی موسیقی کو کھا جاتا ہے۔

کوئی بھی شخص جو چلی کے جنگلات میں نہیں رہا اس سیارے کو نہیں جانتا ــــــ وہ آب و گل وہ سکوت ــــــ آوارہ گردی کی خاطر، گاتے ہوئے دنیا سے گزرنے کے لئے میں اس منظر سے باہر آچکا ہوں

بچپن اور شاعری

میں اپنے بچپن کے گزرے ہوئے برسوں اور بیتے دنوں سے بات کا آغاز کروں گا۔ میرے لئے بارش ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے۔ جنوب کی بے تحاشا بارش کیپ ہارن کے

آسمانوں سے سرحد کی جانب قطب جنوبی سے آبشار کی مانند نیچے آتی ہوئی بارش اور اس سرحد پر اپنے ملک کے جنوبی وحشی علاقے میں، میں نے پہلے پہل اپنی آنکھیں زندگی، زمین، شاعری اور بارش کے لئے کھولیں۔

میں نے بہت سفر کیا ہے اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے بارش کا فن، جو بہت ہی تکلیف اور لطیف طاقت کے ساتھ عمل پذیر رہا تھا اب میرے علاقے آراکینیا میں گم ہو چکا ہے۔ بعض اوقات سارا مہینہ بلکہ تمام سال ہی بارش ہوتی۔ بارش کے دھاگے شیشے کی لمبی لمبی سوئیوں کی مانند چھتوں پر گرتے، کھڑکیوں کے شیشوں پر شفاف لہروں کی طرح نظر آتے اور ہر گھر ایک جہاز کی طرح دکھائی دیتا، جو موسم سرما کے سمندر میں کسی بندرگاہ کے حصول میں جدوجہد کرتا رہتا۔ جنوبی امریکہ کے جنوب کی سرد بارش اس اچانک گرم بارش کی طرح نہیں، جو ہنٹر کی طرح چمک کر نکل جاتی ہے اور اپنے پیچھے بیدار نیلا آسمان چھوڑ جاتی ہے ـــــ جنوب کی بارش صابر ہے اور گہرے سلیٹی رنگ کے آسمان سے نامختتم انداز میں برستی رہتی ہے۔

میرے گھر کے سامنے والی گلی کیچڑ کے ایک بڑے سمندر کی شکل میں ڈھل چکی ہے۔ کھڑکی کے باہر برستی بارش میں، میں گلی کے وسط میں ایک بیل گاڑی کو پھنسے دیکھتا ہوں ایک کسان وزنی سیاہ اونی لبادہ پہنے اپنے بیلوں کو مارتا ہے۔ بارش اور کیچڑ کے سامنے بیل بےبس نظر آتے ہیں۔

ہم سڑک کے ساتھ ناپختہ فٹ پاتھ پر سردیوں اور بارش کے باوجود چلتے ہوئے اسکول جایا کرتے تھے۔ ہوا ہماری چھتریاں اڑا لے جاتی۔ برساتیاں مہنگی تھیں مجھے دستانے اچھے نہیں لگتے تھے۔ میرے جوتے بارش میں تربتر ہو جاتے مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ لٹکی ہوئی انگیا کے ساتھ بھیگی ہوئی جرابیں اور بہت سے بھیگے ہوئے بھاپ دیتے جوتے جیسے چھوٹے چھوٹے انجن نما کھلونے

پھر سیلاب آتے اور دریا کے کناروں پر غریبوں کی بسی ہوئی آبادیاں بہالے جاتے۔ زمین ہلتی اور لرزنے لگتی۔ پھر ایک مرتبہ سیراز کے علاقے میں آتش فشاں لیما پر دہلانے والی روشنی کی چٹان نمودار ہوتی اور آتش فشاں کھولنے لگتا۔

ٹی میو کو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ایک ایسا قصبہ جس کا کوئی ماضی نہیں، گو اس میں لوہے کے کاروبار کی دکانیں موجود ہیں۔ چونکہ قبائلی انڈین پڑھ نہیں سکتے لہٰذا دکانوں کے باہر پرکشش نشانات لٹکے نظر آتے ـــــ ایک بہت بڑی آری، بہت بڑی دیگچی، دیو قامت چمچہ، آگے چلتے ہوئے جوتوں کی دکان پر ایک بہت بڑا جوتا

ٹی میو کو چلی کی زندگی کی جنوبی سرحدوں پر انتہائی آخری چوکی تھی۔ اس کے پیچھے ایک طویل

خونچکاں تاریخ موجود تھی۔ جب تین سو سال کی لڑائیوں کے بعد اسپین کے فاتحین نے انہیں پیچھے دھکیل دیا اور آراکینیا کے انڈین ان سرد علاقوں میں چلے گئے لیکن چلی کے لوگوں نے آگ اور خون کی ان جنگوں کو جنہیں وہ آراکینیا کی صلح کی کوششوں سے تعبیر کرتے رہے تھے، جاری رکھیں۔ اپنے ہی لوگوں کو خود ان کی زمینوں سے بے دخل کرنے کے لئے انڈین قبائل کے خلاف ہر قسم کا اسلحہ استعمال کیا گیا۔ مشین گنوں کا بے دریغ استعمال۔ دیہاتوں کا جلایا جانا اور اس کے بعد ایک مزید شفقت آمیز طریقہ شراب اور قانون کا استعمال۔

وکیل ان لوگوں کو زمین سے بے دخل کرنے کا ماہر ہو گیا تھا اور جب لوگوں نے احتجاج کیا تو جج نے انہیں سزائیں دیں۔ پادری نے انہیں لافانی آگ کے خوف سے ڈرایا اور سخت روحوں نے، بالاخر ایک عظیم قوم کو، جس کے کارناموں، شجاعت اور خوبصورتی کی تعریف کو ڈان الانسو Don Alonso نے اپنی شاعری میں سجایا تھا، تہس نہس کر ڈالا۔

میرے والدین پرال (Parral) سے آئے تھے، جہاں میں پیدا ہوا تھا وہاں وسطی چلی میں انگوروں کی شاندار فصل ہوتی اور بے تحاشا شراب بنائی جاتی۔ میری ماں ڈونا روزا باسالٹو (Dona Rosa Basoalto) اس وقت سے پہلے کہ میں اسے یاد کر سکتا۔ اس سے پہلے کہ میں جانتا کہ یہ وہ تھی جسے میری آنکھیں ڈھونڈتی تھیں، مر چکی تھی۔ میں ۱۲ر جولائی ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوا اور ایک مہینے بعد اگست میں میری ماں تپ دق کے مرض سے گھل گھل کر چل بسی۔

ملک کے وسطی حصے میں چھوٹے کاشتکاروں کے لئے زندگی بہت دشوار تھی۔ میرے دادا (Donjose Angel Reyes) کے پاس تھوڑی سی زمین تھی لیکن بہت سے بچے تھے۔ مجھے اپنے چچاؤں کے نام (Amos, Oseas, Joel, Abadias سب دور دراز ملکوں کے شہزادوں کے سے نام لگتے تھے۔ میرے باپ کا نام (Jose Del Carmen) تھا۔ اس نے اپنے باپ کے فارم کو بہت کم عمری میں چھوڑ دیا تھا اور ایک مزدور کی حیثیت سے ٹل شوانو کی بندر گاہ کی خشک گودیوں میں کام کیا تھا۔ بتدریج وہ ٹی میوکو کی ریلوے میں ملازم ہو گیا۔ وہ ایک تجرباتی ریل گاڑی میں کنڈکٹر تھا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ تجرباتی ریل گاڑی کیا ہوتی ہے؟

جنوبی علاقے میں جہاں طوفانی ہوائیں چلتی تھیں، بارشیں ریل کی پٹڑیوں کو اگر ان کے درمیانی حصوں کو پتھروں سے صحیح طور پر نہ بھرا جاتا، بہا دیا کرتیں تجرباتی ریل گاڑی کو پتھر کی کانوں سے نکالا جاتا اور ٹوٹا ہوا پتھر کھلے ڈبوں میں لادا جاتا۔ چالیس سال قبل اس قسم کی ریل گاڑی پر کام کرنے والے عملے کو آہنی تن و توش کا ہونا پڑتا۔ یہ لوگ کھیتوں سے، ارد گرد کی آبادیوں، جیلوں سے آتے۔ یہ سب توانا جسموں اور عمدہ صحت کے مالک ہوتے۔ کمپنی انہیں تکلیف دہ حد تک کم

معاوضہ دیتی۔ جو اس قسم کی گاڑیوں پر کام کرنے پر رضامند ہو جاتے، ان سے کسی قسم کی معلومات نہ کی جاتیں میرا باپ جو کنڈکٹر تھا احکامات لینے اور جاری کرنے کا عادی ہو چکا تھا کبھی کبھار وہ مجھے اپنے ہمراہ لے جاتا۔

ہم کان سے پتھر لادتے اور ہسپانویوں اور آراکینیا کے عوام کے درمیان ہونے والی خونی جنگوں کے مشہور سرحدی علاقے کے قلب میں واقع جگہ بوروا تک لے جاتے۔ وہاں کے مناظر فطرت مجھے خوشی سے بے حال کر دیتے۔

پرندے، بھنورے اور تیتروں کے انڈے مجھے بہت اچھے لگتے۔ انہیں چشموں سے حاصل کرنا ایک معجزہ تھا۔ نیلے گہرے رنگوں کے چمکیلے، بندوق کی نالی جیسے رنگ کے ــــ میں حشرات الارض کی عمدگی پر متحیر ہوتا۔

میں نے ''Snake mothers'' ''سانپ کی ماؤں'' کو اکٹھا کیا تھا ــــ یہ نام چلی کے سب سے بڑے سیاہ چمکدار بھنورے کو دیا گیا تھا۔ اچانک جب تم ادرک کے تنے، جنگلی سیب یا کوئی ہو کے درخت پر اس کے سامنے آجاتے تو وہ تمہیں چکرا دیتا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس قدر سخت جان ہے کہ اگر میں اس کی پشت پر کھڑا ہو جاتا تو بھی وہ نہ ٹوٹتا۔ اپنی اس قدر سخت کھال کی موجودگی میں اسے زہر آلود ڈنک کی ضرورت نہ تھی۔

میری مہمات مزدوروں میں تجسس پیدا کر دیتیں۔ جلد ہی انہوں نے میری معلومات میں دلچسپی لینا شروع کر دیں۔ جونہی میرا باپ ادھر ادھر ہوتا، وہ جنگل میں غائب ہو جاتے اور مجھ سے کہیں زیادہ مہارت طاقت اور دانائی کے ساتھ، میرے لئے حیران کن خزانے تلاش کر لاتے ان میں ایک شخص مونگے (Monge) تھا۔ میرے باپ کے بقول وہ ایک خطرناک آدمی تھا، جو ہر وقت اپنے پاس ایک چاقو رکھتا۔ اس کے کھردرے چہرے پر دو گہرے زخموں کے نشان تھے۔ عمودی نشان چاقو کی ضرب کا تھا اور دوسرا گہرا نشان اس کی ٹھوڑی پر شیطانی مسکراہٹ کا تھا۔

یہ شخص میرے لئے سفید کوپی ہیو فروالی مکڑیاں، چوسنے والی رنگ ڈوز لاتا۔ ایک بار تو وہ میرے لئے لیوما کے درختوں سے انتہائی چمکدار بھنورا پکڑ لایا تھا، میں نہیں جانتا تھا کہ تم نے کبھی ایسے بھنورے کو دیکھا ہے۔ میں نے بھی زندگی میں پہلی دفعہ اتنا خوبصورت بھنورا دیکھا تھا۔ وہ قوس قزح کے رنگوں میں ملبوس روشنی کی ایک کرن نظر آتا تھا۔ سرخ اور عنابی سبز اور نیلے رنگوں کے دھبے اس کے خول پر موجود تھے۔ وہ بجلی کے کوندے کی مانند میرے ہاتھوں سے نکل کر دوبارہ جنگل میں غائب ہو گیا تھا (Monge) وہاں نہیں تھا کہ اسے دوبارہ میرے لئے پکڑ لاتا۔

میں اس جھلملاتے ہوئے خیالی تصور سے کبھی بھی آزاد نہ ہو سکا اور نہ ہی میں اپنے دوست (Monge)

کو کبھی بھلا سکا۔ میرے باپ نے مجھے اس کی موت کے بارے میں بتایا کہ وہ چلتی ہوئی ریل گاڑی سے گرا اور چٹان سے لڑھکتا ہوا نیچے جا پڑا تھا۔ لیکن جب تک گاڑی روکی گئی تو بقول میرے باپ کے وہ صرف ہڈیوں کا ایک ڈھیر تھا۔

اپنے گھر کے بارے میں تفصیل سے بیان کرنا خاصا مشکل ہے۔

آج سے ساٹھ برس پہلے کے خالصتاً سرحدی مکان ـــــ پہلی بات یہ تھی کہ تمام گھر آپس میں مربوط ہوتے۔ ریز آرٹی گاز اور کینڈیا کے رستوں سے خاندان، اوزار کتابیں، سالگرہ کے کیک، مرہم پٹی کا سامان، چھتریاں، چیزیں اور کرسیوں کے تبادلے ہوتے۔

یہی گھر دیہات کے تمام مشاغل کی جان تھے۔ ڈان کارلوس میسن (Don Carlos Mason) ایک شمالی امریکی۔ جس کے سر کے بالوں میں سفید لٹ ہے اپنی شکل صورت سے ایمرسن سے مشابہ تھا۔ یہ ایک خاندان کا بزرگ تھا، میسن کے بچے حقیقت میں کریولز (Creoles) تھے۔ ڈان کارلوس قانون اور بائبل کی عزت کرتا۔ وہ سلطنت کا معمار نہ تھا لیکن ابتدائی آباد کاروں میں سے تھا۔ کسی کے پاس روپیہ پیسہ نہ تھا لیکن اس کے باوجود چھاپے خانے، ہوٹل، مذبح خانے اس خاندان کے لوگوں کی ملکیت تھے۔ کچھ بیٹے اخباروں کے مدیر تھے اور باقی ان کے لئے کام کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ ہر چیز ڈھے گئی اور ہر شخص اتنا غریب رہ گیا، جیسے وہ پہلے تھا۔ صرف جرمنوں نے اپنے اثاثوں پر قبضہ رکھا اور اس سے وہ جنگل میں تنہا ہو کر رہ گئے۔

ہمارے گھر اس وقت آباد کاروں کے عارضی کیمپ یا کسی مہم جو کی سپلائی کا ٹھکانہ تھے۔ وہاں ہمیشہ نامکمل کمرے موجود تھے اور ادھ بنی سیڑھیاں وہاں ہمیشہ عمارتوں کے بننے کی باتیں ہوتیں۔ والدین نے اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔

ڈان کارلوس کے گھر میں اہم چھٹیوں کو منایا جاتا۔ ہر سالگرہ کے ڈنر پر ٹرکی (Turkey) (مرغی کی قسم کا قدوقامت میں بڑا پرندہ) کو بھونا جاتا۔ بھنی ہوئی بھیڑ اور سویٹ ڈش کے ڈھیر ہوتے۔ مجھے کسٹرڈ کو چکھے ہوئے کئی سال ہو چکے تھے۔ خاندان کا سفید بالوں والا بزرگ اپنی بیوی ڈونا میسلا Dona Micaela) کے ہمراہ ایک بڑی میز کی مرکزی جگہ پر بیٹھا تھا۔ اس کی پشت کی دیوار پہ چلی کا ایک بہت بڑا نقشہ لگا ہوا تھا، جس میں ایک ننھا سا امریکی جھنڈا بھی آویزاں تھا وہ سب بھی ان کے خون کے حصے تھے۔ چلی کا تنہا ستارہ جو چھایا ہوا تھا۔ میسن کے گھر میں ایک بڑا ڈرائنگ روم تھا، جس میں ہم بچوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نہیں جانتا کہ اس میں رکھے ہوئے فرنیچر کا رنگ کیسا تھا، کیونکہ بیشتر اوقات وہ فرنیچر سفید غلافوں میں چھپا رہتا حتیٰ کہ ایک آتش زدگی اس سب کو نگل گئی۔ وہاں ایک البم بھی تھی، جس میں خاندان کے تمام لوگوں

کی تصاویر تھیں۔ نفیس اور نازک لوگ، ان بد رنگ اور بد مست لوگوں کے برعکس، جنہوں نے بعد میں سرحدوں پر حملہ کیا۔ انہی میں میری ماں کی بھی ایک تصویر تھی۔ اس میں وہ سیاہ لباس میں ملبوس ایک نازک اندام خوابناک خاتون نظر آتی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ نظمیں لکھتی تھی لیکن میں اس کی تصویر کے علاوہ وہ نظمیں کبھی نہ دیکھ سکا میرے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اس کی دوسری بیوی کا نام ڈونا ٹری نیڈاڈ (Dona Trinidad) تھا۔ یہ میری سوتیلی ماں تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں اپنے بچپن کے اس سرپرست فرشتہ سیرت شخصیت کے بارے میں ایسے کہوں؟ وہ بے حد چاہنے والی اور پیار کرنے والی عورت تھی اور ایک دیہاتی عورت کی طرح مزاح کی کیفیت سے مکمل طور پر آشنا اور خود میں نہ ختم ہونے والی شفقت بے پایاں رکھتی تھی۔

جونہی میرا باپ گھر میں داخل ہوتا وہ ایک سائے کی مانند خاموش ہو جاتی جیسا کہ ان دنوں تمام عورتوں کا انداز تھا ___ اسی ڈرائنگ روم میں میں نے موزر کا اور کواڈریلیز کے رقص دیکھے

گھر میں ہمارے پاس ایک صندوق تھا، جو دلچسپ چیزوں سے بھرا ہوا تھا صندق کی تہہ میں ایک کلینڈر پر طوطے کی تصویر بنی تھی۔ ایک روز جب میری ماں عبادت میں مصروف تھی، میں نے صندوق میں سے طوطا حاصل کرنے کی کوشش میں خود کو سر کے بل اندر گرا دیا تھا۔ جب میں بڑا ہوا تو صندوق کو آسانی کے ساتھ کھول لیتا۔ اس میں خوبصورت دستی پنکھے بھی موجود تھے۔

اس صندوق میں مجھے کچھ اور بھی یاد آتا ہے، پہلی رومانی داستان، جس نے میرے جذبات کو متاثر کیا۔ اس میں کسی کے ارسال کردہ سینکڑوں پوسٹ کارڈ تھے جن پر البرٹو نام کے دستخط تھے، مجھے یاد نہیں کہ وہ سب کس ماریا کے نام تھے۔ یہ کارڈ بہت خوبصورت تھے۔ ان سب پر اپنے وقت کی عظیم اداکاراؤں کی تصاویر تھیں، جن میں سے اکثر پر شیشے کے ٹکڑے چپکے ہوئے تھے۔ کارڈ پر موجود تصویر کے سر پر اصل بال لگے نظر آتے۔ لیکن یہ تمام خطوط میری ماں کے صندوق میں کیوں کر موجود تھے؟ یہ میں کبھی نہ جان سکا۔

ٹی میوکو میں ۱۹۱۰ء کا سال آیا۔ یادگار سال جب میں نے اسکول جانا شروع کیا۔ اسکول ایک شکستہ عمارت میں تھا، جس کے کمروں میں برائے نام فرنیچر تھا اور وہاں ایک اداس تہہ خانہ بھی تھا۔

موسم بہار میں ہم اسکول سے خوبصورت دریائے کاؤتین کو دیکھتے، جو نیچے وادی میں بل کھاتے ہوئے رستہ بناتا۔ اس کے کنارے جنگلی سیبوں کے درختوں سے لدے ہوتے۔ ہم کلاس سے موقع پا کر غائب ہو جاتے اور نیچے سفید پتھروں پر دوڑتے ہوئے دریا کے سرد پانی میں اپنے

پیروں کو ڈبو دیا کرتے۔ اسکول نے اس چھ سال کی عمر کے بچے پر لامحدود امکانات کو روشن کر دیا تھا کوئی بھی شے اپنے اندر اسرار رکھ لیتی۔

فزکس کی لیبارٹری، جس میں مجھے داخلے کی اجازت نہیں تھی، چمکدار آلات سے بھری ہوئی تھی۔ ٹیسٹ ٹیوبیں ریٹارٹس وغیرہ ــــ لائبریری ہمیشہ بند رہتی آباد کاروں کے بچوں کو کتابوں سے کوئی محبت نہ تھی۔ اس کے باوجود تہہ خانہ سب سے زیادہ دلچسپ جگہ تھی وہاں گہری خاموشی تھی۔ ایک گہری تاریکی جس میں موم بتیوں کی روشنیوں میں ہم وہاں جنگ کے کھیل کھیلا کرتے۔

فاتح اپنے قیدیوں کو بڑے ستونوں سے باندھ دیا کرتے۔ زمینی رطوبت کی بو چھپنے کی جگہ ایک مقبرے جیسائی میو کو کے اسکول کی طرف سے دیا گیا تہہ خانہ، اب بھی میری یادوں کو مسحور کرتا ہے۔

میں بڑا ہو گیا۔ کتابیں مجھے اچھی لگنے لگیں۔ (Buffalo Bill) کی مہمات اور (Salgari) کے سفرنامے مجھے خوابوں کی دور دراز دنیاؤں میں لے جاتے میرے پہلے خالصتاً سچے عشق کا اظہار ایک لوہار کی بیٹی بلانکا ولسن (Blanca wilson) کو لکھے گئے خطوط میں ہوا۔ اسکول کے لڑکوں میں سے ایک لڑکا اس سے سرتاپا عشق میں گرفتار ہو گیا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ خطوط صحیح معنوں میں کیا تھے لیکن ہو سکتا ہے کہ یہی میری پہلی ادبی کاوشیں رہی ہوں ــــ

کیونکہ ایک دن جب میں اپنے اسکول کی اس لڑکی سے اتفاقاً ملا تو اس نے اپنے محبوب کے لکھے ہوئے خطوط کے مصنف کے بارے میں مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے ہی وہ خطوط لکھے تھے۔

میں اپنے کام سے انکار نہ کر سکا، اور گھبراتے ہوئے اس کا اقرار کر لیا تب اس نے مجھے ایک (Quince) (بہی کی قسم کا پھل) دیا، جسے میں نے کھانے کے بجائے خزانے کی طرح سنبھال کر رکھ لیا اس طرح اس لڑکی کے دل سے میں اس کے محبوب کی جگہ لے کر، اسے کبھی نہ ختم ہونے والے محبت نامے لکھتا رہا اور اس سے کوئنس کے پھل وصول کرتا رہا۔ اسکول کے لڑکے میرے شاعر ہونے کے بارے میں نہ جانتے تھے اور اگر انہیں علم ہو جاتا تو وہ اس وجہ سے میری عزت بھی نہ کرتے۔

کسی تعصب کے بغیر، سرحدی علاقہ ابھی تک جنگلی مغرب کی شاندار روایات رکھتا تھا میرے ساتھیوں کے نام Schnake, Schier, Hauser Smith, Taito اور Seranis تھے۔ ہم سب بشمول Aracenas Ramirezes اور Reyes کے ایک جیسے تھے۔ اس میں Basque خاندان کے نام نہ تھے۔ ان میں Frncos, Albálas, Seph

Irish Mcginiys اورardin اور Poles وغیرہ تھے۔ آراکینیا کے نام ایک پراسرار روشنی دیا کرتے تھے جس میں جنگل اور پانی کی مہک شامل ہوتی مثلاً Melivilus اور Catrileos کبھی کبھی ہم بڑھے ہوئے سائبان کے نیچے Acorns سے لڑا کرتے۔ جسے Acorn کی چوٹ نہیں لگی وہ نہیں جان سکتا کہ اس سے کس قدر چوٹ آ سکتی ہے۔ اسکول پہنچنے سے پہلے ہم اپنی جیبیں اسی اسلحے سے بھر لیتے۔ میں کچھ زیادہ تیز نہ تھا۔ نہ ہی مجھ میں طاقت تھی اور نہ مہارت۔ اس طرح چوٹیں بھی مجھے زیادہ آتیں جبکہ میں ان پھلوں کی خوبصورتی ان کے رنگ، ساخت وغیرہ پر غور کر رہا ہوتا مجھ پر ان پھلوں کی بارش شروع ہو جاتی۔

دوسرے سال کے دوران میں نے بارش سے بچنے کے لئے شوخ سبز رنگ کا ہیٹ اوڑھنے کا ارادہ کر لیا۔ یہ ہیٹ میرے باپ کا تھا جس کا اونی کنارہ خاصا وزنی تھا اور جس پر سبز سرخ لائنوں والے نشانات نمایاں تھے۔ یہ مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں اسے اسکول لے گیا۔ جب سر پر یہ ہیٹ اوڑھے ہوئے میں اسکول پہنچا تو بارش ہو رہی تھی اور سبز رنگ کا مومی ہیٹ دور سے ہریل طوطا لگتا تھا۔ جونہی میں سائبان کے قریب پہنچا، جہاں تین سو کے قریب شور مچاتے بچے کھیل میں مصروف تھے، میرا ہیٹ ایک طوطے کی طرح میرے سر سے اڑ گیا۔ میں اس کے پیچھے بھاگا اور ہر بار جب میں اسے پکڑنے کے قریب ہوتا تو وہ آگے کی طرف اڑ جاتا۔ اس کی اڑان کے تعاقب میں کانوں کو بہرا کر دینے والا شور و غل جو میں نے کبھی نہ سنا تھا ـــــ پھر دوبارہ مجھے اپنا سبز ہیٹ دیکھنا نصیب نہ ہوا

ـــــ

ان یادوں میں صحیح طور سے وقت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ میں بہت سے غیر معمولی واقعات کو محفوظ کرتا ہوں، جو میرے لئے خاصے اہم تھے اور اس واقعے کے ذہن میں آتے ہی مجھے یوں لگتا ہے جیسے مجھے تحریک دینے والا یہ پہلا واقعہ رہا ہو ـــــ عجیب و غریب انداز میں فطری تاریخ کے ساتھ منسلک ـــــ شاید فطرت اور محبت، میری نظموں کے لئے بہت اوائل عمری میں موجود تھیں۔

میرے گھر کے بالمقابل دو لڑکیاں رہا کرتی تھیں۔ وہ ہمیشہ مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھتیں کہ میرا چہرہ سرخ ہو جایا کرتا، شاید وہ قبل از وقت بالغ ہو چکی تھیں اور جتنا میں شرمیلا اور خاموش واقع ہوا تھا وہ اتنی ہی حرافائیں تھیں اس مرتبہ قصداً میں اپنے دروازے میں انہیں نہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کھڑا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں کچھ تھا جس نے میری توجہ کو ان کی طرف مبذول کر دیا جب میں نزدیک پہنچا تو انہوں نے مجھے جنگلی پرندے کا ایک گھونسلہ دکھایا۔ یہ سبز جنگلی جھاڑی اور پروں سے بنا ہوا تھا اور اس گھونسلے میں نیلم جیسے گہرے نیلے رنگ کے ننھے ننھے انڈے

رکھے ہوئے تھے جب میں نے اسے بغور دیکھنا چاہا تو لڑکیوں میں سے ایک بولی کہ پہلے وہ میرے کپڑوں میں سے مجھے محسوس کریں گی۔ میں اس قدر خوفزدہ تھا کہ میں نے کانپنا شروع کر دیا اور وہاں سے کھسکنا چاہا ان خوبصورت بلاؤں نے اپنے سروں پر اس دلچسپ خزانے کو رکھے ہوئے میرا پیچھا کیا اس تعاقب کے دوران میں ایک ایسی گلی میں چلا گیا جو ایک بیکری کی طرف جاتی تھی اور یہ بیکری میرے باپ کی تھی۔ یہاں پہنچ کر میرے حملہ آوروں نے بالاخر مجھے پکڑ لیا اور دونوں لڑکیوں نے مل کر میری پتلون کو اتارنا شروع کر دیا، لیکن جونہی ہم نے باپ کے نزدیک آتے قدموں کی آواز سنی تو ہم (حملہ آور اور میں جس پر حملہ کیا گیا تھا) سانس کو روکے ہوئے ایک کاؤنٹر کے نیچے دبک گئے اور اسی جدوجہد میں وہ گھونسلہ گر گرا کر ٹوٹ پھوٹ گیا۔

میں اس دن کو بھی یاد کروں گا جب اپنے گھر کے پچھواڑے، اپنی دنیا کی چھوٹی موٹی چیزوں کی تلاش میں، باڑھ کے تختوں میں سے میں نے ایک سوراخ دیکھا۔ اس سوراخ سے دوسری طرف مجھے اپنے ہی گھر جیسا قطعہ زمین نظر آیا۔ میں چند قدم پیچھے کی طرف کو ہٹ گیا کیونکہ میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اچانک ایک ہاتھ اس سوراخ سے نکلا یہ میری ہی عمر کے ایک چھوٹے بچے کا ہاتھ تھا، جب میں نزدیک پہنچا تو وہ ہاتھ غائب ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایک ننھی سی سفید بھیڑ موجود تھی یہ بھیڑ اڑے ہوئے رنگ کے اون سے بنی ہوئی تھی۔ وہ پہیے جن پر یہ چلتی ہو گی موجود نہ تھے۔ اتنی خوبصورت اور ایسی پیاری بھیڑ میں نے کبھی نہ دیکھی تھی میں بھی اپنے گھر واپس گیا اور ایک تحفہ لئے واپس پلٹا، جو میں نے اسی سوراخ میں رکھ دیا۔ یہ دیودار کے درخت کا ایک سوکھا ہوا پھل تھا، جو ادھ کھلا تھا اور مہک دیتا تھا اور مجھے بے حد عزیز تھا۔

اس لڑکے کا ہاتھ میں نے پھر کبھی نہ دیکھا نہ ہی ایسی خوبصورت بھیڑ کبھی دیکھنے کو پھر ملی جسے میں ایک آگ میں ضائع کر بیٹھا۔ آج بھی جب کبھی میں کھلونوں کی دکان کے سامنے سے گزرتا ہوں تو شیشے کے شوکیسوں میں ضرور تجسس سے دیکھتا ہوں لیکن بے سود ہے۔ اس جیسی بھیڑ دوبارہ کبھی نہ بنائی گئی تھی۔

فن اور بارش

بالکل جیسے موسم سرما میں گلیوں میں بارش، کیچڑ، امریکہ کے جنوبی حصے کی ناقابل برداشت تکلیف دہ سردیاں ہم پر نازل ہوتیں ویسے ہی ان منطقوں میں زرد عذاب ناک گرمیاں آتیں۔

ہم تسخیر نہ کئے گئے پہاڑوں سے گھرے ہوئے تھے۔ لیکن میں سمندر کو جاننا چاہتا تھا۔

قدرت کی ستم ظریفی کہئے کہ میرے باپ کو اس کے ریلوے کے محکمے کے بے شمار دوستوں میں سے کسی ایک ۔نے ایک گھر ادھار دے رکھا تھا۔

رات کے چار بجے مکمل تاریکی میں (میں نہیں سمجھ سکا کہ چار بجے کو صبح کیوں کہتے ہیں) میرے باپ نے اپنی کنڈکٹروالی سیٹی بجا کر سارے گھر کو اٹھا دیا تھا۔ اس وقت کے بعد پھر نہ کبھی سکون ہوا اور نہ ہی روشنی۔ موم بتیوں کے حصار میں، جن کے ننھے ننھے شعلے ہواؤں کے جھونکوں سے بجھ بجھ جاتے تھے، میری ماں میرا بھائی روڈلفو اور بمن لارا باورچی کے ساتھ ادھر سے ادھر بھاگتے پھرتے تھے۔ بستروں کو بنڈل کی شکل میں باندھتے ہوئے ــــ پلنگوں کو بھی ریل گاڑی پر لے جانا تھا۔ میں طبعاً کمزور تھا اور چونکہ نیند سے اچانک اٹھا دیا گیا تھا۔ اس لئے مجھے متلی کا احساس ہو رہا تھا اور ٹھنڈ میری ہڈیوں میں اتری جاتی تھی۔ اس اثناء میں گھر میں نہ ختم ہونے والا شور و غل جاری تھا۔ ہر چیز غریب آدمی کی ایک ماہ کی چھٹی کے لئے لے جائی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ خشک کرنے والی وہ بتیاں بھی جنہیں روشن انگیوں پر بسترے کی چادروں اور ان کپڑوں کو خشک کرنے کے لئے ڈالا ہوا تھا۔ جو وہاں کی مرطوب فضا میں ہمیشہ بھیگے رہتے تھے، باندھا جا چکا تھا اور بنڈل کی شکل میں باہر منتظر بیل گاڑی پر لادا جا رہا تھا۔

ریل گاڑی کا سفر اس سرد صوبے میں ٹی میو کو اور کراہیو کے درمیان پھیلا ہوا تھا۔ ریل گاڑی بے آباد کاشت نہ کی گئی وسیع و عریض پھیلی ہوئی زمینوں میں سے ہوتی ہوئی کنوارے جنگلوں، سرنگوں اور پلوں پر سے زلزلے کی طرح گزری۔ جس طرح اس پھیلے ہوئے دیہاتی علاقے میں اسٹیشن ایک دوسرے سے مموسا اور پھولوں سے لدے ہوئے سیب کے درختوں کے درمیان تنہا تھے۔ ایسے ہی رسمی لباس میں ملبوس اور آبائی شان و شوکت کے ساتھ آراکینیا کے انڈین اسٹیشن پر بھیڑیں، مرغیاں، انڈے اور کپڑا مسافروں میں فروخت کرنے کے لئے منتظر نظر آتے ــــ میرا باپ ہمیشہ نہ ختم ہونے والی سودے بازی کے بعد کچھ خرید لیتا جب وہ آراکینیا کی کسی انڈین عورت کے سامنے سے جو اپنی اشیاء کی قیمت ذرا بھی کم نہ کرتی، مرغی کو اٹھاتا تو اس کی سنہری داڑھی دیکھنے والی ہوتی۔

ہر اسٹیشن کا نام خوبصورت تھا۔ تقریباً سارے ہی نام قدیم آراکینیا سے لئے گئے تھے ــــ یہ ہسپانوی فاتحین اور چلی کے بیٹوں کے درمیان لڑی جانے والی خونریز جنگوں کا علاقہ تھا۔

(Labranza) پہلا اسٹیشن تھا (Boroa) اور (Ranaglco) اس کے بعد آنے والے دوسرے اسٹیشن۔ جنگلی پودوں کی خوشبو سے مہکتے ہوئے نام ــــ مجھے ان ناموں کے حروف مسحور کرتے۔ آراکینیا کے نام ہمیشہ کسی لذیذ شے کی خصوصیت رکھتے۔ دفن شدہ شہد۔ گھونگوں

کے جزیرے یا جنگل کے قریب ایک دریا یا جنگلی سرزمین کے پرندے کا نام۔ ہم دریائے امپریل پر سے گزرے جہاں شاعر ڈان الانسو (Don Alonso) ہسپانوی گورنر کے ہاتھوں تقریباً مار دیا گیا تھا ـــ یہ پندرھویں اور سولھویں صدی میں ہسپانوی فاتحین کا مرکز تھا۔ اس جنگ آزادی میں آراکینیا کے لوگوں نے "جلی ہوئی زمین" کا طریقہ جنگ دریافت کیا۔

انہوں نے خوبصورت شہر میں کوئی عمارت صحیح سالم نہ چھوڑی جیسا کہ ڈان الانسو نے اس شہر کو قابل فخر بیان کیا تھا۔

پھر دریا کے کنارے آباد شہر آگئے۔ ریل نے ایک خوش کن سیٹی بجائی دیہات کے علاقے اور اسٹیشن کو کوئلے کے دھویں کے بادل میں سیاہ کرتے ہوئے گھنٹیاں بج اٹھیں اور اب وسیع آسمانی رنگ کے پرسکون دریائے امپیریل کو سمندر کی طرف جاتے ہوئے سونگھا جا سکتا تھا۔

ان گنت سامان، چھوٹا سا خاندان اور بیل گاڑی میں بیٹھ کر کشتی تک کا سفر سب یقیناً میرے باپ کی نیلی آنکھوں کی ہدایت اور اس کی ریلوے والی سیٹی کے طفیل تھا ـــ ہم نے خود کو اور اپنے سامان کو چھوٹی سی کشتی میں بدقت تمام ٹھونسا۔ کشتی میں جو ہمیں سمندر کی طرف لے جاتی، بیٹھنے کی جگہ نہ تھی میں کشتی کے سر کے نزدیک بیٹھا تھا۔ کشتی کے پہیوں نے پیڈلوں کی مدد سے دریا کی لہروں کو کاٹنا شروع کیا۔ چھوٹی سے کشتی کے انجنوں نے شور مچایا اور جنوب کے طبعاً خاموش لوگ کشتی کے عرشے پر بے جان فرنیچر کے ٹکڑوں کی طرح بکھر گئے۔

اکارڈین پر ایک محبت بھرے نغمے کی دھن ابھری۔ محبت کی آواز ایک پندرہ سالہ لڑکے کے دل کو کوئی شے اس طرح مغلوب نہ کر سکتی تھی جیسے کہ اس سفر میں گھرے کناروں کے درمیان بہنے والے ایک اجنبی بڑے دریا نے جو پراسرار سمندر کی جانب رواں دواں تھا، کی کیفیت نے کر دیا تھا باجو امپیریل میں گھروں کی بس ایک دھجی سی تھی جن کی چھتیں سرخ تھیں۔ یہ شہر دریا کی پیشانی پر واقع تھا۔ اس گھر سے جو ہمارا منتظر تھا، بلکہ وہیں سے جہاں اسٹیمر کو باندھا گیا، میں دور فاصلے پر سمندر کو چنگھاڑتے ہوئے سن سکتا تھا۔

دور دراز کی مداخلت ـــ

سمندر کے مدوجزر میری زندگی میں آرہے تھے۔

یہ گھر ڈان ہوریگیو Don Horagio کی ملکیت تھا، جو ایک دیوقامت کسان تھا تمام مہینہ جب ہم اس کے گھر میں رہے، وہ پہاڑیوں اور ناقابل گذر راستوں پر اپنا ٹریکٹر اور تھریشر چلاتا رہا۔ اپنی مشینوں سے وہ انڈین قبائل اور ان لوگوں کے لئے جو سمندری قصبوں سے آئے ہوئے

تھے، گیہوں کاشت کرتا۔ وہ ایک لمبا چوڑا آدمی تھا، جو اچانک ہمارے خاندان پر اپنی گرجتی ہوئی آواز میں بولنے لگتا۔ اس کا جسم بھوسے اور گندم کی خاک سے ڈھکا ہوتا اور پھر وہ ایسے ہی شور مچاتا ہوا واپس پہاڑوں میں اپنے کام کی طرف چلا جاتا۔ میرے لئے وہ جنوبی علاقوں کی سخت زندگی کی ایک اور مثال تھا اس گھر میں مجھے ہر چیز پراسرار لگی —— اجاڑ گلیاں، میرے گرد اجنبی زندگیاں اور دور سمندر کی اچھال کی غراہٹ۔

اس گھر میں ایک بہت بڑا باغ تھا، جس کے وسط میں ایک گرمائی مکان تھا۔ بارشوں کی مار کھایا ہوا گرمائی مکان جس کے سفید پتھروں پر انگوروں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔

علاوہ میرے، جو کہ کچھ نہیں تھا، کوئی بھی کبھی اس سرمئی تنہائی میں جہاں ہنی سکل اور آئی وی اور میری شاعری پروان چڑھے، نہ اترا تھا اس مکان کے باغ میں ایک دلچسپ چیز ایک لائف بوٹ تھی، جو کسی طوفان میں تباہ ہونے والے جہاز کا سرمایہ ہوگی لیکن اب اس باغ میں لہروں اور طوفانوں کے بغیر لالہ کے پھولوں میں ایک اچھوت کی طرح پھنسی ہوئی تھی۔

ایک عجیب بات، جو اس ناتراشیدہ باغ کے بارے میں نظر آئی یا تو بےتوجہی تھی اور یا پھر کوئی مقصد کہ وہاں صرف گل لالہ اگتے تھے۔ باقی تمام پودے جیسے اس غمزدہ حصے سے غائب ہو چکے تھے۔

کچھ پھول بہت بڑے اور فاختاؤں کی مانند سفید تھے۔ کچھ خون کے قطروں کی طرح سرخ کچھ کاسنی یا سیاہ بھلا دی گئی بیواؤں کی طرح نہ میں نے گل لالہ کو اس قدر عالم ویرانی میں دیکھا اور نہ ہی ان جیسے پھول دوبارہ دیکھنے کو ملے۔

باوجودیکہ میرے دل میں ان پھولوں کے لئے بہت احترام تھا۔ لیکن ساتھ ہی خوف کا ایک وہم بھی۔ تمام پھولوں میں سے بس یہی پھول مجھ میں تحریک سی دیتے جو مجھے انہیں توڑنے سے باز رکھتی۔ بار بار پھول کی ٹوٹی ہوئی شاخ میرے ہاتھ پر چپکنے والا دودھ جیسا مواد لگا دیتی جس میں سے تھرکتی ہوئی خوشبو میرے سانس میں بس جاتی۔ تب میں پھول کی پتیوں کو پیار سے سہلاتا اور انہیں اپنی کتابوں میں رکھ لیتا۔ میرے لئے ان پھولوں کی پتیاں بڑی بڑی تتلیوں کے پر تھے جو اڑ نہ سکتی تھیں۔

پہلی بار جب میں سمندر کے سامنے کھڑا ہوا تو میں مدہوش ہو گیا تھا عظیم سمندر نے اپنے غیض و غضب کو وہاں دو بڑی پہاڑیوں Huilque اور Mavle کے درمیان آزاد کر رکھا تھا۔ ہمارے سروں سے خاصے فاصلے پر یہ صرف بےپناہ برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں ہی نہیں تھیں بلکہ ایک بہت بڑے دیو قامت دل کی بلند آواز دھڑکن تھی —— کائنات کے دل کی دھڑکن

خاندان نے میزپوش اور چائے کے سامان کو اس حصے میں لگایا میرے منہ میں کھانا ریت کے زرات کے ساتھ مل کر چلا گیا جس کی میں نے پرواہ نہ کی البتہ جس چیز نے مجھے ڈرایا وہ گہن کا وہ لمحہ تھا جب میرے باپ نے ہمیں روزانہ نہانے کے بارے میں حکم جاری کر دیا۔

میں اور میری بہن لارا (Laura) یخ پانی کی لہر سے بھیگ چکے تھے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ کسی لہر کی انگلی ہمیں سمندر کے پہاڑوں میں اٹکا دے گی ہم کانپ اٹھے۔ جب ہمارے دانت بجنا شروع ہو گئے اور ہماری پسلیاں نیلی پڑ گئیں اور میں اور میری بہن ہاتھوں میں ہاتھ تھامے مرنے کے لئے تیار تھے تو ریلوے کے ملازم کی وسل بجی اور ہمارے باپ کی آواز نے ہمیں شہادت سے آزاد کر دیا۔

میں اس جگہ کے کچھ اور اسرار سے متعلق بات کروں گا۔

ایک تو (Percherons) (پرشی رونز) اور دوسرا تین بہنوں کا گھر چھوٹے سے گاؤں کے آخری سرے پر کئی عمارتیں تھیں۔ وہ چمڑا رنگنے کے کارخانے بھی ہو سکتے تھے ان فرانسیسی مالکوں کے جو جنوبی چلی میں چمڑے کی صنعت کے کاروباری تھے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ عمارتیں در حقیقت کس مقاصد کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ میں جس بات میں دلچسپی رکھتا تھا وہ صرف یہ تھی کہ بڑے بڑے گھوڑے جو ان عمارتوں کے دروازوں میں سے غروب آفتاب کے وقت نکلتے اور قصبے میں سے گزرا کرتے، یہ پرشی رونز تھے ـــــ شاندار جسموں والے گھوڑے گھوڑیاں جن کی طویل ایالیں ان کی پشت پر سے نیچے انسانی بالوں کی طرح لٹکتیں ان کی بڑی بڑی ٹانگیں بالوں کے گچھوں سے بھری ہوتیں اور جب یہ برق رفتار گھوڑے دوڑتے تو یہ بڑے بڑے پرندوں کی مانند لہریں لیتیں وہ گہرے سرخ، سفید اور طاقتور گھوڑے تھے۔ یقیناً آتش فشاں اگر ان شاندار گھوڑوں کی طرح کبھی بھاگنے اور اچھلنے کے قابل ہوتے تو ایسے ہی حرکت کرتے

وہ گرد آلود پتھریلی گلیوں میں زبردست زلزلوں کے جھٹکوں کی طرح گزرتے۔ وہ گہری آوازوں میں ہنہناتے اور زیر زمین ایسی صدائیں بلند کرتے جو ساکت ہوا میں کپکپاہٹ پیدا کر دیتیں میں نے اپنی زندگی میں دوبارہ ایسے خودسر، مضبوط اور خوبصورت گھوڑے نہیں دیکھے علاوہ ان گھوڑوں کے، جنہیں میں نے چین میں منگ خاندان کے مقبروں میں پتھروں کے بتوں کی شکل میں دیکھا تھا۔ لیکن انتہائی شاندار پتھر بھی ان بڑے عظیم جانوروں کی طرح جو میرے بچپن کی آنکھوں میں خوابوں کی تاریکی سے ابھر کر کسی دوسری دنیاؤں کے جنوں کی طرف جاتے، وہ منظر تشکیل نہیں دے سکتا۔

در حقیقت وہ غیر سدھائی ہوئی دنیا گھوڑوں سے پُر تھی۔ چلی، جرمنی اور آراکینیا کے گھڑ

سوار سب کیسٹیلین اون کے بنے ہوئے کمبل نما لبادے اوڑھے گلیوں میں گھوڑوں پر چڑھتے اور اترتے ہوئے دکھائی دیتے۔ دبلے یا کھائے پیئے، بدنما یا متناسب جسموں والے گھوڑے گھاس کھاتے ہوئے اور اپنے نتھنوں سے بھاپ نکالتے وہیں ٹھہر جاتے، جہاں ان کے سوار انہیں چھوڑ جاتے۔ وہ اپنے آقاؤں اور ان غلاموں کی تنہا زندگی کے عادی تھے۔ بعد میں وہ غلے اور خوراک کی بوریوں سے لدے ہوئے یا کھیتی باڑی کا سامان اٹھائے سطح مرتفع کی بھول بھلیوں میں اوپر چڑھتے ہوئے خراب وخستہ حال سڑکوں پر کبھی نہ ختم ہونے والے انداز میں دوڑتے ہوئے ساحل سمندر کی ریت پر واپس چلے جاتے۔

وقتاً فوقتاً آراکینیا کا گھڑ سوار قرضہ دینے والی دکان یا نیم تاریک شراب خانے سے باہر آتا، اپنے گھوڑے پر دشواری کے ساتھ سوار ہوتا اور نشے میں تقریباً مدہوش اطراف میں جھومتا ہوا پہاڑیوں میں واقع اپنے گھر کی سڑک پر روانہ ہو جاتا۔ اسے دیکھ کر میں ہمیشہ یہ سوچتا کہ نشے میں دھت یہ گھڑ سوار گھوڑے سے گر جائے گا لیکن یہ غلط تھا۔ وہ ہمیشہ گرتے ہوئے خود کو سنبھال لیتا اور دوبارہ جھومنا شروع کر دیتا۔ زین سے چپکا ہوا دوسری طرف جھکتے اور خود کو سنبھالتے ہوئے وہ گھوڑے پر بیٹھے میلوں کی مسافت طے کر لیتا، حتیٰ کہ وہ فطرت کی جنگلی دنیا میں ایک ایسے جانور کی طرح، جسے اپنی راہ کا علم نہیں ہوتا لیکن جو پراسرار انداز میں محفوظ ہوتا ہے، غائب ہو جاتا۔

ان دلچسپ علاقوں میں اپنی گھریلو تقریبات کے لئے ہم کئی مرتبہ گرمیوں میں واپس آئے تھے ٹی میوکو کی کاٹنے والی سردیوں اور ساحل کی عجائبات سے بھرپور گرمیوں کے درمیان وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ میں لکھتے پڑھتے اور عشق میں مبتلا ہوتے ہوئے جوان ہو رہا تھا۔ میں گھوڑے کی سواری کا عادی ہو چکا تھا۔ میری دنیا اوپر کی سمت اور باہر کی طرف کیچڑ سے بھرے ہوئے راستوں کے ساتھ سڑکوں پر اچانک موجود موڑوں پر پھیلی ہوئی تھی۔

میں الجھی ہوئی نباتات، خاموشی یا جنگلی پرندوں کی آوازوں، سرخ لبادوں میں ملبوس پہاڑوں کے عظیم آرچ بشپ کی مانند پھولوں کے درخت کی اچانک چیخ سے دوچار ہوتا یا پھولوں کے ہنگامے میں، جنہیں میں نے پہلے نہ دیکھا تھا برف ہو جاتا یا وقتاً فوقتاً جب توقع بھی نہ ہوتی تو کوپی ہیو کے گھنٹی نما جنگلی پھول ناقابل ضیاع جھاڑیوں سے تازہ خون کے قطروں کی طرح لٹکتے آہستہ آہستہ میں گھوڑے، زین، گھڑ سواری کے پیچیدہ طریقوں، مہمیز دینے کے لئے جوتے کی ایڑی پر لگی پھرکی کا عادی ہو چکا تھا۔

نہ ختم ہونے والے ساحلوں یا سبزے سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں اور دنیا کی تنہاترین جگہ کے درمیان میری روح یعنی میری شاعری سے ایک رابطہ سا بن گیا تھا۔ یہ بہت سال پہلے کی بات ہے

لیکن وہ رابطہ، وہ اظہار دشت نوردی سے وہ عہد اب بھی میری زندگی کا جزو ہے۔

میری پہلی نظم

اب میں آپ کو پرندوں کی ایک کہانی سنانے جارہا ہوں۔ بڈی کی جھیل میں ہنس راجوں کا ظالمانہ شکار ہوتا تھا، کشتیوں میں ان کا تعاقب کیا جاتا اور پھر تیز تیز کشتیاں چلتیں۔

ہنس راج اور الباٹروس (قادوسی آبی پرندے) ست رفتاری سے ہوا میں اٹھتے انہیں پانی کے اوپر تیرتے ہوئے دوڑنا پڑتا۔ وہ اپنے بڑے بڑے بوجھل پر اوپر کو اٹھاتے اور اس لئے بآسانی پکڑے جاتے اور لکڑیوں کی ضرب سے ختم کر دیئے جاتے۔ کسی نے مجھے ایک ادھ موا ہنس راج لا کر دیا۔ یہ ان حسین پرندوں میں سے ایک تھا، جسے میں نے دوبارہ دنیا میں کہیں بھی نہ دیکھا اس ہنس راج کی گردن سیاہ تھی۔ ایک برفانی کشتی، جس کی پتلی نازک سی گردن یوں لگتی تھی، جیسے سیاہ ریشمی اسٹاکنگ میں پھنسا دی گئی ہو اس کی چونچ کا رنگ نارنجی تھا اور آنکھیں سرخ تھیں۔

یہ واقعہ سمندر کے نزدیک پیورٹو ساوا ڈیرا میں ہوا۔ جب وہ مجھے ملا تو تقریباً مرا ہوا تھا۔ میں نے اس کے زخموں کو دھویا اور روٹی کے ننھے ننھے ٹکڑوں اور مچھلی کو اس کے گلے میں اتارا جس سب کو اس نے باہر الٹ دیا۔ بتدریج اس کے زخم مندمل ہونے شروع ہو گئے اور اس نے اندازہ لگالیا کہ میں اس کا دوست تھا۔ ادھر میں بھی یہ سمجھ رہا تھا کہ گھر سے جدائی اسے مار رہی تھی۔ میں سڑکوں اور گلیوں سے ہوتا ہوا دریا تک گیا، میں چاہتا تھا کہ وہ مچھلیاں پکڑے۔ دریائی پانی کی تہہ میں پتھر، ریت اور تیرتی ہوئی نقرئی مچھلیوں کو میں نے اسے دکھایا لیکن اس کی غمناک آنکھیں کہیں دور خلاؤں میں گھورتی رہیں ــــ تقریباً ہر روز میں اسے دریا تک لے جاتا اور پھر واپس گھر لے آتا یہ ہنس راج قد میں میرے ہی برابر تھا۔ ایک سہ پہر کو وہ خوابیدہ نظر آیا، وہ میرے نزدیک ہی تیرتا رہا لیکن میرے اشاروں کے باوجود اس نے مچھلیوں کو شکار کرنے پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ بے حد اداس تھا گھر لے جانے کے لئے جب میں نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر سینے سے لگایا تو مجھے یوں لگا جیسے ایک ربن کھل رہا ہو اور تبھی کسی سیاہ بازو نے میرے چہرے کو چھوا۔ یہ اسی ہنس راج کی بل کھاتی ہوئی نرم و نازک گردن تھی جو گر رہی تھی اور یوں مجھے پتہ چلا کہ مرتے ہوئے ہنس راج گایا نہیں کرتے۔

کاؤٹن میں گرمیوں کا موسم آگ کی طرح جلاتا اور آسمان اور گندم کو دھکاتا۔ زمین اپنی سستی کو جیسے جھٹکنا چاہتی تھی۔ گھر گرمیوں کے موسم کے مطابق نہیں تھے، بالکل جیسے وہ موسم سرما کو برداشت کرنے کی بھی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔

میں دیہات کے اطراف میں گھومتا ہوں، پیدل چلتا ہوں اور چلے جاتا ہوں اور نی لول کی پہاڑی پر کھو جاتا ہوں۔ میں تنہا ہوں، میری جیب بھنوروں سے بھری ہوئی ہے اور بالوں والی مکڑی جسے میں نے ابھی پکڑا تھا ڈبیا میں قید ہے۔ سر پر آسمان نہیں دیکھا جا سکتا۔ جنگل ہمیشہ کی طرح مرطوب ہے، میرے پاؤں پھسلتے ہیں اچانک ایک پرندہ چیختا ہے یہ جو کاؤ پرندے کی وحشت ناک آواز ہے۔ خوف کی لہر میرے پیروں سے اوپر کی طرف اٹھتی ہے کوپی ہیوز خون کے قطرے مشکل سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ دیو قامت فرن کے نیچے میں ایک ننھا سا وجود ہوں۔ ایک فاختہ پروں کو پھڑپھڑاتی ہوئی بالکل میرے منہ کے سامنے سے گزرتی ہے۔ بہت اوپر دوسرے پرندے میرا مذاق اڑاتے ہوئے زور سے ہنستے ہیں۔ مجھے واپسی کا رستہ ڈھونڈنے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ اب بہت دیر ہو چلی۔

میرا باپ ابھی واپس نہیں آیا۔ وہ کہیں صبح کے تین چار بجے واپس لوٹے گا۔ میں دوسری منزل میں اپنے کمرے میں جاتا ہوں اور سالگری کا مطالعہ کرتا ہوں۔ بارش آبشار کی مانند برستی ہے۔ بے حد قلیل مدت میں رات اور بارش ساری دنیا کو ڈھک لیتی ہے۔ میں تنہا ہوں اور اپنی حساب کی کاپی میں نظمیں لکھتا ہوں۔ اگلی صبح میں بہت سویرے اٹھتا ہوں ــــ آلو بخارے سبز ہیں۔

میں ڈھلان پر سے اوپر چڑھتا ہوں۔ میرے پاس نمک کا ایک چھوٹا سا لفافہ ہے۔ ایک درخت پر چڑھ کر اپنے لئے آرام دہ جگہ بناتا ہوں ایک کچے آلو بخارے میں منہ مار کر نمک لگاتا ہوں اور کھاتا ہوں یہ عمل دہرایا جاتا ہے میں جانتا ہوں کہ میں زیادتی کر رہا ہوں۔

ہمارا دوسرا گھر جل گیا تھا اور یہ نیا گھر رازوں سے پُر تھا۔ میں باڑھ پر چڑھ کر ہمسائیوں کو دیکھتا ہوں۔ ارد گرد کوئی نظر نہیں آتا میں کچھ مکڑیاں اکھٹی کرتا ہوں ــــ چند دبلی سی مکڑیوں کے علاوہ کچھ نہیں بیت الخلا گھر کی پشت پر تھا۔ اس کے پاس درخت پر ریشم کے کیڑے تھے باداموں کے درخت کے پھول سفید روئں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ شہد کی مکھیوں کو نقصان پہنچائے بغیر کیسے پکڑا جاتا ہے۔ میں انہیں کچھ دیر اسیر رکھتا ہوں اور اپنے کانوں کے نزدیک لے جاتا ہوں کتنی دلنواز بھنبھناہٹ ہے ــــ

وسیع سرحدی ویرانی میں سیاہ لباس میں ملبوس ایک ننھا شاعر لڑکا خود کو کس قدر تنہا محسوس کرتا ہے

آہستہ آہستہ زندگی اور کتابیں مجھے دلفریب اسرار کی جھلکیاں دکھاتی ہیں۔ کل رات جو کچھ میں نے پڑھا اسے نہیں بھول سکتا۔ دور دراز ملائیشیا میں سندوکان اور اس کے دوست روٹی

کے پھل پر زندہ رہے۔ میں بفلو بل کو پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ انڈین قبائل کو مارتا ہے (لیکن سرخ کھالوں کے بنے ہوئے مخروطی خیمے اور میدان خوبصورت ہیں) مجھ سے اکثر پوچھا گیا ہے کہ میں نے پہلی نظم کب لکھی؟

کب شاعری نے مجھ میں جنم لیا؟

میں یاد کرنے کی کوشش کروں گا ــــ ایک بار دور کہیں میرے بچپن میں جب میں نے بمشکل پڑھنا سیکھا تھا، مجھ میں ایک شدید جذبہ پیدا ہوا اور میں نے کچھ لفظ آدھے وزن میں ترتیب دیئے، لیکن خود میرے لئے یہ روز مرہ کی زبان سے یکسر مختلف اور اجنبی تھے۔ ایک گہرے تجسس کے زیر اثر جس کا مجھے پہلے کوئی تجربہ نہ تھا ایک طرح کی اداسی اور غصے کی کیفیت۔ میں نے انہیں کاغذ کے ایک ٹکڑے پر ایک ترتیب سے لکھا۔ میری ماں کے لئے، فرشتہ نما سوتیلی ماں، جس کے مشفق سائے نے میرے بچپن کی نگرانی کی۔ کہ یہی وہ واحد ہستی تھی جسے میں جانتا تھا۔ یہ ایک نظم تھی۔ اپنی پہلی نظم کے بارے میں جسے میں اپنے والدین کے پاس لے گیا، مجھ میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہ تھی وہ کھانے کے کمرے میں اپنی تیز و تند باتوں میں، جو ایک دریا کی طرح بچوں کو بڑوں کی دنیا سے جدا کر دیتی ہیں، مصروف تھے۔ ابھی تک شاعری کے جذبے سے سرشار کانپتے ہوئے، میں نے ان کی جانب اپنی نظم کا کاغذ بڑھا دیا میرے باپ نے خالی الذھن انداز میں اسے لیا پڑھا اور اسی ذہنی کیفیت میں مجھے واپس کرتے ہوئے کہا "یہ تم نے کہاں سے نقل کی ہے؟" پھر وہ میری ماں سے مدھم آواز میں اپنے دور دراز کے ضروری قصوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔

یوں مجھے یاد آتا ہے کہ میری پہلی نظم نے جنم لیا اور اس طرح پہلی بار میں نے غیر ذمہ دار ادبی تنقید کا نمونہ بھی دیکھا اور تمام عرصہ میں تجسس کی دنیا میں کتابوں کے جوشیلے دریاؤں میں تنہا ملاح کی طرح پھرتا رہا میرے مطالعے کے شوق میں دن اور رات میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ چھوٹے سے ساحلی قصبے پیورتو ساواڈیرا میں مجھے ایک پبلک لائبریری مل گئی میں نے ایک اور بوڑھے شاعر ڈان آگسٹو کو دریافت کیا جو میرے ادبی جذبے سے متاثر تھا وہ مجھے Ibsen, Vargas Vila اور Rocambole کی کتابیں دیتے ہوئے پوچھتا، کیا تم نے انہیں پہلے پڑھا ہے؟

میں شتر مرغ کی طرح سب کچھ نگل لیتا

اس زمانے میں ایک طویل القامت خاتون جو بغیر ایڑی کے جوتے اور لمبے لباس پہنتی ٹی میو کو میں وارد ہوئی۔ وہ لڑکیوں کے اسکول کی نئی پرنسپل تھی اس کا تعلق برفباریوں کے علاقے کے انتہائی جنوبی شہر Magellan سے تھا۔ اس کا نام (Gabrela Mistral) گبریلا مسٹرل تھا میں اسے اپنے آبائی شہر کی گلیوں میں لمبے لمبے لباسوں کو گھسیٹ کر چلتے ہوئے دیکھتا اور اس سے

خوفزدہ رہتا۔

لیکن جب مجھے اس کے پاس لے جایا گیا تو میں نے اسے بے حد پروقار خاتون پایا۔ اس کے گہری رنگت والے انڈین چہرے میں، جو آراکینیا کے خوبصورت گھڑے کی مانند تھا، اس کے بے حد شفاف دانت مسکراتے ہوئے چمکتے، اور سارے کمرے کو روشن کر دیتے۔

میں اس سے دوستی کے لئے بہت چھوٹا اور بے حد شرمیلا تھا اور ہر وقت اپنی ذات میں مگن رہتا تھا۔ میں نے اسے صرف چند مرتبہ دیکھا لیکن ہر بار وہ مجھے کچھ کتابیں دیتی، جو میں لے کر چلا آتا۔ یہ کتابیں کم و بیش روسی ناول ہوتے، جنہیں وہ دنیائے ادب میں غیر معمولی کتابیں کہتی تھی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ گیبریلا نے مجھے روس کے گہرے اور خوفناک تصور والے ناول نگاروں سے متعارف کرایا اور اس طرح ٹالسٹائی (Tolstoy) دوستوفسکی (Dostoevsky) اور (Chekhov) چیخوف نے میری ذات میں ایک خاص جگہ بنا لی۔ وہ اب بھی میرے ساتھ ہیں۔

تین بیواؤں کا گھر

ایک مرتبہ مجھے گیہوں کی چھڑائی کے لئے بلایا گیا تھا چھڑائی کا کام پرانے انداز میں گھوڑوں کی مدد سے ہوتا تھا۔ وہ جگہ جہاں مجھے جانا تھا پہاڑوں میں بہت بلندی پر اور میرے قصبے سے خاصی دور تھی۔ میں اکیلا پہاڑی علاقوں میں راستہ تلاش کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں راستہ بھول گیا تو یقیناً کوئی میری مدد کر دے گا۔

اپنے گھوڑے پر سوار باجوامپیریل کو اپنے پیچھے چھوڑتے ہوئے میں نے دریا کے ریتیلے ساحل پر سفر شروع کیا۔ وہاں بحرالکاہل آزاد ہو کر پہاڑوں کی چٹانوں اور ان پر موجود جھاڑیوں کے جھنڈ میں سے بار بار حملہ آور ہوتا۔ پھر میں بڑی جھیل کے ساتھ ساتھ مڑتا چلا جاتا۔ سمندر کی لہر پہاڑ کے نچلے حصے پر غضبناک انداز میں ٹکراتی مجھے ان چند لمحوں میں، جب لہر پہاڑ سے ٹکرا کر واپس لوٹ جاتی تھی۔ اپنی طاقت میں اضافہ کرتے ہوئے فائدہ اٹھانا تھا۔ اس سے پہلے کہ دوسری لہر مجھے یا میرے گھوڑے کو کچل ڈالتی ہمیں تیزی سے پہاڑی اور پانی کے درمیانی علاقے میں سے راستہ بنانا تھا ــــ خطرہ گزر چکا تھا۔

مغرب میں جھیل کی نیلی شفاف چادر پھیلی ہوئی تھی۔ ریتلا ساحل بہت دور تک جھیل کے دہانے تک بھاگتا ہوا چلا گیا تھا۔ چلی کے یہ ساحل، جو عموماً کٹے پھٹے ہوتے اچانک نہ ختم ہوتے ہوئے ریشمی دھجیوں میں تبدیل ہو جاتے اور آپ کئی دن کئی رات ریت پر سمندری جھاگ کے

قریب چلتے رہتے۔

چلی کے طولانی محدود ساحل بالکل کسی سیارے کا حلقہ سا بنتے نظر آتے ایک بل کھاتی ہوئی پٹی جس کے تعاقب میں جنوبی سمندر کا شور مسلسل رہتا۔ ایک راستہ جو چلی کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا اور قطب جنوبی سے پرے چلا جاتا۔ جنگل کی طرف ہیزل کے درختوں کی چمکتی ہوئی گہری سبز شاخیں مجھے اشارہ کرتیں۔

کچھ شاخیں سرخ پھولوں کے گچھوں اور ہنیرل کے پھلوں سے لدی نظر آتیں سال کے اس حصے میں یہ سرخ رنگ کے ہوتے۔ چلی کی دیو قامت فرن اتنی لمبی ہوتی کہ میں اور میرا گھوڑا، ہم دونوں فرن کی شاخوں کے نیچے سے چھوئے بغیر گزر سکتے تھے۔ جب بھی میرا سر فرن کے سبزے سے چھو جاتا تو شبنم کی بارش ہمیں بھگو دیتی۔ بڑی کی جھیل میرے دائیں ہاتھ پر تھی۔ ایک نیلی چادر جسے اطراف سے جنگل نے گھیرا ہوا تھا۔

اس جھیل کے کنارے میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا۔ وہ اجنبی ماہی گیر تھے اس حصے میں جہاں سمندر اور جھیل گلے ملتے. یا ان کا ٹکراؤ ہو جاتا وہاں دو پانیوں کے درمیان نمکین پانی کی مچھلی، جو تیز لہروں سے نکل آتی تھی اس جگہ پائی جاتی۔

چار پانچ ماہی گیر سیدھے کھڑے ہوئے اپنی نگاہیں جھیل پر جمائے رکھتے اور جھیل میں اس لہر کے آنے کے منتظر رہتے جونہی وہ لہر نظر آتی وہ بھرپور قوت اور پھرتی سے حملہ کرتے پھر وہ بیضوی شکل کی نقرئی مچھلی کو اوپر اٹھاتے. جو مرنے سے پہلے ماہی گیر کی ٹوکری میں سورج کی روشنی میں جھل جھل کرتی۔

دیر ہو رہی تھی۔ میں جھیل کے کناروں کو چھوڑ چکا تھا اور اندر کی طرف سڑک کی تلاش میں پہاڑ کے نوکیلے رستے پر رواں تھا تاریکی بڑھ رہی تھی —— اچانک ایک اجنبی پرندے کی دکھ بھری آواز کراہ کی صورت میں میرے سر پر سے گزری۔ تب ایک عقاب نے آسمان پر اوپر ڈوبتے سورج کی روشنی میں، اشارتاً مجھے دیکھتے ہوئے اپنے پروں کو روک دیا۔ جیسے وہ اپنی اڑان میں میرے تعاقب میں ہو۔ سرخ دموں والی لومڑیاں اور چھوٹے اچھلتے کودتے جانور جن سے میں ناواقف تھا بھونکتے ہوئے سڑک سے گزر گئے۔

مجھے احساس ہوا کہ میں اپنا راستہ بھول چکا تھا۔

رات اور جنگل، جنہوں نے مجھے اس قدر مسرت بخشی تھی اب میرے لئے باعث تکلیف بن گئے تھے۔ اب مجھے ان سے خوف آ رہا تھا۔ خلاف توقع ایک تنہا مسافر، اس لمحے سڑک کی تاریک ہوتی ہوئی تنہائی میں میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ میں رک گیا اور دیکھا کہ پونچو پہنے ہوئے اپنے

گھوڑے پر سوار وہ انہی اجڈ کسانوں میں سے ایک تھا جو پھیلے ہوئے سکوت میں اکثر و بیشتر ابھر آتے تھے۔

میں نے اسے اپنی صورت حال سے آگاہ کیا۔ جس پر اس نے جواب دیا کہ میں آج رات چھڑائی کے لئے نہیں پہنچ سکتا وہ اس علاقے کے کونے کونے سے واقف تھا۔ اسے اس جگہ کا بھی علم تھا، جہاں گندم کی چھڑائی کی جا رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں رات باہر نہیں گزارنا چاہتا اور اس شخص سے کسی ایسی جگہ کے بارے میں پوچھا، جہاں میں صبح تک پناہ لے سکتا تھا۔ اس نے مجھے چند لفظوں میں سمجھا دیا کہ میں دو کوس نیچے کی طرف چلا جاؤں، جہاں ایک راستہ سڑک سے جدا ہوتا ہے۔

"وہاں سے تم دور ایک دو منزلہ مکان کی روشنیوں کو دیکھو گے" اس نے مجھے بتایا

"کیا وہ کوئی ہوٹل ہے؟" میں نے پوچھا

"نہیں نوجوان، لیکن وہاں تمہاری پذیرائی کی جائے گی۔ وہاں تین فرانسیسی خواتین موجود ہیں جو اس مکان میں تیس سال سے رہ رہی ہیں وہ ہر ایک کے ساتھ اچھی طرح سے پیش آتی ہیں۔ تمہیں بھی وہ ٹھہرا لیں گی" میں نے گھڑ سوار کا شکریہ ادا کیا اور اپنی راہ ہو لیا۔ تنگ راستے پر میں ایک بھولی بسری روح کی مانند سفر کرتا رہا۔

ایک کنوارہ خم کھایا ہوا چاند بالکل تازہ کٹے ہوئے ناخن کے ٹکڑے کی مانند آسمان میں اوپر کی طرف چڑھائی کے سفر کا آغاز کر رہا تھا۔ رات کے تقریباً نو بجے، مجھے روشنیاں نظر آنے لگیں۔ جو یقیناً ایک گھر کی ہو سکتی تھیں۔ اس سے قبل کہ خدا کی اس بخشی ہوئی جنت کے دروازے مجھ پر بند ہو جاتے، میں نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور بڑے دروازے میں سے داخل ہو کر لکڑیوں کے ڈھیر کے پاس سے گزرتا ہوا ویرانے میں گم گھر کے مرکزی دروازے تک پہنچ گیا۔

میں نے دروازے کو پہلے آہستگی کے ساتھ اور پھر زور سے کھٹکھٹایا چند منٹ گذر گئے اور میرے ذہن میں دہلا دینے والا یہ خیال کہ وہاں کوئی نہیں رہتا کوندے کی طرح گذر گیا، لیکن تب ہی دروازے کو کھولتے ہوئے ایک نازک اندام سفید بالوں والی سیاہ لباس میں ملبوس خاتون نمودار ہوئی، اس نے تیز نگاہوں سے مجھے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا "کون ہو تم؟ اور کیا چاہتے ہو؟"

یہ ایک بھوتوں کی سی پراسرار آواز تھی۔

"میں ایک طالب علم ہوں اور جنگل میں اپنا رستہ کھو بیٹھا ہوں مجھے چھڑائی کے لئے پہاڑ پر بلایا گیا تھا، میں تھک چکا ہوں، کسی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ بہت متواضع ہیں۔ میں صرف رات گزارنے کے لئے ایک گوشہ چاہوں گا اور صبح سویرے ہی اپنے سفر پر روانہ ہو جاؤں گا"

"اندر آجاؤ، اور خود کو گھر میں سمجھو" وہ بولی

وہ مجھے ایک تاریک حصے میں لے گئی اور دو تین پیرافین لیمپ روشن کئے میں نے غور کیا کہ کانسی کے بنے ہوئے وہ لیمپ بے حد خوبصورت شاہکار تھے۔ کمرے میں رطوبت کی بو تھی۔ لمبے سرخ پردے بڑی کھڑکیوں پر پڑے ہوئے تھے۔ آرام کرسیوں پر سفید غلاف حفاظت کے لئے چڑھے ہوئے تھے۔ لیکن کس سے حفاظت؟ یہ کسی اور صدی کا کمرہ معلوم دیتا تھا۔ بعیداز قیاس۔ بالکل خواب کی مانند سیاہ لباس میں ملبوس نرم روی سے چلتی ہوئی سفید بالوں والی خاتون جس کے نہ قدموں کی آہٹ سنائی دیتی، نہ اس کے پاؤں نظر آتے۔ اس کے ہاتھ کبھی ایک شے کو کبھی دوسری کو، ایک البم، ایک پنکھے کو یہاں وہاں خاموشی سے چھوتے۔ مجھے یوں لگا کہ میں جھیل کی تہہ میں جاگرا ہوں اور وہاں خواب دیکھتے ہوئے تھکا ماندہ لیکن زندہ ہوں۔ اچانک جس خاتون نے میرا استقبال کیا تھا، اس جیسی دو اور خواتین اندر آئیں، خاصی دیر ہو چکی تھی، موسم بے حد سرد تھا۔ وہ میرے قریب بیٹھ گئیں۔ ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ چھیڑتی ہوئی۔ دوسری اداس آنکھوں والی بالکل اس خاتون کی مانند جس نے دروازہ کھولا تھا۔

اچانک گفتگو اس دیہاتی ماحول سے بہت دور چلی گئی، اس رات سے بھی بہت دور جس میں رات کے پرندوں کے گیت، مینڈکوں کی ٹراہٹ اور ہزاروں حشرات سوراخ کر رہے تھے۔ وہ میری تعلیم کے بارے سب کچھ جاننا چاہتی تھیں۔ میں نے اتفاقاً بادلئیر (Baudelaire) کا ذکر کر دیا اور انہیں بتایا کہ میں نے اس کی نظموں کا ترجمہ شروع کر رکھا ہے۔ یہ بالکل جیسے کوئی برقی شعلہ تھا۔ تینوں خاموش خواتین کھل اٹھیں۔ ان کی بے جان آنکھیں اور سخت چہرے جیسے یکدم بالکل بدل گئے جیسے تین کہنہ نقاب ان کے قدیم نقوش سے گر پڑے ہوں

"بودلیئر" وہ حیران ہو گئیں

یہ شاید دنیا کے شروع ہونے کے بعد سے پہلی بار ہے کہ کسی نے اس ویران جگہ میں اس کا نام لیا ہے۔ یہاں ہمارے پاس اس کی کتاب (Fleurs du mal) ہے اس جگہ سے پانچ سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہمارے علاوہ کوئی بھی دوسرا فرد ان شاندار صفحات کو نہیں پڑھ سکتا۔ ان پہاڑوں میں کوئی بھی فرانسیسی نہیں جانتا۔

دو بہنیں (Avigon) میں پیدا ہوئی تھیں۔ چھوٹی بہن جو نسل کے اعتبار سے فرانسیسی ہی تھی پیدائش کے لحاظ سے چلی کی تھی۔ ان کے اجداد والدین اور تمام رشتے دار ایک عرصہ ہوئے مر چکے تھے۔ تینوں بارش، ہوا، فیکٹری کے برادے، چند نوکروں اور پرانے کسانوں سے ملاقات کی عادی ہو چکی تھیں انہوں نے ان کھردرے پہاڑوں میں گھرے ہوئے اس گھر میں رہنے کا فیصلے کر

لیا تھا ایک انڈین خادمہ لڑکی اندر آئی اور نسبتاً عمر رسیدہ خاتون سے سرگوشی میں کچھ کہا تب ہم باہر نکلے اور سرد ہال کمرے میں سے ہوتے ہوئے کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے اور میں ششدر رہ گیا۔ کمرے کے وسط میں ایک گول میز، جس پر سفید میز پوش پڑا تھا، دو نقرئی شمع دانوں سے جن میں بہت سی موم بتیاں جل رہی تھیں روشن تھی۔ چاندی اور شیشے کے ظروف اس شاندار میز پر سجے ہوئے تھے۔ میں ایسے گھبرایا ہوا تھا، جیسے ملکہ وکٹوریہ نے مجھے اپنے محل میں کھانے پر مدعو کر رکھا ہو۔ میں خستہ حال اور گرد آلود تھا جبکہ یہ میز کسی شہزادے کے لئے سجی ہوئی تھی۔ یقیناً انہیں میں پسینے میں شرابور ایک خچر سوار کسان لگ رہا ہوں گا، جس نے اپنی سواری کو ان کے دروازے پر چھوڑ دیا تھا۔ بہت ہی کم میں نے اتنا زیادہ کھایا ہو گا۔ میری میزبان خواتین پکانے کے فن کی ماہر تھیں اور اپنے اجداد کی روایات اور اپنے محبوب وطن فرانس کے کھانوں کی عاشق لگتی تھیں۔ ہر ڈش میرے لئے ایک حیرت تھی۔ لذیذ اور خوشبودار، بعد میں وہ اپنے تہہ خانے سے فرانسیسی انداز کی بنی ہوئی پرانی شراب لے آئیں۔ حالانکہ تھکن میری آنکھوں کو بند کر رہی تھی مگر میں انہیں، نئے نئے عجائبات کے بارے میں بولتا ہوا سنتا رہا۔

تینوں بہنوں کے لئے سب سے بڑا فخر ان کے کھانے پکانے کے اصول تھے۔ ان کے لئے کھانے کی میز مقدس روایت کی حفاظت تھی۔ ایک ایسی ثقافت جس سے وہ اپنے ملک، وقت اور بڑے سمندروں کی وجہ سے جدا ہو گئی تھیں اور جو واپس نہیں آئے گی۔

خود پر ہنستے ہوئے انہوں نے، مجھے ایک دلچسپ فائل دکھائی

کم عمر خاتون نے کہا "ہم محض پاگل بوڑھی عورتیں ہیں"

پچھلے تیس سالوں میں ان کے ہاں اس دور دراز گھر میں ستائیں مسافر آئے تھے۔ جن میں سے کچھ کاروبار کے سلسلے میں، کچھ محض تجسس کی وجہ سے اور کچھ دوسرے میری طرح اتفاق سے ــــ یہ بات ناقابل یقین تھی کہ ان خواتین کے پاس ان میں سے ہر آنے والی کی ذاتی فائل تھی، جس میں آنے والے کی تاریخ اور وہ کھانا جو ان بہنوں نے تیار کیا، درج تھا۔ ہم خوراک کی تفصیل کو لکھ لیتے ہیں تاکہ کسی بھی وقت اگر ان دوستوں میں سے کوئی واپس آئے تو یہ کھانا دہرایا نہ جائے"

میں "پیاز" کی بوری کی طرح بستر میں گر گیا اور سو گیا

صبح کے وقت میں نے ایک موم بتی جلائی، منہ ہاتھ دھو کر لباس پہنا روشنی ہو رہی تھی، جب اصطبل کے کام کرنے والوں میں سے ایک لڑکی نے میرے گھوڑے پر زین کس دی۔ میرا دل گوارا نہ کرتا تھا کہ سیاہ لباس میں ملبوس اپنی میزبان خواتین کو الوداع کہہ سکوں۔ جیسے کسی نے مجھ سے کہا۔ یہ سب کچھ ایک عجیب جادوئی خواب تھا اور اس سحر کو توڑنے کے لئے مجھے ہرگز بیدار

ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ یہ سب کچھ پینتالیس سال قبل ہوا، جب میں نے غفوان شباب میں قدم رکھا تھا۔ اس کنوارے جنگل کے دل میں رہنے والی ان دیس بدر خواتین اور ان کے (Fleurs du mal) کا کیا بنا؟

شمعوں سے روشن ان کی شاندار کھانے کی میز کا کیا ہوا۔ ان کی شراب کی بوتلوں کا کیا بنا؟ لکڑی کے کارخانے کی کیا قیمت تھی؟ اور درختوں میں گم وہ سفید مکان؟ سادہ ترین قسمت: موت اور فراموشی

شاید جنگل ان زندگیوں کو کھا گیا۔ اور وہ کمرے جن میں، میں گیا___ ایک ناقابل فراموش رات۔ اس کے باوجود میری یاد میں زندہ ہیں، بالکل جیسے شفاف خوابوں کی جھیل

قابل عزت تھیں وہ اداس عورتیں، جنھوں نے بغیر کسی عملی وجہ کے ایک پرانی دنیا کے وقار کو برقرار رکھنے کی خاطر جنگل کی تنہائی میں جدوجہد کی۔ جنھوں نے ایک عمدہ ثقافت کے آخری باقیات کی، جسے ان کے اجداد اپنے ہاتھوں سے بھلا بیٹھے تھے دور ویرانے میں، دنیا کے تنہا پہاڑوں کی ناقابل تسخیر آخری حدوں پر حفاظت کی۔

گندم میں عشق

دوپہر سے پہلے میں تازہ دم اور خوش باش ہرنانڈیز کیمپ پہنچ گیا خالی سڑکوں پر تنہا گھڑ سواری اور رات کی اچھی نیند نے میرے جوان چہرے کو ایک خاص قسم کی چمک دے دی تھی۔

گندم، جو اور اوٹ کی چھڑائی اب بھی گھوڑوں کی مدد سے کی جاتی تھی سواروں کی چیخوں کے درمیان گھوڑوں، غلے کے ڈھیر کے گرد چکر لگانے سے زیادہ شاید دنیا میں دلچسپ کوئی اور بات نہ تھی۔

وہاں ہوا میں درخشاں سورج ایک ناتراشیدہ ہیرے کی مانند پہاڑوں کو جھلملاتا تھا۔ چھڑائی ایک سنہری تہوار ہے۔ زرد بھوسے کے ڈھیر سنہری پہاڑیوں میں ڈھل جاتے۔ ہر طرف شور وغل ہوتا اور ایک حرکت۔ بوریاں بھرے جانے کے لئے جا رہی ہوتیں۔ پکاتی ہوئی عورتیں، بھاگتے ہوئے گھوڑے بھونکتے ہوئے کتے، بچے جنھیں بار بار بھوسے کے ڈھیر پر گھوڑے کے سموں کے نیچے سے پھلوں کی طرح اٹھانا پڑتا۔ ہرنانڈیز ایک بالکل مختلف قبیلہ تھا۔ اجڈ مرد داڑھیاں بنائے بغیر قمیصوں میں ملبوس، جن کی پیٹیوں میں پستول ہوتے، جو ہمیشہ گریز میں لتھڑے غلے کی خاک میں اٹے، کیچڑ میں سے یا ہڈی تک بارش میں تربتر ہوتے باپ، بیٹے، بھتیجے سب ایک جیسے نظر آتے۔ وہ گھنٹوں ایک موٹر پر کام کرتے تھریشر کی چھت پر مصروف رہتے۔ ان کے پاس بات کرنے کے لئے

کچھ نہ تھا۔ وہ ہر چیز کے بارے میں مذاق کرتے ماسوائے جب وہ لڑائی میں پھنس جاتے تو پھر ایک طوفان کی مانند دست و گریباں ہو جاتے اور ہر اس شے کو جو ان کی راہ میں حائل ہوتی گرا ڈالتے۔ باہر کھلے کھیتوں میں گائے کے گوشت کو بھونتے، سرخ شراب پینے اور گٹار کی دھنوں میں وہ پیش پیش رہتے۔

وہ سرحدی لوگ تھے۔ ایسے لوگ جنہیں میں پسند کرتا تھا۔ زرد پڑھاکو قسم کے لوگوں کو میں ان طاقتور وحشیوں کے سامنے ہمیشہ بونے سمجھتا۔ میں نہیں جانتا کہ کیوں لیکن ان لوگوں نے ہمیشہ میری عزت کی جو وہ عموماً دوسروں کی نہیں کرتے تھے۔ بھنے ہوئے گوشت، گٹاروں کی دھن اور چھڑائی کے بعد اندھا کر دینے والی تھکن اور سورج کی گرمی کے بعد ہمیں رات کے لئے عارضی بستروں کی ضرورت تھی۔ شادی شدہ جوڑے اور عورتیں جو اکیلی تھیں کیمپ کے اندر جن کی دیواریں تازہ تختوں سے بنائی گئی تھیں لیٹ گئے۔ ہم مردوں کو چھڑائی کے فرش پر سونا تھا جو بھوسے کے پہاڑ میں تبدیل ہو چکا تھا اور ایک پورا گاؤں اس کی زرد فرمائش پر سما سکتا تھا۔ آسائش کی یہ کمی میرے لئے نئی تھی، میں نہیں جانتا کہ کس طرح اس کو پھیلاؤں۔ میں اپنے جوتوں کو گندم کے بھوسے کی تہہ میں آرام سے رکھتا ہوں، اب یہ میرے تکئے کا کام دیتے ہیں۔ پھر اپنے کپڑے اتار کر خود کو اپنے پونچو میں لپیٹا اور بھوسے کے پہاڑ میں دھنس گیا۔ میں باقی سب لوگوں سے جو اکٹھے مل کر ایک آدمی کی طرح خراٹے لیتے تھے، ہٹ کر لیٹا تھا۔

کافی دیر، میں کمر کے بل اپنی آنکھیں کھولے، چہرے اور بازوؤں کو بھوسے سے چھپائے سیدھا لیٹا رہا۔ رات سرد شفاف اور جسم میں اتر جانے والی تھی آسمان پر چاند نہ تھا لیکن ستارے لگتا تھا بارش میں نہا کے نکلے ہیں اور اوپر وہ باقی سوئے ہوئے لوگوں کی ان دیکھی نیند پر آسمان کی گود میں صرف میرے لئے ٹمٹماتے تھے۔ پھر میں سو گیا___ لیکن اچانک میری آنکھ کھل گئی کیونکہ کوئی چیز میری جانب آرہی تھی۔ ایک اجنبی جسم بھوسے میں میری طرف سرک رہا تھا۔ میرے نزدیک آرہا تھا۔ میں ڈر گیا۔ وہ چیز آہستہ آہستہ میرے قریب ہوئے جارہی تھی اب میں بھوسے کے چھلکوں کی آواز کو بخوبی سن سکتا تھا۔ جو اس انجان وجود کی باعث کچلے جارہے تھے۔ میرا بدن اکڑ گیا تھا۔ میں منتظر تھا۔ ممکن ہے کہ مجھے اٹھنا پڑے اور چیخنا پڑے۔ مگر میں بے حس و حرکت پڑا رہا، اب میں سانس کی آواز کو اپنے سر کے قریب ن سکتا تھا۔ اچانک ایک بھاری بھرکم ہاتھ مجھ پر پھیلا یہ ایک عورت کا ہاتھ تھا، جو میری بھنوؤں، آنکھوں اور چہرے پر پیار سے آزادانہ گھومنے لگا پھر ایک حریص منہ میرے منہ سے چمٹ گیا اور مجھے احساس ہوا کہ ایک عورت کا بدن میرے جسم پر اوپر سے نیچے پاؤں تک دباؤ ڈال رہا ہے۔ آہستہ آہستہ میرا خوف ایک شدید خوشی میں تبدیل ہو

گیا۔ میرا ہاتھ لہریں لیتے ہوئے بالوں پر سے پھسلا، نرم بھنویں، آنکھیں جن کے بند پپوٹے لالہ کے پھولوں کی طرح ملائم تھے، میرا ہاتھ انہیں دریافت کرتا رہا ــــ میں نے دو چھاتیوں کو محسوس کیا جو بھری بھری اور سخت تھیں بڑے بڑے گول کولے، ٹانگیں جو میری ٹانگوں کو اپنے حصار میں لئے ہوئے تھیں۔ پھر میری انگلیاں، پہاڑی سبزے کی مانند پیڑو کے بالوں میں اتر گئیں۔ اس نامعلوم منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔

بھوسے کے پہاڑ میں جہاں سات آٹھ مرد اور بھی سو رہے ہوں اور جنہیں دنیا کی کسی بھی شے کے عوض جگانا مناسب نہ تھا بغیر شور مچائے ہم بستری کرنا کس قدر دشوار کام تھا۔ اس کے باوجود ہم سب کچھ کر سکتے ہیں، ممکن ہے اس میں خاص توجہ کا عمل دخل ہو۔ کچھ دیر بعد اجنبی عورت میرے نزدیک ہی سو گئی اور میں اس صورتحال سے ڈر کر پریشان ہو گیا ــــ جلد ہی صبح ہو جائے گی، میں نے سوچا اور پہلے کام کرنے والے، ایک برہنہ عورت کو چھڑائی کے فرش پر میرے پاس لیٹا دیکھیں گے لیکن یہ سوچتے ہوئے میں بھی سو گیا۔ جب میں اٹھا اور میں نے اپنا ہاتھ پھیلایا تو وہاں محض ایک گرم خلا باقی تھا ــــ ایک گرم غیر موجودگی جلد ہی ایک پرندے نے گانا شروع کر دیا اور تھوڑی دیر میں سارا جنگل پرندوں کی آوازوں سے بھر گیا اور مرد عورتوں نے اپنے اپنے کاموں کے لئے چلنا پھرنا شروع کر دیا ــــ چھڑائی کا ایک نیا دن شروع ہو رہا تھا۔

دوپہر کے وقت ہم سب نے بڑے بڑے تختوں سے بنائی گئی عارضی میز پر کھانا کھایا لیکن کن انکھیوں سے کھانے کے دوران میں دیکھتا رہا کہ رات کو میرے پاس آنے والی عورت کون ہو سکتی ہے؟ یہاں کچھ عورتیں بہت بوڑھی تھیں اور کچھ بے حد دبلی زیادہ تر نوجوان لڑکیاں سا[illegible] ڈائن مچھلیوں کی مانند تھیں، جبکہ میں ایک مضبوط بھرے بھرے جسم، بڑے بڑے [illegible] بالوں اور بڑی بڑی چھاتیوں والی عورت کو ڈھونڈ رہا تھا ــــ اچانک ایک عورت اپنے خاوند کے لئے بھنے ہوئے گوشت کا ٹکڑا دینے آئی ــــ یہ ہرنانیڈیز قبیلے کا ایک مرد تھا۔

یقیناً یہی، وہ عورت ہو سکتی تھی جیسا کہ میں نے اسے میز کے دوسرے کنارے سے دیکھا مجھے یقین تھا کہ میں نے اس لمبے لہروں جیسے بالوں والی دل فریب عورت کو خود پر ایک نظر ڈالتے اور خفیف انداز میں مسکراتے ہوئے پکڑ لیا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے اس کی مسکراہٹ میرے سارے وجود کو کھولتی ہوئی اطراف کی گہرائی میں بڑھ رہی تھی اور پھیل رہی تھی۔

دوسرا باب

شہر میں گم

کرائے کے کمرے

اسکول میں کئی سال کی تعلیم اور ہر دسمبر میں ریاضی سے جدوجہد کے بعد میں بظاہر سانتیاگو کی یونیورسٹی میں داخلے کے قابل ہو گیا تھا. بظاہر اس لئے کہتا ہوں کیونکہ میرا دماغ کتابوں اور خوابوں سے بھرا ہوا تھا اور نظمیں شہد کی مکھیوں کی طرح میرے اردگرد بھنبھناتی تھیں۔ ہڈیوں کے وجود پر شاعروں والے سیاہ سوٹ میں ملبوس ستے ہوئے چہرے کے نقوش کے ساتھ میں آہنی صندوق اٹھائے ہوئے سانتیاگو جانے والی رات کی گاڑی کے تیسرے درجے کے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ یہ گاڑی ایک دن اور ایک رات کے سفر کے بعد سانتیاگو پہنچتی تھی۔ اس طویل ریل گاڑی نے مختلف علاقوں اور موسموں کو عبور کیا۔ میں اس گاڑی میں اتنی مرتبہ سفر کر چکا تھا, لیکن میرے لئے وہ اب بھی بدستور دلچسپی کا محور تھی۔

مرغیوں سے بھری ہوئی ٹوکریاں اٹھائے گیلے پونچوؤں کو پہنے ہوئے کسان, میل جول نہ رکھنے والے قبائلی انڈین ـــ تیسرے درجہ کے ڈبے میں جیسے مکمل زندگی کھل کر سامنے آگئی تھی۔ بہت سے لوگ ٹکٹ لئے بغیر سیٹوں کے نیچے سفر کرتے تھے جب کبھی ٹکٹ چیکر آجاتا تو ایک عجیب سی تبدیلی ظہور پذیر ہوتی, کچھ مسافر غائب ہو جاتے, کچھ خود کو پونچو میں ایسے چھپا لیتے کہ اس پر دو مسافر تاش کا کھیل شروع کر دیتے. تاکہ ٹکٹ چیکر کو اس عارضی بنی ہوئی میز پر شک نہ گزرے اس اثنا میں گاڑی, شاہ بلوط اور آراکیریا کے درختوں کے دیہاتی علاقوں, اس کے کچی پکی دیواروں والے گھروں, سفیدے کے درختوں اور وسطی چلی کی خاک آلود عمارات کے وسط سے گزرتی۔

میں نے کئی مرتبہ دارالحکومت اور صوبوں کے مابین سفر کیا تھا لیکن جب بھی میں سبز جنگلات کو چھوڑتا۔ لکڑی پیدا کرنے والا علاقہ۔ جو مجھے ماں کی طرح گود میں لے لیتا تھا۔ ہمیشہ مجھ میں بے چینی کا ایک احساس پیدا کر دیتا۔

میرے لئے دھوپ میں پکی ہوئی اینٹوں کے مکانات۔ اپنے ماضی رکھنے والے شہر، مکڑی کے جالوں اور سکوت سے پر لگتے۔ اب بھی میں سرد جنگلات اور بیرونی دنیا کا، جو مجھ سے کھو چکی ہے، شاعر ہوں میں ۵۱۳ ماروری اسٹریٹ کے ایک ہوسٹل کے لئے تعارفی خط لایا تھا۔ کوئی شے میری یاد سے یہ نمبر نہیں بھلا سکتی۔ میں تمام تاریخیں، حتیٰ کہ سال تک بھول جاتا ہوں لیکن نمبر ۵۱۳ جسے سالوں پہلے، میں نے کھودا ابھی تک میرے ذہن میں موجود ہے۔ ڈرتے ہوئے کہ میں کبھی بھی وہ ہوسٹل نہ ڈھونڈ پاؤں گا اور اس اجنبی اور ڈرا دینے والے شہر میں اپنا راستہ کھو بیٹھوں گا، اسی اسٹریٹ میں، جس کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا، میں اپنے کمرے کی بالکونی میں بیٹھ جاتا اور ختم ہوتی ہوئی سہ پہر میں آسمان پر سبز اور گلابی رنگوں کے جھنڈوں اور آسمانوں کے دھمکی زدہ شہر کے کنارے پر مکان کی چھتوں پر تنہائی کو دیکھا کرتا۔

اس وقت طالب علموں کے لئے ایک ہوسٹل میں رہنا فاقوں مرنے والی بات تھی میں نے اس زمانے میں بے تحاشا لکھا لیکن بہت کم کھایا۔ کچھ شاعروں کو جنہیں میں ان دنوں جانتا تھا، محض غربت کی قلیل خوراک کے باعث مر گئے تھے۔ ان میں سے ایک رومیو موراگا، جو مجھے یاد ہے میرا ہم عمر شاعر مجھ سے قد میں خاصا بڑا لیکن مجھ سے زیادہ سادہ لوح تھا۔ جس کی لطیف شاعری اظہار سے بھری ہوتی اور جہاں بھی سنی جاتی اپنا اثر چھوڑتی۔

رومیو موراگا اور میں دارالحکومت کے نزدیک سان برنارڈو کے شہر میں نظمیں پڑھنے گئے۔ ہمارے اسٹیج پر پہنچنے سے پہلے سامعین پھولوں کے کھیل کی سنہرے بالوں والی خوبصورت ملکہ اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر عوامی بینڈ کی دھنیں سن کر اور شہر کے معززین کی تقاریر کو سن کر بہت اچھے موڈ میں تھے لیکن جب میں اسٹیج پر پہنچا اور دنیا کی بدترین آواز میں اپنی نظمیں پڑھنی شروع کیں تو یکایک سب کچھ بدل گیا۔ مجمع نے میرا مذاق اڑایا، کھانسی کی آوازیں آئیں اور سامعین میری دردناک نظموں پر خاصی دیر تک ہنستے رہے، اس وحشیانہ سلوک کو دیکھتے ہوئے میں جلدی جلدی پڑھتے ہوئے اسٹیج سے اتر آیا اور اپنے ساتھی رومیو ماروگا کے ساتھ جا ملا۔ یہ ایک یادگار بات تھی، جب چھ فٹ لمبا گہرے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے رومیو موراگا اسٹیج پر پہنچا اور مجھ سے بھی بھدی آواز میں اپنی نظم پڑھنے لگا تو اسے سن کر مجمع میں سے کوئی بھی اپنے غصے کو نہ چھپا سکا اور وہ سب مل کر چیخنے لگے "اے فاقہ زدہ شاعرو، دفع ہو جاؤ اور جشن کا مزہ کرکرا نہ کرو"

میں ماروری اسٹریٹ کی اقامت گاہ سے ایک ریشم کے کیڑے کی مانند باہر نکل آیا۔ میں اس جگہ کو خدا حافظ کہااور سمندر یعنی دنیاکی دریافت میں چل نکلا۔ انجان سمندر سانتیاگو کی وہ گلیاں تھیں، جنہیں میں نے یونیورسٹی سے اپنے کمرے تک آتے جاتے ہوئے اب تک نہ دیکھا تھا. اور اب میں ہمیشہ کے لئے یہ جگہ چھوڑ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس مہم میں میرے چہرے پر بھوک کے آثار مزید نمایاں ہو جائیں گے. حالانکہ میری سابق مالک مکان خواتین میرے ہی ملک کے دور دراز حصے سے تعلق رکھتی تھیں اور رحم کھاتے ہوئے کبھی کبھی پیاز یا آلو دے دیتی تھیں۔ لیکن میں بے بس تھا، محبت زندگی، فتح، آزادی مجھے آواز دیتی تھیں یا مجھے ایسالگتا تھا۔ آرگیسولیس اسٹریٹ میں اساتذہ کے ادارے کے قریب. میں نے ایک کمرہ کرائے پر لیا تھا. جہاں میں مکمل طور پر خود مختار تھا۔ اس اسٹریٹ میں ایک کھڑکی پر لگے ہوئے بورڈ پر "کرائے پر کمرے" لکھا نمایاں تھا۔ خود مالک مکان سامنے کے کمروں میں رہتا تھا۔ صورت شکل سے وہ ایک شریف آدمی نظر آتا تھا۔ اس کے سر کے بال سفید تھے اور آنکھیں مجھے کچھ اچھی نہ لگتی تھیں۔ وہ بے حد جذباتی اور فن گفتگو کا ماہر تھااور اپنی روزی، عورتوں کے ہیر ڈریسر کے طور پر کماتا تھا۔ ایک پیشہ. جسے وہ چھوڑ چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ نظر نہ آنے والی دنیامیں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا____ یہاں سے دور کی دنیا

میں نے اپنی کتابوں اور کچھ کپڑوں کو جو میرا سرمایہ تھے اس ٹرنک سے نکالا. جو میرے ساتھ ٹی میوکو سے سفر کر رہا تھااور اپنی آزادی اور تنہائی پر فخر و انبساط کے جذبات کے ساتھ بستر میں دراز ہو گیا۔ پڑھنے کے لئے اور سونے کے لئے۔ اس گھر کا اندرونی صحن نہ تھا۔ صرف ایک گیلری جس کے دونوں طرف لاتعداد بند کمرے تھے۔ اگلی صبح جب میں نے اس ویران عمارت کے کونے کھدروں کو دریافت کیا تو میں نے دیکھا کہ تمام دیواریں بشمول غسل خانے کی دیوار سے تحریروں سے جو کم و بیش ایک ہی مطلب رکھتی تھیں بھری پڑی تھیں۔

"خود کو چھوڑ دو، تم ہم سے نہیں مل سکتے، تم مردہ ہو"

چونکا دینے والے اعلانات جو ہر کمرے حتی کہ کھانے کے کمرے. راہ داریوں اور چھوٹے چھوٹے گوشوں تک میں موجود تھے۔

یہ سانتیاگو کی سخت ترین سردیوں کا موسم تھا۔

ہسپانوی نو آبادیاتی نظام سے میرے ملک کو فطرت کے جھٹکوں کو سہنے اور انہیں ناپسند کرنے کی صلاحیت ورثے میں ملی تھی۔ (ان واقعات کے پچاس سال بعد اب ایلیا اہرن برگ نے جو ماسکو کی برفیلی گلیوں سے آیا تھا، مجھے بتایا کہ اسے چلی کے مقابلے میں اس قدر ٹھنڈ کبھی ماسکو میں بھی محسوس نہ ہوئی تھی) سردیوں کے موسم نے کھڑکیوں کے شیشوں کو نیلا کر دیا تھا۔ میری گلی کے

درخت سردی سے کانپتے تھے۔ پرانی گاڑیاں گھسیٹتے ہوئے گھوڑے نتھنوں سے بھاپ کے بادل نکالتے۔ عدم سے دہشت ناک اطلاعات کے ساتھ اس گھر میں رہنے کے لئے موسم انتہائی بدترین تھا۔

مالک مکان نے مجھے پاگلوں کی طرح دیکھا اور آہستگی سے تشریح کی کہ اس کی بیوی چارہ ماہ پہلے مرگئی تھی۔ یہ مرنے والے کے لئے ایک آزمائشی لمحہ ہے مرے ہوئے لوگوں کی روحیں اکثر وہاں جاتی ہیں، جہاں وہ مرنے سے پہلے رہی ہوں ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتیں کہ ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ ہمیں انہیں بتانا ہو گا کہ ہم ان کی طرف سے بےتوجہ نہیں ہیں تاکہ انہیں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔ اسی لئے میں نے یہ تحریریں اپنی بیوی کی روح کے لئے لکھ رکھی ہیں۔ ان تحریروں سے اس کے لئے یہ سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی کہ وہ اب مرچکی ہے۔ لیکن سفید بالوں والے آدمی نے یقیناً یہ سوچا ہو گا کہ میں بہت چالاک تھا۔ اس نے میری آمدروفت پر غور کرنا شروع کر دیا۔ میری خواتین مہمانوں کے آنے پر قوائد لگانے شروع کئے، میری کتابوں اور میرے خطوط کی جاسوسی شروع کر دی۔ میں اکثر اپنے کمرے میں بغیر اطلاع دیئے داخل ہو جاتا، محض یہ دیکھنے کے لئے کہ مخفی علوم کا ماہر میرے مختصر سے فرنیچر اور معمولی سے سامان کی جانچ پڑتال کرتا ہو گا۔

اپنی سہمی ہوئی آزادی کو بچانے کی خاطر مجھے رہنے کے لئے نئی جگہ کی تلاش کرنا ہوگی۔ لہٰذا میں نے سخت سردیوں کے باوجود نامہربان گلیوں میں چکر لگانے شروع کر دیئے۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک لانڈری کی پشت پہ موجود کمرے میں مجھے رہنے کی جگہ مل گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہاں کی مالکہ کو دنیائے عدم سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔

سرد آنگنوں میں اجڑے ہوئے باغات، جن کے فواروں میں ٹھہرا ہوا پانی کائی کے دبیز قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔

پشت پر ایک اونچی چھت والا کمرہ تھا، جس کے دروازے اور کھڑکیاں بلند تھیں میری آنکھوں میں ان کے باعث چھت سے فرش کا درمیانی فاصلہ بڑھ جاتا تھا۔ میں اس کمرے میں رہائش پذیر رہا۔

ہم طالب علم شاعر ایک وحشیانہ زندگی گزارتے ہیں۔ اپنے کمرے میں کام کے دوران میں اپنا انداز دیہاتی رکھتا، روزانہ کئی کئی نظمیں لکھتا اور ہمیشہ چائے کے کپ پیتا رہتا، جو میں خود ہی بناتا تھا۔

لیکن میرے کمرے اور گلیوں سے دوران دنوں ادیبوں کی متلون زندگی ایک خاص دلچسپی

کی حامل تھی۔ ادیب چائے خانوں کی بجائے شراب خانوں اور چھوٹی سراؤں میں بیٹھا کرتے۔ نظمیں اور بحث مباحثہ صبح ہونے تک جاری رہتا۔ میری تعلیم اس سب سے متاثر ہو رہی تھی ریلوے نے میرے باپ کو سرمئی رنگ کے فیلٹ کے کپڑے کا ایک لباس دیا تھا جو اس نے کبھی نہ پہنا تھا۔ میں نے اس لباس کو شاعر کے لئے ایک انداز کا بنا لیا تھا تین چار اور شاعروں نے بھی اسی قسم کا لباس پہننا شروع کر دیا اور پھر یہ سلسلہ ایک سے دوسرے تک چل نکلا تھا۔ یہ لباس اچھے لوگوں کے غصے کے ساتھ ساتھ انہیں بھی جو اچھے نہ تھے تحریک دیتا۔

چلی میں ٹینگو رقص اپنے عروج پر تھا۔ اپنی بھاری دھمک اکارڈین موسیقی اور لے کے ساتھ لیکن اس کے علاوہ اس میں ان مضبوط رقاص کا دخل بھی تھا, جو ہماری شبانہ زندگی میں اجنبی جگہوں پر وارد ہوئے ــــــ زیر زمین دنیا کے یہ کردار، رقاص اور دنگا فساد کرنے والے افراد, ہماری زندگی کے طریقوں اور اس مخصوص لباس پر رائے زنی کرتے۔ ہم شاعر ان سے بہت لڑتے۔ اسی زمانے میں غیر اتفاقی طور پر میری دوستی ایک بیوہ خاتون سے ہو گئی, جو ہمیشہ کے لئے میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں, جب کبھی وہ اپنے مرے ہوئے محبوب شوہر کو یاد کرتی دھندلا جاتیں۔ اس کا شوہر ایک نوجوان ناول نگار تھا, جو اپنے خوبصورت جسم کے باعث منفرد جانا جاتا تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی ایک خوبصورت جوڑا لگتے تھے۔ عورت اپنے گداز خوبصورت جسم، گہری نیلی آنکھوں اور گہرے رنگ کے بالوں کی وجہ سے اور مرد طویل قامت اور کھلاڑیوں جیسے جسم کے باعث, اس ناول نگار نے خود کو بےپناہ شراب نوشی کی وجہ سے تباہ کیا تھا, لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ اس کی سنہرے بالوں والی بیوی نے بھی اس کی موت میں اپنے بےپناہ شہوانی مزاج کو شامل رکھا اور یوں پنسیلین سے پہلے کے زمانے میں، روحانی بیوہ نے اپنے محبوب شوہر کو چند ہی ماہ میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس خوبصورت بیوہ نے اب تک اپنے گہرے رنگ کے ملبوس کو میرے روبرو نہ اتارا تھا۔ سیاہ اور عنابی رنگ کے ریشمی ملبوس میں وہ بالکل اس سفید برفیلے پھل کی مانند نظر آتی جس کے چاروں طرف ماتمی رنگ چھایا ہو۔ لیکن بالاخر ایک روز لانڈری کی پشت پر واقع میرے کمرے میں وہ لباس اتر گیا ہم بستری کا فعل تکمیل کو پہنچنے والا تھا کہ میں نے اپنی آنکھوں کے نیچے اس کی بند آنکھوں پر غور کیا وہ ایک فطری عالم مستی میں آہیں بھرتی ہوئی چیخ رہی تھی "اوہ روبیرٹو ــــــ روبیرٹو"

(یہ ایک رسمی سا عمل دکھائی دیتا تھا ـــ غائب ہو جانے والے دیوتا کو یاد کرتے ہوئے اور ایک نئے عمل کے لئے خود کو جھکاتے ہوئے)

میری جوانی اور امنگوں کے باوجود یہ حسین بیوہ، میرے لئے ضرورت سے کہیں زیادہ تھی اس کی خواہشات روز افزوں بڑھتی گئیں اور اس کا روحانی دل بتدریج مجھے قبل از وقت تباہی کی طرف لئے جارہا تھا ـــــ اس مقدار میں محبت، نقاہت اور فاقہ کشی کے لئے ٹھیک نہیں۔ اس طرح میری کمزوری روز بروز ڈرامائی صورت اختیار کر رہی تھی۔

شرمیلا پن

اپنی زندگی کے شروع کے سال اور شاید آئندہ بھی کئی سال اور اس کے بعد کے مزید برسوں میں، میں بس ایک قسم کے گونگے بہرے کی طرح رہا۔ رسمی سیاہ لباس میں اس وقت سے جبکہ میں ایک نوجوان لڑکا تھا، گزشتہ صدی کے سچے شاعروں کی طرح مجھ پر ایک مبہم تاثر تھا کہ میں قطعی برانظر نہیں آتا لیکن بجائے لڑکیوں کا تعاقب کرنے کے، چونکہ میں جانتا تھا کہ ان کے سامنے میرا چہرہ سرخ ہو جائے گا اور میں ہکلانے لگوں گا، میں یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ مجھے ان میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، ان کے پاس سے گزر جانے کو ترجیح دیتا میں احساس کے جذبے سے بہت دور تھا۔ وہ سب میرے لئے ایک گہرا راز تھیں۔ میں اس خفیہ آگ میں جل جانے اور اس ناقابل دریافت گہرائی کے کنویں میں ڈوبنے کو پسند کرتا تھا۔

لیکن خود کو پانی یا آگ میں پھینکنے کی جرات مجھ میں نہیں تھی اور چونکہ مجھے کوئی ایسا نظر نہ آتا، جو مجھے دھکا دے سکے، لہذا میں اس دلنشیں راستے پر اطراف میں نگاہ ڈالے بغیر مسکراتے ہوئے چلتا رہا۔

بڑے لوگوں، غیر نمایاں اشخاص، ریلوے یا ڈاک کے محکمے کے ملازموں اور ان کی بیگمات کے سامنے بھی کچھ ایسی ہی صورتحال مجھ پر طاری ہو جاتی۔ خواتین یا بیگمات کے الفاظ بورژوا کلاس کے لئے مخصوص تھے کیونکہ یہ لوگ، عورت یا بیوی جیسے الفاظ کو سن کر چونک پڑتے تھے۔ میں میز پر اپنے باپ کی گفتگو کو سنتا لیکن اگلے ہی دن ان لوگوں سے جو رات کو کھانے پر گھر میں مدعو تھے اتفاقاً ملاقات ہو جاتی تو مجھ میں انہیں سلام کرنے کی جرات نہ ہوتی، بلکہ اپنی الجھن کو ٹلانے کی غرض سے میں دوسری گلی میں چلا جاتا۔

شرمیلا پن روح میں ایک خاص قسم کا بل ہے۔

ایک وسعت، جو تنہائی میں کھلتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک موروثی دکھ بھی ہے جیسے کہ ہماری دو جلدیں ہوں اور نیچے والی جلد بغاوت کر دے اور زندگی سے سکڑ جائے ان چیزوں میں جو انسان کی تشکیل کرتی ہیں، یہ خصوصیات، یہ نقصان دہ بات دو دھاتوں کے ملاپ کا ایک جزو ہے، جو

مستقبل میں ذات کے تسلسل کے لئے ایک بنیاد بناتا ہے۔

بارش سے مسحور میری پس ماندگی، خود اپنی ذات میں طویل فراریت اس سے کہیں زیادہ رہی، جتنا اسے رہنا چاہئے تھا۔ جب میں دار الحکومت میں پہنچا تو آہستہ آہستہ میں نے دونوں جنس کے دوست بنا لئے۔ لوگ جس قدر میری طرف کم توجہ دیتے اتنا ہی میرے لئے دوست بنانا زیادہ آسان تھا۔

انسانیت کے بارے میں اس وقت تک میں زیادہ متجسس نہ تھا اس دنیا میں ہر ایک کو تو نہیں جانا جا سکتا. میں نے خود سے کہا اس کے باوجود کچھ حلقوں میں اس نئے شاعر کی وجہ سے جو بمشکل سولہ سال کی عمر سے زیادہ نہ تھا۔ ایک تنہا لڑکا، جسے وہ آتے جاتے سلام کئے یا خدا حافظ کہے بغیر دیکھا کرتے تھے. ایک تجسس پھیل گیا تھا۔ علاوہ اس کے کہ میں ایک لمبا ہسپانوی لباس پہنے رکھتا. جو مجھے کھیتوں میں پرندوں کو ڈرانے والا ابوا بنا دیتا، کسی کو بھی یہ شک نہ گزرا کہ میرا یہ دلچسپ لباس غربت کے باعث بنایا گیا تھا۔

وہاں کے لوگوں میں سے، جنہوں نے میری صحبت کو پسند کیا، شہر کے دو بہت مدبع لوگ بھی تھے۔ پیلویانیز اور اس کی بیوی مینا۔ یہ دونوں اس تصوراتی حسین زندگی کی ایک مکمل مادی شکل تھے، جسے میں بخوشی گزارتا ـــــ گرم، مدھم روشنیوں، خوبصورت فرنیچر اور کتابوں، سے پر دیواروں کے گھر میں یہ میرا پہلا موقع تھا۔

کتابوں کی پشت کی جلد کے مختلف رنگ میرے لئے بہار کے موسم کی مانند تھے. جو میری پہنچ سے باہر تھے۔ میری چپ رہنے کی عادت اور خود میں مگن رہنے والے مزاج کو دیکھتے ہوئے دونوں میاں بیوی ایک شفقت آمیز نخوت کے ساتھ مجھے اکثر اپنے گھر بلایا کرتے میں ان کے گھر سے بہت خوشگوار کیفیت میں نکلا کرتا جسے انہوں نے محسوس کر لیا تھا اور وہ مجھے دوبارہ آنے کی دعوت دیتے۔

پہلی بار، میں نے اس گھر میں (Cubist) کیوبسٹ تحریک کی تصویریں دیکھیں۔ ان میں سے ایک مصور (Juan Gris) جان گرس تھا۔

انہوں نے بتایا کہ جان گرس پیرس میں خاندان کا ایک اچھا دوست رہا تھا۔ لیکن جس چیز نے مجھے زیادہ متاثر کیا، وہ میرے دوست یانیز کا پاجامہ تھا۔ جب کبھی بھی مجھے موقع ملتا، میں کنکھیوں سے شدید چاہت کے انداز میں اسے دیکھا کرتا۔

سردیوں کا موسم تھا اور پاجامہ گہرے سمندری نیلے رنگ کے ایک دبیز کپڑے سے بنایا گیا تھا۔ ایک کپڑا جو میں نے اکثر بلیرڈ کی میزوں پر لگا دیکھا تھا۔ ان دنوں، میں قیدیوں جیسے دھاری دار

پاجامے کے علاوہ کسی اور قسم کے پاجامے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

پیلوپانیز اور اس کی بیوی مینا جیسے لوگ میں نے دوبارہ نہ دیکھے ان کے شاندار ملبوسات غریب شاعر کے جذبہ رشک کو جو خود سانتیاگو کے مضافات میں ایک اجنبی تھا، تحریک دیتے۔ پچاس برسوں میں، آج تک میں نے دوبارہ اس وضع کا پاجامہ پھر کبھی نہ دیکھا۔

کئی سال میں ان میاں بیوی سے نہ مل سکا۔ مینا نے روسی سرکس کے ایک نٹ کی خاطر، جس کا سانتیاگو سے گزر ہوا تھا، اپنے خاوند اس کے مدھم روشنیوں والے گھر اور بے حد عمدہ قسم کی آرام دہ کرسیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ بعد میں وہ آسٹریلیا سے برطانوی جزائر تک اس نٹ کی خاطر، جس نے اس کے پیر اکھاڑ دیئے تھے، ٹکٹیں فروخت کرتی رہی اور آخر میں جنوبی فرانس کے صوفیوں کے ایک گروہ میں پھنس کر ختم ہو گئی۔ جہاں تک اس کے شوہر پیلوپانیز کا تعلق ہے اس نے اپنا نام بدل کر جان ایمار رکھ لیا اور اپنے وقت کا بے حد توانا لیکن ایک غیر دریافت شدہ مصنف بن گیا۔ ہم تمام عمر دوست رہے۔ بالاخر وہ خاموشی سے غربت میں مر گیا اس کی کئی کتابیں اب شائع ہوئی ہیں۔ میرے خیال میں وہ ضرور جڑیں پکڑیں گی اور کسی دن کھل اٹھیں گی۔

میں پیلوپانیز یا جان ایمار کا ذکر چھوڑتے ہوئے از سرنو اپنے شرمیلے پن کی بات کروں گا۔ اپنے زمانہ طالب علمی میں میرا دوست پیلوپانیز مجھے اپنے باپ سے متعارف کرانے کی دھن میں تھا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں یورپ کا چکر لگوا دے گا" اس نے مجھے بتایا تھا اس زمانے میں لاطینی امریکہ کے سارے شاعروں اور مصوروں کی نظریں پیرس پر لگی تھیں پیلو کا باپ جو ایک پینٹر تھا، بے حد اہم شخص تھا۔

وہ صدارتی محل اور پلازا ڈی آرماس کے قریب ایک سڑک پر واقع بہت بڑے گھروں میں سے ایک میں رہتا تھا ـــــ جہاں یقیناً وہ کسی شک کے بغیر رہنے کو ترجیح دیتا۔ میرے دوست باہر کے کمرے میں رہتے تھے ـــــ میرے حسب نوی انداز کے لباس کو اتارتے ہوئے تاکہ میں قدرے نارمل نظر آؤں، انہوں نے سینئر کے مطالعے کے کمرے کو کھولا اور مجھے اس میں بند کر دیا۔

یہ ایک بہت وسیع اور فراخ کمرہ تھا اور ممکن ہے کسی زمانے میں یہ استقبالی کمرہ بھی رہا ہو لیکن اس وقت وہ علاوہ وسطی حصے کے تقریباً خالی تھا۔ دوسرے کونے میں مجھے ایک آرام کرسی میں بڑے پیڈسٹل لیمپ کے نیچے سینئر بیٹھا نظر آیا۔ اخبار کے صفحات نے جنہیں وہ پڑھ رہا تھا اسے ایک پردے کی طرح مکمل طور پر چھپا رکھا تھا۔ بے حد پھسلواں فرش پر پہلا قدم اٹھاتے ہوئے، میں ایک اسکائر کی مانند پھسلا، خوابیدگی کی کیفیت میں میں نے اپنی بڑھی ہوئی رفتار کو روکنا چاہا اور اس

کوشش میں کئی بار گرا اور آخری بار خود کو سینیٹر کے قدموں کے قریب پایا جو اخبار رکھے بغیر اب
بغور مجھے اپنی سرد آنکھوں سے دیکھ رہا تھا. میں نے اس کے نزدیک رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی کرسی
میں بیٹھنے کی کوشش کی عظیم آدمی نے بالکل ایک ماہر حشرات کی سی نظروں سے جس کے سامنے ایک
نقصان نہ پہنچانے والی مکڑی کا نمونہ لا کر رکھا جائے اور جس سے وہ اچھی طرح سے واقف ہو. مجھے
دیکھا۔ اس نے میرے منصوبوں کے بارے میں ادھورے سوالات کیئے۔ اس کے بعد میں پہلے
سے کہیں زیادہ خاموش اور مزید شرمیلا ہو گیا۔ میں نہیں جانتا کہ میں نے اسے کیا بتلایا۔ بیس منٹ
کے بعد اس نے اپنا چھوٹا سا ہاتھ برخاستگی کے طور پر میری طرف بڑھایا اور مجھے یوں لگا جیسے میں نے
اسے وعدہ کرتے ہوئے سنا ہو کہ وہ مجھے دوبارہ ملے گا۔

اس نے دوبارہ اپنا اخبار اٹھایا اور میں نے خطرناک حد تک پھسلواں فرش پر تمام احتیاطی
تدابیر کو بروئے کار لاتے ہوئے جو در حقیقت مجھے پہلی مرتبہ کمرے میں داخل ہوتے وقت مدنظر
رکھنی چاہئے تھیں، کمرے سے واپسی کا راستہ اختیار کیا بے شک میں اپنے دوست کے سینیٹر باپ کو
دوبارہ نہ سن سکا۔

دوسری طرف کچھ عرصے بعد ایک فوجی بغاوت نے جو کہ در حقیقت ایک احمقانہ اور رجعت
پسند حرکت تھی، سینیٹر کو اس کے کبھی نہ ختم ہونے والے اخبار سمیت کرسی سے اچھال دیا تھا۔ میں
اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ اس سے مجھے بے حد خوشی ہوئی۔

طلباء کی تنظیم

ٹی میوکو میں طلبا کی تنظیم کے رسالے، ”کیلیری ڈاڈ“ (Calaridad) کے تبصرے
کے لئے میں نامہ نگار تھا۔ اس رسالے کی بیس تیس کاپیاں میں اپنے اسکول کے ساتھیوں میں
فروخت کیا کرتا تھا۔

ایک خبر نے جو ٹی میوکو میں ۱۹۲۰ء میں پہنچی، میری نسل کے لوگوں پر خونی نشانات چھوڑ
دیئے۔

”گولڈن یوتھ“ نامی ایک تنظیم نے جو چند لوگوں پر مشتمل حکومتی اولاد تھی طلبا کی تنظیم
کے ہیڈکوارٹر پر حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔

ارباب اقتدار نے جو نو آبادیاتی نظام سے لے کر اب تک امرا کی خدمات میں رہے تھے،
حملہ آوروں کے بجائے حملے کی زد میں آنے والوں کو جیل میں بند کیا (Domingo Gomez
(Rojas) روجاس، چلی کی شاعری کی جوان امید کو سخت اذیتیں دی گئیں جس کے نتیجے میں وہ پاگل

ہو گیا اور ایک زیر زمین تہہ خانے میں مر گیا۔ ایک چھوٹے سے ملک کی قومی سطح پر اس جرم کے بعد پیدا ہونے والے حالات عملی طور پر غرناطہ میں فریڈریکو گارسیا لور کا (Fredico Garcia Lorca) کے قتل ہونے کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال کی طرح گہرے اور دور رس تھے۔

۲۱ر مارچ ۱۹۲۱ء کو جب میں سانتیاگو یونیورسٹی میں داخلہ لینے پہنچا تو چلی کے دارلحکومت میں اس وقت صرف پانچ لاکھ لوگ رہتے تھے۔ شہر میں گیس کا دھواں اور کافی کی بو شامل تھی ہزاروں عمارتیں اجنبی لوگوں اور کھٹملوں کا مسکن تھیں۔ عوامی بار برداری کے لئے چھوٹی چھکڑا نما ٹیکسیاں تھیں، جو لوہے اور گھنٹیوں کے ملے جلے شور کے ساتھ ہمہ وقت جدوجہد میں مصروف رہتیں۔

شاہراہ آزادی سے شہر کی دوسری سمت مرکزی اسٹیشن کے قریب جہاں میرا کالج واقع تھا، میرا سفر رہتا۔ طلباء کی تنظیم کے ہیڈ کوارٹر میں باغی طلباء کی مشہور شخصیتیں آتی رہتیں، جو تصوراتی طور پر وقت کی مضبوط ترین انارکسٹ تحریک سے وابستہ تھیں۔

الفریڈو ڈیماریا Aefredo Demaria ڈینیل شوئیٹزر (Daniel Sehneitza) سانتیاگو لابور کا (Santiago Laborca) اور جان گنڈلفو (Juan Ganduefo) جانے پہچانے رہنما تھے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم بلاشک و شبہ جان گنڈلفو تھا جس کی بے باک سیاسی بسارت اور بے پناہ جرات کی وجہ سے سب ڈرتے تھے۔ اس نے مجھ سے بالکل ایک بچے کی طرح سے سلوک کیا اور واقعی میں ایک بچہ ہی تھا ایک مرتبہ جب میں اس کے دفتر میں ایک طبی ملاقات کے باعث دیر سے پہنچا تو وہ مجھ پر برہم ہوا اور دیر سے آنے کی وجہ دریافت کی "تم یہاں وقت پر کیوں نہیں پہنچے؟" یہاں دوسرے مریض بھی منتظر بیٹھے ہیں"

میں نہیں جانتا تھا کہ کیا وقت تھا میں نے جواب دیا

اپنی واسکٹ کی جیب سے گھڑی نکال کر مجھے دیتے ہوئے وہ بولا

"اسے رکھ لو تاکہ آئندہ تم وقت کے بارے میں جان سکو"

جان گنڈلفو پستہ قامت اور گول چہرے کا مالک تھا اور قبل از وقت گنجے پن کا شکار تھا لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ اپنی موجودگی کا احساس کرا دیتا۔

ایک بار ایک فساد کرنے والے فوجی نے جو جھگڑالو ہونے کے ساتھ ساتھ تلوار چلانے کا دھنی بھی تھا گنڈلفو کو ڈوئیل کے لئے چیلنج کر دیا، جسے اس نے قبول کر لیا اور دو ہفتے کی مشق کرنے کے بعد اپنے مدمقابل کو ڈوئیل میں ہرا کر بے دست و پا کر دیا۔ تقریباً اسی زمانے میں اس نے میری پہلی کتاب کے سرورق کے لئے لکڑی میں کچھ اور تصاویر بنائیں ـــــ لکڑی میں کٹائی سے بنائی

گئی کئی موثر تصاویر ایک ایسے آدمی نے بنائی تھیں، جس کا کبھی اس فن سے کوئی تعلق نہ رہا تھا۔

ادب کی انقلابی دنیا میں سب سے اہم شخصیت (Robersto Meza Fuentes) ر وبرٹو میزا فیونٹیز تھا جو (Juventud) رسالے کا مدیر تھا۔ یہ طلباء کی تنظیم کا رسالہ تھا اس میں لکھنے والوں کی تعداد زیادہ تھی اور Clarided کے مقابلے میں اسے زیادہ محنت سے تیار کیا جاتا تھا۔ اس رسالے میں سب سے زیادہ عمدہ کام (Manvel Roy اور Gonzaleveu) (as کا تھا جو بزرگ نسل سے تعلق رکھنے کے باوجود میرے ساتھ تھے۔ ریل روجاز حال ہی میں کئی سال بعد سے ارجنٹینا سے آیا تھا اور اس نے اپنی متاثر کرنے والی جسامت اور اپنے موثر الفاظ سے، جن میں شفقت، فخر اور ایک رکھ رکھاؤ شامل ہوتا، ہمیں حیران کر رکھا تھا ـــــ وہ ایک Lin) (otyp سطر چھاپ مشین پر کام کرنے والا تھا۔

میں گونزالیز ویرا کو کوٹی میو کو سے جانتا تھا، جہاں سے وہ طلباء کے ہیڈکوارٹر پر پولیس کے حملے کے بعد بھاگ گیا تھا، وہ ریلوے اسٹیشن سے جو میرے گھر کے نزدیک تھا، سیدھا مجھے ملنے چلا آیا۔ اس کی اچانک موجودگی نے سولہ سالہ شاعر کو بے حد متاثر کیا ـــــ میں نے اس قدر زرد رو انسان کبھی نہ دیکھا تھا۔

گوشت کے بغیر اس کا چہرہ ہڈی اور سنگ مرمر سے ترشا ہوا لگتا تھا۔ اس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا، پتلون کے پائنچوں اور آستینوں کی خستگی کے باوجود وہ کچھ کم شاندار نہ لگتا تھا۔ اس کے الفاظ طنز آمیز اور گفتگو کے شروع ہی میں چبھنے ہوئے لگتے۔ بارش کی ایک رات کو جو اسے میرے گھر لے آئی تھی، میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ زندہ ہے میں اس کی موجودگی سے ایسے ہی متاثر ہوا تھا جیسے (Sacha Yeagulev) ساچا یوگولیو (Nihilest) نہیلسٹ انقلابی کے اپنے گھر آنے سے ہوا ہو گا۔ (Andreyev) آندریو کا افسانوی کردار گولیو لاطینی امریکہ کے جوان انقلابیوں کے لئے ایک مثالی کردار کی حیثیت رکھتا تھا۔

البرٹو روجاز (ALBERTO ROJAZ GIMENEZ)

"کلیری ڈاڈ" (Claridad) کا رسالہ، جس میں میں ایک ادبی اور سیاسی سرگرم رکن کی حیثیت سے شامل ہوا البرٹو روجاز، کے ہاتھ میں تھا۔ جو میرے انتہائی قریبی دوستوں میں سے تھا۔ وہ ایک قرطبی انداز کا ہیٹ پہنتا اور غرناطی فیشن کے لمبے گل موچھے رکھتا تھا۔ باوجود اپنی غربت کے، وہ خود کو انتہائی شاندار انداز میں لئے دیئے رکھتا۔ جس کے باعث وہ ایک سنہری پرندے کی طرح نمایاں رہتا۔ اس میں نمائشی خوش لباس نوجوان کی تمام خصوصیات مثلاً ہتک کا رویہ،

بے شمار لڑائیوں پر ایک فطری گرفت اور اس کے ساتھ ساتھ خوشی مزاج ذہنی رویہ اور زندگی میں ہر چیز کے لئے رغبت وغیرہ شامل تھیں۔

وہ ہر چیز کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا، جیسے کتابیں، لڑکیاں، شراب کی بوتلیں، جہاز، سفر کے راستے، جزیروں کے گروہ، اور اپنی معلومات کا وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اظہار کرتا رہتا۔

اول دنیا میں وہ ایک بزرگانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ داخل ہوا تھا، ایک ایسے شخص کی مانند جو اپنے حسن اور علمیت کو ضائع کرنے کی عادت میں ہو اس کی ٹائیاں ہمیشہ بے کراں غربت میں خوشحالی کی شاندار علامت ہوتیں وہ ہمیشہ ایک نئے گھر اور نئے شہر میں منتقل ہوتا رہتا اور یوں چند ہفتوں کے لئے اس کی فطری حس مزاح، اس کا مستقل اور اچانک بوھیمین انداز لاتعداد لوگوں کو لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتا ـــــ وہ ہمیشہ جیسے آتا تھا ویسے ہی چلا جاتا۔ نظمیں، تصویریں، ٹائیاں، محبتیں اور دوستیاں، جہاں جہاں وہ رہتا چھوڑ کر چلا جاتا۔ کیونکہ وہ کہانیوں کے شہزادے کی طرح ناقابل قیاس اور ناقابل یقین حد تک فیاض تھا، وہ ہمیشہ اپنی چیزیں بانٹ دیا کرتا۔ ہیٹ، قمیص، کوٹ، حتیٰ کہ جوتے تک

جب اس کے پاس کوئی مادی شے نہ رہتی، تو وہ کاغذ کے ٹکڑے پر کوئی سطر یا نظم کا کوئی مصرع لکھ دیتا یا پھر کوئی اور دلچسپ بات جو اس وقت اس کے ذہن میں آجاتی اور جاتے ہوئے وہ کسی کو دے جاتا۔ اس شاندار تاثر کو لئے ہوئے جیسے کہ وہ تمہارے ہاتھ میں کوئی انمول ہیرا رکھ رہا ہو۔

اس کی نظمیں جدید انداز میں لکھی ہوئی ہوتیں۔

(Appollinaire) اور جدیدیت پسند لوگوں کے خیالات کے مطابق اس نے شاعری کے ایک نئے دبستان کی بنیاد رکھی، جسے اس نے 'AGU' کا نام دیا اسے وہ انسان کی پہلی فتح، نومولود بچے کی پہلی نظم کہتا تھا۔

روجاز نے ہمارے لکھنے، سگرٹ پینے اور لباس پہننے تک کے انداز میں نئی اختراعات کیں ـــــ انتہائی لطیف انداز میں اس نے مجھ سے میرا پڑھنے کا دردناک انداز ختم کرا دیا لیکن نہ اس کے مشکوک رویے نے اور نہ ہی اس کی بے تحاشا شراب نوشی نے مجھ پر کوئی اثر مرتب کیا۔

پھر بھی جب میں اس کا چہرہ یاد کرتا ہوں، جو ہر چیز کو منور کر دیتا تھا، جو خوبصورتی کو ہر گوشے میں یوں لہرا دیتا، جیسے کسی نے کوئی خفیہ تتلی حرکت میں کر دی ہو۔ ڈان میگوئل سے اس نے کاغذ کے پرندے بنانے سیکھے تھے۔ وہ ایک لمبی گردن اور پھیلے ہوئے پروں کا پرندہ بناتا، جسے وہ ہوا میں اڑا دیتا اور اپنی اس حرکت کو وہ ان کے لئے "طاقتور دھکے" سے تعبیر کرتا۔ اس نے

فرانسیسی شاعروں کو اور تہہ خانے میں مدفون شراب کی بوتلوں کو دریافت کیا اور فرانس جیمز ہیرونیز کو محبت نامے تحریر کیے۔

اس کی خوبصورت نظمیں اس کی جیبوں میں مڑی تڑی تمام جگہوں تک پہنچیں لیکن آج تک شائع نہ ہوسکیں۔

غلطی کی حد تک سخی ہونے کے باعث وہ توجہ اپنی جانب مبذول کرلیتا تھا ایک روز ایک کیفے میں ایک اجنبی اس کے پاس آیا اور اس سے کہنے لگا "جناب میں آپ کو سنتا رہا ہوں اور آپ مجھے بے حد پسند آئے ہیں، کیا میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں"

"وہ کیا بات ہے؟" روجاز نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اجنبی نے جواب دیا "آپ مجھے اپنے اوپر سے پھلانگنے دیجئے"

"کیا؟" شاعر نے پوچھا "کیا تم اس قدر طاقتور ہو کہ میرے اس میز پر بیٹھنے کے باوجود تم مجھے پھلانگ لوگے؟"

"نہیں جناب، اجنبی نے کہا، میں بعد میں، جب آپ اپنے تابوت میں آرام کرتے ہوں گے، آپ پر سے پھلانگنا چاہتا ہوں"

"دلچسپ لوگوں سے جن سے میں آج تک ملا ہوں میری تعظیم کا یہی طریقہ ہے کہ میں ان کی موت کے بعد، اگر وہ اجازت دیں تو ان کے اوپر سے پھلانگوں، میں ایک تنہا آدمی ہوں اور یہی میرا واحد مشغلہ ہے" اپنی ڈائری نکال کر دکھاتے ہوئے اس نے ان لوگوں کی فہرست دکھائی جن پر سے وہ پھلانگ چکا تھا۔

خوشی سے پاگل ہوتے ہوئے روجاز نے اس کی عجیب و غریب پیشکش کو قبول کر لیا۔ بہت برسوں کے بعد چلی کے موسم برسات میں، ہر ایک کو یاد ہوگا کہ روجاز مر گیا معمول کے مطابق وہ اپنی جیکٹ سانیتاگو شہر کے کسی شراب خانے میں بھول گیا تھا۔ انٹارکٹک کے موسم سرما میں وہ صرف قمیض پہنے ہوئے اپنی بہن روزیتا کے گھر گیا اور دو دن بعد نمونیہ کے مرض نے اس دنیا سے ایک انتہائی دلچسپ شخص کو عدم کی طرف روانہ کر دیا۔ اور شاعر اپنے کاغذ کے بنائے ہوئے پرندوں کے ہمراہ برستی ہوئی بارش میں آسمانوں میں اڑ گیا لیکن اس رات روجاز کے دوستوں کو اجنبی مہمان سے سابقہ پڑا۔ موسلا دھار بارش گھروں کی چھتوں پر برس رہی تھی، بجلی کی چمک اور ہوا کے جھکڑ بارش کے ساتھ تھے جو کو نیتا کے دیو قامت درختوں کو ہلا رہے تھے کہ اچانک دروازہ کھلا اور سیاہ لباس میں ملبوس ایک شخص بارش میں شرابور اندر داخل ہوا۔ کسی کو علم نہ تھا کہ وہ کون ہے۔ دوستوں کی متجسس نگاہوں کے سامنے اجنبی شخص نے اپنے جسم کو تولا اور تابوت کے اوپر سے

پھلانگ گیا اور جیسے وہ آیا تھا ویسے ہی ایک لفظ کہے بغیر رات کے اندھیرے لیجیو برستی ہوئی بارش میں وہ غائب ہو گیا۔ اور یوں البرٹو روجاز کی دلچسپ زندگی، ایک پر اسرار رسم سے جس کے معمہ کو آج تک کوئی حل نہ کر سکا، سربہ مہر ہو گئی۔

میں اسپین پہنچا ہی تھا کہ مجھے روجاز کی موت کی اطلاع ملی۔ بہت کم مجھے کسی موت کا اتنا دکھ ہوا تھا۔ یہ بارسیلونا میں ہوا اور میں نے فوراً ہی مرثیہ لکھنا شروع کر دیا۔ "البرٹو روجاز اڑتا ہوا آتا ہے" ـــــ جو بعد میں شائع ہوا تھا۔

مجھے اسے رسماً خدا حافظ ہی کہنا تھا ـــــ وہ اتنی دور چلی میں مر گیا تھا، جہاں سخت دھواں دھار بارشوں کے موسم سے قبرستان میں سیلاب آچکا ہو گا۔ میں اس کے فانی جسم کے پاس نہ رہ سکا تھا نہ ہی اس کے آخری سفر میں شریک ہوا تھا لہٰذا میں نے ایک تقریب کے بارے میں سوچا اور اپنے مصور دوست (Cabezon) کے پاس چلا گیا ہم دونوں نے دو بڑی موم بتیاں خریدیں۔ ہر موم بتی انسانی قد کے برابر تھی۔ ان موم بتیوں کو لئے ہوئے ہم اس اجنبی معبد کے سائیوں میں داخل ہوئے۔

سانتا ماریا سمندری مسافروں کا کلیسا تھا ـــــ ماہی گیروں اور ملاحوں نے صدیوں پہلے اسے ایک ایک پتھر جوڑ کر تعمیر کیا تھا اور وہ نذرانے کے طور پر دی گئی ہزارہا اشیاء سے مزین تھا ـــــ ہر وضع اور سائز کی ننھی ننھی کشتیاں ابد سے سفر کرتی ہوئی خوبصورت کلیسا کی دیواروں اور چھتوں پر حسین نقش و نگار کی صورت میں موجود تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے مرحوم شاعر کے لئے یہ جگہ سب سے زیادہ مناسب تھی اگر اسے اس جگہ کا علم ہوتا تو شاید یہ اس کا محبوب ترین مقام ہوتا میرے مصور دوست اور میں نے قد آدم موم بتیوں کو کلیسا کے وسط میں روشن چھت کے بادلوں کے نزدیک روشن کیا اور خالی کلیسا کے ہال میں بیٹھ گئے ہم دونوں اپنے ساتھ سفید شراب کی بوتلیں لائے تھے۔

اپنے لاادری رویئے کے باوجود ہمیں یوں محسوس ہوا کہ اس خاموش رسم نے ایک پراسرار انداز میں ہمیں اپنے مرحوم دوست کے قریب کر دیا تھا۔

کلیسا کے خالی ہال میں جلتی ہوئی موم بتیاں انتہائی بلندی پر روشن تھیں ہو سکتا ہے، وہ پاگل شاعر کی جس کا دل ہمیشہ کے لئے بجھ گیا تھا دو آنکھیں ہوں، جن سے وہ نذر کی ہوئی چیزوں کے مابین ہمیں سائیوں میں سے دیکھتا ہو۔

"مجھے پورے وثوق سے یہ یقین ہے کہ میں نے انہیں ایک وجدانی کیفیت میں لکھا تھا پھر میں نے اس نظم کو سبات (Sabat) کو بھیجنے کا فیصلہ کر لیا یہ یوراگوئے کا ایک عظیم شاعر تھا جسے غیر

منصفانہ طور پر آجکل بھلا دیا گیا ہے اس میں میں نے اپنے شاعری کرنے کے جذبے کو پروان چڑھتے دیکھا تھا۔ وہ شاعری جو محض انسان کو نہیں بلکہ فطرت اور اس کی خفیہ طاقتوں کو اپنے بازوؤں میں لے سکے۔ زرمیہ شاعری، جو کائنات کے سربستہ رازوں اور انسان کی قوتوں کے بارے میں بات کرے گی۔ پھر ہم دونوں میں خط و کتاب ہونے لگی۔ اپنے کام کے دوران سبات کے بھیجے گئے خطوط کو میں بڑی توجہ سے پڑھتا جو اس نے ایک نوجوان انجان شاعر کو لکھے تھے۔

میں نے اس رات لکھی گئی نظم کو سبات کے لئے بھیجا تا کہ پتہ چل سکے کہ آیا وہ اس کے اثر میں لکھی گئی تھی؟ اس کی جانب سے ایک بہت عمدہ خط میرے جواب میں موصول ہوا "بہت کم میں نے اتنی کامیاب اور شاندار نظم دیکھی ہے لیکن ہاں یہ میں تمہیں بتا دوں کہ اس نظم میں (Sab at کی گونج موجود ہے" یہ اندھیرے میں روشنی کے کوندے کی طرح تھا، اور میں اس کے لئے ممنون ہوں وہ خط کئی دنوں تک میری جیب میں پڑا رہا حتیٰ کہ پھٹ گیا، کئی چیزیں داؤ پر تھیں۔ میں بالخصوص اس رات کے بے کار خیالات کے ہجوم میں غلطاں و پیچاں تھا۔ بغیر کسی فائدے کے میں، ستاروں کے کنویں میں گر پڑا تھا۔ ستاروں کے طوفان نے میرے اعصاب پر حملہ کر دیا تھا۔ مجھ سے غلطی ہوئی تھی منطق کو ہر قدم پر تنگ رستوں میں میری رہبری کرنی چاہئے۔ مجھے ندامت سیکھنی پڑے گی۔ میں نے اپنے کئی مسودے پھاڑ ڈالے اور بہت سے دوسروں کو ادھر ادھر رکھ دیا۔ کم از کم دس بسال سے پہلے یہ نظمیں منظر عام پر نہیں آئیں گی۔ سبات کے خط نے میری عظیم شاعری کی بے پناہ خواہشات کو ختم کر دیا تھا۔ میں نے خود کو کمرے میں بند کر لیا اور قصداً اس بات کی کوشش کی کہ اپنے اظہار اور اسلوب میں دھیما پن پیدا کروں۔

بناوٹ اور تصنع کے بغیر خوبیوں کی تلاش، اپنی دنیا کے سکون کی خاطر میں نے ایک اور کتاب لکھنی شروع کی اور (Veinte Poemas) اس کا نتیجہ تھا۔ نظموں کی یہ کتاب میرے لڑکپن کے دکھوں اور جذبوں کے علاوہ میرے ملک کے جنوبی علاقے کی تباہ کر دینے والی فطرت کی شاعری ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ کتاب دکھوں سے پر ہے لیکن اس میں زندہ رہنے کی بھرپور مسرت بھی موجود ہے اور اسی لئے میں اس کتاب کو بے پناہ چاہتا ہوں۔ ایک دریائے امپریل اور اس کا منبع اس کتاب کے لکھنے میں میرے معاون رہے نظموں کی یہ کتاب سانتیاگو سے میرے عشق کی داستان ہے۔ طالب علموں سے بھری ہوئی اس کی گلیاں، یونیورسٹی اور ہنی سکل کی مہک میں لوٹائی ہوئی محبت سانتیاگو کے بارے میں تحریر کردہ باب ایکورین اسٹریٹ، شاہراہ اسپین اور استادوں کے ادارے کی ممبران عمارت میں لکھے گئے، لیکن پس منظر میں ہمیشہ جنوب کے درخت اور دریا ہی رہے۔

(Songs of Despair) کتاب میں دریائے امپیریل (Bajo Imperial) اور (Crahue) کراہو کی پرانی گودیوں کا ذکر ہے جہاں ٹوٹے ہوئے تختے اور فراخ دریا کے تھپیڑوں سے کٹے ہوئے لکڑی کے شہتیر اور آبی پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ سنی جاتی ہے۔ جسے آج بھی دریا کے دہانے پر سنا جاسکتا ہے۔ کسی تباہ شدہ بحری جہاز کی باقیات میں سے لمبی نیلی جسامت والی لائف بوٹ جس میں (Jean, Christopher) کو پڑھا اور (Cancion Deseperada) کو تحریر کیا۔ آسمان مجھ پر گہرا نیلگوں تھا. جیسا کہ اس سے پہلے میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ میں زمین میں چھپی ہوئی کشتی کے اندر بیٹھ کر لکھا کرتا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ ادبی آگہی مجھ میں اس سے پہلے کبھی اس قدر زیادہ اور اتنی بھرپور تھی۔ سر پر نیلا آسمان، میرے ہاتھوں میں (Jean, Christop her) یا دوسری کسی نظم کے مصرعے، میرے اردگرد ہر دہ شے جو موجود تھی یا میری شاعری میں موجود رہی دور سے سمندر کی آواز، جنگلی پرندوں کی چیخیں اور کسی لافانی جھاڑی کی مانند نہ ختم ہونے والی جلتی ہوئی محبت۔

مجھ سے اکثر پوچھا گیا کہ (Veinte Poemas) کی عورت کون ہے؟ حالانکہ اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے۔ دو عورتیں جوان دکھ بھری جذباتی نظموں کا تانا بانا بنتی ہیں یوں کہہ لیں کہ (Marisol) میری سول اور (Marisombra) میری سومبارا اس سے متعلق تھیں۔

سمندر اور سورج، سمندر اور سایہ —— میری سول دیہات کی مسحور کن فضا ستاروں کے ساتھ بھرپور رات میں اور ٹی میوکو کے مرطوب آسمان کی طرح سیاہ آنکھوں کے ساتھ محبت ہے۔ وہ اپنے مستانہ اور زندگی سے بھرپور حسن کے ساتھ تقریباً ہر صفحے پر بندرگاہ کے پانیوں سے گھری اور پہاڑوں پہ آدھے چاند کے ساتھ نمودار ہوتی ہے۔

میری سومبارا شہر میں طالبہ ہے، سرمئی ٹوپی، شرمیلی نگاہیں میرے زمانہ طالب علمی کے آئندہ دنوں میں ہنی سکل کی ہمیشہ بسنے والی خوشبو اور شہر کے چھپے ہوئے راستوں پہ جذباتی ملاقاتوں کا جسمانی سکون

اس اثنا میں چلی میں زندگی بدل رہی تھی

چلی کے عوام کی تحریک ابھر رہی تھی، جو ادیبوں اور طالب علموں سے مضبوط تقویت کی خواہاں تھی۔ ایک طرف بورژوا طبقے کا بڑا رہنما (Arturo) آرٹورو تھا ایک بے پناہ طاقت ور اور دیوتا قسم کا انسان جو جمہوریہ کا صدر بن گیا تھا۔ لیکن اس نے سارے ملک کو اپنی جوشیلی تحریروں سے ہلا دیا ایک غیر معمولی شخصیت ہونے کے باوجود طاقت میں آنے کے بعد وہ فوراً ہی امریکہ کے ایک روایتی فرماں روا میں ڈھل گیا۔ امرا کی حکومت کا بڑا حصہ جس کے خلاف اس نے لڑائی لڑی

تھی اسے اور اس کی انقلابی تقریروں کو نگل گیا۔ ملک ہڑتالوں کی وجہ سے بتدریج ٹکڑوں میں تقسیم ہوتا رہا۔ تبھی پرولتاری طبقے کا ایک محنت کش رہنما (Louis Emilio) یوئیس امیلیو، جو غیر معمولی طور پر پرولتاری طبقے کو لاتین کے مراکز اور ملک بھر میں محنت کشوں کے لئے نو یا دس اخبارات کا اجرا کر کے منظم کر رہا تھا۔

بے روزگاری کے بڑھتے ہوئے طوفان نے ملک بھر کے اداروں کو ہلا کر رکھ دیا تھا میں ہفتہ وار (Claridad) میں مضامین لکھ رہا تھا۔

ہم طلباء عوام کے حقوق کی حمایت کرنے کے نتیجے میں پولیس کے ہاتھوں سانتیاگو کی گلیوں میں مار کھا چکے تھے۔ نائٹریٹ اور تانبے کی کانوں میں ہزاروں کام کرنے والے محنت کش دارالحکومت میں جمع ہو چکے تھے۔

مظاہروں اور اس کے بعد میں ہونے والے تشدد کے واقعات نے ملک کی زندگی پر المناک نشان چھوڑے تھے۔

اس وقت سے لے کر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد سیاست میری شاعری اور میری زندگی کا جزو بن گئی۔ اپنی شاعری میں، میں گلی کا دروازہ بند نہیں کر سکا بالکل جس طرح میں اپنے نوجوان شاعر کے دل پہ محبت، زندگی خوشی اور دکھ کا در بند نہ کر سکا۔

لفظ

جناب آپ جو چاہیں کہہ سکتے ہیں

لیکن یہ الفاظ ہیں، جو گاتے ہیں..... یہ دکھ دیتے ہیں اور نیچے اتر آتے ہیں۔ میں ان کے سامنے جھکتا ہوں..... میں انہیں پیار کرتا ہوں..... میں ان سے چمٹتا ہوں میں ان کو نیچے گراتا ہوں۔ ان کو کاٹتا ہوں۔ میں انہیں پگھلاتا ہوں ..... مجھے الفاظ سے اتنا پیار ہے ..... غیر متوقع الفاظ..... وہ الفاظ جن کا میں حریصانہ انداز میں منتظر رہتا ہوں یا اکڑ جاتا ہوں حتیٰ کہ وہ اچانک گر جاتے ہیں............

حروف علت سے مجھے پیار ہے..... وہ رنگین پتھروں کی طرح چمکتے ہیں۔ روپہلی مچھلی کی مانند اچھلتے ہیں وہ جھاگ ہیں، دھاگے ہیں، دھات ہیں، شبنم ہیں............ کچھ لفظوں کے پیچھے میں دوڑتا ہوں ..... وہ اس قدر خوبصورت ہیں انہیں اڑان کے وسط میں سے جب وہ میرے برابر سے گزرتے ہیں پکڑنا چاہتا ہوں۔ وہ میرے برابر سے گزرتے ہیں..... میں انہیں دھوکے سے پکڑتا ہوں انہیں صاف کرتا ہوں، ان کی کھال اتارتا ہوں، میں خود کو قاب کے روبرو کرتا ہوں ان کی

ہیت قلموں کی مانند ہے...... متحرک، ہاتھی دانت، سبزی چکنائی، پھل کی مانند، کائی کی طرح، شفاف قلم جیسے، زیتون کی مانند اور پھر میں انہیں پھینٹتا ہوں، ہلاتا ہوں، میں انہیں پیتا ہوں، انہیں حلق سے نیچے اتارتا ہوں، گودے میں بدلتا ہوں، خوراک کی طرح سجاتا ہوں اور پھر انہیں جانے دیتا ہوں...... میں انہیں اپنی نظم میں، غار کی چھت سے لٹکتی ہوئی برف کی قلموں کی طرح چھوڑتا ہوں ...... چمکتی ہوئی لکڑی کی چاندی جیسے...... کوئلوں کی مانند...... تباہ شدہ بحری جہاز کی باقیات...... لہروں کے تحفے...... لفظ میں ہر چیز زندہ ہے...... ایک خیال مکمل تبدیلی کے عمل سے گزرتا ہے کیونکہ ایک لفظ اپنی جگہ سے تبدیل ہوتا ہے یا دوسرا جگہ لیتا ہے بالکل ایک خراب چھوٹی سی شے کی مانند، جملے میں جو اس کا متوقع نہ تھا۔ لیکن اس کا کہنا ماننا ہے...... وہ سایہ رکھتے ہیں، شفاف، وزن، پر، بال اور ہر شے جو انہوں نے دریا میں بہتے ہوئے جمع کی، دیس دیس کی خاک چھانی، اپنی جڑوں سے دور رہے...... وہ بہت قدیم ہیں اور بے حد جدید وہ تابوتوں میں زندہ رہتے ہیں، چھپے ہوئے، پھول کی سی گل میں

میری زبان کس قدر عظیم ہے ـــــ یہ ایک شاندار زبان ہے، جو ہمیں ہسپانوی فاتحین سے ورثے میں ملی ہے...... وہ بڑے بڑے جہازوں میں امریکہ تک آلوؤں، چینی، دالوں، تمباکو، سونا، غلہ، انڈوں کے لئے آئے۔ ایک بے پناہ بھوک کے ہمراہ، جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی وہ ہر شے کو ہڑپ کر گئے، مذاہب، پرامڈ، قبیلے، پرستش گاہیں بالکل ان چیزوں کی مانند، جنہیں وہ اپنے بڑے بڑے قبیلوں میں لائے تھے جہاں کہیں بھی وہ گئے۔ انہوں نے زمین کو سرنگوں کر لیا، لیکن الفاظ پتھروں کی مانند وحشیوں کے جوتوں، ان کی داڑھیوں، ان کے خودوں، ان کے گھوڑوں کے نعلوں سے گرتے ہیں...... شاندار الفاظ جو چمکنے کے لئے چھوڑ دیئے گئے...... ہماری زبان ـــــ ہم ہارے ہوئے لوگ تھے

ہم فاتحین بن گئے .... وہ یہاں سے سونا اٹھا کر لے گئے، اور ہمارے لئے سونا چھوڑ گئے .... وہ یہاں سے سب کچھ سمیٹنے کے باوجود سب کچھ یہیں چھوڑ گئے......... وہ ہمارے لئے الفاظ چھوڑ گئے.........

البرٹو روجاز کے تعلق سے

میں اسے پاگل پن ہی کہوں گا ـــ ایک قسم کا پاگل پن جو اکثر شاعری کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ معقول لوگوں کی اکثریت کے لئے شاعر ہونا بہت مشکل ہو گا اور شاید انتہائی شاعروں کے لئے معقول ہونا بھی۔

باوجود اس کے کہ منطق کا پلڑا بھاری رہتا ہے اور یہ منطق ہی ہے ـــ انصاف کی اصل

حقیقت ـــــ جسے دنیا پر حکمرانی کرنی چاہئے۔ (Miguel de Unamuno) میگوئل نے جسے چلی سے بے حد پیار تھا، ایک مرتبہ کہا تھا "جسے میں پسند نہیں کرتا وہ ایک خول ہے، یہ سب کچھ کیا ہے، منطق سے یا طاقت سے؟ منطق سے ہمیشہ منطق ہے"

میں پاگل شاعروں میں سے ایک (Alberto Valdivia) البرٹو والڈیویا کے بارے میں بات کروں گا۔

البرٹو، دنیا کا نحیف ترین شخص تھا اور اس کی رنگت اس قدر زرد تھی کہ وہ محض ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آتا تھا۔ سر پر چونکا دینے والے سفید بالوں کا ڈھیر اور آنکھوں کو ڈھکے ہوئے ایک عینک ایک دور دراز دنیا کا تاثر دیتی ہم اسے والڈیویا لاش کہتے تھے۔ وہ کیفوں، کھانے پینے کی جگہوں، رقص گاہوں اور شراب خانوں میں آواز پیدا کئے بغیر آتا جاتا، اور اخباروں کا ایک چھوٹا سا پراسرار بنڈل ہمیشہ اس کی بغل میں دبا ہوتا۔

"عزیز لاش" اس کے دوست اس کے جسم سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا کرتے اور تب انہیں ہمیشہ یہ احساس ہوتا کہ وہ ہوا کے جھونکے سے بغل گیر ہو رہے ہیں اس نے انتہائی لطیف جذبات سے معمور کچھ بہت خوبصورت سطریں لکھیں تھیں۔

ہر چیز چلی جائے گی
سہ پہر، سورج، زندگی
بدی، جسے ختم نہیں کیا جا سکتا رہے گی
شفق کی بہن میری زندگی
بس تم مجھ سے جدا نہ ہونے والی رہو گی

یہ شاعر، جسے ہم چاہت سے والڈیویا لاش سمجھتے تھے، درحقیقت ایک سچا شاعر تھا۔ ہم اکثر اسے کہتے، ٹھہرو اور ہمارے ساتھ رات کا کھانا کھاؤ ہمارے دیئے ہوئے نام نے اسے کبھی پریشان نہ کیا۔

بعض اوقات اس کے بے حد باریک ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کھیلتی۔ اس کے جملے مختصر لیکن ہمیشہ بامعنی ہوتے۔ ہر سال ہم اسے قبرستان لے جاتے۔ پہلی نومبر کو ہم اس کے لئے رات کے کھانے کا انتظام کرتے۔ کھانا اتنا شاندار ہوتا جتنا غریب نوجوان ادیبوں اور طلباء کی جیبیں برداشت کر سکتیں تھیں۔ ہماری "لاش" مہمان کرسی پر جلوہ افروز ہوتی۔ ٹھیک بارہ بجے ہم سب میز سے اٹھتے اور قبرستان کی طرف ہلکے پھلکے انداز میں روانہ ہو جاتے کوئی مرحوم شاعر کی یاد میں تقریر کرتا۔ پھر ہم میں سے ہر ایک اسے خدا حافظ کہہ کر اسے قبرستان کے دروازے پر تنہا

چھوڑ کر واپس چلے جاتے "لاش" نے عرصہ ہوا اس روایتی رسم کو مان لیا تھا اور اس میں کوئی ستم بھی نہ تھا، کیونکہ وہ ہمیشہ اس میں خوش دلی سے شمولیت کرتا اور رسم کے آخر تک ساتھ رہتا۔ جانے سے پہلے ہم اسے کچھ پیسے دے دیتے تاکہ وہ اپنی قبر میں سینڈوچ کھا سکے۔ دو تین دن بعد کوئی بھی شاعر لاشؔ کو خاموشی سے دوبارہ دوستوں کی محفل میں ریستوران میں داخل ہوتے دیکھ کر حیران نہ ہوتا وہ امن سے اکیلے رہتے ہوئے آئندہ یکم نومبر تک دن گنتا رہتا۔

بیونس آئرز میں مجھے ارجنٹیا کے ایک بے حد خبطی ادیب سے ملنے کا موقع ملا، جس کا نام شاید (Omar Vignole) اومروگینول تھا یا ہے میں نہیں جانتا کہ وہ اب بھی بقید حیات ہے۔ وہ ایک دیو قامت شخص تھا جو چلنے کی ایک بھاری چھڑی کو اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔

ایک مرتبہ وسطی قصبے کے ایک ریستوران میں، جہاں اس نے رات کے کھانے پر مجھے مدعو کر رکھا تھا، میز پر میری جانب مڑا اور ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک ایسی آواز میں جسے پورے کمرے میں سنا جا سکتا تھا کہا "بیٹھ جاؤ اومروگینول"

میں بے چینی کی کیفیت میں بیٹھ گیا اور فوراً ہی اس سے پوچھ بیٹھا تم مجھے اومروگینول کیوں کہتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ تم اومروگینول ہو اور میں پابلو نرودا

"ہاں" اس نے جواب دیا، لیکن اس ریستوران میں بے شمار لوگ ہیں، جو مجھے محض نام سے جانتے ہیں اور ان میں سے بہت سے ایسے ہیں، جو مجھ میں سے دن کی روشنی کو نکال دینا چاہتے ہیں۔ میں چاہوں گا کہ ایسا وہ تمہارے ساتھ کریں"

وگینول ارجنٹینا کے ایک صوبے میں کاشتکار رہ چکا تھا اور اپنے ہمراہ ایک گائے لے آیا تھا۔ جو اس کی نہ جدا ہونے والی دوست بن گئی تھی۔ وہ بیونس آئرز میں ہر جگہ اپنی گائے کے ہمراہ اس کی رسی تھامے پھرتا اسی زمانے میں اس کی کچھ کتابیں شائع ہوئیں۔ جو تمام کی تمام عجیب و غریب ناموں کے ساتھ تھیں مثلاً "گائے کیا سوچتی ہے؟" "میں اور میری گائے"

جب (PEN) کلب کی پہلی بین القوامی ادبی کانفرنس بیونس آئرز میں منعقد ہوئی تو اس کے سربراہ (Victoria Ocampo) وکٹوریہ اوکیمپو اور تمام ادیب صرف یہ سوچ کر کانپ گئے کہ وگنول وہاں اپنی گائے کے ہمراہ آ جائے گا۔ انہوں نے حکام بالا کو اس خطرے کے بارے میں آگاہ کر دیا اور پولیس نے پلازہ ہوٹل کے اطراف کی تمام سڑکوں کی ناکہ بندی کر دی، تاکہ اتنی شاندار جگہ منعقد ہونے والی کانگرس میں کسی خبطی دوست کو ہنگامہ کرنے سے روکا جا سکے۔ لیکن یہ سب بے کار ثابت ہوا۔ تقریبات پورے زور شور پر تھیں اور ادیب حضرات یونان کی کلاسیکی دنیا کا آج کے عہد کے جدید تاریخی مطلب سے اطلاق کے بارے میں بحث مباحثے میں مصروف تھے کہ

عظیم وگنول اپنی جدا نہ ہونے والی گائے کے ہمراہ کانفرنس ہال میں آدھمکا اور طرفہ تماشہ یہ کہ گائے نے بھی چیخنا شروع کر دیا، جیسے وہ بھی مباحثہ میں شریک ہونا چاہتی ہو۔ وہ اپنی گائے کو شہر کے مرکز تک ایک بند ویگن میں لایا تھا، جس پر محتاط پولیس کو زرہ بھر بھی شک نہ ہو سکا اسی وگنول کے بارے میں، میں کچھ اور بتاؤں گا کہ ایک مرتبہ اس نے ایک پہلوان کو چلینج دے دیا۔ جسے اس نے قبول کر لیا اور مقابلے کی رات کو میرا دوست صحیح وقت پر لیونا پارک میں اپنی گائے کے ہمراہ پہنچ گیا، جسے اکھاڑے کے کونے میں بٹھا کر اپنا شاندار لبادہ اتارا اور (Calcutta Strangler) کلکتہ اسٹرنگیلر کے بالمقابل کھڑا ہو گیا۔ لیکن نہ گائے اور نہ خود لڑنے والے شاعر کے چیلنج نے اس کا ساتھ دیا۔ کلکتہ کی شہرت والے پہلوان نے وگنول کی خوب پٹائی کی اور اسے رنگ کے رسوں میں بے یارو مدد گار حالت میں باندھ دیا، اور صرف پٹائی ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ بے عزتی میں اضافہ کرتے ہوئے تالیوں کے شور میں وہ اپنا پاؤں اس ادبی بیل کے گٹے پر رکھ کر کھڑا ہو گیا، جبکہ دیکھنے والے لڑائی کو جاری رکھنے کے لئے شور کر رہے تھے۔

چند ماہ بعد وگنول کی ایک اور کتاب شائع ہوئی۔ جس کا نام "گائے کے ساتھ مکالمہ" تھا۔ میں اس کتاب کے پہلے صفحے پر موجود ایک دلچسپ انتساب کو کبھی نہ بھولوں گا۔ اگر میرا حافظہ میرا ساتھ دیتا ہے تو وہ کچھ یوں تھا۔

"میں اس فلسفیانہ کام کو ان چالیس ہزار کتیوں کے بچوں کے نام منسوب کرتا ہوں، جنہوں نے ۲۴ر فروری کو لیونا پارک میں میری موت کے لئے غل غپاڑہ کیا اور سیٹیاں بجائیں"

پیرس میں دوسری جنگ عظیم سے پہلے میں مصور (Alvaro Guevara) آلوارو گیویرا سے ملا، جو یورپ میں (Chile Guevara) کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ایک دن اس نے مجھ سے فون پر بات کی، اس کی آواز میں جلدی کا عنصر نمایاں تھا "یہ ایک بہت ضروری بات ہے" وہ بولا میں اسپین سے وہاں پہنچا تھا اور ہماری جدوجہد اس وقت کے ہٹلر (Nixon) یعنی نکسن کے خلاف تھی۔ میڈرڈ میں میرا گھر بمباری سے تباہ ہو چکا تھا اور میں نے [illegible]، عورتوں اور بچوں کو بمباری کے باعث صفحہ ہستی سے نابود ہوتے دیکھا تھا۔

جنگ عظیم کی شروعات تھی۔ میں دوسرے ادیبوں کے ہمراہ جنہوں نے فسطائیت کے خلاف جنگ شروع کر رکھی تھی، کتابوں کی مدد سے عوام کی آنکھیں کھولنے پر اپنے انداز میں شامل تھا، تاکہ وہ ایک عظیم خطرے کو دیکھ سکیں میرے ملک کے لوگ اس جدوجہد سے باہر تھے۔

ایلوارو ایک محنتی مصور لیکن الگ تھلگ رہنے والا شخص تھا، جو ہمیشہ مصروف رہتا تھا۔ ہم بارود

کے : ییر پر بیٹھے تھے، جب کہ بڑی طاقتوں نے ہسپانوی جمہوریہ کی مدد میں آنے والے اسلحے کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں اور بعد مین میونخ میں جب انہوں نے ہٹلر کی فوجوں کے لئے دروازے کھول دیئے تو جنگ سر پر آچکی تھی۔ میں نے چلی گیویرا کی درخواست پر اس سے ملنے کی ٹھانی، کیونکہ جو وہ مجھے بتانا چاہتا تھا، وہ بہت ضروری تھا۔

"یہ سب کس کے بارے میں ہے؟" میں نے اس سے پوچھا

"ضائع کرنے کے لئے وقت بالکل نہیں ہے" اس نے جواب دیا۔ تمہارے لئے فسطائیت کی مخالفت کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے کسی کو بھی کسی چیز کی ضد نہیں ہونا چاہئے ہمیں ضروری کام کرنا چاہئے اور میں نے وہ ضروری کام دریافت کر لیا ہے، جس کے بارے میں میں تمہیں ابھی بتاؤں گا تاکہ تم نازیوں کے خلاف کانگریس کا خیال چھوڑ کر زیادہ سنجیدہ کام پر لگ جاؤ، ضائع کرنے کے لئے ذرا سا بھی وقت نہیں ہے۔"

ایلوارو میرے پاس واقعی بہت کم وقت ہے، مجھے بتا دو کہ سب کچھ کیا ہے" پابلو، میرا خیال درحقیقت تین ایکٹ کے کھیل میں واضح ہو گا، میں اسے تمہارے مطالعے کے لئے لایا ہوں"

اس نے مجھے سختی سے گھورا۔ اس کا چہرہ، جھاڑیوں جیسی گھنی بھنوؤں کے ساتھ ایک سابق مکہ باز کا سا تھا اور یہ کہتے ہوئے ایک خاصا دبیز مسودہ مطالعے کے لئے نکالا۔ میں نے بے چین ہوتے ہوئے اپنی کم وقتی کا بہانہ کیا اور اسے مجبور کیا کہ وہ خود مختصراً اپنے خیالات اور پلان کے بارے میں مجھے بتا دے جس سے اس کے مطابق نسل انسانی کو بچایا جا سکتا تھا۔

یہ کولمبس کے انڈے کی طرح ہے، جسے با آسانی توڑا جا سکتا ہے، برعکس اس کے کہ یہ کیا نظر آتا ہے۔ اس نے کہا میں تفصیل سے بتاؤں گا۔ اگر تم ایک آلو کاشت کرو تو اس سے تمہیں کتنے آلو ملیں گے؟

میں نے کچھ کہنے کو جواب دیا ممکن ہے چار یا پانچ

اس سے کہیں زیادہ اس نے جواب دیا۔

بعض اوقات چالیس بعض اوقات سو سے بھی زیادہ۔ تصور کرو کہ ہر شخص ایک آلو باغ میں کاشت کرتا ہے یا بالکونی میں یا کہیں بھی۔

چلی میں کتنے لوگ ہیں۔ اسی لاکھ۔ اسی لاکھ کاشت کئے گئے آلوؤں کو چار سے ضرب دو، سو سے ضرب دو ـــ یہ بھوک اور جنگ کا اختتام ہے۔ چین میں کتنے لوگ ہیں؟ پچاس کروڑ (اس وقت کے مطابق) صحیح؟ ہر چینی ایک آلو کاشت کرتا ہے۔ چالیس آلو ہر لگائے جانے والے آلو سے حاصل ہوتے ہیں۔ پچاس کروڑ آلوؤں کو اگر چالیس سے ضرب دی جائے تو انسانیت بچ

جاتی ہے جب نازی پیرس میں داخل ہوئے تو انہوں نے نہ دنیا کے بچاؤ کے بارے میں سوچا نہ ہی کولمبس کے انڈے یا کولمبس کے آلو کے بارے میں ____

ایلوارو گیویرا کو پیرس میں ایک کہر آلود سرد رات کو اس کے گھر میں گرفتار کر لیا گیا پھر وہ اسے قیدیوں کے ایک کیمپ میں لے گئے اور جنگ کے خاتمے تک اس کے بازو پر ایک نشان کھود کر اسے وہاں قید میں رکھا۔

وہ اس جہنم سے ایک ڈھانچے کی صورت میں واپس آیا اور کبھی بھی صحت یاب نہ ہو سکا۔ چلی وہ آخری مرتبہ آیا جیسے اپنے ملک کو خدا حافظ کہنے آیا ہو۔ آخری بار چومنے، سوتے میں چلنے والے شخص کا بوسہ اور پھر واپس فرانس چلا گیا، جہاں موت نے اس کا کام تمام کر دیا۔

عظیم مصور، عزیز دوست چلی گیویرا میں تمہیں ایک بات بتانا چاہوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ تم مر چکے ہو اور تمہاری غیر جانب دارانہ آلو کی سیاست نے تمہاری کوئی مدد نہ کی، میں جانتا ہوں کہ نازی تمہاری موت کے ذمے دار تھے۔

اس کے باوجود گزشتہ جون میں مجھے نیشنل گیلری میں جانا پڑا میں صرف ٹرنر کی تصاویر دیکھنا چاہتا تھا لیکن ابھی میں مرکزی کمرے تک نہ پہنچا تھا کہ میں نے ایک بے حد خوبصورت تصویر کو تلاش کیا، یہ میرے لئے اتنی ہی شاندار تصویر تھی، جیسی کہ ٹرنر کی ہو سکتی تھی ____ جگمگاتا ہوا حسین شاہکار۔ یہ ایک عورت کی پورٹریٹ تھی۔ ایک مشہور خاتون جس کا نام (Edith Sitwell) ایڈتھ سٹیویل تھا اور یہ پینٹنگ تماری تخلیق تھی۔ لاطینی امریکہ کے کسی واحد مصور کی بنائی ہوئی تصویر جسے لندن میوزیم میں عظیم فن کاروں کے شاہکاروں کے وسط میں سجنے کا اعزاز ملا تھا۔

میں جگہ اور عزت کے بارے میں پرواہ نہیں کرتا اور دل میں میرے لئے اس خوبصورت کینوس کی بھی بہت کم جگہ ہے۔ میرے لئے جو بات اہم ہے وہ یہ کہ ہم ایک دوسرے کو زیادہ بہتر طور پر نہیں سمجھ سکے اور ہم نے بغیر سمجھے ہوئے اپنی زندگیوں کو متضاد راہوں پہ جانے دیا، محض ایک آلو کی وجہ سے۔

میں ایک بے حد سادہ آدمی ہوں ____ یہی بات میرے لئے باعث توقیر رہی میں نے اپنے دوستوں کی لغویات کا ساتھ دیا، اور ان کی درخشاں آرائشوں پر رشک بھی کیا۔ ان کے شیطانی انداز، ان کے ننھے کاغذی پرندے حتیٰ کہ ان کی گائیں تک۔ جن کا بیان نہ کرنے والے انداز میں ادب سے کوئی تعلق رہا ہو۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ میں انصاف کرنے کے لئے بلکہ محبت کرنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ تقسیم کرنے والے بھی، جو مجھ پر حملے کرتے ہیں، خود پہلے میری شاعری

سے توانائی حاصل کرنے کے بعد میری آنکھیں نکالنے کے لئے کوشاں رہے۔ اگر کچھ نہیں تو کم از کم میری خاموشی کے حق دار تھے۔ میں کبھی بھی اپنے دشمنوں میں گھومنے پھرنے سے اس لئے خوفزدہ نہ تھا کہ میں خود کو آلودہ کر لوں گا، کیونکہ جو میرے دشمن تھے وہی عوام کے دشمن تھے۔

(Apollinaire) اپولینیئر نے کہا تھا۔

"ہم پر رحم ہو، جو غیر حقیقی دنیاؤں کی سرحدیں دریافت کرتے ہیں" کہانیوں کے بارے میں سوچتے ہوئے میں اپنی یادوں کے حوالے دیتا ہوں، جو میں نے ابھی سنائیں ان لوگوں کی کہانیاں جو مجھے اس لئے زیادہ عزیز نہیں تھے کہ وہ خبطی تھے اور زیادہ بہادر نہ تھے کیونکہ میں نہیں جانتا تھا کہ کیسے امن سے عہدہ برا ہوں۔

بڑا کاروبار

ہم شاعر ہمیشہ پریقین رہے کہ ہمارے روشن خیلات ہمیں امیر کبیر بنا دیں گے۔ ہم کاروباری معاملات میں فطین ہوں گے لیکن ایسے فطین جنہیں کوئی نہیں سمجھتا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ۱۹۲۴ء میں ایسے ہی دولت بنانے والے ایک دوست کے مشورے پر کہ اگر میں چلی کے پبلشر کو اپنی کتاب (Crepusculario) کے حقوق محض ایک ایڈیشن کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فروخت کر دوں تو یہ سودا مجھے امیر بنا دے گا۔

یہی سوچتے ہوئے ایک وکیل کے سامنے میں نے اس معاہدے پر دستخط کر دیئے جس کے عوض پبلشر نے مجھے پانچ سو پیسوز (چلی کا سکہ) دے دیئے، جو اس وقت کے پانچ ڈالر سے کچھ کم رقم بنتی تھی۔

روجاز الویرو ہومیرو نوٹری پبلک کے دفتر کے باہر میرے منتظر تھے کہ اس تجارتی کامیابی کی خوشی میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کریں اور در حقیقت ہم نے اس وقت کے سب سے شاندار ریستوران (La Bahia) میں کھانا کھایا، جس میں اعلیٰ قسم کی شرابیں اور سگار موجود تھے لیکن اس سے پہلے ہم نے اپنے جوتے اس وقت تک پالش کروائے کہ وہ شیشے کی طرح چمک اٹھے۔

ریستوران، چار پالش کرنے والے بچے اور ایک پبلشر اس کاروبار میں منافع میں رہے۔ امارت شاعر کے نزدیک ہی آکر رک گئی ایلوارو کا دعویٰ تھا کہ وہ ہر قسم کے کاروبار کے بارے میں تیز نظر رکھتا ہے۔ ہم اس کے منصوبوں سے جنہیں وہ بروئے کار لاتا اور پیسے کی بارش کرتا، متاثر تھے۔ ہم بوہیمین (آزاد مشرب) لوگوں کے لئے اس کا انگریزی زبان پر عبور، اس کی ورجینا

کے تمباکو کی سگرٹیں، نیویارک کی یونیورسٹی میں اس کی تعلیم، اس کے عملی فلسفے اور کاروباری دماغ کے بارے میں بہت کچھ بتاتیں۔ ایک روز وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور بڑے اعتماد کے ساتھ ایک منصوبے میں جو ہم سب کو جلد ہی امیر بنا دیتا، شرکت کرنے کو کہا، میں محض چند پیسوز کی شراکت سے اس کے کاروبار میں آدھے کا شریک ہو سکتا تھا اس روز خدا اور قانون کے علاوہ ہم خود کو سرمایہ دار محسوس کرتے ہوئے کچھ بھی کر گزرنے کے قابل تھے۔

"یہ کس قسم کا کاروبار ہے؟" میں نے خزانے کے بادشاہ سے جھجکتے ہوئے پوچھا ایلوارو نے اپنی آنکھیں بند کیں، منہ سے دھوئیں کا ایک مرغولہ نکالا جو چھوٹے چھوٹے چھلوں میں منقسم ہو گیا اور آخر جھلائی ہوئی آواز میں جواب دیا——— "اونی کھالیں"

"اونی کھالیں؟" میں نے حیرت میں پوچھا

"سمندری سیل کی کھالیں۔ ایک ہی رنگ کے بالوں والے سمندری سیل کی کھالیں"

میں مزید تفصیلات نہ پوچھ سکا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ سمندری سیل یا سمندری شیر کسی رنگ کے بال بھی رکھتے ہیں۔

میں نے جب انہیں جنوبی ساحلوں کی چٹانوں پر دیکھا تھا تو دھوپ میں صرف ان کی چمکتی ہوئی جلد دیکھی تھی اور کبھی ان کی جلد پر بالوں کے بارے میں غور بھی نہ کیا تھا۔ مکان کا کرایہ، درزی کی اقساط اور موچی کے پیسے دیئے بغیر برق رفتاری کے ساتھ ہر اس شے کو جو میری ملکیت تھی، میں نے پیسے کی شکل میں جمع کیا اور ایک رقم اپنے کاروباری ساتھی کے سامنے رکھ دی۔

ہم کھالوں کو دیکھنے گئے۔ ایلوارو نے انہیں اپنی ایک خالہ سے خریدا تھا۔ جو جنوب میں کئی غیر آباد جزیروں کی مالک تھی۔ انہی غیر آباد جزیروں پر سمندری جانور اپنی جنسی تقریبات کیا کرتے تھے اور اب وہ یہاں میری آنکھوں کے سامنے بڑی بڑی پیلی کھالوں کے ڈھیر کی صورت میں موجود تھے۔

نئے خریداروں کو متاثر کرنے کے لئے کھالوں کے ڈھیر ایلوارو کے گودام میں چھت تک لگے ہوئے تھے۔ میں نے مدھم آواز میں پوچھا کہ ہم ان لامحدود کھالوں کے پہاڑ کا کیا کریں گے؟ "ہر ایک کو اس قسم کی اونی کھالوں کی احتیاج ہوتی ہے، تم دیکھو گے اور ہم گودام سے چلے گئے۔

ایلوارو توانائی کی چنگاریاں اڑاتا ہوا، اور میں بغیر کچھ کہے سنے سر جھکائے ہوئے

ایلوارو خالص کھال کے بنے ہوئے بریف کیس کو لئے پھرتا، جس میں کاروبار کے سادہ فارم بھرے ہوتے۔ ہماری آخری رقم اخبار میں اشتہار پر خرچ ہو گئی۔ "صرف کسی ایک شخص کو

جوان میں دلچسپی رکھتا ہو" اشتہار پڑھنے دو، پھر دیکھنا ہم امیر ہو جائیں گے"

ایلوارو ایک انتہائی خوش لباس انسان تھا، جو کم از کم آدھی درجن انگلش کپڑے کے سلے سوٹ چاہتا تھا۔ میں بھی اپنے نا آسودہ خوابوں میں ایک اچھا شیونگ برش خریدنے کا خیال رکھتا تھا، کیونکہ جو برش اب میرے پاس تھا، وہ تقریباً گنجا ہونے والا تھا۔

بالاخر ایک خریدار آیا___ وہ چمڑے کی مصنوعات کا کام کرتا تھا ایک چھوٹے قد کا بھاری بھرکم انسان جس کی بے خوف آنکھیں اور بے اعتنائی کا انداز میرے خیال میں رعونت لئے ہوئے تھا۔

ایلوارو نے محتاط اور غیر جانب دار انداز میں اس کا استقبال کیا اور کھالیں دکھانے کے لئے تین دن بعد ایک خاص وقت مقرر کیا۔

ان تین دنوں میں ایلوارو نے بہترین انگلش سگریٹ اور ہوانا کے مشہور "رومیو جیولٹ" سگار خریدے، جنہیں اس نے خریدار کے متوقع آمد کے وقت کے لئے اپنے کوٹ کی اوپر جیب میں نمایاں طور پر سجایا کہ وہ نظر آئیں۔ ہم نے اچھی قسم کی کھالیں فرش پر بچھا دیں ہر شخص مقررہ وقت پر آیا۔ اس نے اپنا ہیٹ نہ اتارا بلکہ چہرے کے مخصوص انداز سے ہمیں سلام کیا۔ اس نے جلد ہی چھت پر بچھی ہوئی کھالوں کو بغور دیکھا۔ پھر اس نے اپنی تیر نگاہیں بھرے ہوئے خانوں پر ڈالیں اور اپنی انگلی کو مشکوک انداز میں اس خانے کی طرف اٹھایا جہاں میں نے خراب ترین کھالوں کو جمع کر رکھا تھا۔

ایلوارو نے اس سخت لمحے میں خریدار کو ہوانا کا سگار پیش کیا جسے اس پست قامت خریدار نے چھینا، اس کے ایک سرے کو منہ سے چبایا اور سگار کو منہ میں ٹھونس لیا اور پھر مطمئن انداز میں اس بنڈل کی طرف سے جسے وہ دیکھنا چاہتا تھا، اشارہ کیا

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اسے مال دکھایا جائے۔ میرا ساتھی اسی شخص کی طرح مسکراتے ہوئے، جسے پھانسی کا حکم دے دیا جائے، سیڑھی پر چڑھا اور بڑے بنڈل تھامے ہوئے نیچے اتر آیا۔ وقفے وقفے سے اس شخص نے ایلوارو کے دیئے ہوئے سگار سے دھواں نکالا اور انتہائی سکون کے ساتھ ایک ایک کھال کا معائنہ کیا۔ اس شخص نے ایک کھال اٹھا کر اسے رگڑا، دہرا کیا اور غصے میں ایک طرف پھینک دیا اور فوراً دوسری کھال کی طرف متوجہ ہوا، جو اسی طرح رگڑی، گھسائی، سونگھی گئی اور گرا دی گئی آخر کار جب وہ اپنا معائنہ تمام کر چکا تو اس نے ایک بار پھر اپنی گدھ جیسی آنکھوں کو اوپر کے خانوں میں رکھی ہوئی کھالوں پر ڈالا اور پھر میرے کاروباری ماہر ساتھی کے ماتھے پر گاڑ دیا اور تب ایک سخت اور خشک آواز میں جو الفاظ ادا کئے وہ کم از کم ہمارے

لئے لافانی ہو گئے۔ "میرے عزیز محترم ـــــ میں ان کھالوں میں سے کچھ نہیں لے رہا" یہ کہتے ہوئے وہ ہمیشہ کے لئے، ہیٹ اوڑھے، ایلوارو کا سگار پیتے ہوئے بغیر خدا حافظ کہے چلا گیا ـــــ ہمارے لکھ پتی ہونے کے خوابوں کا قاتل

میری پہلی کتابیں

کسی بھی بے حد شرمیلے شخص کی طرح، میں نے شاعری میں پناہ لی نئی ادبی تحریکیں سانتیاگو پر منڈلا رہی تھیں۔

میں نے اپنی پہلی کتاب ۵۱۳ ماروری اسٹریٹ میں مکمل کی میں روزانہ دو تین بلکہ چار پانچ نظمیں لکھا کرتا تھا۔

ڈھلتی ہوئی سہ پہر کو میری بالکونی کے باہر ایک ایسا منظر خود کو بے نقاب کرتا، جسے میں دنیا میں کسی بھی شے کے عوض کبھی نہ بھول سکا۔ یہ غروب آفتاب کا منظر تھا، اپنے شاندار رنگوں کی چھوٹ، بکھری ہوئی روشنی کی کرنوں نارنجی اور گلابی رنگوں کے پنکھ کے ہمراہ

میری کتاب کے درمیانی حصے کا نام "ماروری کی شفق" تھا

کسی نے بھی مجھ سے کبھی دریافت نہ کیا کہ ماروری کا کیا مطلب ہے۔ ممکن ہے لوگوں کی بہت کم تعداد یہ جانتی ہو کہ یہ ایک معمولی سی سڑک کا نام تھا، جس میں غیر معمولی شفق کے مناظر نظر آتے تھے۔

۱۹۲۳ء میں میری پہلی کتاب (Crepusculario) منظرعام پر آئی۔ پہلی اشاعت کے معاوضے کو ادا کرنے میں ہر روز مجھے ناکامیوں اور کامیابیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ میں نے فرنیچر کی کچھ چیزیں جو میرے پاس تھیں فروخت کر دیں۔ وہ گھڑی جو میرے باپ نے مجھے دی تھی، جس پر دو جھنڈے ایک دوسرے کو قطع کرتے دکھائے گئے تھے، جلد ہی فیلدی کے دلال کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ میرا شاعروالا سوٹ اس کے بعد بکا۔ ناشر بے حد سخت انسان تھا آخر میں جب کتاب چھپ کر تیار ہو گئی اور جلد بندی ہو چکی، تو اس نے مجھے شیطانی انداز میں دیکھتے ہوئے کہا "تم کوئی کتاب لے کر نہیں جا سکتے، جب تک اس کے لئے مجھے پورا معاوضہ نہ دے دو"۔ نقاد Alone نے، آخری رقم مجھے دی، جسے ناشر نے مجھ سے چھین لیا اور میں اپنی کتابیں اپنے کندھے پر اٹھائے سوراخ شدہ جوتے پہنے خوشی سے سرشار سڑک پر تھا۔ میری پہلی کتاب! میں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ ادیب کا اسرار و جادو سے کوئی تعلق نہیں اور کم از کم شاعر کو ذاتی سطح پر سب کی بھلائی کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔

شاعری سے نزدیک ترین شے. روٹی کاایک ٹکڑا یا خوبصورت چینی کی ایک پلیٹ یا پھر لکڑی کاایک خوبصورت انداز میں کندہ کیا ہوا ٹکڑا ہے جو بے شک بے ڈھبے ہاتھوں سے ہی بنا ہو۔ اس کے باوجود میں شاعر کے سوا کسی بھی ضاع کو نہیں مانتا جو اپنے خوابوں کی الجھن سے لرزہ براندام ہوتا ہے، کبھی کبھی مستی کے اس تجربے سے گزرتا ہے جو صرف ایک بار اس کی زندگی میں رونما ہوتا ہے اس پہلی شے کے باعث جسے اس کے ہاتھوں نے تخلیق کیا ہو یہ ایک ایسا لمحہ ہے، جو کبھی واپس نہیں آئے گا۔ بہت سے ایڈیشن زیادہ فصیح، بہت خوبصورت ہوں گے۔ اس کے الفاظ دوسری زبانوں کے گلاسوں میں شراب کی طرح انڈیلے جائیں گے اور اس روئے زمین پر گانے کے لئے اس کی خوشبو کو دوسری جگہوں تک پھیلایا جائے گا. لیکن وہ لمحہ جب پہلی کتاب تازہ روشنائی اور کڑکڑاتے ہوئے کاغذ کے ساتھ منظرعام پر آتی ہے، مسرت اور سرور کا وہ لمحہ پروں کی پھڑپھڑاہٹ کی آواز کے ہمراہ یا مفتوح بلندی پر پہلا کھلتا ہوا پھول شاعر کی زندگی میں وہ لمحہ محض ایک بار آتا ہے۔

میری نظموں میں سے ایک نظم "الوداع" اس ناپختہ کتاب سے نکل گئی، جسے بہت سے لوگ، جہاں کہیں بھی میں گیا اب بھی زبانی یاد رکھتے ہیں وہ یہ نظم مجھ سے بعض اوقات بے حد غیر معمولی جگہوں میں سنانے کی فرمائش کرتے ہیں یا خود سناتے ہیں۔ مجھے یہ برا بھی لگتا ہے کہ جیسے ہی کسی جگہ مجھے متعارف کرایا جاتا، کوئی لڑکی اس نظم کی ذہن پر طاری رہنے والی سطروں سے اپنی آواز بلند کر دیتی یا کبھی کسی ملک کے کوئی وزیر اس نظم کا پہلا بند پڑھتے ہوئے میرا استقبال کرتے۔

کئی برس بعد اسپین میں (Fedrico Garcia Lorca) فیڈریکو گارسیالورکا نے مجھے بتایا کہ خود اس کے ساتھ اس کی نظم (The Faithless Wife) کے بارے میں کیا ہوتا رہا۔ لورکا کسی بھی شخص کے لئے اپنی دوستی کا بہترین ثبوت اپنی کسی بہت ہی مقبول اور خوبصورت نظم کو دوبارہ سنا کے کرتا مگر ہم اپنی ہی کسی ایک نظم کی غیر متزلزل شہرت سے تنگ آچکے تھے۔ یہ صحت مند اور فطری احساس ہے۔ پڑھنے والوں کی طرف سے اس قسم کی پابندی شاعر کو محض ایک خاص وقت میں قید کر دیتی ہے جبکہ تخلیق کی مثال ایک مسلسل چلتے ہوئے کاتنے والے چرخے کی سی ہے، زیادہ سے زیادہ سہولت اور خود اعتمادی کے ساتھ لیکن شاید کچھ کم تازگی اور بے ساختگی کے ساتھ۔

اب میں (Crepusculario) کو اپنے پیچھے چھوڑ رہا تھا۔ ایک گہرا تجسس اور بے چینی میری شاعری کو مہمیز دے رہے تھے۔ جنوب کی طرف مختصر دوروں نے میری شاعری کو تازہ دم کر دیا تھا۔

۱۹۲۳ء میں میرے ساتھ ایک عجیب واقع پیش آیا، میں ٹی میو کو میں اپنے گھر واپس آیا

تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا، سونے سے قبل میں نے اپنے کمرے کی کھڑکیوں کو کھول دیا۔ آسمان نے مجھے بھونچکا کر دیا۔ تمام آسمان جیسے زندہ و تابندہ تھا اور ہزاروں ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے رات مجھے تازہ نہائی ہوئی محسوس ہوئی اور انٹار کٹک کے ستارے ایک ترتیب کے ساتھ میرے سر پر پھیلے ہوئے تھے۔ میں ستاروں سے مدہوش ہو گیا تھا۔

آسمانی اور کائناتی نشہ ـــــ میں اپنی میز کی طرف دوڑا اور زور زور سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بالکل جیسے میں املا لکھ رہا ہوں۔ نئی کتاب کی پہلی نظم لکھنی شروع کی وہ کتاب جس کے کئی نام رکھے گئے لیکن بالآخر (Elbondero Entusiasta) اس کا نام قرار پایا، یہ بالکل ایسے ہی آسان تھا، جیسے میں خود اپنے پانیوں میں تیر رہا ہوں۔

اگلا دن خوشیوں سے بھرا تھا۔ میں نے اپنی نظم پڑھی بعد میں جب میں سانتیاگو گیا تو (Aliro Oyarzun) الیرو جادوگر نے میری نظم کی ان سطروں کو ستائش کے انداز میں سنا اور پوچھا

"کیا تمہیں یقین ہے کہ اس نظم کی پہلی سطریں (Sabat Ercasty) سے متاثر ہو کر نہیں لکھی گئیں؟

تیسرا باب

دنیا کی شاہراہیں

والپاریزو میں آوارگی

(Valparaiso) والپاریزو، سانتیاگو کے خاصا قریب ہے، دونوں پہاڑی سلسلے سے جدا ہیں، جس کی چوٹیوں پر بلند کیکٹس کے درخت موجود ہیں جو خاصے غیر دوستانہ ہونے کے ساتھ ساتھ پھولوں سے لدے ہوئے چار پہلو ستون کی مانند ہیں۔ اس کے باوجود تعریف کے قابل کوئی ناممکن شے والپاریزو کو سانتیاگو سے الگ رکھتی ہے۔ سانتیاگو برف کی دیواروں میں مقید ایک شہر ہے جبکہ دوسری طرف والپاریزو اپنے دروازے وسیع و عریض سمندر کی جانب کھول دیتا ہے اور اپنی گلیاں، شور اور بچوں کی آنکھوں کی جانب

خود سر جوانی کی حالت میں، ہم اچانک صبح سویرے، رات کو نہ سونے کے باوجود جبکہ ہماری جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ ہوتی۔ تیسرے درجے کی گاڑی میں سوار ہو جاتے۔ ہم سب شاعر اور مصور تھے۔ سب کے سب بیس برس کی عمر میں، جوانی کے دیوانے جوش و خروش کے ساتھ کچھ کر گزرنے کے لئے بے قرار والپاریزو کے ستارے نے اپنی مقناطیسی دھڑکن کے ساتھ ہماری موافقت کی۔

بہت زیادہ برس نہیں گزرے تھے کہ ایک بار پھر میں نے اسی ناقابل بیان آواز کو سنا۔ یہ میڈرڈ کے قیام کے دوران ہوا تھا۔ ایک شراب خانے میں رات گئے تھیٹر سے آئے ہوئے یا بعض جگہوں میں مٹر گشت کے دوران مجھے اچانک یوں لگتا جیسے (Toledo) ٹولیڈو مجھے بلا رہا ہو۔ کسی بھی شور کے بغیر اس کی بھوتوں اور خاموشی کی سی آواز۔ رات کے ان لمحوں میں، اپنی ہی وضع کے

جوان پاگل دوستوں کے ہمراہ میں ایک قدیم، بھوسلے رنگ کے ٹیرھے میڑھے کلیسا کی جانب ہو لیا۔ اپنے لباس ہی میں Tagos کی ریت پر پتھروں کے پل کے نیچے سونے کے لئے۔ میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہے ؟ کہ میں جب بھی والپاریزو گیا جس کی میں خود ایک تصویر بنا سکتا ہوں، جو میرے ذہن میں چسپاں ہے، کھیتوں کی قربت سے جدا کی گئی جھاڑیوں کی خوشبوؤں سے معطر

ہم ایک شاعر اور مصور کو الوداع کہنے کو جا رہے تھے، جسے فرانس تک تیسرے درجے میں سفر کرنا تھا ــــ ہم میں سے کسی کے پاس بھی اتنے پیسے نہ تھے کہ گھٹیا سے ہوٹل کا خرچہ بھی برداشت کر سکتے لہٰذا ہم نے شاندار والپاریزو میں (Novoa) نووا کو ڈھونڈنا چاہا۔ اس کے گھر تک پہنچنا بھی کوئی ایسا آسان نہ تھا، ان گنت پہاڑیوں سے گزرتے ہوئے گرتے پڑتے، ہم نووا کے پیچھے چلتے ہوئے بالاخر اس کے گھر تک پہنچ گئے۔

وہ ایک متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ گھنی داڑھی اور بھاری مونچھوں کے ساتھ۔ اس کے کوٹ کی دمیں پہاڑی کی ڈھلان پر چڑھتے ہوئے پروں کی طرح ہلتی تھیں اور ہم اندھا دھند اس کے تعاقب میں چلے جا رہے تھے جبکہ وہ بے تکان بولے چلا جا رہا تھا۔ وہ ایک خبطی صوفی تھا، جو ہم شاعروں سے ذاتی طور پر متاثر تھا اور فطری طور پر وہ ایک فطرت پسند شخص تھا، جو سبزیاں کھانے کو ترجیح دیتا تھا وہ اپنی جسمانی صحت اور زمین کے قدرتی تحائف کے مابین خفیہ رابطوں کی تعریف کئے جاتا۔ جیسے جیسے وہ چلتا گیا، ہمیں تبلیغ کرتا رہا اپنی گرجدار آواز کو ہم پر یوں پھینکتے ہوئے جیسے ہم سب اس کے شاگرد ہوں۔ ان تاریک اور بھلائے گئے علاقوں میں اس کی بلند و بالا شخصیت سینٹ کرسٹوفر کی مانند تھی۔

آخر کار ہم اس کے گھر پہنچ گئے، جو دو کمروں پر مشتمل ایک کیبن نکلا ان کمروں میں سے ایک میں ہمارے سینٹ کرسٹوفر کا نمبر لگا تھا جبکہ دوسرے کمرے میں ایک بہت بڑی شاندار آرام کرسی پڑی ہوئی تھی۔ جس کے اوپر گلاب کے پھولوں کی شاخیں بنی تھیں اور بازوؤں میں چھوٹی چھوٹی درازیں موجود تھیں ــــ وکٹورین عہد کا ایک نادر نمونہ اس رات مجھے سونے کے لئے یہ بڑی کرسی میسر آئی جبکہ میرے ساتھیوں نے شام کے اخبارات کو فرش پر بچھایا اور بڑی احتیاط کے ساتھ خبروں اور اداریوں کے کالموں پر دراز ہو گئے۔

ان کے خراٹوں اور سانس کی آوازوں نے جلد ہی مجھے بتا دیا کہ وہ [illegible] سو رہے ہیں لیکن اس شاندار کرسی میں بیٹھے ہوئے میرے لئے سونا بہت دشوار تھا۔ میں بلند پہاڑوں کی تنہا چوٹیوں سے ایک سکوت کو نیچے اترتے ہوئے سن سکتا تھا۔ تاریکی میں بھونکتے ہوئے کتوں کی آوازیں اور دور کہیں سے آتے جاتے ہوئے بحری جہازوں کی سیٹیوں نے میرے لئے [illegible] پاریزو کی اس رات کو

معنی خیز بنا دیا تھا۔

اچانک میں نے اپنے آپ میں ایک نہ رک سکنے والی عجیب سیلابی طاقت کو ابھرتے ہوئے محسوس کیا۔ یہ پہاڑی کی مہک تھی۔ ایک سبزے کی مخصوص مہک جو میرے بچپن میں گھاس کے میدانوں میں پلی بڑھی تھی اور جسے میں شہر کے شور و شغف میں بالکل بھول چکا تھا۔ مجھ پر دھرتی ماں کی آغوش میں ایک لوری کے ساتھ غنودگی طاری ہونے لگی۔ آخر کہاں سے زمین کی یہ جنگلی مہک، خوشبوؤں میں سے خالص ترین خوشبو آ رہی ہے؟ میری انگلیوں نے بڑی کرسی کے کونوں کھدروں کو تلاش کرنا شروع کر دیا اور اس طرح ان گنت چھوٹی درازوں کو ڈھونڈ ڈالا اور ان میں خشک نرم سوکھے ہوئے پودوں کو، تڑے مڑے گول نیزوں کی مانند دھات کی وضع کے تیروں کو محسوس کر سکتا تھا۔

ہمارے سبزی خور مبلغ کا کل صحت بخش اسلحہ خانہ، اپنے بڑے بڑے ہاتھوں سے جنگلی پودے اکھٹے کرنے والے سیلابی سینٹ کرسٹوفر کی گزری ہوئی زندگی کا مکمل ریکارڈ۔ جب اس راز سے پردہ اٹھ گیا تو میں مطمئن ہو کر باغ کی جڑی بوٹیوں کی مہک کی حفاظت میں سو گیا۔

کئی ہفتے میں (Don Zoilo) ڈان زوئیلو کے گھر کی دوسری سمت والپاریزو کی ایک تنگ گلی میں رہائش پذیر رہا۔

ہمارے گھروں کی بالکونیاں ایک دوسرے کو چھوتی تھیں۔ میرا ہمسایہ ایک راہب کی مانند صبح سویرے بالکونی پر باہر آتا اور اپنی پسلیوں کے پنجر کو نمایاں کر کے ورزش کرتا۔ غریبانہ لباس میں ملبوس، جو عموماً ملاحوں کا ایک پھٹا پرانا اوور کوٹ ہوتا جیسا کہ وہ عرصہ ہوا سمندری مہمات کے بعد جہاز اور کسٹم کی نوکری سے ریٹائر ہو چکا تھا۔ اتوار کے دن پہننے والے سوٹ کو وہ باقاعدگی سے ہر صبح نہایت سلیقے سے برش کرتا۔ یہ سیاہ فلالین کا ایک خوبصورت سوٹ تھا، لیکن جسے میں نے کبھی بھی اسے پہنے ہوئے نہ دیکھا ایک ایسا لباس، جسے اس نے ہمیشہ اپنے کپڑوں کی الماری میں موجود دوسرے نوادرات میں شامل کئے رکھا۔

اس میں سب سے عزیز دولت ایک (Stradivarios) اپنے اطالوی موجد (اسٹراڈی وری) کے نام سے موسوم ایک قسم کا وائلن تھا۔ جسے اس نے ساری زندگی بے حد چاہت سے دیکھا لیکن نہ خود کبھی اسے بجایا اور نہ کسی دوسرے کو اس بات کی اجازت دی۔

ڈان زوئیلو اس ساز کو نیویارک میں بیچ کر اپنی قسمت بنانا چاہتا تھا کبھی کبھار وہ اسے اپنی عمر رسیدہ الماری میں سے نکال کر باہر لاتا اور ہمیں اسے دیکھنے کا موقع فراہم کرتا۔

کسی دن ڈان زوئیلو بغیر وائلین کے شمال کی طرف نکل جاتا اور بھڑکدار انگوٹھیاں پہنے اور

سونے کے دانتوں سے جبڑے کی ان خالی جگہوں کو پر کئے واپس پلٹتا، جو گزرتے ہوئے وقت نے اسے عطا کی تھیں۔

ایک صبح وہ اپنی بالکونی کی ورزش گاہ میں نہ آیا۔ ہم نے اسے پہاڑی کے اوپر قبرستان میں اس کے سیاہ سوٹ میں، جس نے اس راہب کی ہڈیوں کو پہلی بار ڈھکا، دفن کر دیا۔ اس کے ساز کے تار اس کے رخصت ہونے پر نہ روئے۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ اسے کیسے بجایا جائے علاوہ ازیں جب کپڑوں کی الماری کو کھولا گیا تو وائیلن وہاں موجود نہ تھا۔ شاید وہ سمندر کی جانب یا ڈان زویلو کے خوابوں کی تاج پوشی کے لئے نیویارک کی سمت اڑ گیا تھا۔

ایک خفیہ بل کھایا ہوا والپاریزو، جہاں غربت اس کی پہاڑیوں پر جھرنوں کی طرح ابلتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ لوگوں کی ان گنت تعداد پہاڑیوں پر کیا کھاتی ہے اور کیا پہنتی ہے (اور یہ بھی کہ وہ کس قدر نہیں کھاتے اور کیوں نہیں پہنتے) ہر گھر کے باہر سوکھنے کے لئے دھلے ہوئے لٹکتے ہوئے کپڑوں کے پرچم اور ننگے پیروں کے جھمگٹے جو لحظہ بہ لحظہ زیادہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور نہ بجھنے والی محبت کو دھوکا دیتے ہیں۔

سمندر کے قریب مسطح زمین پر بالکونیوں والے گھر میں، جن کی کھڑکیاں بند ہیں اور جہاں کبھی بھی قدم اندر داخل نہیں ہوتا، مہم جو کا محل انہی گھروں میں سے ایک تھا۔ میں نے اس یقین کے ساتھ دروازے پر موجود کانسی کے کھٹکے کو مسلسل دستک دی کہ آواز سن لی جائے گی۔ بالآخر نرم رو قدم دروازے تک پہنچے اور ایک حیران کن مشکوک نظروں والے چہرے نے مجھے اندر داخل ہونے سے روکتے ہوئے دروازے کو ایک جھری کی حد تک کھولا۔ یہ گھر کی ایک بوڑھی خادمہ تھی۔ شال اور ایپرن میں چھپا ہوا ایک سایہ، جس کے قدموں کی آواز محض سرگوشی کی مانند تھی مہم جو، جو خاصا بوڑھا تھا، خادمہ کے ساتھ بند کھڑکیوں والے اتنے بڑے گھر میں تن تنہا رہتا تھا، میں وہاں اس کے نوادرات کے مجموعے کو دیکھنے آیا تھا۔

غلام گردشیں اور دیواریں، بھڑکیلے سرخ رنگ کی اشیا سے بھری ہوئی تھیں۔ سبز اور سلیٹی دھاریوں والے نقاب، نابود ہو چکے۔ سمندری دیوتاؤں کے مجسمے، پولی نیشین بالوں کی سوکھی ہوئی وگیں، چیتے کی کھال سے مڑھی ہوئی لکڑی کی ڈھالیں، خوفناک دانتوں کی مالائیں، چپو، جو نہ جانے کتنے پانیوں کے دھاروں کو کاٹ چکے ہوں گے، دیواروں پر نقرئی پھلوں والے دہشتناک چاقو، جو سایوں میں چمک اٹھتے تھے میں نے غور کیا کہ لکڑی کے جنگجو دیوتا خصی ہو چکے تھے۔ ان کے اعضائے تناسل احتیاط کے ساتھ لنگوٹ کے کپڑے سے ڈھکے ہوئے تھے، اور یقیناً یہی کپڑا، خادمہ اپنے لئے بطور شال یا ایپرن کے استعمال کرتی تھی۔ پرانا مہم جو اپنے انعامات کے درمیان

ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھرا اور مجھے وضاحتوں سے نوازا، جن میں سے نصف طنز میں اور نصف حق شفاع کے طور پر کسی کے بارے میں، جو اپنی شبیہوں کی لو میں ایک خاصا وقت گزار چکا ہو۔ اس کی سفید بکری نما داڑھی (Samoan) ساموں کے دیوتا جیسی تھی۔ اس نے اپنی وہ شکاری پستولیں بھی مجھے دکھائیں، جن سے وہ کئی شیروں اور ہرنوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔

اپنی آواز کو بدلے بغیر وہ اپنی مہمات کے بارے میں بولتا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ بند کھڑکیوں میں کہیں سے سورج کی روشنی اندر آگئی ہے، صرف ایک ننھی سی کرن کو چھوڑنے کے لئے۔ ایک ننھی منی جاندار تتلی، جو دیوتاؤں کے مابین تھرکتی تھی۔

واپس چلتے ہوئے میں نے جزائر جانے کے بارے میں اپنے پروگرام کا ذکر کیا۔ سنہری ساحلوں کے لئے میرا جلد ہی پابہ رکاب ہونے کا تجسس تب، اپنے اردگرد بغور دیکھتے ہوئے اس نے اپنی مونچھوں کو میرے کانوں سے لگایا اور کانپتے ہوئے بولا۔

"خادمہ کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہئے، لیکن میں اس سفر کے لئے تیار ہو رہا ہوں"

ایک لمحے کے لئے وہ وہیں کھڑا ہو گیا اپنی ایک انگلی کو ہونٹوں پر رکھے ہوئے جیسے وہ جنگل میں کسی شیر کے قدموں کی چاپ کو سن رہا ہو اور تب اچانک تیزی سے اس پر دروازہ بند ہو گیا بالکل جیسے افریقہ کے براعظم پر رات اتر آئے۔

میں نے ہمسایوں سے سوال کیا "کیا یہاں کچھ نئے خبطی موجود ہیں؟ کیا وا لہدیزوں میں واپس آنا مناسب ہو گا؟

ان لوگوں نے جواب دیا "کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے" لیکن اگر تم اس گلی میں آگے جاؤ گے تو (Don Bartolome) ڈان بارٹولوم تمہیں مل جائے گا

"لیکن کس طرح میں اسے پہچانوں گا"؟

"غلطی کی کوئی گنجائش نہیں، وہ ہمیشہ شاندار گاڑی میں سفر کرتا ہے"

کچھ گھنٹوں کے بعد، جب میں ایک پھلوں کی دکان میں سیب خرید رہا تھا تو ایک گھوڑا گاڑی دروازے پر آکر رکی اور ایک طویل القامت شخص سیاہ لباس میں ملبوس اس سے نیچے اترا۔ وہ بھی سیب خریدنے آیا تھا۔ اس کے ایک کندھے پر سبز رنگ کا طوطا تھا، جو فوراً وہاں سے اڑ کر مجھ پر آیا اور بغیر دیکھے میرے سر پر ٹھونگ ماری

میں نے اس شخص سے سوال کیا "کیا تم ہی ڈان بارٹولوم ہو؟"

"بالکل صحیح میرا نام بارتولوم ہے" اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی لمبی تلوار کو لبادے کے نیچے سے نکال کر مجھے تھما دیا جبکہ اس اثنا میں اس نے اپنی ٹوکری کو سیبوں اور انگوروں سے جنہیں وہ خریدنے آیا تھا، بھر لیا تھا

یہ ایک قدیم تلوار تھی، لمبی اور تیز دھار جس کا قبضہ ماہیر کاریگروں نے تیار کیا تھا بالکل ایک کھلے ہوئے گلاب جیسا

میں اسے نہیں جانتا تھا اور نہ ہی کبھی بعد میں اسے دیکھا۔ لیکن گلی میں، میں اس کے ہمراہ بے حد مودب ہو کر چلا، خاموشی سے میں نے اس کی گاڑی کا دروازہ کھولا اور اس کے پھلوں کی ٹوکری کو اندر رکھتے ہوئے نہایت احترام کے ساتھ اس کی تلوار کو اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور طوطے کو واپس لوٹا دیا۔

والپاریزو کی مختصر دنیائیں، جنہیں غیر منصفانہ طور پر نظرانداز کر دیا گیا تھا، وقت کے پیچھے رہ گئی تھیں، گودام میں کہیں کونوں میں رکھی ہوئی ان متروک پیٹیوں کی مانند، جن کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ یہ کہاں سے آئی ہیں انہیں کہاں جانا ہے بلکہ یہ وہ پیٹیاں ہیں جو کہیں بھی نہ جائیں گی شاید ان ہی خفیہ دنیاؤں میں والپاریزو کی ان روحوں میں ایک گمشدہ رہ جانے والی قوت، طوفان، نمک، سمندر جو اچھلتا ہے اور گنگناتا ہے، موجود تھا ایک دہلا دینے والا سمندر ہر شخص کے اندر بند تھا۔

ایک غیر مربوط آواز۔ ایک الگ کی گئی حرکت، جو خوابوں کے آٹے اور جھاگ میں تبدیل ہو جاتی تھی۔

میں ششدر تھا کہ وہ خبطی زندگیاں، جو میں نے دریافت کیں، وہ اس بندرگاہ کی جاں گسل زندگی کا ناگزیر حصہ تھیں۔

اوپر پہاڑیوں پر غربت، خوشی اور دکھ کے وحشیانہ جھٹکوں میں پنپتی ہے۔ انسانوں کے کام خوشیوں کے نقاب سے جو آتی جاتی رہتی ہے، بندرگاہ کو ڈھکتے تھے لیکن دوسرے ملازمتوں کے لئے کبھی بھی نہ پہاڑی کی بلندی تک جا سکے نہ گہرائی میں نیچے۔ انہوں نے اپنی لامحدود دنیا کو اپنے حصے کے سمندر کو اپنے اپنے صندوقوں میں بند کر رکھا تھا۔ اور وہ اس سب کو جو ان کے پاس تھا دیکھتے تھے جبکہ نامعلوم ان پر دھند کی طرح چھایا ہوا تھا۔

کبھی کبھار والپاریزو ایک زخمی وھیل کی طرح بل کھاتا ہے، وہ ہوا میں اچھلتا ہے عذاب میں مر جاتا ہے اور دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔ شہر کا ہر باسی اپنی یاد میں ایک زلزلے کو لئے پھرتا ہے۔ وہ خوف کی پتی کی مانند تمام زندگی شہر کے قلب سے چمٹا ہوا ہے۔

ہر شخص اپنے پیدا ہونے سے پہلے ہی ایک ہیرو ہے۔ کیونکہ بندرگاہ کی یاد میں بذات خود شکست ہے، زمین کا لرزنا جیسے کہ زلزلے میں ہوتا ہے اور زیر زمین سے سطح پر آجانا جیسے سمندر کی تہہ میں کوئی شہر ہو۔ سطح زمین کے نیچے، مدفون میناروں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں جیسے انسانوں کو بتانے کے لئے کہ سب تمام ہو چکا

کبھی دیواریں اور چھتیں جو چیخوں اور سکوت میں، شعلوں اور خاک میں زمین بوس ہوئیں۔ جب ہر شے ہمیشہ کے لئے موت کے ہاتھوں خاموش ہو گئی تب سمندر سے روز حشر کی مانند ایک پہاڑ جیسی لہر اٹھتی ہے، وسیع و عریض سبز ہاتھ بلند اور کمینہ خو ابھرتا ہے انتقام کے مینار کی طرح تاکہ باقی ماندہ زندگی پر جو اس کی پہنچ میں آجائے، جھاڑو پھیر دے کبھی یہ سب ایک مجسم حرکت سے شروع ہوتا اور خوابیدہ لوگ اٹھ جاتے سوئی ہوئی حالت میں روح گہرائی کی انتہاؤں تک پہنچ جاتی ہے۔ اس نے ہمیشہ یہ جاننا چاہا ہے اور اب جانتی ہے اور تب اس عظیم گڑگڑاہٹ میں بھاگنے کے لئے کوئی جگہ نہیں کیونکہ دیوتا جا چکے ہیں۔ عظیم الشان کلیسا مٹی کے ڈھیر میں ڈھل گئے ہیں۔

یہ غضبناک بیل سے یا دھمکانے والے چاقو یا پانی سے جو سب کچھ نگل جاتا ہے۔ جان بچا کر بھاگنے کا خوف نہیں یہ ایک کانٹا تو خوف ہے ایک لمحاتی خوف جیسے کائنات پھٹ رہی ہو اور بکھر رہی ہو اور اسی اثنا میں زمین ایک ڈھکی ہوئی گڑگڑاہٹ کی آواز نکالتی ہے ایک ایسی آواز جو اس سے پہلے کسی نے نہ سنی ہو۔ زمین پر گرے ہوئے گھروں کی مٹی آہستہ آہستہ بیٹھتی ہے اور ہم اپنے مرے ہوئے عزیزوں کے ساتھ تنہا رہ جاتے ہیں۔ تمام مرے ہوؤں کے ساتھ یہ نہ جانتے ہوئے کہ ہم کیونکر زندہ ہیں۔

سیڑھیاں نیچے اور اوپر سے شروع ہوتی ہیں۔ بل کھاتی ہوئی، جوں جوں یہ اوپر جاتی ہیں اور بالوں کے گچھوں کی مانند کم ہوتی جاتی ہیں اور یوں آپ کو ایک وقفہ سا ملتا ہے، پھر یہ سیدھی ہو جاتی ہیں۔ یہ دھندلاتی ہیں، نیچے ڈوبتی ہیں باہر کو نکل آتی ہیں۔ واپس مڑتی ہیں اور کبھی ختم نہیں ہوتیں کتنی سیڑھیاں؟ سیڑھیوں تک کتنے قدم؟ اور ان پر کتنے پاؤں؟ کتنی صدیوں کے قدم اوپر نیچے جاتے ہوئے کتاب، ٹماٹر، مچھلی بوتلیں روٹی اٹھائے ہوئے؟ کتنے ہی ہزاروں گھٹنوں نے ان قدموں کو ننھی نالیوں میں منتقل کرتے ہوئے خستہ کر دیا، جہاں کھیلتی اور چیختی ہوئی بارش نیچے کی طرف بہتی ہے۔

کسی اور شہر نے والپاریزو کی طرح انہیں نہ چھلکایا نہ پتیوں کی طرح خود اپنی تاریخ میں بکھیرا نہ اپنے چہرے پر نہ انہیں ہوا میں اچھال کر دوبارہ اکٹھا کیا۔ سیڑھیاں جنہوں نے اپنی چڑھائی کے وسط میں کاسنی پھولوں کو جنم دیا سیڑھیاں جن سے ایشیا کا ملاح اپنے گھر میں محض ایک نئی مسکراہٹ

یا خوفناک غیر حاضری دیکھنے گیا۔ سیڑھیاں جن سے ایک لڑکھڑاتا ہوا شرابی سیاہ شہاب ثاقب کی مانند گر گیا۔ سیڑھیاں جن پر چڑھ کر سورج پہاڑوں سے محبت کرتا ہے۔ اگر ہم والپاریزو کی سیڑھیوں پر اوپر نیچے چلتے جائیں تو ہم دنیا کا ایک چکر لگالیں۔

میرے دکھوں کا والپاریزو ......! جنوبی بحرالکاہل کی تنہائی میں کیا ہوا؟ آوارہ ستارہ یا جگنوؤں کی جنگ، جن کی جگمگاہٹ اس تباہی میں باقی رہی؟ والپاریزو کی رات ــــ سیارے پر روشن ایک نقطہ۔ ویران کائنات میں اس قدر ننھا ــــ جگنو چمکے اور کسی گھوڑے کے آتشیں نعل نے پہاڑوں میں چلنا شروع کر دیا۔

پھر اس وسیع ویران رات نے اپنے عظیم ہیولوں کی تنظیم کو اکٹھا کیا جس نے دور دراز تک روشنی کو پھیلا دیا۔

(Aldebaran) البدیران بلندی پر کپکپاتے ہوئے لرز اٹھا (Cassiopeia) نے اپنا لباس، جنت کے دروازے پر لٹکا دیا جبکہ جنوبی صلیب کا نہ شور کرنے والا، رتھ رات کی روشن کہکشاں پر رواں رہا۔ پھر بالوں والے پیچھے کو ہٹتے ہوئے Sagittarius نے بہت بلندی سے کچھ گرایا، اپنے سموں میں چھپایا ہو کوئی ہیرا یا اپنے بالوں بھری کھال سے ایک پسو

والپاریزو چمکدار گنگناتا ہوا جھاگ اور روشنیوں کے ہمراہ پیدا ہوا تھا۔ رات اپنی تنگ گلیوں میں سیاہ آبی جل پریوں سے بھری ہوئی تھی۔ دروازے تاریکی میں منتظر تھے۔ ہاتھوں نے تمہیں اندر کھینچا۔ جنوب میں بستر کی چادروں نے ملاح کو بے راہ کیا۔

پولی انیتا (polyanta) ٹرائی ٹی ٹونگا (Tritetonga) کارمیلا (Cormela) فل ورڈی ڈیاس (Florde Dios) ملٹی کولا (Multicula) بیری نیس (Berenice) بے بی سوئیٹ Baby Sweet) ان سب نے بندر کے شراب خانوں کو بھر دیا۔ وہ ان لوگوں کا "جو ہذیان کے بحری جہاز کی تباہی کے بعد بچ گئے تھے" خیال کرتے ہوئے میرے بارش زدہ لوگوں کی دھن پر ایک دوسرے کی جگہ لیتے ہوئے رقص کرتے رہے۔

مضبوط ترین وہیل کے شکار میں استعمال ہونے والے بحری جہازوں نے لیواتھان کو زیر نگیں کرنے کے لئے بندر گاہ کو خیرباد کہا۔ دوسرے جہاز کیلی فورنیا اور سونے کے لئے نکل پڑے۔ ان میں سے آخری نے سات سمندروں کو عبور کیا تاکہ چلی کے صحراؤں سے نائٹریٹ کے ڈھیر کو اکٹھا کریں، جو شکستہ بت کی بے وقت راکھ کی مانند دنیا کے اس خشک منطقے میں پھیلی ہوئی ہے ــــ یہ بڑی مہمات تھیں

والپاریزو دنیا کی رات کے روبرو جگمگا اٹھا

دنیا سے آنے والے اور دنیا کی طرف جانے والے .بحری جہاز کے بجائے کبوتروں کی مانند چلے۔ میٹھے خوشبودار جہاز، سامان بردار بھوکے بحری جہاز، جو کیپ ہارن پر بہت دیر تک رکے رہے تھے ...... بہت سے حالات میں کسی بھی بندر گاہ تک پہنچنے والے مردوں نے خود کو گھاس پر گرا دیا۔ غضبناک اور حیران کن دن، جب سمندر ایک دوسرے سے دور دراز کی (Patagonian Bey) آبنائے پٹیاگونین میں ملتے تھے۔

وہ زمانے تھے جب والپاریزو اپنے اس عملے کو جو اس سے پیار کرتے تھے اور اس پر تھوکتے تھے، معقول رقم دیتا تھا

کسی جہاز سے ایک عظیم الشان پیانو پہنچا، کسی دوسرے جہاز سے (Gauguin) گاگین کی پیرو والی دادی فلورا ٹرسٹن (Flora Tristan) کسی اور جہاز سے حقیقی رابن سن کروسو آیا جسے حال ہی میں جان فرنانڈیز کے جزائر سے پکڑا تھا، دوسرے جہاز سماٹرا سے انناس، کافی، سیاہ مرچیں (Guayaqul) گویاکل سے کیلے آسام سے یاسمین چائے، اسپین سے سونف دور دراز کی ایک آبنائے (Centaur) سینتار کے زنگ آلود نعل جیسی، خوشبو کے جھونکوں سے بھری ہوئی تھی۔

ایک گلی میں دار چینی کی مٹھاس آپ کو قابو میں کرتی تو دوسری گلی میں سیبوں کی مہک آپ کے وجود میں سے تیر کی مانند نکل جاتی۔ چلی کے سمندر کی بیکراں وسعتوں سے سمندری گھاس آپ کو للکارتی چلی آتی۔ تب والپاریزو روشن ہوتا ہے اور گہرا طلسمی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ بتدریج یہ سمندر سے ایک نارنگی کے درخت میں بدل جاتا ہے، جس کی پتیاں تھیں، خنکی اور سایہ تھا اور جو پھلوں سے لدا ہوا تھا۔

والپاریزو کی پہاڑیوں نے اپنے باشندوں کو بے گھر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تاکہ بلندی کے گھر ویسے ہی رہ جائیں اور وہ سرخ مٹی کی چٹانوں سے لٹکتے رہیں، جو سنہری پھولوں کے باعث زرد لگتی تھیں اور خود رو سبزے کی وجہ سے گہری سبز۔ لیکن گھر اور ان کے مکین بلندیوں سے چمٹے ہوئے۔ ان میں گڑے ہوئے کپکپاتے ہوئے، پریشان، ان کے دل بلندیوں پر رہنے کے خواہاں چٹانوں کو دانتوں سے پکڑے ہوئے۔

بندر گاہ، سمندر اور فطرت کے مابین ایک رسہ کشی ہے، جو کورڈی لیراز پر جا کر بالکل وحشی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ انسان تھا، جس نے بتدریج جنگ جیتی، پہاڑیوں اور سمندر کی وسعت نے شہر کو ترتیب دیتے ہوئے، بارکوں کے بجائے، بہار کے گوناگوں رنگوں اور اس کی لطیف گنگناہٹ کے ساتھ ایک نئی صورت بخشی گھر رنگوں، میں ڈھل گئے۔ ارغوانی اور زرد، کانسی اور تانبے کا رنگ سبز

اور گلابی، رنگوں کی آمیزش اور والپاریزو ایک حقیقی بندر گاہ کے طور پر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

ایک بہت بڑا بحری جہاز، جو زمین پر چڑھ گیا لیکن ابھی تک زندہ ہے جہازوں کا ایک بیڑہ، جن کے جھنڈے ہوا کے رخ پر ہیں، بحرالکاہل کی ہوا، جو جھنڈوں سے بھرے ہوئے شہر کے لئے متقاضی تھی۔ میں ان مہکتی ہوئی زخمی پہاڑیوں میں رہا ہوں۔ یہ لاتعداد پہاڑیاں جہاں زندگی سانپ کی مانند ان گنت بل کھاتی اور بگل کے حلقوں کی طرح مڑتی ہوئی۔ کچی غریب بستیاں دل کو آرزدہ کرتی ہیں، انہی موڑوں پر سے آپ کے لئے ایک نارنجی رنگ کا میری گوراؤنڈ منتظر ملے گا۔ ننگے پیر چلتی ہوئی ایک لڑکی، جس کا چہرہ تربوز میں چھپا ہو گا ملاحوں اور عورتوں کے جمگھٹے۔ ٹین کی زنگ خوردہ چادر کا بنا ہوا ایک اسٹور۔ ایک ننھا سا سرکس، جس کا پنڈال جانوروں کو سدھارنے والے کی مونچھوں جتنا بڑا ہو گا۔ بادلوں کی جانب جاتی ہوئی ایک سیڑھی۔ پیازوں سے بھری ہوئی اوپر کو جاتی لفٹ بلندی کی طرف پانی لے جاتے ہوئے سات گدھے۔ آگ لگنے والی عمارت سے واپس آتی ہوئی فائر بریگیڈ کی گاڑی۔ اسٹور کی کھڑکی اور اس میں سے نظر آتا بوتلوں کا ایک ڈھیر زندگی اور موت کو لئے ہوئے

لیکن ان پہاڑیوں کے بے شمار نام ہیں، جن کے مابین سفر کبھی ختم نہیں ہوتا، کیونکہ والپاریزو میں سے سفر نہ زمین پر ختم ہوتا ہے اور نہ ہی دنیا میں۔ میری ہل، بٹرفلائی ہل، پولانگو ہل، ہسپتال، لنٹل ٹیبل ہل، موڑ، سمندر، ہالنگ ٹیکل، پائرز، شیپارو، فرن، لٹر، ونڈھل، آلمنڈ گروو، پیکوسین، شرکیٹز، اکیس وڈو، اسٹرا، جیل خانہ، وکسینز، ڈونا الویرا، سینٹ اسٹیفن، اسٹور گا، ایمرالڈ، آلمنڈ ٹری، راؤر گوئز، آرنلڈی، ملک مین، امیکولیٹ کنیپشن ھل، سیمینری ھل، تھیل، لیفی ٹری، انگلش ہسپتال، پام ٹری، کوئین وکٹوریہ، کاراوالو، سینٹ جان آف گاڈ، پوکورو کوو ھل، گوٹ ھل، بس کین ھل، ڈان ایلیزا، کیپ، شوگر کین ھل، بک آؤٹ ھل، پاری ساھل، کونٹین، آکس، فلاور

میں اتنی جگہوں پر نہیں جا سکتا

والپاریزو کو ایک نئے سمندری عفریت کی احتیاج ہے، جس کی آٹھ ٹانگیں ہوں ایک جس کی مدد سے وہ ان سب سے نمٹ سکے۔ میں اس کی بہت دور تک کی وسعت کو بیان کرتا ہوں اس کی مانوس وسعت لیکن پھر بھی میں اس کے تمام رنگدار دائیں حصے کو قابو میں نہیں کر سکتا۔ اور سبز باغات سے بھرا ہوا اس کا بایاں حصہ۔ اس کی چوٹیاں اور اس کی گہرائیاں، میں، محض اس کی گھنٹیوں کے پیچھے چل سکتا ہوں، اس کی لہریں اور اس کے نام

اس سب پر مستزاد اس کے ناموں ہی میں ہے، کیونکہ یہی اس کی جڑیں ہیں اور چھوٹی جڑیں۔ یہ ہوا ہیں اور یہی مٹی یہ تاریخ ہیں اور یہی غنائی تمثیل اور انہی کے حروف میں سرخ خون بہتا ہے۔

چلی کا قونصل ایک سوراخ میں

اسکول میں ادبی انعام، نئی کتابوں کے باعث کچھ مقبولیت اور میری رسوائے زمانہ کندھے پر پڑی بے آستین کی قبا (Cape) نے مجھے فنکاروں کے حلقوں میں ایک تھوڑی سی عزت کی رمک عطا کر دی تھی لیکن صدی کی دوسری دہائی میں ثقافتی زندگی ہمارے ممالک میں بطور خاص چند غیر معمولی اور بے مثال مستثنیات کے، یورپ پر انحصار کرتی تھی۔

ایک کوسموپولیٹن دانشور ہماری ہر جمہوریہ میں بر سر پیکار تھا۔ اور وہ مصنفین جو بر سر اقتدار طبقے سے تعلق رکھتے تھے پیرس میں رہا کرتے تھے۔

ہمارا بڑا شاعر (Vicente Huidobro) وی سینٹی هیوڈوبورو، جس نے نہ صرف فرانسیسی زبان میں طبع آزمائی کی بلکہ اپنا نام بھی وی سینٹی سے ونیسنٹ کر لیا تھا مجھے بھی جونہی نوجوانی میں ذرا سی شہرت ملنے لگی تو لوگوں نے مجھ سے پوچھنا شروع کر دیا۔

"بھئی تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں فوراً پیرس جانا چاہئے"

ایک دوست نے وزارت خارجہ کے ایک افسر اعلیٰ سے میرے لئے بات کی، جس نے مجھے ملاقات کے لئے بلا بھیجا۔ یہ افسر میری نظموں کے بارے میں جانتا تھا۔

"میں تمہارے ارادوں سے واقف ہوں۔ اس آرام کرسی میں آرام سے بیٹھ جاؤ یہاں سے تم چوک میں ہونے والے میلے کو بخوبی دیکھ سکتے ہو۔ ان گاڑیوں کو دیکھو یہ سب دکھاوا ہے۔ تم ایک خوش نصیب نوجوان شاعر ہو۔ کیا تم اس محل کو دیکھتے ہو؟ کبھی یہ میرے خاندان کی ملکیت تھا اور اب میں یہاں اس دفتر میں افسرانہ زندگی میں غرق ہوں۔ بس روحانی چیزیں ہی سب کچھ ہیں۔ کیا تم (Tchaikovsky) کو پسند کرتے ہو؟" فنون پر تقریباً ایک گھنٹہ گفتگو کے بعد اس نے مجھے الوداع کرتے ہوئے ہاتھ ملایا اور پریشان نہ ہونے کا مشورہ دیا۔ وہ قونصل خانے کی ملازمت کا سربراہ تھا "اب تم خود کو بیرون ملک ملازمت کے لئے منتخب سمجھو"

دو سال تک وقتاً فوقتاً میں اس کے دفتر کے چکر لگاتا رہا اور ہر بار وہ پہلے کی طرح چاپلوس نظر آیا۔ جونہی وہ مجھے دیکھتا تو فوراً ہی اپنے کسی سیکرٹری کو بلا کر اپنی بھنوں کو چڑھاتے ہوئے کہتا میں یہاں کسی کے لئے نہیں ہوں۔ میں ہر روز کی نثر کو بھولنا چاہتا ہوں۔ اس وزارت کی واحد

روحانی بات اس شاعر کا ہمارے آنا جانا ہے، مجھے امید ہے کہ یہ ہمیں کبھی فراموش نہ کرے گا۔

مجھے یقین ہے کہ وہ خلوص سے بولتا، لیکن اس کے فوراً ہی بعد وہ اعلیٰ نسل کے کتوں کا ذکر شروع کر دیتا۔ "کوئی شخص جو کتوں سے پیار نہیں کرتا وہ بچوں سے محبت نہیں کرتا" وہ انگریزی ناول کا ذکر چھیڑ دیتا پھر علم الانسان پر چھلانگ لگاتا اور روحانیات کی باتیں کرنے لگتا اور اپنی گفتگو کو حسب نسب اور طمطراق پر ختم کر دیتا

جب میں اس سے اجازت لیتا تو وہ ایک بار پھر ایسے دہراتا، جیسے میرے اور اس کے مابین کوئی خفیہ معاہدہ ہو، کہ میرا بیرون ملک جانا قطعی بات ہے۔ حالانکہ میرے پاس اس زمانے میں کھانے کے لئے زیادہ پیسے نہ ہوتے تھے۔ مگر میں شام کو ایک سفارت کار کی مانند سانس لیتے ہوئے نکلتا، اور جب میرے دوست میرے ارادوں کے بارے میں مجھ سے سوال کرتے تو میں بن کر کہتا "میں اپنے یورپ کے دورے کے بارے میں سرگرم عمل ہوں" یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا، جب تک میری ملاقات اپنے دوست (Bianchi) بیانکی سے نہ ہوئی۔ بیانکی چلی کا شریف خاندان ہے، مصور، مقبول موسیقار، مصنفین، ادیب، مہم جو اور اینڈیز پر چڑھنے والے سب حضرات بیانکی کے نام کے ساتھ تیز ذہانت اور ایک بے چینی کی کیفیت کو منطبق کرتے تھے۔

میرے دوست نے جو خود سفیر رہ چکا تھا اور وزارتوں کے اندرونی اور بیرونی طریق کار سے واقف تھا، مجھ سے پوچھا

"کیا ابھی تک تمہاری ملازمت کی تقرری نہیں آئی؟"

کسی بھی لمحے وہ مجھے مل جائے گی، کیونکہ وزارت ثقافت کے سربراہ نے مجھے اس کا یقین دلایا ہے"

وہ ہنسا اور کہنے لگا "چلو وزیر سے چل کر ملتے ہیں"

اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور ہم سنگ مرمر کے زینے پر چڑھتے ہوئے اوپر چلے گئے۔ چپڑاسی اور دوسرے اہلکار ہمارے راستے سے ہٹ گئے، میں مبہوت تھا جیسا کہ میں اپنے وزیر خارجہ سے ملنے والا تھا وہ خاصا پست قامت تھا اور اس بات کو چھپانے کی خاطر وہ اپنے ڈیسک پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے دوست نے ذکر کیا کہ میں چلی چھوڑنے کے لئے کتنا بے چین ہوں۔ وزیر نے اپنی بہت سے گھنٹیوں میں سے ایک کو بجایا اور میری حیرت میں اضافہ کرتے ہوئے، میرا روحانی محافظ اچانک ظاہر ہو گیا۔

"مثالی کارکن نے جو (Tchaikovsk) کو اب نہیں لا سکتا تھا دنیا میں پھیلے ہوئے مختلف

ممالک کی ایک فہرست سنا دی۔ لیکن میں محض ایک نام کو سمجھ سکا، جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہ سنا تھا، اور نہ پڑھا تھا رنگون:

"پابلو، تم کہاں جانا چاہتے ہو؟ وزیر نے مجھ سے سوال کیا"

"رنگون" میں نے ہچکچائے بغیر جواب دے دیا

اسے فوراً تقرری کا پروانہ دو۔ وزیر نے میرے محافظ کو حکم دیا، جو فوراً باہر چلا گیا اور کچھ ہی دیر میں میری تقرری کے احکامات کے ساتھ واپس آ گیا۔ وزیر کے دفتر میں ایک گلوب رکھا ہوا تھا۔ میرا دوست بیانکی اور میں اس پر نامعلوم شہر رنگون کو ڈھونڈتے رہے پرانے نقشے میں ایشیا کے منطقے میں ایک گہرا گڑھا پڑا ہوا تھا اور یہی گڑھا، جسے ہم نے بعد میں دریافت کیا رنگون تھا۔ یہ رنگون ہے" لیکن جب کچھ دیر بعد، میں اپنے شاعر دوستوں سے ملا اور انہوں نے میری تقرری کے لئے جشن منانا چاہا تو میں اس شہر کا نام بالکل بھول چکا تھا، خوشی سے پاگل ہوتے ہوئے میں صرف یہ بتا سکا کہ بحیثیت قونصل کے شاندار مشرق میں کہیں تعینات کیا گیا ہوں اور وہ جگہ جہاں مجھے بھیجا گیا ہے وہاں نقشے میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہے۔

مونٹپارینسی (Montparnasse)

۱۹۲۷ء میں جون کے ایک دن ہم دور دراز کے علاقوں کے لئے چل نکلے (Buen osaires)

بیونس آئرز میں ہم نے اپنے فرسٹ کلاس کے ٹکٹوں کو تھرڈ کلاس کے دو ٹکٹوں میں تبدیل کرایا اور بیڈن بحری جہاز پر سفر شروع کر دیا اس جرمن جہاز پر ایک ہی درجہ تھا، لیکن وہ یقیناً پانچواں درجہ تھا۔ کھانے کے دو اوقات تھے۔ ایک مرتبہ ہسپانوی اور پرتگیزی آباد کاروں کو جتنا جلدی ہو سکتا کھلایا جاتا اور دوسری نشست میں باقی ماندہ ہر کس و ناکس کو جن میں بطور خاص لاطینی امریکہ کی کانوں اور فیکٹریوں سے واپس جاتے ہوئے جرمن مسافر ہوتے میرے ساتھی (Al varo) الوارو نے فوراً ہی خاتون مسافروں کی درجہ بندی کر لی تھی۔ وہ بہت ہی مشاق، دل پھینک عاشق واقع ہوا تھا۔ وہ عورتوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا — ایک وہ، جو مردوں کا شکار کرتی ہیں اور دوسرے، جو ہنٹر کی اطاعت کرتی ہیں — یہ فرق ہمیشہ منطبق نہ ہوتا تھا اس کے پاس عورتوں کی ہمدردی بٹورنے کے لئے ہمیشہ نت نئی ترکیبیں ہوتیں۔ جب کبھی ان دلچسپ خواتین کا کوئی جوڑا عرشے پر نمودار ہوتا تو وہ فوراً مجھے ہاتھ سے پکڑ کر گھسیٹتا اور میری ہتھیلی کو مشاقانہ انداز میں پراسرار نظروں اور اشاروں کے ساتھ پڑھنے لگتا۔

دوسری ہی بار تفریح کرنے والی خواتین رک کر اس سے اپنا ہاتھ دیکھنے کی درخواست کرنے

لگتیں اور وہ فوراً ہی ان کے ہاتھوں کو تھام لیتا اور بہت دیر تک ان کے ہاتھ سہلاتا رہتا اور ان کا مستقبل جس کے بارے میں وہ بتاتا ـــــ ہمیشہ ان کے ہمارے کیبن میں آنے پر منتج ہوتا۔ لیکن جلد ہی سفر نے ایک نیا رخ موڑا اور میں نے مسافروں کو دیکھنا بند کر دیا۔

میں نے دنیا اور اکتا دینے والے بحر اوقیانوس کو دیکھنا بند کر کے اپنی آنکھوں کو ایک بے حد سیاہ آنکھوں کی مالک برازیل کی لڑکی پر مرکوز کر دیا جو (Rio-de-Jaeneiro) ریوڈی جنیرو سے اپنے بھائیوں اور والدین کے ہمراہ ہمارے جہاز میں سوار ہوئی تھی۔

ان برسوں کا لاابالی لزبن (Lisbon) گلیوں میں مچھیروں اور کانٹے پر سالازار (مچھلی) کے بغیر مجھے حیران کر دیتا۔ ہمارے چھوٹے سے ہوٹل میں غذا بہت لذیذ تھی۔ پھلوں کے بڑے بڑے خوان میز کی سجاوٹ میں اضافہ بنتے۔ رنگارنگ کے گھر، محرابی دروازوں کے پرانے محل، عفریتی گنبدوں والے کلیسا، جنہیں خدا صدیوں پہلے چھوڑ کر کہیں اور بسنے کے لئے چلا گیا تھا۔ پرانے محلوں میں جوا کھیلنے کے کیسینو، راستوں میں بچوں کے سے تحیر کا ہجوم

پتھروں والے فرش کی گلی میں چلتی ہوئی خالی الدماغ ڈچز آف براگنزا جس کے تعاقب میں گلیوں کے بچوں کا ہجوم ـــــ یہ تھا میرا یورپ میں داخلہ

اس کے بعد میڈرڈ (Madrid) اور اس کے بھرے ہوئے ریستوران، زندہ دل ساتھی (Primode Rivera) پرانمو ڈی راویرا، ایک ایسے ملک کو استبداد کا سبق پڑھاتے ہوئے، جو کہیں بعد میں یہ سب خود سیکھے گا

میری نظموں کے مجموعے (Residencia Enla Tierra) کی پہلی نظم جو ہسپانیوں کو آہستہ آہستہ سمجھ میں آئی، بعد میں جب (Alberti) البرتی (Lorca) لورکا (Aleiyand re) ایلگندار اور (Diego) ڈیگو نمودار ہوئے، تو واضح ہو گئی۔ اور میرے لئے اسپین بھی ایک نہ ختم ہونے والی ریل گاڑی تھی اور دنیا کا افسوسناک تھرڈ کلاس کا ڈبہ جو ہمیں پیرس لئے جا رہا تھا۔

ہم مونتپارینسی کے پرہجوم جلوس میں غائب ہو گئے، جن میں ارجنٹینا، برازیل، چلی، وینزویلا سب ہی ملکوں کے لوگ گومیز کے عہد حکومت میں ابھی ابھرنے کا خواب نہیں دیکھ رہے تھے اور وہاں قدم آدم لبادوں میں ملبوس پہلے ہندو اور میری میز کے قریب میری ہمسائی اپنے ننھے سے ناگ کے ہمراہ جو اس کے گلے کے گرد لپٹا ہوا تھا کریم کافی کو سوگوار انداز میں پی رہی تھی۔

جنوبی امریکہ کے ہمارے ساتھی کونیناک (شراب) پی کر (Tango) ٹینگو رقص میں

مشغول تھے، محض اس خفیف سے موقع کے منتظر کہ شاہی جنگ شروع کر کے آدھی دنیا پر قابض ہو جائیں۔

جنوبی امریکہ کے ہم جیسے قصباتی بوھیمین لوگوں کے لئے پیرس فرانس، یورپ، محض دو سو میٹر کی چوڑی پٹی اور سڑکوں کے چند موڑوں پر مشتمل تھا۔ مونتپارینسی، لا روتونڈو، لی ڈوم، لاکیول اور تین چار دوسرے کیفے سیاہ فام گانے والوں اور موسیقاروں کے ساتھ مقبول ہونا شروع ہو رہے تھے۔

جنوبی امریکہ سے ارجنٹینا کے لوگ امیر ترین اور دنگا فساد کرنے والوں میں آگے آگے تھے۔ کسی بھی وقت جہنم کا سماں پیدا ہو جاتا اور کسی ارجنٹینی کو تین چار ویٹر ہوا میں اٹھا کر میزوں پر سے گزارتے ہوئے آخر کار باہر گلی میں پھینک دیتے۔ بیونس آئرز سے ہمارے کزن اس بدسلوکی کے نتیجے میں جس سے ان کے پتلونوں کی شکل بگڑ جاتی اور ان کے بال خراب ہوتے، پرواہ نہ کرتے تھے۔ اس زمانے میں بالوں میں لگانے والی کریم ارجنٹینا کی ثقافت کا ایک حصہ تھی۔

درحقیقت پیرس کے ان شروع کے دنوں میں جب وقت تیزی سے گزرتا گیا میں کسی ایک فرانسیسی، کسی یورپین، کسی ایشیائی یا کم از کم افریقی یا اوشیانا کے کسی شخص سے نہ ملا۔ ہسپانوی زبان بولنے والے امریکی میکسیکو اور پیٹا گونیا کے باشندے گروہوں میں نکلتے، ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے بدکلامی کرتے مگر اس کے باوجود ایک دوسرے کے بغیر نہ رہتے۔

گوئٹے مالا کا باشندہ پیراگوئے کے انسان کو (Pasteor) کے آدمی پر ترجیح دیتا ہے، جس کے ساتھ وہ خوش وقت رہے۔ اس زمانے میں، میں (Cesar Vallego) سیزار والیجو سے ملا یہ ایک شاعر تھا جس کی شاعری کچھ ایسی کھردری تھی جیسے جنگلی جانور کی کھال کو چھو لیا جائے، لیکن اس کے باوجود یہ شاعری ایک اضافی قوت کے ساتھ شاندار تھی۔

لاروتونڈو میں ہمارا تعارف ہوا تھا اور اتفاقیہ طور پر پہلی ہی ملاقات میں ہماری بات چل نکلی اور اس نے اپنے مخصوص پیرو کے لہجے میں مجھے خوش آمدید کہتے ہوئے کہا "تم ہمارے شاعروں میں سب سے عظیم ہو، صرف (Robin Dario) رابن ڈاریو ہی تم سے مقابلہ کر سکتا ہے"

"والیجو" میں نے کہا اگر تم یہ چاہتے ہو کہ ہم ایک دوسرے کے دوست رہیں تو آئندہ ایسی بات نہ کرنا میں نہیں جانتا کہ اگر ہم بحیثیت ادیب ایک دوسرے کو لیں گے تو معاملہ کہاں پہنچے گا"

میرے الفاظ نے اسے بے چین کر دیا۔ میری غیر ادبی تعلیم نے مجھ میں غیر مہذب رجحانات کو فروغ دے دیا تھا، جبکہ دوسری طرف وہ ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتا تھا، جو عمر میں مجھ

سے بڑی تھی بلکہ اس میں اخلاقیات اور تہذیب بھی نمایاں طور پر موجود تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ اسے یہ بات کچھ اچھی نہیں لگی تو مجھے اپنے آپ پر ایک ناپسندیدہ مہمان کا گمان ہونے لگا۔ لیکن فوراً ہی یہ خیال ایک بادل کی طرح اڑ گیا اور ہم اسی لمحے سے اچھے دوست بن گئے۔

برسوں بعد جب میں نے پیرس میں وقت گزارا، تو ہم روزانہ ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے اور تب مجھے اسے سمجھنے کا بہتر موقع ملا۔

والیجو مجھ سے قد میں چھوٹا، دبلا اور چوڑی ہڈی کا مالک تھا، میرے مقابلے میں وہ زیادہ ریڈ انڈین تھا، جس کی آنکھوں کا رنگ گہرا تھا اور پیشانی فراخ گنبد کی طرح نمایاں تھی۔ اس کا انکا جیسا خوبصورت چہرہ اداس ملکوتی حسن کا نمونہ تھا۔ تمام شاعروں کی طرح وہ خود پرست تھا۔ جب لوگ اس کے انڈین خدوخال کی تعریف کرتے تو اسے اچھا لگتا وہ اپنے سر کو بلند رکھتا، تاکہ میں اس کی تعریف کروں اور وہ کہتا "میرے پاس کچھ ہے، کہو کیا ایسا نہیں ہے" اور پھر خاموشی سے خود پر ہنس پڑتا۔ خود اپنی ذات کے بارے میں اس کا احترام کچھ ایسا نہیں تھا جیسا کبھی کبھار وی سینیٹے ھیوڈوبورو نے بیان کیا۔ وہ اپنے ماتھے پر خود بالوں کی ایک لٹ کو جھولنے دیتا اور اپنی انگلیوں کو بالوں میں لے جاتا اپنی چھاتی کو باہر نکالتا اور پوچھتا "کیا تم نے غور کیا ہے کہ میں نپولین بونا پارٹ سے کس قدر مشابہ ہوں؟"

والیجو بظاہر خاصا موڈی آدمی تھا، ایک ایسے شخص کی مانند، جو ایک عرصے تک سایوں میں مارا مارا پھرتا رہا ہو۔ وہ حلیم الطبع انسان تھا اور اس کا چہرہ ایک ھیرٹیک نقاب سے ملتا جلتا تھا لیکن اس کا باطن اس کے برعکس تھا۔ اکثر میں نے اسے (بطور خاص جب ہم اسے اس کی عیار حاوی فرانسیسی بیوی سے جو ایک افسر کی بیٹی تھی چھپا کر لیجاتے) واقعی ایک اسکول کے بچے کی طرح خوشی سے اچھلتے ہوئے دیکھا۔ بعد ازاں وہ دوبارہ اپنی محکومی اور اطاعت میں ڈوب جاتا۔

جس (Maecenas) میناز کا ہم انتظار کر رہے تھے، لیکن جو پیرس کے سایوں میں کبھی نہ ابھرا۔ وہ چلی کا ایک ادیب تھا، جو فرانس کے رافیل البرتی کا دوست تھا اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ چلی کے ایک بہت بڑے جہاز ران کمپنی کے مالک کا بیٹا تھا، جو اپنے شاہ خرچ ہونے کی شہرت بھی رکھتا تھا۔

یہ مسیحا، جو آسمان سے نیچے آ گرا تھا، مجھ تک پہنچا اور پھر ہم سب کو ایک مشہور روسی شراب خانے میں لے گیا۔ اس کی دیواریں کوہ قاف کے ملبوسات سے بنی ہوئی تھیں۔ جلد ہی ہم روسی یا نیم روسی لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھرے تھے۔ جنہوں نے پہاڑی دہقانی عورتوں کا لباس پہنا ہوا تھا۔ (Condon) کون ڈون ہی ہمارے میزبان کا نام تھا، جو روس کے بگڑے ہوئے

آخری نوابین میں سے ایک لگتا تھا۔ ایک نازک سی سنہرے بالوں والی لڑکی کو اس نے بار بار شیمپین کی بوتل لانے کا حکم دیا اور ہوا میں مجنونہ انداز میں ہاتھ نچا کر کوزاک رقص کی نقل اتاری، جو اس نے کبھی نہ دیکھے تھے۔

"شیمپین، اور شیمپین"

اور پھر دفعتاً ہمارا زرد رو لکھ پتی میزبان زمین پر ڈھے گیا۔ وہ وہیں میز کے نیچے سوتا رہا، کسی ایسی کاکیشین لاش کی مانند جو ریچھ کا شکار بن گئی ہو۔ ہم کانپ کر رہ گئے۔ وہ برف کی پٹیوں اور ایمونیا کی کئی بوتلیں نتھنوں تلے کھولنے کے باوجود ہوش میں نہیں آرہا تھا ہماری بے بسی اور اعصابی کیفیت کو دیکھتے ہوئے ناچنے والی تمام لڑکیاں سوائے ایک لڑکی کے ہمیں تنہا چھوڑ گئیں۔ اپنے میزبان کی جیب میں سے ہمیں ایک بہت ہی شاندار چیک بک ملی، جسے وہ اپنی موجودہ حالت میں استعمال نہ کر سکتا تھا بڑے کوساک نے فوری بل کے پیسے ادا کرنے کا تقاضا کر دیا اور باہر جانے کے دروازے کو اس لئے بند کر دیا کہ ہم میں سے کوئی باہر نہ نکل سکے۔ اس کے قبضے، سے ہم صرف اسی صورت میں باہر نکل سکے جب میں نے اپنا بالکل نیا سفارتی پاسپورٹ بطور ضمانت کے اس کے حوالے کر دیا اور یوں ہم وہاں سے اپنی بے جان لکھ پتی میزبان کو کندھوں پر ڈال کر نکلے اور بدقت تمام اسے ٹیکسی میں ڈال کر اس کے ڈی لکس ہوٹل تک لے گئے۔ وہاں ہم نے اسے دو دربانوں کے حوالے کر دیا، جو اسے کسی جہاز کے پل پر سے گرے ہوئے امیر البحر کی مانند اٹھا کر اندر لے گئے۔

تب ایک لڑکی، جس نے اس حالت میں ہمارا ساتھ نہ چھوڑا تھا، ٹیکسی میں بیٹھی ہمارا انتظار کرتی رہی۔ الوارو اور میں نے اپنے ہوٹل میں اسے پیاز کے سوپ پینے کی دعوت دے دی۔ اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ہم نے بازار سے پھول خریدے اور پھر دونوں نے ایک اچھا سمارٹن ہونے کے ناطے اسے چوما اور غور کیا کہ وہ واقعی خاصی خوبصورت لڑکی تھی۔

وہ نہ تو بے حد حسین ہی تھی اور نہ بالکل گھریلو وضع کی لڑکیوں جیسی، لیکن اس کی اوپر کو اٹھی ہوئی ناک، جو پیرس کی لڑکیوں کی ایک نمایاں خصوصیت تھی، اسے ممتاز کرتی تھی۔ پھر ہم نے اسے اپنے سادہ سے ہوٹل میں مدعو کیا ہمارے ساتھ جانے پر اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔

وہ الوارو کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئی اور میں اپنے بستر میں تھکا ہارا بے سدھ ہو کر گر پڑا۔ لیکن شاید تب ہی، میں نے کسی کو بہت نزدیک سے کچھ کہتے ہوئے سنا۔ یہ الوارو تھا اس کا بے ضرر جنوبی چہرہ کچھ مختلف لگا "سنو" وہ کہنے لگا

"یہ لڑکی حیران کن حد تک ایک خاص چیز ہے، کیا، یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا، تمہیں خود

سے آزمانا ہو گا"

کچھ لمحوں بعد اجنبی عورت میرے بستر میں تھی۔ نیم خوابیدہ لیکن ممونیت کے اظہار کے ساتھ اس سے ہم بستری کرتے ہوئے مجھے اس کے پر اسرار تحفے کا ثبوت مل گیا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ کوئی ایسی چیز جو اس کے ہاں کہیں اندر سے اوپر کو آتی تھی۔ کوئی چیز جو مسرت کی ابتدا تک واپس چلی جاتی تھی پہلی لہر کی اٹھان کے ساتھ۔ وینس کے شہوانی رازوں تک ___ الوارو نے ٹھیک کہا تھا

صبح ناشتے کے وقت الوارو نے مجھے ہسپانوی میں تنبیہ کی

"اگر ہم اس عورت سے فی الفور پیچھا نہیں چھڑائیں گے تو ہمارے سفر کا خاتمہ سمجھو، ہم ڈوب جائیں گے، سمندر میں نہیں بلکہ جنس کے ناقابل فہم عمل میں" ہم نے اس پر تحفوں کی بوچھاڑ کا فیصلہ کیا چھوٹے چھوٹے تحفے، پھول، چاکلیٹ اور کچھ فرانکس، جو ہمارے پاس بچ گئے تھے۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ کاکیشن نائٹ کلب میں کام نہیں کرتی تھی اور وہ گزشتہ رات ہی کو وہاں پہلی بار گئی تھی پھر ہم اس کے ساتھ ٹیکسی میں سوار ہوئے۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک غیر مانوس علاقے سے گزر رہا تھا جب ہم نے اسے رکنے کے لئے کہا۔ ہم نے اسے چومتے ہوئے الوداع کہا اور پھر دوبارہ اسے کبھی نہ دیکھا۔

مشرق کا سفر

میں کبھی اس ریل گاڑی کو نہیں بھولوں گا جو ہمیں (Marseilles) مارسیلز تک لے گئی۔ یہ گاڑی خوشبودار پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکری کی مانند تھی لوگوں کے ہجوم، دیہاتی لڑکیاں۔ ملاح اور ان کے اکارڈین۔ سب مل کر گیت گاتے ہوئے۔

ہم بحیرہ روم کی جانب بڑھ رہے تھے، روشنی کے دروازوں کی سمت .... یہ ۱۹۲۷ء کا سال تھا۔ میں مارسیلز سے بے حد متاثر تھا۔ اس کی کمرشل رومانویت اور بندر گاہ پر موجود جہازوں کا اپنے انداز میں جھومنا۔ لیکن جس بحری جہاز سے ہم سنگاپور کی طرف روانہ ہوئے وہ بذات خود سمندر میں چھوٹا سا فرانس تھا۔ اپنے بورژوا مسافروں کو لئے ہوئے جو دور دراز کی بندر گاہوں میں آباد کالونیوں میں مختلف سرکاری نوکریوں پر فائض تھے۔

سفر کے دوران جب ملاحوں نے ہماری ٹائپ کرنے کی مشینیں اور لکھنے کے مسودوں کو دیکھا تو انہوں نے ہم سے اپنے لئے خطوط چھاپنے کی فرمائش کر دی۔

ہم نے بہت سے ناقابل یقین خطوط ٹائپ کئے، جو ان ملاحوں نے اپنی دوست لڑکیوں کو

مارسیلز، بورڈیمس اور فرانس کے مختلف شہروں میں لکھوائے تھے۔ درحقیقت وہ خطوط لکھوانے سے کہیں زیادہ اس بات سے خوش تھے کہ یہ خطوط ٹائپ پر لکھے جارہے ہیں، لیکن ان کے باوجود جو پیغامات انہوں نے اپنے خطوط میں لکھوائے، وہ مجھے سب کے سب (Tristan Corbiers) کی نازک احساسات والی نظموں کی طرح لگے۔

بحیرہ روم اس کی بندر گاہیں، اس کے قالین اور اس کے بازار ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی کھل گئے۔

بحیرہ احمر میں، میں (Djibouti) ڈی جی بوتی کی بندر گاہ سے بہت متاثر ہوا تھا۔ چونے جیسی سفید ریت جس پر اکثر (Arthor Rimbaud) آرتھر رمباڈ کے چکر لگتے۔ مجسموں کی مانند پھلوں کی ٹوکریاں اٹھائے ہوئے سیاہ فام حبشی لڑکیاں علاقائی باشندوں کی شکستہ حال جھونپڑیاں اور روشنیوں میں لرزہ براندام ریستوران .... وہاں انہوں نے لیموں کے ساتھ ٹھنڈی چائے پیش کی۔

اصل چیز جو دیکھنے والی تھی، وہ شنگھائی کی رات میں روشنیاں تھیں خراب شہرت والے شہر آپ کو ایک مردہ عورت کی طرح اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ شنگھائی نے اپنی رات کا منہ ہمارے لئے کھول دیا تھا۔ دو دیہاتی لڑکے دنیا میں تیسرے درجے کے مسافروں کے مابین تھوڑے سے پیسوں اور لذت کے کسی تجربے کے بغیر بیٹھے تھے۔

ہم ایک ایک کر کے شنگھائی کے تمام بڑے شبینہ کلبوں میں گئے۔ یہ ہفتے کی آخری رات تھی اور کلب خالی تھا۔ رقص گاہوں کے ویران ہال مایوس کن صورتحال پیش کر رہے تھے۔ یہ ہال اس قدر بڑے تھے کہ وہاں سینکڑوں ہاتھی ناچ سکتے تھے۔ لیکن فی الوقت وہاں کوئی رقص میں نہ تھا زار کے روس کی بے حد دبلی پتلی ڈھانچوں جیسی خواتین تاریک کونوں سے باہر نکل آئیں اور انگڑائیاں لیتے ہوئے ہم سے شیمپین پینے کا تقاضا کرنے لگیں پس ہم سے کچھ گناہ اور سرزد ہوئے اور جو کچھ ہم سے ضائع ہوا، وہ وقت تھا جہاز تک پہنچنے میں خاصی رات بیت چکی تھی اور ہم ساحل سے بہت دور تنگ گلیوں میں بھٹک رہے تھے۔ بالاخر ہم میں سے ہر شخص ایک رکشہ میں سوار ہوا۔ انسانی گھوڑوں سے چلنے والے ایسے وسائل، جن سے ہم نا آشنا تھے تب ۱۹۲۷ء میں وہ چینی طویل فاصلوں تک ان چھوٹی چھوٹی گاڑیوں میں مسافروں کو بٹھائے ہوئے بغیر رکے دوڑا کرتے تھے۔ چونکہ بارش شروع ہو چکی تھی اور بوچھاڑ تیز تھی۔ ہمارے رکشے لے کر دوڑنے والوں نے سوچتے ہوئے رکشے روکے اور احتیاط سے رکشہ کے باہر بارش سے بچاؤ کے لئے چھاتے تان دیئے تاکہ بارش کا ایک قطرہ بھی اندر جا کر غیر ملکی ناکوں پر نہ پڑ سکے۔

"یہ کس قدر مہذب اور خیال کرنے والے لوگ ہیں۔ دو ہزار سال کی ثقافت یونہی بے کار نہیں گئی" آلوارو اور میں نے اپنی متحرک نشستوں میں سوچا اس کے باوجود کسی چیز نے مجھے بے چین کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس چھاتے کے اندر سے جس نے ہمیں اندر بالکل محفوظ کر دیا تھا۔ میں کچھ بھی نہ دیکھ سکتا تھا لیکن اس برساتی کپڑے میں، میں اپنے ڈرائیور کی آواز کو سن سکتا تھا۔ جو کسی بھنبھناہٹ سے مشابہ تھی۔ اس کے ننگے پیروں کی آواز میں، پھر کچھ اور پیروں کی آوازیں شامل ہو گئیں۔ بالاخر یہ آوازیں ختم ہو گئیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ پختہ رستہ ختم ہو چکا تھا۔ بظاہر اب ہم شہر سے باہر کھلے میدان میں سفر کر رہے تھے اچانک میرا رکشہ رکا۔ رکشہ لے کر دوڑنے والے نے مہارت کے ساتھ چھاتے کو سامنے سے کھولا۔ اس ویران ماحول میں کہیں بھی بحری جہاز کا نام و نشان نہ تھا۔۔ دوسرا رکشہ میرے برابر میں کھڑا تھا۔ الوارو بھی گھبرا کر رکشے سے نیچے اتر آیا تھا۔

"پیسے۔ پیسے" سات آٹھ چینی ہمیں اپنے دائرے میں گھیرے کر شور مچا رہے تھے۔ میرے دوست نے کچھ ایسی حرکت کی جیسے وہ اپنے پتلون کی جیب سے کوئی ہتھیار نکال رہا ہو اور بس یہ کافی تھا کہ ہم دونوں پر گھونسوں کی بارش ہو گئی میں پیچھے کی طرف گر پڑا لیکن چینی نے زمین پر گرتے ہوئے میرے سر کو ہوا میں تھام لیا اور آہستگی سے مجھے زمین پر لٹا دیا۔ برق رفتاری سے انہوں نے میری جیبوں کی تلاش لے ڈالی۔ قمیص، پینٹ، جوتے، جرابیں اور میری ٹائی۔ وہ فنکارانہ انداز میں مظاہرہ کر رہے تھے۔ لباس کا کوئی انچ ایسا نہ تھا، جسے بغور نہ دیکھا گیا ہو—— ہمارے پاس چھوٹی ریز گاری میں سے کچھ باقی نہ رہا تھا۔ لیکن شنگھائی کے اچکوں کی روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے ہمارے پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات کی عزت کی۔

جب ہم تنہا رہ گے تو ہم نے روشنیوں کی طرف چلنا شروع کیا۔ جلد ہی سینکڑوں چینی رات کے اس وقت میں وہاں مل گئے۔ لیکن وہ ایمان دار تھے ان میں سے کوئی بھی فرانسیسی، انگریزی یا ہسپانوی زبان سے واقف نہ تھا۔ لیکن سب ہی ہماری اس زبوں حالی میں مدد کے خواہاں نظر آتے تھے اور کسی طریقے سے ان لوگوں نے ہمیں ہمارے جہاز کے تیسرے درجے کے کیبن تک پہنچا دیا تھا۔

ہم جاپان پہنچ گئے، جن پیسوں کا ہمیں چلی سے انتظار تھا، اس کا حصول قونصل خانے میں ہونا تھا۔ اس اثنا میں ہمیں یوکوہاما میں سمندری مسافروں کی ایک پناہ گاہ میں ٹھہرنا پڑا۔ یہاں ہم بھوسے کے اذیت ناک گدوں پر سوئے کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا—— برف پڑ رہی تھی اور ٹھنڈ ہماری ہڈیوں میں اتری جاتی تھی لیکن کسی نے ہماری پرواہ نہ کی۔

ایک صبح سورج کے طلوع ہونے پر ایک آئل ٹینکر جاپانی ساحل سے کچھ دور دو ٹکڑوں میں پھٹ گیا اور یہی جگہ بہت سے دوسرے ملاحوں سے بھر گئی۔ ان لوگوں میں باسک بھی تھا، جو اپنی زبان کے علاوہ ہسپانوی زبان بھی بول سکتا تھا۔ اس نے ہمیں اپنی مہم کے بارے میں بتایا۔ چار دن اور چار راتیں وہ تباہ شدہ جہاز کے ایک ٹکڑے پر جلتے ہوئے تیل کی لہروں کے حصار میں بہتا رہا تھا۔ ان بچ جانے والے لوگوں کو کمبل اور راشن دیا گیا تھا اور وسیع القلب انسان باسک ہمارا محسن بن گیا۔

دوسری طرف چلی کا قونصل جنرل تھا جس کا نام میری خیال میں (De La marina) ڈلی لامارینا یا پھر (De La rivera) ڈی لاریویرا تھا۔ جو ہم سے بے حد نخوت سے ملا جس نے ہمیں ہماری حیثیت کے بارے میں بتایا کہ ہم اچھوت تھے اور اس کے پاس ہمارے لئے وقت نہ تھا۔ جیسا کہ اسے اس شام کو (Countess Yofusan) کاؤنٹس یوفوسان کے ہاں رات کے کھانے پر جانا تھا۔ امپیریل کورٹ سے اس کے لئے جانے کا دعوت نامہ تھا یا پھر اس کے علاوہ وہ حکمران خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ مثلاً یہ کہ "بادشاہ سلامت بہت شاندار آدمی ہیں"

اس کے پاس ٹیلی فون موجود نہ تھا۔ یوکوہاما میں بھلا فون کی کیا ضرورت ہے؟ وہ محض اسے جاپانی میں بلائیں گے۔ جہاں تک پیسوں کی خبر کا تعلق ہے، تو بینک منیجر نے جو اس کا قریبی دوست تھا کوئی ذکر نہ کیا تھا۔ اسے بے حد افسوس تھا لیکن ساتھ ہی اس کا جانا بے حد ضروری تھا۔ اسے ایک شاندار تقریب میں شامل ہونا تھا "کل تم سے ملاقات ہو گی"

ہر روز کا یہی قصہ تھا۔ ہم قونصل خانے سے لرزتے ہوئے نکلتے کیونکہ ان چوری نے ہمارے لباس کو تقریباً ختم کر کے رکھ دیا تھا اور اب ہمارے پاس گھٹیا قسم کے سوئیٹر رہ گئے تھے۔ آخری روز ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے پیسے یوکوہاما میں ہمارے پہنچنے سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ بینک نے قونصل خانے کو تین نوٹس بھیجے تھے لیکن وہاں کے ارباب اقتدار نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی تھی جب کبھی میں اخبارات میں کسی قونصل کے اپنے ہی ملک کے کسی جنونی باسی کے ہاتھوں قتل کی خبر پڑھتا ہوں، تو مجھے وہ سر پھرا افسر یاد آجاتا ہے۔

اس رات ہم ٹوکیو کے سب سے عمدہ ریستوران میں گئے۔ اس زمانے میں ٹوکیو میں بہت عمدہ خوراک ملتی تھی۔ ہفتوں کی ہماری بھوک نے اچھی غذا کو دیکھ کر اشتہا کو ہوا دے دی تھی۔ جاپان کی خوبصورت لڑکیوں کی محفل میں ہم نے ان بد نصیب مسافروں کے نام جام لنڈھائے، جو دنیا بھر کے خبیث قونصلروں کے ہاتھوں خراب ہوئے ہوں گے۔

سنگاپور ـــ ہم نے سوچا کہ ہم رنگون کے نزدیک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن کتنا تلخ تجربہ تھا. جو فاصلہ نقشے پر چند ملی میٹر کا تھا وہ ایک وسیع و عریض خلیج کی شکل میں نظر آیا۔ ابھی ہمارے سامنے جہاز کا کئی روز کا سفر تھا اس کے علاوہ جو جہاز باقاعدہ طور پر رنگون جاتا تھا وہ گزشتہ روز جا چکا تھا۔ ہمارے پاس ہوٹل کا کرایہ دینے کو پیسے نہ تھے مزید پیسے رنگون میں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ آہ! لیکن سنگاپور میں میرا ساتھی چلی کا قونصل وہاں ایک خاص مقصد کے لئے موجود تھا۔

(Senor Mansilla) سینور منسیلا تیزی سے اندر آیا۔ اس کی مسکراہٹ آہستہ آہستہ ہلکی ہوتی گئی حتیٰ کہ وہ مکمل طور پر ختم ہو گئی اور اس نے درشت لہجے میں ہم سے کہا "میں تم لوگوں کے لئے کچھ نہیں کر سکتا. تمہیں وزارت سے رابطہ کرنا ہو گا" میں نے مشورہ دیا کہ ہم قونصلروں کو اتفاق رائے رکھنی چاہیے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ شخص ایک سفاک جیلر کی مانند تھا۔ وہ اپنا ہیٹ اٹھا کر دروازے تک پہنچنے ہی والا تھا کہ میرے دماغ میں اچانک میکاویلین خیال ایک کوندے کی طرح چمکا۔

"سینور میں پیسے کی خاطر اپنے وطن کے بارے میں کچھ لیکچر دینے پر مجبور ہوں گا، تاکہ ہم اپنے سفر کو جاری رکھ سکیں۔ ازراہ کرم مجھے ایک ہال، ترجمان اور ضروری اجازت نامہ دے دیں"

وہ شخص سفید پڑ گیا

سنگاپور میں چلی کے بارے میں لیکچر؟ میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ یہاں میں انچارج ہوں اور صرف میں ہی چلی کے بارے میں کچھ کہہ سکتا ہوں۔ "سینور منسیلا اطمینان رکھیں" میں نے کہا. جتنا لوگ ہمارے دور دراز ملک کے بارے میں جانیں گے اتنا ہی بہتر ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیوں پریشان ہو گئے ہیں؟"

آخر میں یہ احمقانہ رائے. جس نے حب الوطنی کے جذبے کو بلیک میل کی حد تک پہنچا دیا تھا ایک سمجھوتے پر منتج ہوئی۔ غصے سے کانپتے ہوئے اس نے ہم سے رسیدوں پر دستخط کرائے اور ہمیں پیسے دے دیئے۔

جب ہم نے رقم کو گنا تو احساس ہوا کہ ہم سے زیادہ رقم کی رسیدوں پر دستخط کرا لئے گئے ہیں جس کی اس نے وضاحت کی "یہ سود ہے"

(دس روز کے بعد میں نے اسے رنگون سے ایک چیک بھیجا جو سود کے بغیر تھا)

عرشے سے جوں جوں جہاز رنگون کے نزدیک ہوتا گیا. مجھے بڑے پگوڈا (Shwe Dagon) کے مینار کی شکل کے سنہری مینار نظر آنے لگے۔

جیتی پر اجنبی لباس کی ایک کثیر تعداد کے ہیجان خیز رنگوں کا اجتماع تھا وہیں ایک بڑے کثیف دریا کا دہانہ مار تاباں (Martaban) کی خلیج میں خالی ہوتا تھا۔ اس دریا کا نام دنیا کے تمام دریاؤں سے خوبصورت تھا ـــــ دریائے اراوادی ـــــ اور اس کے پانیوں کے نزدیک میری زندگی شروع ہوا چاہتی تھی۔

الوارو (ALvARO)

ایک بے حد متاثر کن شخصیت، الوارو۔ اس کا نام الوارو ڈی سلوا ہے۔ وہ نیویارک میں رہتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ نیویارک کے جنگل میں گزارا تھا۔ میں اسے بے کار وقت میں مالٹے کھاتے ہوئے سگرٹ کے کاغذ کو ماچس سے جلاتے ہوئے اور لوگوں کو تنگ کر دینے والے سوال پوچھتے ہوئے تصور کرتا ہوں

وہ ہمیشہ سے، ایک غیر منظم استاد تھا۔ بے پناہ ذہانت کا مالک ایک ایسی فطین ذہانت، جو اسے کسی بھی جگہ کے بجائے نیویارک لے گئی۔ یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے جب وائیلٹ کے پھول جو وہ کسی انجان راہ چلتی لڑکی کو دیکھ کر دینے کے لئے دوڑا تھا اور وہ اس کے ہاتھوں سے گر گئے تھے۔ الوارو اس اجنبی لڑکی کے ساتھ، یہ جانے بغیر کہ اس کا نام کیا ہے یا وہ کہاں سے آئی تھی اسی لمحے ہم بستری کا خواہاں تھا۔ اس واقعہ اور جیمز جوائس پر اپنی ناختم ہونے والی تقریروں کے دوران اس نے مجھ پر اور بہت سے دوسرے لوگوں پر غیر مشتبہ خیالات دنیا کے اس انسان کے نظریئے کے بارے میں جو شہر میں چھپا رہتا ہے اور جو موسیقی مصوری، کتابوں اور رقص میں سے نئے پن کو تلاش کرتا ہے، بتایا...... ہمیشہ مالٹے کھانا، سیبوں کو اکٹھا کرنا۔ کھانے کے طریقوں میں ناممکن...... ہر بات پر حیران ہونا...... اس میں، ہم نے آخر کار اپنے خوابوں کا شہری نمونہ دیکھا، جو کہ ہم سب صوبائی لوگ بننا چاہتے ہیں...... صندوقوں پر کوئی لیبل نہ لگے ہوں...... لیکن ان میں بھانت بھانت کے ممالک اور کنسرٹ موجود ہوں۔ فارغ اوقات میں کیفوں کی ملاقاتیں، یونیورسٹی کی برف سے ڈھکی ہوئی چھتیں ـــــ وہ ایک ایسے نقطے پر پہنچ گیا تھا جہاں اس نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی ـــــ جہاں کہیں بھی میں جاتا، میں سبزیوں کے خواب میں رہ جاتا ہوں۔ میں اپنے ذہن کو کسی خاص جگہ پر رکھنا چاہتا ہوں اور جڑوں کو نیچے تاکہ سوچ سکوں اور زندہ رہ سکوں الوارو ہمیشہ ایک جوش اور ولولے کے ساتھ ایک سے دوسرے موضوع پر چھلانگ لگاتا۔ کسی بھی فلم سے بے پناہ خوش ہو جاتا اور فوراً ہی مسلمانوں کے لباس کو پہن کر اسٹوڈیو جانے کو تیار ہو جاتا۔

میرے پاس کچھ تصاویر ہیں، جن میں، میں بنگالی لباس پہنے ہوئے ہوں۔ (کلکتہ میں، میں

ایک سگرٹ کی دکان میں گیااور خاموش رہا. جہاں لوگوں نے مجھے ٹیگور کے خاندان کا فرد سمجھ لیا)

جب ہم ڈم ڈم اسٹوڈیو گئے کہ شاید وہ ہمیں کرائے پر رکھیں ــــ اور تب ہمیں کرایہ نہ دینے کی بنا پر وائی ایم سی اے کو اور ان نرسوں کو چھوڑنا پڑا، جو ہم سے پیار کرتی تھیں۔ الوارو کاروبار کے نئے جھمیلوں میں پھنس گیا تھا، وہ چاہتا تھا کہ ہم آسام سے چائے، کشمیر سے کپڑا، گھڑیاں اور قدیم نوادرات فروخت کریں ــــ سب کچھ جلد ہی ختم ہو گیا...... اس نے کشمیر سے ہمیں نمونے بھیجے، چائے کے چھوٹے چھوٹے لفافے۔ میونخ یا شاید نیویارک ــــ میں نے بہت سے ادیب دیکھے ہیں مستقل مزاج، ان تھک اور بے حد لکھنے والے ــــ لیکن وہ عظیم ہے اس کی کوئی چیز کبھی شائع نہ ہوئی ــــ میں نہیں سمجھتا...... صبح کو بستر سے اٹھے بغیر اپنی ناک کے چھوٹے سے ابھار پر عینک لگائے ہوئے وہ پہلے ہی تیار ہوتا ٹائپ رائٹر پر کسی بھی وضع کا کاغذ چڑھائے ہوئے جو اس کے ہتھے لگ جاتا، مصروف کار ہو جاتا ــــ اور اس کے باوجود اس کی تنقید، اس کے مالئے، اس کے لمحاتی رابطے، نیویارک میں اس کا ٹھکانہ۔ اس کے وائلٹ کے پھول، اس کا الجھاؤ جو کسی قدر واضح لگتا ہے۔ اس کی وضاحت جو کتنی الجھی ہوئی ہے۔ وہ کوئی کام جس کی لوگ اس سے توقع کرتے کبھی مکمل نہ کرتا۔ ممکن ہے اس لئے کہ وہ یہ پسند نہ کرتا ہو، یا شاید اس لئے کہ وہ یہ نہ کر سکتا ہو ــــ کیونکہ وہ ایک وقت میں بہت سے کام کر رہا ہے یا کیونکہ وہ کچھ بھی نہیں کر رہا ــــ لیکن وہ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ براعظموں کے اس پار بھی اپنی گہری نیلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا ہے اس عمدہ حسیت کے ساتھ لیکن اس کے باوجود وہ وقت کی ریت کو اپنی انگلیوں کے درمیان سے نکلنے دیتا ہے۔

چوتھا باب

درخشاں تنہائی

جنگل کے تصورات

ان یادوں میں غلط و پیچاں مجھے اچانک بیدار ہونا پڑتا ہے۔ یہ سمندر کی آواز ہے۔ میں والپاریزو کے ساحل کے نزدیک (Isla Negra) ازلانیگرا میں لکھ رہا ہوں۔

طاقتور ہوائیں، جنہوں نے ساحل پر کوڑے برسائے ہیں، ابھی رک گئی ہیں سمندر ـــــ بجائے میرے اسے کھڑکی سے دیکھنے کے، وہ مجھے جھاگ کی ہزاروں آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اپنی لہروں میں اب بھی طوفان کی خوفناک استقامت کے نشان دکھاتا ہے۔

بہت سال جو اس قدر دور ہو گئے! انہیں پھر سے جوڑنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے لہروں کی آواز، جسے میں اب سنتا ہوں، میرے اندر کسی شے کو بار بار چھوتی ہے۔ کوئی شے بجائے تلوار کی ایک جھلک کے مجھے لوری دے دے کر سلاتی ہے میں ان تصورات کو بغیر کسی ترتیب کے اکٹھا کروں گا بالکل ان لہروں کی طرح جو آتی جاتی رہتی ہیں۔

۱۹۲۹ء کی ایک رات ـــــ میں ہجوم کو اکٹھا ہوتے دیکھتا ہوں یہ مسلمانوں کی چھٹی کا دن ہے۔ وہ گلی کے وسط میں جمع ہو گئے ہیں۔ وہاں ایک گڑھے میں کوئلے دہک رہے ہیں۔ میں ذرا نزدیک ہوتا ہوں راکھ کی پتلی تہہ کے نیچے جلتے ہوئے کوئلوں کی حدت سے میرا چہرہ تمتماتا ہے۔ اچانک حیران کر دینے والا ایک شخص نمودار ہوتا ہے سرخ اور سفید رنگ چہرے پر ملے وہ چار لوگوں کے کندھوں پر سوار سرخ لباس میں ملبوس ہے۔ وہ اسے نیچے اتارتے ہیں اور وہ جیسے عالم خمار میں اللہ اللہ چیختا ہوا جلتے ہوئے [illegible] پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔

سارا مجمع اس منظر میں گم ہے۔ جادوگر کوئی نقصان اٹھائے بغیر جلتے ہوئے کوئلوں پر سے گزر گیا ہے۔ تب ایک اور آدمی ہجوم کو چیر کر آتا ہے اور اپنے چپل اتار کر اسی طرح ننگے پیروں دہکتے کوئلوں پر چلتا ہے۔ اسی طرح رضاکارانہ طور پر لوگ آگے آتے ہیں اور جلتے ہوئے کوئلوں پر چلتے رہتے ہیں۔ کچھ آگ کے وسط میں رک کر اللہ اللہ کا ورد کرتے ہیں اور رونگٹے کھڑے کر دینے کی حد تک چیختے ہوئے اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف کرتے ہیں۔ بعض اپنے بچوں کو گود میں لئے ہوئے گزرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں جلتا یا ممکن ہے وہ جلتے ہوں لیکن مجھے یقین نہیں۔

مقدس دریا کے قریب کالی کا مندر نمایاں ہے۔ کالی موت کی دیوی ہے ہم اس مندر میں ان سینکڑوں زائرین کے ہمراہ جو ملک کے ہندو علاقوں سے کالی کی عنایات حاصل کرنے آئے ہیں، داخل ہوتے ہیں۔ چیتھڑوں میں ملبوس خوفزدہ وہ برہمنوں کے آگے ہانکے جاتے ہیں، جو ان سے ہر قدم پر کسی نہ کسی چیز کے لئے پیسے مانگتے رہتے ہیں۔ برہمن کالی دیوی کے سات پردوں میں سے ایک پردہ اٹھاتے ہیں اور اسی دم ایک تھال کا ایسا گرجدار دھماکہ ہوتا ہے جس سے مردے بھی جاگ جائیں۔ زائرین گھٹنوں کے بل گر جاتے ہیں، وہ جڑے ہوئے ہاتھوں سے اپنی اطاعت کا اظہار کرتے ہیں، ہاتھ ان کی پیشانیوں کو چھوتے ہیں اور وہ دوسرے پردے تک پہنچتے ہیں ـــــ پروہت انہیں صحن میں دھکیلتا ہے، جہاں وہ بکریوں کے سروں کو ان کے جسموں سے ایک ہی جھٹکے میں کلہاڑی کے وار سے الگ کر دیتے ہیں اور نئے اعزازات وصول کرتے ہیں۔ زخمی جانوروں کی چیخیں، تھال کی گرجدار آواز میں ڈوب جاتی ہیں ـــــ غلیظ سفید دیواروں پر چھت تک خون کی چھینٹیں پڑتی ہیں۔ کالی دیوی ایک مجسمہ ہے جس کی آنکھیں سفید اور چہرہ تاریک ہے اور ایک خوں رنگ دو میٹر لمبی زبان اس کے منہ سے لٹکتی ہوئی زمین کو چھوتی ہے۔ کھوپڑیوں اور موت کے نشان کے گلوبند اس کے کانوں اور گلے میں جھولتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ زائرین باہر گلی میں نکل جائیں وہ اپنے پاس موجود آخری سکے دیوی کی نظر کرتے ہیں۔

شاعر میرے اردگرد اپنے گیت اور نظمیں گانے کے لئے جمع تھے، لیکن وہ ان اداس زائرین جیسے نہ تھے۔ اپنے لمبے لٹکتے ہوئے سفید لباسوں میں ملبوس گھاس پر پلوتھا مار کر اپنے ڈھول لئے بیٹھے تھے۔

ہر ایک نے چیختی ہوئی آواز میں ایک قدیم لے اور بحر میں لاکھوں سال پرانا گیت گانا شروع کیا، لیکن گانے کا بڑا مقصد حل ہو چکا تھا۔

یہ نغمے طربیہ یا شہوانی نوعیت کے نہ تھے بلکہ یہ احتجاج کے گیت بن گئے تھے، بھوک کے

خلاف گیت ـــ جیلوں میں لکھے گئے گیت

ان میں بہت سے نوجوان شاعر تھے، جن سے میں سارے ہندوستان میں ملا ان کی پھٹی ہوئی آنکھوں کو میں کبھی بھی فراموش نہ کر سکوں گا

یہ لوگ حال ہی میں جیلوں سے باہر آئے تھے اور شاید کل پھر جیلوں میں اپنی کوٹھڑیوں میں چلے جائیں گے۔ کیونکہ وہ مصائب اور دیوتاؤں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے یہ وہ عہد ہے، جس میں رہنا ہمارا مقدر ہے۔ اور یہی دنیا کی شاعری کا سنہرا دور ہے۔

جب کہ نئے گیت تخلیق کئے جا رہے ہیں (Bombay) بمبئ اور اس کے مضافات میں لاکھوں لوگ ہر رات سڑکوں کے کنارے سوتے ہیں۔ وہ وہیں پیدا ہوتے ہیں، وہیں سوتے ہیں اور انہی سڑکوں کے کنارے مر جاتے ہیں۔ ان کے لئے کوئی گھر نہیں روٹی نہیں، دوا نہیں

مہذب مغرور انگلستان اپنی نو آبادیاتی قلمرو کو اس حالت میں چھوڑ کر گیا ہے اس نے اپنی سابق رعایا کے لئے اسکولوں، کارخانوں، گھروں، ہسپتالوں کے بجائے جیل خانوں اور خالی وہسکی کی بوتلوں کے پہاڑوں کو چھوڑا ہے۔

رنگون کی یاد ایک نازک خیال ہے، جو لہر کی مانند واپس آتا ہے سماٹرا کے شہر (Medan) میڈان میں، میں نے کئی بار بوٹینکل گارڈن کے دروازے کو کھٹکھٹایا اور میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ ہر بار ایک ہی شخص اسے کھولنے کے لئے آیا۔ ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر روش پر چلتے اور ایک میز کے گرد بیٹھ جاتے جس پر وہ اپنے دونوں ہاتھ اور پیروں کو زور سے مارتا تب ایک بیرا نمودار ہوتا جو ہمیں بیئر کے ایک گھڑے سے نوازتا۔ یہ گھڑا نہ بہت بڑا ہوتا نہ چھوٹا بس شاعر کے لئے کافی تھا۔

سنگاپور کے چڑیا گھر میں ہم نے ایک گانے والے پرندے کا پنجرہ دیکھا۔ غصے میں چمکتا ہوا ایک خوبصورت پرندہ جو شاید ابھی باغ عدن سے اڑ کر وہاں پہنچا تھا اور کچھ دور پرے دوسرے پنجرے میں ایک سیاہ چیتے کی مادہ جس سے ابھی تک جنگل کی مہک آرہی تھی، اپنے پنجرے میں بے چینی سے ٹہلے جا رہی تھی وہ ستاروں بھری رات کا ایک عجیب سا حصہ لگتی تھی، مسلسل حرکت میں ایک مقناطیسی فیتہ ایک چھوٹا سا سیاہ آتش فشاں، جو ساری دنیا کو تباہ کر دینے کے لئے تیار ہو۔ متحرک توانائی کا خالص ڈائینمو اور دو زرد آنکھیں دو چاقو، خود اپنی قید اور انسانی نسل کو نہ سمجھتے ہوئے اپنی آگ کو پھینکتے ہوئے۔

ہم (Penang) پینانگ شہر، (جسے کبھی انڈو چائنا کہا جاتا تھا) کے مضافات میں ایک عجیب و غریب مندر تک پہنچے۔ اس کا نام ناگ مندر تھا۔ اس مندر کا ذکر سیاحوں اور صحافیوں نے بارہا

کیا ہے۔ بے شمار جنگیں، بار بار کی تباہ کاریاں، پھر اتنا بہت سا وقت اور لگاتار بارشیں پینانگ کی گلیوں میں آئیں۔ مگر میں حیران ہوں کہ یہ مندر اب بھی موجود ہے۔

ٹائیلوں والی چھت کے نیچے ایک چھوٹی تاریک عمارت جو ٹروپیکل بارشوں سے ختم ہو چکی ہے اور خود رو جھاڑیوں کے پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔ مرطوب بو فرنگی پانی کی مہک۔ پہلی بار جب ہم مندر میں داخل ہوتے ہیں تو اندھیرے میں ہمیں کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر کی تیز خوشبو اور وہاں حرکت کرتی ہوئی کوئی شے ـــــ یہ ایک سانپ ہے اور سست انداز میں پھیلا ہوا ہے۔ آہستہ آہستہ ہم دوسرے سانپ دیکھتے ہیں اور پھر تو وہاں بہت سے سانپ نظر آتے ہیں۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ وہاں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں سانپ ہیں چھوٹے چھوٹے ناگ. جو شمع دانوں کے گرد لپٹے ہوئے ہیں۔ کچھ موٹے رنگ کے اور گہرے رنگوں کے اور کچھ پتلے لیکن سب کے سب سوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔

چینی کے بے تحاشا پیالے ادھر ادھر رکھے ہیں۔ کچھ میں دودھ بھرا ہے، دوسروں میں انڈے ہیں۔ سانپ ہمیں نہیں دیکھتے۔ ہم مندر کی بھول بھلیوں میں سے گزرتے ہیں، انہیں چھوتے ہوئے۔ وہ ہمارے سروں پر سنہری چھتوں سے لٹکتے ہیں۔ وہ پتھروں پر خوابیدہ ہیں یا قربان گاہوں پر کنڈلی مارے ہوئے۔ وہاں پرے مہلک ترین سانپ رسل وائپر (Russell's Vip er) ایک انڈے کو نگل رہا ہے۔ نزدیک ہی درجنوں کورل سانپ ہیں جن کے گلابی حلقے ان کے فوری زہر کی اطلاع دیتے ہیں۔ میں نے زرد رنگ کے ایک نیزے جیسے سانپ کو دیکھا بہت سے بڑے (Pythons) پائیتھن (Coluber Derusiy) کولوبرڈی رسی (Colober No yia) کولوبرنویا۔ سبز، بھوسلے، نیلے، سیاہ سانپوں سے ہال بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف موت کی خاموشی تھی۔ وقتاً فوقتاً زعفرانی رنگ کے لبادوں میں ملبوس کوئی پروہت سانپوں میں سے گزر جاتا ہے۔ اس کے لباس کا چمکدار رنگ اسے بھی بہت سارے سانپوں میں شامل کر دیتا جو دودھ کے کٹورے یا انڈے کی تلاش میں ہو۔

کیا ان سانپوں کو یہاں لایا گیا تھا؟ کس طرح ان کا گزر ہوتا ہے؟ ہمارے سوالات کا جواب ایک مسکراہٹ سے دیا گیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ خود ہی یہاں پہنچے ہیں اور جب ان کا دل چاہے گا یہ جگہ چھوڑ دیں گے درحقیقت تمام دروازے کھلے ہوئے ہیں اور ان پر شیشے یا جالی کی کوئی روک نہیں جو ان سانپوں کو مندر میں اندر رہنے پر مجبور کرے۔

بس کو (Saigon) سائیگون جانے کے لئے پنیانگ میں پھیلے ہوئے جنگل اور انڈوچائنا کے دیہات سے ہو کر گزرنا تھا۔ میری زبان کو کوئی بھی نہ سمجھتا تھا اور نہ ہی میں کسی کی زبان سے واقف

تھا۔ ہم جنگل میں ناختم ہونے والی سڑک پر کسی جگہ رکتے اور ترچھی آنکھوں والے لئے دیئے غیر معمولی لباس میں ملبوس دہقان مسافراترتے۔ اب پرانی شکستہ بس میں جواس تاریک رات میں بکھر جانا چاہتی تھی بس تین یا چار مسافر رہ گئے تھے۔

اچانک میں گھبرا گیا۔ میں کہاں تھا؟ میں کدھر جارہا تھا؟ آخر کس لئے میں اجنبیوں کے درمیان یہ ناختم ہونے والی رات کاٹ رہا تھا۔ ہم (Laos) لاؤس سے (Cambodia) کمبوڈیا میں داخل ہو رہے تھے۔ میں نے بغور اپنے آخری مسافر ساتھیوں کے چہروں کو دیکھا ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ لٹیرے نظر آتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہ تھا۔ کہ میں ان ڈاکو وضع کے لوگوں کے مابین بیٹھا تھا, جن کا ذکر مشرق کی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو دیکھا اور میری طرف گھورا ـــــ بس جنگل کے وسط میں بالکل ساکت ہو گئی۔

میں نے اس جگہ کا انتخاب کیا, جہاں میں مروں گا (میں انہیں خود کو ان اجنبی درختوں کے پاس قربانی کے لئے نہ لے جانے دوں گا) جن درختوں کے تاریک سائے آسمان کو کاٹتے ہیں۔ میں یہیں اسی شکستہ حال بس کی اس بنچ پر مرجاؤں گا۔ اس بس میں, جہاں مرغیوں, سبزیوں کی بھری ہوئی ٹوکریاں اور پیٹیاں رکھی ہیں۔ اس غضبناک لمحے کی وہ واحد دوست اشیاء جنہیں میں نے اپنے قاتلوں کے غیض و غضب کا مقابلہ کرنے کے لئے ادھر ادھر دیکھا اور پھر میں نے غور کیا کہ وہ بھی غائب ہو گئے تھے۔ میں خاصی دیر تک تن تنہا اس غیر مانوس سخت اندھیری رات میں, جب میری روح مکمل طور پر نکلی جا چکی تھی انتظار کرتا رہا ـــــ میں مرنے والا تھا اور کسی کو بھی اس کے بارے میں علم نہ ہو گا۔ اپنے چھوٹے سے محبوب وطن سے اس قدر دور اپنی کتابوں اور ان سب سے جنہیں میں پیار کرتا تھا اتنی دور اچانک ایک روشنی نمودار ہوئی اور پھر سڑک روشنیوں میں زندہ ہو گئی۔ وہاں ڈھول کی آواز تھی۔ کمبوڈین موسیقی کی تیز آواز بانسریاں, ڈھول اور ٹارچوں کی روشنی نے سڑک کو اجالے اور موسیقی سے بھر دیا تھا ایک آدمی اندر آیا اور انگریزی میں بولا

"بس خراب ہو گئی ہے چونکہ خاصا انتظار کرنا ہو گا, شاید صبح ہونے تک اور یہاں سونے کے لئے جگہ نہیں ہے لہذا مسافر موسیقاروں اور رقاصوں کے گروہ کو ڈھونڈنے گئے تھے, تاکہ تمہاری تفریح کا سامان ہو سکے"۔

گھنٹوں ان درختوں کے نیچے, جو اب قطعاً ذلیل کرتے نظر نہ آتے تھے میں سورج نکلنے تک ایک شریف اور قدیم ثقافت کے ناچوں کو دیکھتا رہا اور موسیقی سنتا رہا۔

شاعر لوگوں سے نہیں ڈر سکتا۔ زندگی مجھے انتباہ کر رہی تھی اور ایک ایسا سبق پڑھا رہی تھی, جو میں کبھی نہ بھولوں گا ـــــ مخفی عزت کا سبق ایک برادری کے بارے میں, جسے ہم بالکل

نہیں جانتے، خوبصورتی کے بارے میں جو تاریکی میں کھلتی ہے۔

ہندوستان میں ایک کانگریس

یہ ایک فتح مند دن ہے۔

ہم انڈین نیشنل کانگریس پارٹی کے اجتماع میں موجود ہیں۔

ایک ایسی قوم، جو آزادی کی خاطر جنگ لڑ رہی ہے۔ ہزاروں مندوبین گیلریوں میں جمع ہیں۔ میں وقت کے ایک سرکردہ رہنما گاندھی اور پنڈت موتی لعل نہرو سے ملتا ہوں۔ موتی لعل نہرو کا سجیلا جوان بیٹا جواہر لعل حال ہی میں انگلستان سے واپس لوٹا ہے۔

نہرو آزادی کا خواہاں ہے۔ جبکہ گاندھی پہلے قدم کے طور پر محض صوبائی خود مختاری چاہتا ہے۔ گاندھی ایک چالاک لومڑی کی واضح تصویر رکھتا ہے۔ ایک عملی انسان ہمارے پرانے عہد کے کریول رہنماؤں کی وضع کا سیاست دان۔ ایک شاطر ذہن، ایک عیار اور ناقابل شکست چالوں کا ماہر جوں ہجوم اس کی سفید دھوتی کے دامن کو پرستش کے انداز میں چھوتا ہوا گاندھی جی، گاندھی جی کہتا ہوا آگے بڑھتا ہے. وہ انہیں فرض سمجھتے ہوئے سلام کرتا ہے۔ اور اپنی عینک اتارے بغیر مسکراتا ہے۔ وہ پیغامات وصول کرتا ہے، انہیں پڑھتا ہے۔ وہ بغیر تردد کے برقیوں کا جواب دیتا ہے۔ وہ ایک درویش ہے، جو کبھی نہیں تھکتا۔ نہرو ان کے انقلاب کا مشتہر تھا۔

کانگریس کی قد آور شخصیات میں سے ایک شخصیت سبھاش چندر بوس کی تھی جو اپنے ملک کا ایک شدت پسند جذباتی سیاست دان ہونے کے ساتھ ساتھ سامراجیوں کا شدید مخالف اور ہندوستان کا ایک پسندیدہ سیاسی رہنما تھا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں جاپانی حملے کے دوران اس نے برطانوی سامراج کے خلاف حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا۔ بہت سال بعد یہاں ہندوستان میں اس کے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ کس طرح سنگاپور کا قلعہ زیر نگیں ہوا تھا۔

"ہمارے ہتھیار جاپانی محاصرہ کرنے والوں کے لئے سکھائے گئے تھے. اچانک ہم نے خود سے سوال کرنا شروع کیا کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ ہم نے اپنے سپاہیوں کو موڑا اور اپنی بندوقوں کو برطانوی فوجوں کی طرف کر دیا۔ یہ بہت آسان تھا۔ جاپانی حملہ آور محض وہاں سے گزر رہے تھے جبکہ انگریز یہاں صدیوں سے آباد تھے"

سبھاش چندر بوس گرفتار ہوا۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا اور بغاوت کا جرم ثابت ہونے پر ہندوستان میں برطانوی عدالت نے اسے سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ اس کے خلاف احتجاج کرنے والوں کی تحریک نے آزادی کی تحریک کو دوچند کر دیا۔ بالآخر بہت سی قانونی لڑائیوں کے بعد اس

کے وکیل خود نہرو نے اس کے لئے آزادی کو جیت لیا۔ اس لمحے سے وہ بے پناہ مقبول شخصیت بن گیا۔

لیٹے ہوئے دیوتا

ہر طرف گوتم بدھ کے مجسمے ـــــ بدھ دیوتا

سیدھے بیٹھے ہوئے کرم خوردہ مجسمے، جن پر سنہری رنگ کے جانوروں کی مانند رنگ لگا ہو۔ تباہ ہوتے ہوئے، جیسے ہوا انہیں خراب کر رہی ہو۔

..........ان کے گالوں، ان کے لباسوں کی تہوں میں، کہنیوں پر، ناف اور منہ میں اور مسکراہٹ پر چھوٹے چھوٹے چھلے، کائی کے دھبے، جنگلی فضلے کی باقیات.......... یا بیٹھے ہوئے، بہت بڑے مجسمے ـــــ چالیس میٹر پتھر، ریت، گرینائیٹ، پیلے، سرسراتے ہوئے بتوں کے درمیان اچانک جنگل کے کسی کونے سے ابھر کر سامنے آتے ہوئے..........

خوابیدہ یا غیر خوابیدہ۔ وہ وہاں سینکڑوں سال، ہزاروں سال بلکہ نہ جانے کتنے ہزاروں سال سے موجود ہیں.......... اس کے باوجود امن کے بارے میں ان کے ہاں کچھ فرمائش ہے اور وہ کسی اور دنیا کے فیصلہ نہ کرنے والے مزاج کے بارے میں جانے جاتے ہیں، اس خواہش میں کہ رہیں یا چلے جائیں اور وہی نرم پتھریلی مسکراہٹ، شاہانہ اور بے وزن لیکن اس کے باوجود سخت اینٹ پتھر سے بنی ہوئی ـــــ کس پر؟ کتنے بہت سوں پر؟ اس خون رنگ سیارے میں وہ مسکرا رہے ہیں..........؟

تیز تیز چلتی ہوئی ایک دیہاتی عورت پاس سے گزر گئی۔ آگ کی طرف سے مرد جنگجو سپاہی، جھوٹے پروہت، سیاح جو سب کچھ چٹ کر جاتے ہیں.......... اور مجسمہ اپنی جگہ پر قائم رہا۔ پتھر کا عظیم مجسمہ، گھٹنوں، لباس میں سلوٹوں کے ساتھ ایک ایسی نگاہ کے ساتھ جو دور کہیں فاصلے پر گم ہے اور پھر بھی یہیں موجود ہے۔ مکمل طور پر غیر انسانی اور پھر بھی کسی قدر انسانی کسی صورت یا تضاد میں ایک مجسمہ، دیوتا یا دیوتا نہیں، پتھر یا پتھر نہیں چیختے ہوئے پرندوں کے شور تلے، سرخ پروں والے پرندوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ میں محسور جنگل کے پرندوں میں..........

ہمیں ورثے میں ملے ہوئے اذیت ناک ہسپانوی یسوع مسیح یاد آتے ہیں.......... زخموں، پھوڑوں، زخموں کے نشانوں اور کلیساؤں میں وہی شمعوں کی چھوڑی ہوئی بند کمروں کی مخصوص بو کے ساتھ.......... ان یسوع مسیحیوں کے انسان یا دیوتا ہونے کے بارے میں ثانوی خیالات تھے .... انہیں انسان بنانا، ان لوگوں کے قریب لانا، جو دکھ جھیل رہے ہوں، دایاں، وہ جن کے

سر کاٹ ڈالے گئے ہوں، معذور حریص لوگ، کلیسا کی اندرونی سیاست اور کلیسا کے باہر کے حالات، انہیں انسان بنانے کے لئے سنگ تراشوں نے ان کے جسموں پر زخم دکھائے لیکن یہ سب دکھوں کے مذہب پر ختم ہو گیا۔ گناہ کرو گے تو مصیبت اٹھاؤ گے۔ گناہ نہ کرو گے تب بھی دکھ جھیلو گے۔ زندہ رہو گے دکھ اٹھاؤ گے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی رستہ نہیں۔ یہاں بھی نہیں یہاں محض پتھر کو امن ملا۔ سنگ تراشوں نے درد کی توپوں کے خلاف بغاوت کی اور یہ عظیم بدھا، جن کے پاؤں دیو قامت دیوتاؤں کی مانند ہیں اپنے پتھریلے چہرے پر انسانی مسکراہٹ لئے ہوتے ہیں، ان تمام مذاہب کے بغیر.......... اور ان سے مردہ کمروں، مکڑی کے جالوں کی بو کے بجائے امن کی ہریالی کی مہک آتی ہے۔ اچانک چلنے والے ہوا کے جھونکے کی جو ان پر پروں، پتوں اور زرگل کی مانند لامحدود جنگل سے چکروں میں اترتے ہیں۔

بد نصیب انسانی خاندان

اپنی شاعری پر ان گنت مضامین میں، میں نے یہ پڑھا ہے کہ مشرق بعید میں میرے قیام نے شاعری پر کئی جہتوں سے اثر مرتب کیا ہے بطور خاص میری نظموں کے مجموعے Residencia en la tierra) کی نظمیں وہ واحد نظمیں ہیں، جو میں نے اس زمانے میں لکھیں لیکن اس بات کے دفاع میں اتنی دور جائے بغیر میں یہ کہتا ہوں کہ اثر ڈالنے کا یہ سلسلہ ایک غلط فہمی ہے۔

مشرقی ممالک کے تمام پراسرار فلسفے، جب حقیقی زندگی کا سامنا کرتے ہیں تو اضطراب، اعصابیت، ذہنی پیچیدگی اور مغرب کی مفاد پرستی کا پیدا کردہ نتیجہ نظر آتے ہیں، جو سرمایہ دارانہ رہنما اصولوں کا بحران ہے۔ اس عہد کے ہندوستان میں کسی کے لئے بھی خود اپنی ذات پر توجہ دینے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ نو آبادیاتی صورتحال، جو ذلت کے ہاتھوں خاموشی سے ہیضہ، چیچک، بخار اور بھوک سے مرنے والوں کی بیچارگی پر قائم تھی۔ اس پر ہندوستان کے جاگیردارانہ ماحول، ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی، اور صنعتی کس مپرسی نے زندگی پر ایسی خوفناک مہر لگا دی تھی کہ صوفیانہ طرز حیات کا اظہار غائب ہو گیا تھا۔ عموماً صوفیانہ مراکز مغرب سے آئے ہوئے مہم جو حضرات پر جن میں شمالی اور جنوبی امریکہ دونوں کے لوگ شامل تھے، چل رہے تھے۔ بے شک ان میں سے کچھ لوگ اس بارے میں سنجیدہ فکر کے حامل تھے۔ لیکن بیشتر کی تعداد ارزاں بازاری ہتھکنڈوں میں ملفوف ماورائی قسم کی گفتگو کے بڑے پیمانے پر فروخت کا دھندا تھا یہ لوگ ہمیشہ یوگا اور دھرما کے بارے میں تقریریں کرتے اور مذہبی قلابازیوں میں بلند بانگ لیکن خالی نعرے لگانے میں مصروف نظر آتے۔ ان وجوہات کی بنا پر مشرق مجھے ایک بڑے بد نصیب انسانی خاندان کی طرح

لگا. جس نے میرے لاشعور میں اپنے دیوتاؤں اور رسومات کے لئے کوئی جگہ نہ چھوڑی۔

میں نہیں کہتا کہ اس عہد میں میری شاعری نے، محض ایک خارجی انسان کی تنہائی کے بارے میں، جس کو باہر سے ایک منتشد د اور قطعاً اجنبی دنیا میں لا کھڑا کیا ہو، عکاسی کی ہے۔ میں مخفی علوم کے ان سیاحوں میں سے ایک کو جو سبزی خور ہونے کے علاوہ استاد بھی تھا یاد کرتا ہوں وہ ایک کوتاہ قد گنجا، نیلی آنکھوں والا ادھیڑ عمر کا کردار تھا، جس کا نام (Powers) پاورز تھا۔ جس کی مراقیوں جیسی تیزنظر آپ میں سے گزر سکتی تھی۔ وہ بدھ مت کا ایک پیروکار تھا جو شمالی امریکہ سے یہاں آیا ہوا تھا اور ہمیشہ اپنے لیکچروں کو خوراک کی احتیاط پر یہ کہتے ہوئے ختم کرتا "جیسا کہ راک فیلر کہا کرتا تھا، ہر روز ایک سنگترہ کھائیں" اس کی شگفتہ مزاجی اور طبیعت میں فراخی مجھے پسند آئی۔ وہ ہسپانوی زبان بولتا تھا۔ اور اس کے لیکچر کے بعد ہم پیٹ بھر کر بھیڑ کا گوشت اور پیاز کھایا کرتے۔ وہ بدھ مت کا پیروکار تھا یا نہیں، میں نہیں جانتا مگر وہ آدمی خوب تھا۔

اس کے لیکچر سے کہیں زیادہ اس کی بسیار خوری قابل اعتماد تھی۔ جلد ہی اسے عشق کا روگ لگ گیا۔ پہلے تو ایک پچ ذات کی لڑکی کے ساتھ جو اس کے لباس اور فلسفے کے بارے میں پاگل تھی۔ وہ خون کی کمی کا شکار ایک نوجوان لڑکی تھی، جس کی بڑی بڑی اداس آنکھیں تھیں۔ وہ پاورز کے بارے میں یقین رکھتی تھی کہ وہ بدھا کا زندہ روپ ہے اور اس طرح مذاہب جنم لیتے ہیں۔ کئی ماہ اس عورت کے ساتھ گزارنے کے بعد ایک دن وہ مجھے اپنی نئی شادی کی دعوت دینے آیا۔ اس کی موٹر سائیکل پر جو اسے ریفریجریٹر کی ایک کمپنی کے سیلزمین کی حیثیت سے ملی تھی، جلد ہی ہم عبادت گاہوں، درختوں کے جھنڈوں، چاولوں کے کھیتوں کو اپنے پیچھے چھوڑتے ہوئے بالاخر ایک چھوٹے سے دیہات میں چینی گھر اور اس کے مکینوں تک پہنچ گئے۔ پاورز کا موسیقی اور آتش بازی سے استقبال کیا گیا۔ دلہن اپنے سفید میک اپ میں ایک بلند کرسی پر جو وہاں موجود تمام کرسیوں سے اونچی تھی، خاموش بیٹھی رہی۔ موسیقی کے دوران ہم رنگ ہارنگ کے مشروب پیتے رہے۔ اس اثناء میں ایک بار بھی پاورز یا اس کی بیوی نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی۔ ہم شہر واپس آگئے اور اس نے بتایا کہ اس شادی کی تقریب میں محض اس کی دلہن نے حصہ لینا تھا۔ اس کے وہاں نہ ہوتے ہوئے بھی یہ تقریبات جاری رہیں گی۔ بعد میں وہ اس کے پاس رہنے کو چلا گیا۔

"تم جانتے ہو کہ تم کئی شادیاں کر چکے ہو"

"میری دوسری بیوی جانتی ہے اور بہت خوش ہوگی" اس نے کہا۔ اس کا یہ کہنا بھی اس قدر سچا تھا جتنی اس کی سنگترے والی کہانی۔ جب ہم اس کے گھر پہنچے، اس کی پہلی بیوی کا گھر تو ہم

نے وہاں اس کی کم ذات دکھیا بیوی کو زہر کی پیالی اور ایک الوداعی خط کے ساتھ مردہ پایا۔ اس کا گہرے رنگ کا تقریباً عریاں جسم، مچھردانی کے اندر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ شاید کئی گھنٹے اس نے عذاب کو جھیلا تھا۔ باوجودیکہ کہ اب مجھے پاورز سے نفرت ہو رہی تھی، لیکن اس لمحے میں میں اس کے ہمراہ رہا کہ اس کا دکھ واقعی صحیح تھا۔ ہم نے سستے سے تابوت کو دریا کنارے جلتی ہوئی لکڑیوں کے ڈھیر پر رکھ دیا۔ اس نے چتا کو آگ لگائی اور سنسکرت زبان میں کچھ بولنے لگا۔ نارنجی رنگ میں ملبوس سازندوں نے اداس کر دینے والی دھنیں بجائیں۔ چتا آہستگی سے جلتی رہی پھر بھی اسے دوبارہ جلایا گیا۔ دریا اپنے کناروں کے درمیان بے حسی سے بہتا رہا مشرق کے ابدی آسمان نے بھی لاتعلقی کا اظہار کیا ــــ ایک غریب تنہا اور قابل رحم لڑکی کے لئے کبھی نہ ختم ہونے والی بے توقیری۔

ہر تیسرے مہینے جب کوئی بحری جہاز کلکتہ سے چائے اور جمی ہوئی پیرافین سے لدا چلی کے لئے آتا تو میرا وہاں ہونا ضروری ہوتا تاکہ کاغذات پر دستخط اور مہریں لگ سکیں۔ یہ سب میرے دفترانہ فرائض میں شامل تھا۔ اور پھر اس دوران میرا خالی وقت بازاروں اور مندروں میں گزرتا ــــ میری شاعری کے لئے یہ سب سے اذیت ناک دور تھا۔ سڑکیں میرا مذہب بن چکی تھیں۔ برما کی سڑک کا چینی حصہ، جس میں اوپن ایئر تھیٹر، کاغذی ڈریگن اور چمکدار لالٹینیں ہوتیں۔ ہندو اسٹریٹ، سب سے حقیر تھی، جہاں مندروں میں ایک مخصوص ذات کاروبار کرتی اور غریب لوگ باہر کیچڑ میں لوٹتے۔

بازار، جہاں پان کے پتوں کے سبز اہرام اور (Malachite) میلاچائٹ کے پہاڑ بنے نظر آتے۔ دکانیں جہاں جنگلی جانور اور پرندے فروخت ہوتے۔ بل کھاتی گلیاں، جہاں گداز بدنوں والی برمی عورتیں اپنے منہ میں لمبے لمبے چرٹ تھامے چلتیں۔ یہ سب مجھے اپنی طرف کھینچتا اور بتدریج میں حقیقی زندگی کے سحر میں گرفتار ہو جاتا۔ ذات کی تقسیم کے نظام نے ہندوستانی لوگوں کو ایک ایمفی تھیٹر کی شکل میں، جو لوہے کی نالیوں سے حصوں میں منقسم ہوتا ہے سجا رکھا تھا۔ جہاں ایک دوسرے پر ان کے دیوتا براجمان تھے۔ انگریزوں نے بھی اسی طرح اپنی ذات کے نظام کو برقرار رکھا ہوا تھا جو چھوٹی دکانوں کے کلرکوں سے شروع ہو کر پیشہ ور لوگوں اور دانش وروں سے ہوتا ہوا مال برآمد کرنے والے تاجروں سے اس نظام کی چھت کے چمن پر ختم ہوتا، جہاں سول سروس کے اعلیٰ عہدے دار اور ایمپائر کے بڑے بڑے بینکر متمکن ہوتے۔

یہ دو دنیائیں کبھی ایک دوسرے کو نہ چھو پائیں۔ ملک کے اصل باشندے انگریزوں کے لئے مقرر کی گئی جگہوں پر نہ جا سکتے تھے اور انگریز ملک کی دھڑکتی ہوئی نبض سے بہت دور رہائش پذیر

تھے اس صورتحال نے میرے لئے خاصے مسائل پیدا کر دیئے۔

میرے برطانوی دوستوں نے مجھے گھوڑا گاڑی میں دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا اور مشورہ دیا کہ ایک قونصل کو اس قسم کی گاڑی استعمال کرنا زیب نہیں دیتا۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ میں ایرانی ریستورانوں میں نہ جایا کروں، جہاں میں نے شفاف چھوٹی پیالیوں میں دنیا کی بہترین چائے کو پیا تھا۔ یہ آخری انتباہات تھے، جن کے بعد انہوں نے مجھے کبھی مدعو نہ کیا۔

یہ لاتعلقی مجھے کبھی بھی خوش نہ کر سکتی تھی۔ وہ ناقابل برداشت یورپین قطعاً دلچسپ نہ تھے اور پھر یہ بھی تھا کہ میں مشرق میں اپنی زندگی ان عارضی نو آبادیاتی حکمرانوں کے ساتھ گزارنے تو نہیں آیا تھا۔ بلکہ میں تو دنیا کی اس قدیم ترین روح اور اس بڑے بدنصیب انسانی خاندان کے ساتھ رہنے آیا تھا۔ میں وہاں کے لوگوں کی طرز معاشرت اور زندگی میں اتنا گہرا اتر گیا کہ ایک مقامی لڑکی کو اپنا دل دے بیٹھا باہر وہ ایک انگریز خاتون کے لباس میں ملبوس ہوتی اور اپنا نام (Josie) جوسے بلس (Bliss) بتاتی لیکن اپنے گھر کی تنہائی میں جو جلد ہی مجھے نصیب ہو گئی، وہاں اس نے وہ لباس ایک شاندار سارنگ پہننے کے لئے اور اپنا خفیہ برمی نام بتانے کے لئے اتار ڈالا۔

رنڈوے کا رقص

میری گھریلو زندگی تکلیف دہ تھی۔ دل پذیر جوسے بلیس آہستہ آہستہ اس قدر متقاضی اور مجھ پر حاوی ہوتی چلی گئی کہ اس کے جلاپے کے دوروں نے بیماری کی صورت اختیار کر لی۔ ورنہ شاید میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہ لیتا میں اس کے ننگے پیروں سے پیار کرتا تھا، اس کے سیاہ بالوں کو روشن کرتے ہوئے پھولوں سے مجھے عشق تھا۔ لیکن اس کے غیض و غضب نے اسے وحشیانہ دوروں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ میرے لئے آنے والے ہر برقیے کو کھولے بغیر چھپا دیتی وہ اس ہوا میں، جس میں میں سانس لیتا، سلگتی رہتی۔

بسا اوقات ایک روشنی مجھے جگا دیتی۔ مچھر دانی کے دوسری جانب حرکت میں ایک بھوت ــــ سفید لباس میں ملبوس یہ جوسے بلیس ہوتی ــــ بغیر اس ارادے کے کہ مجھے قتل کر دے، وہ اپنے ہاتھ میں لمبے پھل والا مقامی چاقو تھامے ہوئے گھنٹوں وہ میرے بستر کے گرد اسی طرح گھومتی رہتی۔

وہ کہا کرتی تھی۔ جب تم مرو گے تو میرے خدشات ختم ہو جائیں گے۔ اگلے ہی دن وہ پراسرار رسومات کو دہراتی تاکہ مجھے وفادار رکھ سکے۔ وہ یقیناً کسی روز مجھے مار ڈالتی۔ خوش قسمتی، سے مجھے سرکاری طور پر سیلون کی منتقلی کا خط مل گیا۔ میں نے خفیہ طور پر وہاں سے

روانگی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اور ایک روز اپنے کپڑے اور کتابیں وہیں چھوڑ کر، میں نے گھر کو معمول کے مطابق خیرباد کہااور اس بحری جہاز پر سوار ہو گیا، جسے مجھے وہاں سے بہت دور لے جانا تھا۔

میں جوسے بلیس کو جو ایک وضع کا بری چیتا تھی دکھی دل کے ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ بحری جہاز بمشکل خلیج بنگال میں داخل ہی ہوا ہو گا کہ میں نے ایک دکھ بھری نظم (Widower,s Tango) کو لکھنا شروع کیا جو ایک ایسی عورت کے نام منسوب تھی جو مجھ سے بچھڑ گئی تھی اور جس نے مجھے کھو دیا تھا، محض غصے کے اس آتش فشاں کے باعث جو مسلسل اس کے لہو میں کھولتا رہتا تھا۔

تب رات اس قدر طوفانی لگی اور زمین اتنی تنہا!

افیم

تمام گلیاں افیم کے لئے الگ کر دی گئی تھیں.......... نشے باز چھوٹی بنچوں پر لیٹے ہوئے تھے.......... درحقیقت وہ ہندوستان کی مقدس جگہوں میں تھے..... ان میں عیش و آرام کا کوئی نشان نہ تھا۔ نہ وہاں ریشمی تکیئے تھے نہ ہی پوشش۔ کچھ بھی نہیں سادہ سے خالی بانسوں کے بنے ہوئے بنچ اور چینی پورسیلین کے تکیئے..... ایک ایسے تقدس اور سجاوٹ کا ماحول تھا جو مندروں میں نہیں ملتا..... خواب دیکھنے والے نہ ہلے نہ کوئی آواز نکالی..... میں نے ایک پائپ سے کش لگائے..... اس میں کچھ بھی نہ تھا علاوہ گرم دودھیا دھویں کے..... میں نے چار کش لگائے اور پانچ روز بیمار پڑا رہا، ایک ایسی استفراغی حالت میں، جو میری ریڑھ کی ہڈی سے اٹھتی تھی اور میرے دماغ سے اترتی تھی..... روشنی اور خود زندگی کے لئے نفرت افیم کا انتقام..... اس میں اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہئے اتنا کچھ کہا جا چکا ہے۔ اتنا لکھا گیا ہے۔ بریف کیسیوں اور تھیلوں میں اس قدر بھرا جا چکا ہے تاکہ کسٹم سے اس زہر کو بچایا جائے مشہور زمانہ مقدس زہر!.......... مجھے اپنی متلی کی کیفیت پر قابو پانا ہو گا۔

افیم سے آشنا ہو جاؤ۔ اس کا تجربہ کرو، اس سے پہلے کہ میں کوئی فیصلہ دے سکوں.......... میں نے کئی بھرے ہوئے پائپ کش لگا کر ختم کئے حتیٰ کہ میں جان گیا۔ کوئی خواب نہیں، نہ ہی خیالی تصویریں کسی قسم کے دورے کی کیفیت نہیں..... ذائل ہوتی ہوئی طاقت کی ایک نغماتی صورت حال بالکل جیسے کبھی نہ ختم ہونے والی ہلکی سی دھن ہوا میں موجود ہو..... پھیلتی ہوئی تاریکی ذات میں ایک خالی پن خفیف سی حرکت، کہنی میں، گردن میں، دور سے آتی ہوئی کسی گاڑی کی آواز ہارن یا گلی میں کوئی چیخ ذات کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ ایک لذت آمیز خوابیدہ احساس۔ مجھے سمجھ آ گیا کہ

آخر کیوں باغات سے کرائے کے ہاتھ، دن بھر مزدوری کرنے والے، رکشہ کھینچنے والے جو سارا سارا دن رکشہ کو گھسیٹتے رہے ہیں، یہاں آکر بے حس و حرکت پڑے رہتے ہیں...... افیم جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا، خمار کی کیفیت نہ تھی بلکہ یہ استحصال شدہ لوگوں کے لئے ایک راہ فرار تھی۔

وہاں افیم خانوں میں سارے نشئی غربت کے مارے ہوئے تھے...... وہاں کڑھے ہوئے تکئیے یا عیش و عشرت کا کوئی سامان نہ تھا۔ نہ ہی ان جگہوں پر ذرا سی بھی روشنی اور نہ ہی افیمیوں کی آنکھوں میں کوئی چمک...... کیا وہ آرام کر رہے تھے...... کیا وہ سو رہے تھے؟ یہ میں کبھی نہ جان سکا۔ کوئی نہ بولا...... کبھی کسی نے منہ نہ کھولا...... نہ وہاں فرنیچر تھا، نہ قالین کچھ بھی تو نہیں۔ شکستہ بینچوں پر جو زیادہ بیٹھنے کے باعث چکنی ہو چکی تھیں سوائے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے تکیوں کے جو نظر آتے تھے...... اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ بس خاموشی اور افیم کی بو، حیرت ناک حد تک ناخوشگوار اس کے باوجود طاقتور...... اس میں شک نہ تھا کہ یہی تباہی کا راستہ تھا کالونی بنانے والے طاقتور لوگوں کی افیم محکوموں کے لئے مخصوص تھی۔ داخل ہوتے ہی نشہ کرنے والوں کو اپنے کوٹے کا علم ہو جاتا، ان کا نمبر اور ان کا پرمٹ ان کے لئے تیار ہوتا...... اندر ایک وسیع دھویں میں ملفوف خاموشی کی حکومت ہوتی۔ ایک رکی ہوئی کیفیت جو خاموشی کو ختم کرتے ہوئے تھکن کو لذت آمیز بنا دیتی............

ایک دھندلا سکوت...... ٹوٹے ہوئے حقیر خواب یہاں سکون پاتے...... خواب دیکھنے والے اپنی آدھی بند آنکھوں سے گھنٹوں سمندر میں ڈوبے رہتے۔ تمام رات پہاڑ کی چوٹی پر ایک لطیف اور فرحت بخش کیفیت میں لطف اندوز ہوتے...... اس کے بعد میں کبھی ان افیم خانوں میں نہ گیا...... میں جان چکا تھا۔ میں تجربہ سے گزر گیا تھا۔ میں نے اچھوتوں کو چھو لیا تھا، جو دھویں کے پردے میں چھپے ہوئے تھے۔

سیلون

۱۹۲۹ء میں سیلون، دنیا کے سب سے بڑے اور خوبصورت جزیروں میں سے ایک تھا، جو برما، اور ہندوستان ہی کی طرح نو آبادیاتی صورت حال کا حامل تھا۔ انگریزوں نے خود کو اپنے کلبوں، لاتعداد موسیقاروں، غلاموں، جولاہوں، کمہاروں، زرد لباس والے پنڈتوں اور پتھروں میں ڈھلے ان گنت خداؤں کے ہمسائے میں محسور کر رکھا تھا۔

ہر شام میں ڈنر جیکٹ میں ملبوس انگریزوں اور ہندوؤں کے مابین پھنسا کبھی ان کی من گھڑت بڑائی تک پہنچنے کے بارے میں امید نہ کر سکتا تھا۔ میرے پاس سوائے تنہائی کے کچھ نہ تھا۔ اور اس

طرح وقت میری زندگی میں بالکل تنہا تھا۔ اس کے باوجود، جب میں یاد کرتا ہوں تو وہ سب انتہائی درخشاں تصور لگتا ہے، بالکل جیسے بے حد چمکدار بجلی کا کوندا میری کھڑکی پر آ کر رک گیا ہو، تاکہ میرے مقدر پر روشنی ڈالے۔

میں سمندر کے نزدیک (Wella Watte) ویلا واٹے کے مضافات میں بنے ہوئے نئے بنگلے میں رہنے لگا۔ اس جگہ آبادی بہت کم تھی۔ بس لہریں نزدیکی چٹانوں پر سر پٹکتیں—— شام پڑتے ہی سمندر کی موسیقی نمایاں ہو جاتی۔

صبح کے وقت دھلی ہوئی فطرت کے نکھار کا معجزہ اثر انگیز تھا۔ علی الصبح میں مچھیروں کے ساتھ شامل ہو جاتا۔ ان کی لمبی لمبی کشتیاں بالکل سمندری مکڑیاں لگتیں۔ مچھیرے مختلف رنگوں کی مچھلیاں باہر نکالتے۔ درختوں سے پرندوں جیسی مچھلیاں بعض کی رنگت تو بالکل گہری نیلی مخمل جیسی ہوتی۔ دوسری کانٹے دار غباروں کی مانند ہوتیں۔ ایک خوف کے ساتھ میں ان سمندری ہیروں کا قتل عام دیکھتا غریبوں کو یہ مچھلیاں ٹکڑوں میں فروخت ہوتیں۔ سمندر کی گہرائیوں میں خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی مچھلیوں کو بڑے بڑے چاقو ٹکڑوں میں تقسیم کرتے ہوئے اسے خون آلود تجارت میں منتقل کر دیتے ساحل پر ٹہلتے ہوئے، میں ہاتھی کے نہانے کے سوراخ کے پاس آ جاتا اپنے کتے کے ہمراہ میں رستہ نہیں بھول سکتا تھا۔ ساکن پانی سے ایک مٹیالے رنگ کی بے حرکت کھبی نمودار ہوتی، جو جلد ہی سانپ کی شکل اختیار کر لیتی اور پھر ایک بڑا سر باہر آتا اور آخر کار ایک سونڈ کے ساتھ ایک پہاڑ ابھر آتا دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو، جہاں اتنے سارے ہاتھی سڑکوں پر کام کرتے نظر آئیں۔ کبھی بھی چڑیا گھر کے پنجرے یا سرکس کی مدد سے کہیں دور یہ ایک دلچسپ منظر تھا۔ کٹے ہوئے درختوں کے تنوں کو اٹھاتے اور اتارتے ہوئے بالکل دیو پیکر محنت کشوں کی مانند

کتا اور نیولا میرے واحد ساتھی تھے۔ کتا جنگلی تھا، لیکن مادہ نیولا میرے پاس ہی رہ کر بڑی ہوئی تھی۔ وہ میرے بستر میں سوتی۔ میرے ساتھ میز پر کھانا کھاتی، کوئی بھی نیولے کے محبت بھرے مزاج سے واقف نہیں۔ میری پالتو مادہ نیولا میرے روزمرہ کے کاموں سے واقف تھی۔ وہ میرے کاغذوں پر کودتی اور سارا دن میرے پیچھے دوڑتی رہتی۔ دوپہر کو کھانے کے بعد وہ میرے سر اور شانے کے درمیان سمٹ کر سو جاتی۔ جنگلی جانوروں کی برتی نیند

میری پالتو نیولا سارے ہمسائے میں مشہور ہو گئی تھی۔ زہریلے کوبرا سے نیولوں کی بہادرانہ جنگوں نے انہیں اساطیری عزت بخش دی تھی اور میں اس میں یقین کرتا ہوں کہ کئی بار ان کی سانپوں سے لڑائی کو دیکھ چکا تھا جنہیں وہ اپنی پھرتی اور سخت چتکبری جلد کے باعث جو سانپوں کو دھوکا دیتی ہے، ہرا دیتے ہیں۔ دیہاتی لوگوں کا خیال ہے کہ لڑائی کے بعد نیولا ایسی جڑی بوٹیوں کی

تلاش میں چلا جاتا ہے جو زہر کا تریاق ہوتی ہیں۔ بہر حال میری مادہ نیولا کی شہرت ایک روز محلے کے بچوں کو تیسرے پہرے ایک شاندار جلوس کی شکل میں میرے گھر لے آئی۔ گلی میں ایک بڑا سانپ نکل آیا تھا اور وہ مجھ سے نیولے کی مدد لینے کے لئے آئے تھے۔ اپنے چاہنے والے تامل اور سینہالی بچوں کے ہمراہ میں نیولے کو گود میں لئے ہوئے اس جگہ تک پہنچا، جہاں ایک انتہائی خطرناک سیاہ رنگ کا سانپ جو شاید رسل وائپر یا پھر یولونگا تھا اور جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کا کاٹا نہیں بچتا۔ وہ پانی کی ایک نالی پر اگی ہوئی خودرو گھاس میں بالکل برف پر کوڑے کی مانند موجود تھا۔ میرے پیچھے آنے والے خاموشی سے رک گئے تھے۔ میں نے اس نالی تک پہنچ کر اپنے نیولے کو سانپ سے دو میٹر کے فاصلے پر چھوڑ دیا۔ نیولے نے خطرے کو بھانپتے ہوئے سانپ کی طرف پیش قدمی کی میرے ننھے دوست اور میں دم سادھے کھڑے تھے۔ میدان کارزار میں جنگ شروع ہونے والی تھی۔ سانپ نے کنڈلی ماری اور اپنے پھن کو اٹھا کر اپنی مقناطیسی آنکھوں کو ننھے سے جانور پر گاڑ دیا۔ مادہ نیولا آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور اس عفریت کے منہ سے محض چند سینٹی میٹر کے فاصلے پر پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ کیا ہونے والا ہے اور تب وہ ایک لمبی جست لگا کر مخالف سمت میں مڑی اور سانپ اور تماشائیوں کو اپنے پیچھے چھوڑتی ہوئی رکے بغیر میری خوابگاہ تک پہنچ کر دم لیا اور اس طرح تمیں سال سے بھی کہیں پہلے ویلا واٹے کے مضافات میں، میں ذات سے گر گیا تھا۔

دوسرے دن میری بہن میرے لئے ایک کاپی لے آئی، جس میں میری شروع زمانے کی لکھی ہوئی نظمیں تھیں۔ ان نظموں کا زمانہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۱۹ء کے درمیان کا تھا انہیں پڑھتے ہوئے مجھے نظموں کے بچگانہ پن اور نوجوانی کی اداسی پر مسکرانا پڑا ادبی شعور کی وہ تنہائی جو میرے جوانی کے افکار میں موجود تھی۔ کسی بھی پختہ کار ادیب کے مقابلے میں نوجوان ادیب اس تنہائی کے بغیر نہیں لکھ سکتا، بیشک وہ محض خیالی ہی ہو۔ اس کے مقابلے میں پختہ کار ادیب، جو کچھ بھی تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن جس میں معاشرے اور انسان کے لئے ہمدردی کی مہک نہیں ہوتی۔ میں نے ویلا واٹے میں ان دنوں تنہائی کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ اس سارے زمانے میں، میں فیلڈ میں استعمال ہونے والے عارضی سے پلنگ پر سویا۔ میری دسراہٹ کے لئے بس ایک میز، دو کرسیاں میرا کام، کتا، نیولا اور وہ لڑکا تھا، جو سارے دن گھر کا کام کرتا اور رات کو اپنے گاؤں چلا جاتا۔ اس نوکر کو تو ساتھی بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ اس کا رتبہ مشرقی خادم کا تھا، جسے سائے سے بھی زیادہ خاموش رہنا پڑتا ہے اس کا نام شاید برامپی تھا یا ہے۔ اسے کسی قسم کے احکامات دینے کی ضرورت نہ ہوتی کیونکہ وہ ہمیشہ ہر چیز کو تیار رکھتا۔ میز پر میرا کھانا، میرے استری

شدہ کپڑے، بر آمدے میں وہسکی کی بوتل، لگتا تھا وہ بولنا بھول چکا ہے۔ بس ایک چیز جو اسے آتی تھی، وہ بڑے بڑے دانتوں کو نکال کر مسکرانا تھا۔ تنہائی اس صورت میں لکھنے کے لئے موزونیت والا معاملہ نہ تھا بلکہ قید خانے کی دیوار تھی، جس سے آپ اپنا سر بھی ٹکراتے تو کوئی دیکھنے نہ آتا قطع نظر اس کے کہ آپ کتنا ہی چیختے یا روتے۔

نیلگوں ہوا کے اس پار زرد ریت کی دوسری جانب زمانہ ازل کے جنگلوں سے دور خطرناک سانپوں اور ہاتھیوں سے بھی پرے، مجھے احساس ہوا کہ سینکڑوں ہزاروں انسان پانی کے قریب گاتے ہوئے کام کرتے، آگ کو روشن کرتے، گھڑوں کو ڈھالتے اور جذباتی عورتیں، پتلی چٹائیوں پر بے پناہ ستاروں کی روشنی میں برہنہ سوتیں۔ لیکن میں بھلا کس طرح دشمن تصور کئے بغیر اس دھڑکتی ہوئی دنیا تک پہنچ پاتا؟ آہستہ آہستہ میں جزیرے کی زندگی سے مانوس ہو گیا اور ایک رات دعوت میں شمولیت کی خاطر میں کولمبو کے سارے تاریک مضافات کو عبور کر گیا۔ ایک گھر سے کسی بچے یا پھر کسی عورت کے گانے کی آواز آئی میں نے ایک سادہ سے دروازے پر رکشہ کو رکوایا۔ میں خوشبو سے مسحور ہو چکا تھا سیلون کی نہ چوکنے والی خوشبو کی تیز مہک ــــ ایک ایسی خوشبو جس میں چنبیلی۔ ناریل کے تیل، فرنگی پانی اور میگنولیا کی خوشبو شامل تھی۔ سیاہ چہروں نے جن میں رنگ اور رات کی بو شامل تھی، مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔ میں خاموشی کے ساتھ ایک چٹائی پر بیٹھ گیا جبکہ اس پراسرار انسانی آواز جس نے مجھے رکنے پر مجبور کر دیا تھا، تاریکی میں گانا شروع کر دیا۔ بچے یا عورت کی کانپتی ہوئی اور سسکیاں لیتی ہوئی آواز ایک ناقابل یقین بلندی تک پہنچ گئی۔ پھر اچانک جیسے اسے کاٹ دیا گیا ہو اور وہ اتنی مدھم ہو گئی کہ تاریکی سے سائے کی طرح مل گئی، فرنگی پانی کی مہک سے لپٹتی ہوئی خود کو پیچیدگی میں بل دیتی اور پھر اچانک اپنے نقرئی بوجھ کے ساتھ گرتی ہوئی جیسے کہ اس کی بلند تان نے آسمان کو چھو لیا ہو، محض تیزی سے چنبیلی کے جھاڑ میں واپس الٹنے کی خاطر

ڈھولوں کے جادوئی سحر میں گرفتار میں خاصی دیر وہاں کھڑا رہا اور اس آواز سے متاثر ہو کر ایک ایسے جذبے میں مدہوش چل پڑا، جسے بیان نہیں کیا جا سکتا ایک ایسی دھن جس کی پراسراریت کل زمین سے خارج ہوتی ہے ــــ ایک زمین، جو سائیوں اور خوشیوں میں لپٹی ہوئی موسیقی سے لبریز ہے۔ انگریز پہلے ہی سے سیاہ اور سفید لباس میں ملبوس اپنی میزوں پر بیٹھے تھے۔ مجھے معاف کیجئے، میں رستے میں موسیقی سننے کے لئے رک گیا تھا اور وہ جو سیلون میں ۲۵ برس سے رہ رہے تھے، انہوں نے اپنی غیریقینیت کا شاندار انداز میں اظہار کیا۔ موسیقی؟ کیا یہاں کے لوگوں کے ہاں موسیقار ہیں ان میں سے کوئی بھی اس بات سے واقف نہ تھا۔ یہ گویا ان کے لئے ایک خبر

تھی وسیع ایشیائی دنیا کے باشندوں اور ان کے برطانوی آقاؤں کے درمیان یہ خوفناک خلیج کبھی نہ پاٹی جا سکی اور اس نے محض ایک غیر انسانی تنہائی اور ایشیائی زندگی کی قدروں کے بارے میں ایک نامکمل ناواقفیت کی یقین دہانی کرائی۔ اس محدود نو آبادیاتی نظام میں کچھ مستثنیات ضرور تھے، جن کا بعد میں علم ہوا۔ سروسز کلب سے اچانک کسی انگریز کے ہندوستانی لڑکی سے عشق میں گرفتار ہونے کی خبر اڑتی اور فوراً ہی اسے کوڑھیوں کی طرح اس کے اپنے ملک کے باشندے اپنے حلقے سے کسی اچھوت کی طرح نکال دیتے۔ اسی زمانے میں کچھ اور بھی ہوا اور نو آبادیاتی حاکموں نے کسی سنہالی کسان کی جھونپڑی جلا دینے کا حکم دے دیا، تاکہ اسے اس کی زمین سے بے دخل کیا جا سکے، جس انگریز کو جھونپڑی جلانے کو کہا گیا، وہ ایک سادہ سا انسان تھا اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا، جس کی بنا پر اسے ملازمت سے برطرف کرکے واپس برطانیہ بھیج دیا گیا۔ لندن پہنچنے پر (Leonard Woolf) لیونارڈ وولف نے مشرق کے بارے میں لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے عمدہ کتاب تحریر کی جس کا نام (A village in the Jungle) تھا۔ زندگی اور ادب دونوں کے بارے میں ایک شاندار سچ، لیکن یہ کتاب اس کی اپنی بیوی Virginnia Wo) (olfورجینیا وولف کی شہرت میں دب کر رہ گئی، جو ذاتی حوالے سے لکھنے والے ناول نگاروں میں ایک شہرت کی حامل ہے۔

بتدریج خاموشی کی برف پگھلی اور میں کچھ دوست بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ تبھی مجھے یہ علم ہوا کہ وہاں کی نوجوان نسل نو آبادیاتی نظام میں اس بری طرح سے جکڑی ہوئی تھی کہ وہ محض انگلستان میں چھپنے والی کتابوں کا ذکر کرتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ مشہور پیانو نواز نقاد، سینما کا فوٹو گرافر (Lionel Wendt) لیونل وینڈٹ ایک ایسی ثقافتی زندگی کا مرکز تھا جو سلطنت برطانیہ اور سیلون کے درمیان موت کے ہنگاموں اور انسانی انداز پر پھیلی ہوئی شکستہ ثقافتی زندگی کی آئینہ دار تھی۔

لیونل وینڈٹ کی ذاتی لائبریری بہت بڑی تھی، جو لندن سے تازہ ترین کتابیں وصول کرتا تھا اور مجھے فیاضانہ طور پر ہر ہفتے سائیکل کے ذریعے کتابوں کا تھیلا بھجوا دیا کرتا۔ اس طرح میں نے کئی کلو میٹر فاصلے کے برابر انگریزی ناولوں کا مطالعہ کر لیا۔ جن میں فلورنس میں خفیہ طور پر شائع شدہ (Lady Chatterley's Lover کا پہلا ایڈیشن بھی تھا۔ لارنس کے کام نے مجھے اپنی شاعرانہ خوبی اور انسانوں کے مابین چھپے ہوئے بعض رشتوں کی مخصوص مقناطیسی کیفیت سے بے حد متاثر کیا تھا مگر جلد ہی مجھ پر یہ واضح ہو گیا کہ اپنی بے حد ذہانت کے باوجود، بہت سے دوسرے بڑے برطانوی ادیبوں کی طرح، وہ اپنے پڑھنے والوں کو ہدایت دینے کے بارے میں مایوس تھا۔

(D.H. Lawrance) ڈی ایچ لارنس جنسی تعلیم دینے کے بارے میں راہ کا تعین کرتا ہے حالانکہ بظاہر اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ محبت اور زندگی انسان کو یہ خود سکھا دیتی ہے۔ اس نے آخر میں مجھے سخت مایوس کیا، لیکن اس کے باوجود اس کے بارے میں میری پسندیدگی ختم نہ ہوئی، کیونکہ ڈی ایچ لارنس نے خود کو جنس کی صوفیانہ جہت کی تلاش میں خاصا خراب کیا تھا، جو اس لئے بھی خاصی تکلیف دہ تھی کہ ویسے بھی یہ بے کار بات تھی۔

سیلون کے قیام میں مجھے ہاتھیوں کا ایک شکار کبھی نہ بھولے گا۔ ہمارے ضلع میں ہاتھیوں کی تعداد بڑھ گئی تھی، جہاں وہ مسلسل حملہ کر کے کھیتوں اور گھروں کو تباہ کر دیتے۔ دیہاتیوں نے ایک ماہ کے لئے دریا کے اطراف میں گھاس کے ڈھیروں میں آگ لگا کر اور ڈھول بجا بجا کر جنگلی ہاتھیوں کے غولوں کو جنگل کے اندر کہیں دور ہنکا دیا تھا۔ شب و روز جلتی ہوئی آگ اور مسلسل شور نے ان دیو قامت عفریتوں کو جزیرے کے شمال مغربی سمت میں ایک سست رفتار دریا کی مانند دھکیل دیا تھا۔

باڑہ، جو جنگل میں ایک خاص حصہ تھا، وہاں میں نے دیکھا کہ کس طرح ایک تنگ راستے سے ایک ہاتھی اس کے اندر داخل ہوا اور پھر وہاں پھنس کر رہ گیا۔ اسی ہاتھی کے پیچھے سینکڑوں ہاتھی بھی اندر چلے گئے اور یوں وہ سب اندر جا کر ایسے پھنسے کہ نہ آگے نکلنے کی کوئی راہ تھی نہ واپسی کا کوئی راستہ ان میں سے طاقتور ترین ہاتھیوں نے سامنے کی دیوار کو توڑنا چاہا۔ لیکن لاتعداد نیزوں نے ان کا راستہ روک دیا تھا۔ پھر وہ سب کے سب باڑے کے مرکز میں ہتھنیوں اور اپنے بچوں کو بچانے کی خاطر گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی یہ تنظیمی اور دفاعی صلاحیت دل کو چھونے والی ایک کیفیت تھی۔ ناراضگی کا اظہار انہوں نے بلند آواز میں چیخ کر کیا جیسے وہ زور سے بگل بجا رہے ہوں اور اپنی مایوسی کی حالت میں بے شمار نازک پودوں کو کچل ڈالا۔

اچانک دو سدھانے والے ہاتھیوں پر سوار اندر گئے۔ سدھائے ہوئے ہاتھیوں نے عام پولیس کے سپاہی کی طرح کام کیا۔ وہ گھرے ہوئے ہاتھیوں کے دونوں جانب کھڑے ہو گئے اور آہستہ آہستہ شکاریوں نے ان سب کو رسوں سے باندھ کر بے بس کر دیا۔ گرفتار شدہ ہاتھی کئی روز کھانے سے منہ موڑے رکھے لیکن شکاری ان کی کمزوری سے واقف ہیں، وہ انہیں کئی روز بھوکا رکھنے کے بعد ان کے من بھاتے کھانے یعنی نرم و نازک شاخوں کو لا کر ان کے سامنے ڈال دیتے اور یوں بالآخر ہاتھی ہتھیار ڈال کر کھانا شروع کر دیتے۔ اسی طرح ہاتھی سدھا لئے جاتے اور وہ سخت کاموں میں جت جاتے۔

کولمبو میں زندگی

کولمبو میں انقلاب کی کوئی نظر آنے والی علامت نہ تھی۔ اس کی سیاسی فضا ہندوستان سے بالکل مختلف تھی۔ یہاں ہر شے ایک استبدادی سکوت میں ملفوف تھی۔ یہ ملک انگلستان کو سب سے عمدہ چائے فراہم کرتا تھا۔ ملک حصوں بلکہ خانوں میں بٹا ہوا تھا۔ وسیع باغوں والے انگریز، جو تکون کی نوک پر قابض تھے، شاندار گھروں میں رہتے تھے، جن کی تقلید متوسط درجے کے لوگ بالکل ایسے ہی کرتے، جیسے جنوبی امریکہ میں—— باغات کے یہ مالک جنوبی افریقہ میں ولندیزی آباد کاروں کی نسل سے تھے، جو نو آبادیاتی جنگوں کے نتیجے میں پچھلی صدی میں افریقہ سے سیلون آئے تھے۔

زیریں حصے میں سیلون کی بدھ اور مسلمان آبادی تھی، جس کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ اس سے بہت نیچے مزدور پیشہ قلیل آمدنی والے لوگ آباد تھے ان میں ہندوستان کے جنوب سے آنے والے بیشتر تارکین وطن تھے جو تامل زبان بولتے تھے اور ہندو مذہب کے پیروکار تھے۔

اس نام نہاد مہذب معاشرے میں جو کولمبو کے اعلیٰ ترین کلبوں میں اپنے جواہرات اور ملبوسات کی نمائش کرتا تھا، دو مشہور مدمغ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کو تیار تھے۔ ان میں سے ایک فرانسیسی (Count de Mauny) کاؤنٹ ڈی مانی تھا، جس کے خاصے پرستار بھی تھے دوسرا ایک شاندار وضع کا لیکن دھڑلے دار پولینڈ کا رہنے والا میرا دوست (Winzer) ونزر تھا، جس کی شہر میں موجود فیشن گھروں پر حکمرانی تھی۔ یہ شخص انتہائی بزلہ سنج، مسیحی اور دنیا میں موجود ہر شے کے بارے میں معلومات رکھتا تھا۔ اس کا پیشہ بھی خاصا دلچسپ تھا۔ "ثقافتی اور قدیم آثار کے خزانوں کو جمع کرنے والا" ونزر کے ہمراہ ایک سرکاری مہم پر سفر میرے لئے حیران کن ثابت ہوا۔ کھدائیوں سے دو شاندار شہر آنورادھا پورا اور پولوناروا، جنہیں جنگل نگل گیا تھا، منظر عام پر آگئے تھے۔ ان کے ستون اور راہ داریاں، درخشاں سنہالی سورج میں چمک اٹھے تھے۔ فطری طور پر، جو کچھ بھی حفاظت سے باندھ کر بحری جہاز سے لے جایا جا سکتا تھا، وہ لندن کے برٹش میوزیم کے لئے پہلے ہی جا چکا تھا۔

میرا دوست ونزر اپنے کام میں خاصا مشاق تھا۔ وہ بدھ راہبوں کی دور افتادہ عبادت گاہوں تک گیا اور سرکاری گاڑیوں پر ہزاروں سال پرانے پتھروں کے شاندار مجسموں کو اٹھا کر لے گیا، جو انگلستان کے عجائب گھروں میں سج گئے جن کے بدلے میں جاپانی پلاسٹک کے بنے ہوئے بدھا کے مجسمے لے کر بدھ راہبوں کے زعفرانی رنگت والے چہروں پر نظر آنے والی طمانیت دیدنی تھی۔ وہ انہیں تقدس بھری آنکھوں سے بار بار دیکھتے اور انہیں اپنی قربان گاہوں پر سجاتے، جہاں جیسپر اور گرینائٹ کے بنے ہوئے مجسمے صدیوں مسکراتے رہے تھے۔ میرا دوست ونزر حکومت

برطانیہ کا باکمال شخص تھا۔ ایک وضع دار فنکار

ان دنوں جیسے واقعی مقدر پر سیاہ بادل چھا گئے تھے۔ کسی انتباہ کے بغیر میری برمی دوست جوسے بلیس نے آکر میرے گھر کے عین سامنے خیمہ تان دیا تھا۔ وہ اپنے وطن سے اتنی طویل مسافت طے کر کے یہاں پہنچی تھی۔ یہ جانتے ہوئے کہ چاول رنگون کے علاوہ کہیں نہیں اگتا وہ ایک بوری چاولوں کی کمر پر لاد کر ہمارے پسندیدہ گلوکار (Paul Robsin) پال رابسن کے ریکارڈوں اور ایک چٹائی کے ہمراہ آگئی تھی۔

سارا وقت وہ سامنے والے دروازے پر موجود رہتی اور دیکھتی رہتی کہ کون کون میرے گھر آتا ہے۔ وہ آنے والوں کی نہ صرف بے عزتی کرتی بلکہ کبھی کبھار ان پر حملے بھی کر دیتی۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ کس بری طرح سے جلن کا شکار ہو کر میرے گھر تک کو جلا ڈالنے پر آمادہ تھی۔ ایک بار تو اس نے ایک پیاری سی یوریشین لڑکی کو، جو مجھ سے ملنے میرے گھر آگئی تھی بری طرح سے زدوکوب بھی کیا۔ نو آبادیاتی پولیس نے اس کے ناقابل گرفت رویئے کو اس خاموش گلی کے لئے ایک مصیبت تصور کیا اور مجھے مطلع کیا گیا کہ اگر میں نے اسے اپنے ہاں پناہ نہ دی تو وہ اسے وہاں سے اٹھا کر پھینک دیں گے۔ ان تمام دنوں میں، میں اپنے لئے اس کی بے پناہ محبت اور خوف سے ناخوش رہا لیکن میں نے اسے اپنے گھر میں قدم نہ رکھنے دیا۔ وہ محبت کی ماری ہوئی ایک تخریب کار تھی، جو کچھ بھی کر گزرنے پر قادر تھی۔ تنگ آکر ایک دن اس نے واپس جانے کا ارادہ کر لیا، اور مجھ سے التجا کی کہ میں اسے اس کے جہاز تک چھوڑ آؤں جب جہاز کے لنگر اٹھانے اور میرے جہاز سے اترنے کا وقت آیا تو اس نے وہاں موجود دوسرے مسافروں کی بھیڑ کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے مجھے اپنے بازوؤں میں کھینچ لیا اور میرے چہرے کو اپنے بوسوں اور آنسوؤں سے چھپا ڈالا۔ اس نے میرے بازوؤں کو چوما، میرے لباس کو چوما اور بالکل جیسے کسی رسم کے سے انداز میں اچانک جھک کر، اس سے پہلے کہ میں اسے ایسا کرنے سے روکتا، میرے جوتوں کو چوم ڈالا، اور جب وہ کھڑی ہوئی تو میرے جوتوں کی سفید کھریا مٹی اس کے چہرے پر آٹے کی طرح لگی ہوئی تھی۔ میں اسے اس کے سفر سے نہ روک سکا اور مجھ میں یہ ہمت نہ ہوئی کہ میں اسے جہاز سے اتار کر اپنے ساتھ لے جاتا۔ میری دور اندیشی نے مجھے ایسا کرنے سے روکا لیکن میرے دل پر ایک ایسا گھاؤ لگا جو اب بھی میرے وجود کا حصہ ہے۔ وہ اندوہناک دکھ جس کا مداوا نہ ہو سکا۔ اس کے سفید مٹی لگے چہرے پر بہتے ہوئے وہ آنسو اب بھی میری یاد میں روشن ہیں۔

میں اپنی کتاب (Residencia En la Tierra) کا پہلا حصہ ختم کر چکا تھا۔ لیکن میرا کام بہت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ فاصلے اور گہرے سکوت نے مجھے میری دنیا سے

جدا کر رکھا تھا، اور میں خود کو دل کی گہرائی کے ساتھ اپنے ارد گرد کی اجنبی دنیا سے نزدیک نہ کر سکا تھا۔

واقعات جو خلا میں معلق میری زندگی میں رونما ہوئے، میری کتاب میں قلم کی روشنائی کے بجائے، زندگی کے لہو سے قریب تر، فطری رنگ لئے ہوئے آتے ہیں، لیکن میں نے جنگل کی خاموشی پر انحصار کیا۔ میں نے سچائی اور موثر گونج پر تلخ انداز میں، جو خود میری تباہی کی طرف سلسلہ وار کام کر رہی تھی زور دیا تھا (کہ اصل میں یہی شاعری کے ضروری امکانات میں سے ہیں) ۔ محض اسٹائل ہی انسان نہیں ہے بلکہ یہ ہروہ شے ہے جو انسان کے اطراف میں موجود ہے اور اگر ہوا جس میں وہ سانس لیتا ہے اس کی نظم میں شامل نہیں ہوتی تو نظم مردہ ہے، مردہ اس لئے کہ اسے سانس لینے کا موقع نہیں ملا۔ میں نے اس قدر دلچسپی سے اور اتنا زیادہ مطالعہ کبھی نہیں کیا تھا جیسا کہ مجھے کولمبو میں موقع ملا، جہاں میں خاصے عرصے قیام پذیر رہا۔ وقتاً فوقتاً میں (Rimbaud) رمباڈ (Qve vedo) کووی ڈویا (Proust) پراؤسٹ کی طرف واپس آ جاتا، جو از سر نو مجھے میرے لڑکپن کے عہد کے دکھوں، محبتوں اور رقابتوں کے تجربے یاد دلاتے اور مجھے احساس ہوتا کہ پراؤسٹ کی نظم (Vinteuil) میں ایک نغماتی جملہ، جسے پراؤسٹ نے مہک دار اور آسمانی کہا تھا، محض شہوانی آواز کی تفصیلی مہک ہی نہیں بنتا بلکہ بذات خود ایک جذبے کی بے بسی کا معیار بن جاتا ہے۔ اس تنہا ماحول میں میرا مسئلہ اس موسیقی کی تلاش میں تھا، تاکہ میں اسے سن سکوں اپنے موسیقار دوست کی مدد سے ہم نے مسئلہ پر غور کیا، حتیٰ کہ ہم پراؤسٹ کی (Vinteuil) کو سمجھ سکے جو (Faure) (Wagner) (Schubert) (Saint-Saens) اور (d' indy) اور (Cesarflank) کی اجتماعی کوشش تھی۔ میری موسیقی کا نصاب ان تمام موسیقاروں کو نظر انداز کر گیا تھا، جو باعث شرم تھا۔ ان کے کام بند ڈبوں کی مثال تھے، جو میرے لئے نہ کھل سکے، میرے کان کبھی بھی علاوہ چند مشہور دھنوں کے کچھ نہ پہچان سکے۔ مزید معلومات کی خاطر، جو موسیقی کے بجائے ادبی زیادہ تھیں، میں نے تین ریکارڈوں کی البم حاصل کیں یہ (Frank) فرینک کے پیانو اور وائلن کی دھنیں تھیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ (Vinteu il) کا جملہ ان میں موجود تھا، جس میں حقیقتاً شک کی گنجائش نہ تھی میرے لئے اس میں خالصتاً ادبی کشش تھی۔ اس کے دور اندیشانہ بیان کے مطابق جو ایک روبہ تنزل معاشرے کے بارے میں تھا، جس سے وہ پیار کرتا تھا۔ پراؤسٹ، جو شاعرانہ حقیقت نگاری کا عظیم مداح تھا، جذباتی انداز میں فنون لطیفہ، مصوری، کلیساؤں، اداکاراؤں اور کتابوں میں مبتلا رہا، باوجودیکہ اس کا شعور ہر اس شے کو، جسے وہ چھولیتا، منور کر دیتا، لیکن اکثروبیشتر وہ موسیقی میں اس شدت کے ساتھ پناہ لے لیتا،

جسے اس نے صفحہ قرطاس پر کبھی بیان نہ کیا اس کے لفظ میری زندگی میں بھی سکون پیدا کرتے. اور میں اس خفیہ جذباتی کیفیت کو جسے میں خود اپنی ذات میں کھو چکا تھا. قابو پانے کے قابل ہوتا۔ میں پراؤسٹ کے اس طلسماتی موسیقی کے بیان کو دیکھنے کا متمنی تھا اور میں موسیقی کی لہر میں بہہ چکا تھا۔

جملہ خود اپنے درد کو بڑھاتے ہوئے سائیوں کی گہرائی میں گم کر دیتا اور غصے کی کیفیت میں وہ گوتھک طرز تعمیر کی طرح ایک ایسی لے پر لہراتا ہوا ابھرتا نظر آتا. جو کسی مینار کو نہ ختم ہونے کی حد تک اوپر کی طرف لے جاتا ہے۔ درد سے جنم لیتا ہوا عنصر. جو فتح کی خاطر اپنی بلندی کی طرف دیکھتا ہے۔ اپنی اصل کو غم سے تبدیل ہونے پر انکار نہ کرے گا۔ وہ ایک دکھ کے مینار میں گھوم جاتا ہے جبکہ پیانو کے دردناک سر وقتاً فوقتاً آواز کی موت کا ساتھ دیتے۔ اکثر و بیشتر دل کو متاثر کر دینے والی پیانو کی قربت اس وقت تک کہ محبت اور درد موت اور فتح میں اکٹھے واضح ہوں، خود کو دہراتی ____ میرے لئے اس میں کوئی شک نہ ہو سکتا تھا کہ ایک جملہ تھا اور دوسری دھن

وحشی تاریکی میرے گھر پر، جو ویلا واتے کے ناریل کے درختوں میں گم ہو گیا تھا ایک گھونسے کی مانند آئی، لیکن ہر رات دھن میرے ساتھ مجھے آگے کو بڑھاتی ہوئی میرے گرد چکر لگاتی ہوئی کبھی نہ ختم ہونے والی اداسی سے مجھے لبریز کرتے ہوئے میرے ساتھ زندہ رہی۔ یہی اس کی فاتح اداسی تھی۔ اب تک نقادوں نے میرے کام میں اس مخفی اثر کو جس کا میں اب اقرار کر رہا ہوں تلاش نہیں کیا۔ جیسا کہ میں نے (Residencia enla Tierra) کا بیشتر حصہ یہیں ویلا واتے میں مکمل کیا تھا۔ باوجود یکہ میری شاعری نہ خوشبودار تھی نہ آسمانی لیکن ہاں زمین سے مربوط ضرور تھی۔ میرے خیال میں وہ اوصاف، جو کم و بیش ہر شے کی حالت میں مخفی ہوتے ہیں، انہیں میرے داخلی محسوسات سے اور اس موسیقی سے کوئی سروکار نہ تھا. جو میری ذات میں رہتی تھی۔

سالوں بعد ایک بار پھر چلی میں مجھے وہاں کے تین مشہور موسیقاروں سے ملنے کا موقع ملا۔ یہ سب جوان تھے اور ایک پارٹی میں اکٹھے ہوئے تھے۔ یہ شاید ۱۹۳۲ء کا سال تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے یہ (Marta Bronet) مارٹا برونٹ کا گھر تھا۔ کلاڈیو ایک کونے میں ڈومنگو سانتا کروز اور آرمانڈو سے باتوں میں مصروف تھا۔ میں نے کئی بار ان کی سمت پیش قدمی کی لیکن وہ باتوں میں مصروف رہے اور ایک بار بھی میری جانب نہ دیکھا۔ وہ موسیقی اور موسیقاروں کے بارے میں بے تکان بولتے رہے۔ ایک مرتبہ میں نے کوشش کی کہ اس دھن کا ذکر کروں ____ واحد دھن جو میں جانتا تھا۔

انھوں نے بے پرواہی سے میری طرف دیکھااور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے Cesar Franck) سیزار فرینک ورڈی آخر سیزار فرینک ہی کیوں ؟ تمہیں (Verdi) ورڈی کے بارے میں جاننا چاہئے۔ یہ کہہ کر وہ پھر اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے. مجھے میری لاعلمی میں ڈبوتے ہوئے. جس سے میں کبھی بھی فرار پانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

سنگاپور

کولمبو میں تنہائی ہی نہ صرف اداس کر دینے والی تھی بلکہ ست رفتار بھی تھی۔ جس گلی میں، میں رہائش پذیر تھا، وہاں میرے چند دوست تھے۔ مختلف رنگوں کی لڑکیاں میرے سفری بستر تک آتیں اور محض جسمانی تشنج کی چمک کے علاوہ کوئی بات پیچھے نہ چھوڑتیں۔ میرا جسم اس استوائی ساحل پر دن رات جلنے والی تنہا آگ تھاایک دوست (Pasty) پیسٹی اکثراپنی سہیلیوں کے ہمراہ جو سانولی اور گندمی رنگ کی ہوتیں جن میں (Boer) نسل کی برطانوی اور دراوڑی نسل کی لڑکیاں بھی شامل ہوتیں، میرے ساتھ کسی بھی معاوضے کے بغیر ہم بستری کر لیتیں۔ ان میں سے ایک لڑکی نے جو "Chummeries" میں جایا کرتی تھی اور یہ اس کے بقول وہ کوٹھیاں تھیں، جہاں، مختلف دفتروں اور فرموں کے جوان انگریز کلرک خوراک اور پیسے بچانے کی خاطر اکٹھے رہا کرتے تھے۔ اس لڑکی نے کسی تردد کے بغیر یہ بتایا کہ ایک مرتبہ اس نے چودہ مردوں کے ساتھ ہم بستری کی تھی۔

"اور تم نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے اس سے پوچھا

اس رات ان کے ہاں دعوت تھی اور میں اکیلی وہاں موجود تھی۔ ان لوگوں نے گراموفون چلا رکھا تھا۔ میں نے ان میں سے ہر ایک کے ساتھ چند قدم رقص کیا اور رقص کے دوران ہم رستے سے بھٹک کر کسی خوابگاہ کا رخ کر لیتے۔ اس طرح سے ہر شخص خوش تھا۔

وہ طوائف نہ تھی بلکہ نو آبادیاتی نظام کی پروردہ تھی۔ اس نظام کے درخت کا ایک بے باک اور فیاض پھل۔ اس کی کہانی نے مجھے متاثر کیا تھا جس کے بعد سے آئندہ کے لئے میرے دل میں اس کی جگہ بن چکی تھی۔

میری تنہا رہائش گاہ کسی بھی رہائشی ٹھکانے سے بہت دور تھی، جب میں نے اسے کرائے پر لیا تو مجھے بیت الخلا کو ڈھونڈنا پڑا تھا کہ وہ کدھر ہے جیسا کہ مجھے وہ کہیں نظر نہ آیا تھا۔ وہ شاور کے نزدیک ہونے کے بجائے گھر کے پچھواڑے بنا ہوا تھا۔ جسے میں نے تحیر کے ساتھ دیکھا۔ یہ ایک لکڑی کا صندوق تھا، جس کے وسط میں ایک سوراخ تھا جیسا کہ میرے بچپن میں چلی کے دیہاتوں میں

ہوتا تھا، لیکن ہمارے ہاں بیت الخلا یا بہتے ہوئے پانی پر بنائے جاتے تھے یا پھر گہرے کنوؤں پر۔ جبکہ یہاں اس گول سوراخ کے نیچے دھات کا بنا ہوا ایک برتن پڑا تھا، جو ہر صبح صاف ہو جاتا لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ کس طرح اس کی صفائی ہوتی تھی۔

ایک صبح میں معمول سے کچھ پہلے اٹھ گیا اور جو کچھ میں نے دیکھا اس سے ششدر رہ گیا۔ میرے گھر کے پچھلے صحن میں ایک انتہائی حسین عورت، جیسی ابھی تک میں نے سیلون میں نہ دیکھی تھی۔ ایک تاریک مجسمے کی مانند وہ پرھیا ذات کی ایک تامل تھی۔ اس نے انتہائی سستے کپڑے کی سرخ اور سنہرے رنگوں کی ساری پہنی ہوئی تھی اور اس کے عریاں ٹخنوں میں بھاری کنگن موجود تھے۔ ناک کے دونوں طرف دو سرخ نقطے چمکتے تھے۔ یقیناً یہ مصنوعی شیشے کے ہوں گے لیکن اس پر وہ یاقوت نظر آتے تھے۔ وہ بیت الخلا کی جانب مجھ پر نظر ڈالے بغیر خاموشی سے چلتی ہوئی گئی اور میرے وجود کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس غلیظ برتن کو سر پر اٹھائے ہوئے ایک دیوی کی طرح چلتی ہوئی غائب ہو گئی۔

وہ اس قدر خوبصورت تھی کہ اس کے اتنے حقیر کام کی نوعیت کے باوجود میں اسے اپنے ذہن سے فراموش نہ کر پایا۔ جنگل کے شرمیلے جانور کی مانند وہ کسی اور ہی دنیا کا ایک مختلف روپ دکھائی دیتی تھی۔ میں نے اسے متوجہ کرنا چاہا لیکن بے سود تھا۔ اس کے بعد کئی بار میں نے اس کی راہ میں مختلف تحائف جیسے ریشمی کپڑا یا پھل وغیرہ رکھے لیکن وہ برابر سے بغیر کچھ سنے یا دیکھے گزر جاتی۔ بے توقیری کا وہ عمل اس کے گہرے رنگ کی خوبصورتی کے باعث ایک لاتعلق ملکہ کا رسمی فرض بن گیا تھا۔ ایک صبح میں نے ارادہ کر لیا اور اس کی کلائی کو مضبوطی سے تھام کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس سے ہم کلام ہونے کے لئے میرے پاس کوئی زبان نہ تھی۔ بغیر مسکرائے اس نے خود کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور جلد ہی وہ میرے بستر میں بے لباس تھی۔

اس کی کمر کس قدر نازک تھی۔ اس کے بھرے بھرے کولہے اور اس کی چھاتیوں کے بھرے ہوئے پیالے۔ ان سب نے اسے جنوبی ہندوستان کے ہزاروں سال پرانے مجسموں میں ڈھال دیا تھا۔ یہ ایک انسان اور مجسمے کا ملاپ تھا۔ اس دوران اس نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں لیکن وہ جذبات سے یکسر عاری تھی۔ وہ مجھ سے نفرت کرنے میں حق بجانب تھی اور یہ تجربہ دوبارہ نہ دہرایا گیا۔۔۔

مجھے تار پڑھ کر یقین نہ آتا تھا۔۔۔ وزارت خارجہ کی جانب سے مجھے نئی تقرری کی اطلاع ملی تھی اور یوں مجھے اب کولمبو میں قونصل کے بجائے یہی فرائض سنگاپور اور باٹاویا میں سرانجام دینے تھے۔ اس طرح میں غربت کے ایک دائرے سے نکل کر دوسرے میں داخل ہو گیا تھا۔ کولمبو میں

اس وقت تنخواہ ۱۶۶ ڈالر ماہانہ تھی لیکن اب دو جگہوں میں قونصل کی حیثیت سے تنخواہ دگنی ہو گئی تھی یعنی کل ۳۳۳ ڈالر جس کا مطلب یہ تھا کہ اب مجھے کم از کم سفری بستر سے نجات مل جائے گی۔

لیکن میں اپنی مادہ نیولے "کریا" کا کیا کروں گا؟ کیا اسے ہمسائے کے بچوں کے سپرد کر دوں، جنہیں سانپ پر اس کی طاقت میں کوئی اعتماد نہیں رہا۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس کا خیال نہ کریں گے۔ وہ اسے کبھی بھی میری طرح اپنے ساتھ کھانا نہ کھلائیں گے۔ کیا اسے جنگل میں اپنی فطری حالت میں آزاد چھوڑ دوں؟ نہیں، اس کا تو دفاعی نظام ہی بے کار ہو چکا ہے اور اسے پرندے ہی مار ڈالیں گے، پھر میں اسے اپنے ہمراہ کیسے لے جا سکتا ہوں؟ اس قسم کے مسافر کو کبھی بھی جہاز پر سوار نہ ہونے دیا جائے گا۔ لہٰذا میں نے اپنے سنہالی نوکر لڑکے "بھرامہی" کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کر لیا۔ ہم ملایا، انڈونیشیا کے ممالک میں جا رہے تھے، جہاں کی زبان بھرامہی نہ بول سکتا تھا۔ مادہ نیولا اس کے ہمراہ ٹوکری میں عرشے پر سفر کر سکتی تھی اور پھر بھرامہی بھی میری طرح اسے اتنا ہی جانتا تھا اور اس طرح خوشی اور دکھ کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بھرامہی اور نیولے کے ہمراہ، میں نے سیلون کے جزیرے کو ایک نئی اور انجانی دنیا کے لئے چھوڑ دیا۔

یہ سمجھنا مشکل ہو گا کہ کس لئے دنیا بھر میں چلی کے قونصل خانے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ یہ واقعی بے تکا سا لگتا ہے کہ قطب جنوبی کے نزدیک ایک چھوٹی سی ریاست اپنے نمائندے آرکی پلاگو جیسے دور افتادہ ملک اور کرہ ارض کے دوسری جانب بکھرے ہوئے ساحلوں پر رکھنے میں قادر ہے۔ درحقیقت جیسا کہ میں نے جانا، یہ قونصل خانے ہم جنوبی امریکیوں کی خود کو اہمیت دینے اور خام خیالی میں مبتلا رہنے کی ایک عادت ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ان دور افتادہ جگہوں سے چلی کو پٹ سن، موم بتیاں بنانے کے لئے پیرافین اور سب سے بڑھ کر کثیر تعداد میں چائے مل جاتی تھی۔ چلی میں ہم دن بھر میں چار مرتبہ چائے پیتے ہیں لیکن ہم چائے اگا نہیں سکتے۔ ایک مرتبہ تو نائٹریٹ کے کام کرنے والوں میں چائے کی کمیابی پر طویل بحث بھی ہوئی تھی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ایک دن وہسکی کے دور کے بعد انگریز تاجروں نے مجھ سے سوال کر دیا تھا کہ آخر اتنی بڑی چائے کی مقدار کے ساتھ ہم چلی میں کیا کرتے ہیں؟

"ہم اسے پیتے ہیں" میں نے انہیں بتایا

(اگر وہ مجھ سے چلی میں چائے کے کسی صنعتی راز کے بارے میں جاننے کے خواہاں تھے، تو مجھے افسوس تھا کہ میں نے انہیں مایوس کر دیا)

سنگاپور میں قونصل خانہ دس سال سے موجود تھا۔ میں اپنے نوکر بھرامبی نیولے اور تیس سالہ اعتماد کے ساتھ ساحل پر اتر گیا، جہاں سے ہم سیدھے ریفلز ہوٹل پہنچے، وہاں میں نے اپنے کپڑے، جو خاصی تعداد میں جمع ہو چکے تھے، دھلنے کے لئے بھیجے اور پھر میں بر آمدے میں بیٹھ گیا۔ ایک آرام کرسی پر دراز ہوتے ہوئے جن (Gin) کے دو یا شاید تین گلاسوں کا آرڈر دے دیا۔ یہ بالکل (Somerset Maugham) سامرسیٹ ماہم کی کہانیوں جیسا تھا۔ حتیٰ کہ میں نے ٹیلیفون ڈائریکٹری میں اپنے قونصل کے مرکزی دفتر کو دیکھنا شروع کیا۔ لعنت ہے۔ اس میں نام و نشان تک نہ تھا۔ میں نے فوراً ہی برطانوی سرکاری حکام کے حوالے سے ایک فوری کال بک کرائی۔ وہاں سے جواب ملا کہ چلی کے قونصل خانے کا وہاں وجود نہ تھا۔ میں نے قونصل سینور مین سیلا کے بارے میں معلومات کیں لیکن وہ اس کے بارے میں بے خبر تھے۔ میں سخت مصیبت میں گرفتار تھا، کیونکہ میرے پاس ہوٹل اور لانڈری کے لئے محض ایک دن کے پیسے اور تھے، تب مجھے اچانک خیال آیا کہ مرکزی دفتر یقیناً باٹاویا (Batavia) میں ہو گا اور میں نے اسی بحری جہاز پر سوار ہونے کا ارادہ کر لیا، جس سے میں یہاں تک پہنچا تھا۔ وہ جہاز فی الحال بندر گاہ میں لنگر انداز تھا۔ میں نے اپنے کپڑوں کی واپسی کا تقاضا کیا، جو بھیگے ہوئے پڑے تھے۔ بھرامبی نے انہیں ایک گیلے بنڈل کی صورت میں لپیٹا اور ہم برق رفتاری سے بندر گاہ کی جانب دوڑے۔

میں اپنی کتاب (Residencia En la Tierra) کا پہلا حصہ ختم کر چکا تھا۔ لیکن میرا کام بہت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ فاصلے اور گہرے سکوت نے مجھے میری دنیا سے جدا کر رکھا تھا، اور میں خود کو دل کی گہرائی کے ساتھ اپنے اردگرد کی اجنبی دنیا سے نزدیک نہ کر سکا تھا۔

واقعات جو خلا میں معلق میری زندگی میں رونما ہوئے، میری کتاب میں قلم کی روشنائی کے بجائے، زندگی کے لہو سے قریب تر، فطری رنگ لئے ہوئے آتے ہیں، لیکن میں نے جنگل کی خاموشی پر انحصار کیا۔ میں نے سچائی اور موثر گونج پر تلخ انداز میں، جو خود میری تباہی کی طرف سلسلہ وار کام کر رہی تھی زور دیا تھا (کہ اصل میں یہی شاعری کے ضروری امکانات میں سے ہیں)۔ محض اسٹائل ہی انسان نہیں ہے بلکہ یہ ہر وہ شے ہے جو انسان کے اطراف میں موجود ہے اور اگر ہوا جس میں وہ سانس لیتا ہے اس کی نظم میں شامل نہیں ہوتی تو نظم مردہ ہے، مردہ اس لئے کہ اسے سانس لینے کا موقع نہیں ملا۔ میں نے اس قدر دلچسپی سے اور اتنا زیادہ مطالعہ کبھی نہیں کیا تھا جیسا کہ مجھے کولمبو میں موقع ملا، جہاں میں خاصے عرصے قیام پذیر رہا۔ وقتاً فوقتاً میں (Rimbaud) رمباڈ (Qve vedo) کووی ڈویا (Proust) پراؤسٹ کی طرف واپس آجاتا، جو از سر نو مجھے میرے لڑکپن کے

عہد کے دکھوں، محبتوں اور رقابتوں کے تجربے یاد دلاتے اور مجھے احساس ہوتا کہ پراؤسٹ کی نظم (Vinteuil) میں ایک نغماتی جملہ، جسے پراؤسٹ نے مہک دار اور آسمانی کہا تھا، محض شہوانی آواز کی تفصیلی مہک ہی نہیں بنتا بلکہ بذات خود ایک جذبے کی بے بسی کا معیار بن جاتا ہے۔ اس تنہا ماحول میں میرا مسئلہ اس موسیقی کی تلاش میں تھا، تاکہ میں اسے سن سکوں اپنے موسیقار دوست کی مدد سے ہم نے مسئلہ پر غور کیا، حتیٰ کہ ہم پراؤسٹ کی (Vinteuil) کو سمجھ سکے جو (Faure) (Schubert) (Wagner) (Saint-Saens) اور (d' indy) اور (Cesarflank) کی اجتماعی کوشش تھی۔ میری موسیقی کا نصاب ان تمام موسیقاروں کو نظر انداز کر گیا تھا، جو باعث شرم تھا۔ ان کے کام بند ڈبوں کی مثال تھے، جو میرے لئے نہ کھل سکے، میرے کان کبھی بھی علاوہ چند مشہور دھنوں کے کچھ نہ پہچان سکے۔ مزید معلومات کی خاطر، جو موسیقی کے بجائے ادبی زیادہ تھیں، میں نے تین ریکارڈوں کی البم حاصل کیں یہ (Frank) فرینک کے پیانو اور وائلن کی دھنیں تھیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ (Vinteu il) کا جملہ ان میں موجود تھا، جس میں حقیقتاً شک کی گنجائش نہ تھی میرے لئے اس میں خالصتاً ادبی کشش تھی۔ اس کے دور اندیشانہ بیان کے مطابق جو ایک روبہ تنزل معاشرے کے بارے میں تھا، جس سے وہ پیار کرتا تھا۔ پراؤسٹ، جو شاعرانہ حقیقت نگاری کا عظیم مداح تھا، جذباتی انداز میں فنون لطیفہ، مصوری، کلیساؤں، اداکاراؤں اور کتابوں میں مبتلا رہا، باوجودیکہ اس کا شعور ہر اس شے کو، جسے وہ چھولیتا، منور کر دیتا، لیکن اکثر و بیشتر وہ موسیقی میں اس شدت کے ساتھ پناہ لے لیتا، جسے اس نے صفحہ قرطاس پر کبھی بیان نہ کیا اس کے لفظ میری زندگی میں بھی سکون پیدا کرتے، اور میں اس خفیہ جذباتی کیفیت کو جسے میں خود اپنی ذات میں کھو چکا تھا، قابو پانے کے قابل ہوتا۔ میں پراؤسٹ کے اس طلسماتی موسیقی کے بیان کو دیکھنے کا متمنی تھا اور میں موسیقی کی لہر میں بہہ چکا تھا۔

جملہ خود اپنے درد کو بڑھاتے ہوئے سائیوں کی گہرائی میں گم کر دیتا اور غصے کی کیفیت میں وہ گوتھک طرز تعمیر کی طرح ایک ایسی لے پر لہراتا ہوا ابھرتا نظر آتا، جو کسی مینار کو نہ ختم ہونے کی حد تک اوپر کی طرف لے جاتا ہے۔ درد سے جنم لیتا ہوا عنصر، جو فتح کی خاطر اپنی بلندی کی طرف دیکھتا ہے۔ اپنی اصل کو غم سے تبدیل ہونے پر انکار نہ کرے گا۔ وہ ایک دکھ کے مینار میں گھوم جاتا ہے جبکہ پیانو کے دردناک سروقتاً فوقتاً آواز کی موت کا ساتھ دیتے۔ اکثر و بیشتر دل کو متاثر کر دینے والی پیانو کی قربت اس وقت تک کہ محبت اور درد موت اور فتح میں اکٹھے واضح ہوں، خود کو دہراتی ــــ میرے لئے اس میں کوئی شک نہ ہو سکتا تھا کہ ایک جملہ تھا اور دوسری دھن

وحشی تاریکی میرے گھر پر، جو ویلا وانٹے کے ناریل کے درختوں میں گم ہو گیا تھا ایک گھونسے کی مانند آئی، لیکن ہر رات دھن میرے ساتھ مجھے آگے کو بڑھاتی ہوئی میرے گرد چکر لگاتی ہوئی کبھی نہ ختم ہونے والی اداسی سے مجھے لبریز کرتے ہوئے میرے ساتھ زندہ رہی۔ یہی اس کی فاتح اداسی تھی۔ اب تک نقادوں نے میرے کام میں اس مخفی اثر کو جس کا میں اب اقرار کر رہا ہوں تلاش نہیں کیا۔ جیسا کہ میں نے (Residencia enla Tierra) کا بیشتر حصہ یہیں ویلاوانٹے میں مکمل کیا تھا۔ باوجودیکہ میری شاعری نہ خوشبودار تھی نہ آسمانی لیکن ہاں زمین سے مربوط ضرور تھی۔ میرے خیال میں وہ اوصاف، جو کم و بیش ہر شے کی حالت میں مخفی ہوتے ہیں، انہیں میرے داخلی محسوسات سے اور اس موسیقی سے کوئی سروکار نہ تھا، جو میری ذات میں رہتی تھی۔

سالوں بعد ایک بار پھر چلی میں مجھے وہاں کے تین مشہور موسیقاروں سے ملنے کا موقع ملا۔ یہ سب جوان تھے اور ایک پارٹی میں اکٹھے ہوئے تھے۔ یہ شاید ۱۹۳۲ء کا سال تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے یہ (Marta Bronet) مارٹا برونٹ کا گھر تھا۔ کلاڈیو ایک کونے میں ڈومنگو سانتا کروز اور آرمانڈو سے باتوں میں مصروف تھا۔ میں نے کئی بار ان کی سمت پیش قدمی کی لیکن وہ باتوں میں مصروف رہے اور ایک بار بھی میری جانب نہ دیکھا۔ وہ موسیقی اور موسیقاروں کے بارے میں بے تکان بولتے رہے۔ ایک مرتبہ میں نے کوشش کی کہ اس دھن کا ذکر کروں ـــــ واحد دھن، جو میں جانتا تھا۔

انہوں نے بے پرواہی سے میری طرف دیکھا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے Cesar (Franck سیزار فرینک ورڈی آخر سیزار فرینک ہی کیوں؟ تمہیں (Verdi) ورڈی کے بارے میں جاننا چاہئے۔ یہ کہہ کر وہ پھر اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے، مجھے میری لاعلمی میں ڈبوتے ہوئے، جس سے میں کبھی بھی فرار پانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

سنگاپور

کولمبو میں تنہائی ہی نہ صرف اداس کر دینے والی تھی بلکہ سست رفتار بھی تھی۔ جس گلی میں، میں رہائش پذیر تھا، وہاں میرے چند دوست تھے۔ مختلف رنگوں کی لڑکیاں میرے سفری بستر تک آتیں اور محض جسمانی تشنج کی چمک کے علاوہ کوئی بات پیچھے نہ چھوڑتیں۔ میرا جسم اس استوائی ساحل پر دن رات جلنے والی تنہا آگ تھا ایک دوست (Pasty) پیسٹی اکثر اپنی سہیلیوں کے ہمراہ جو سانولی اور گندمی رنگ کی ہوتیں جن میں (Boer) نسل کی برطانوی اور دراوڑی نسل کی

لڑکیاں بھی شامل ہوتیں، میرے ساتھ کسی بھی معاوضے کے بغیر ہم بستری کر لیتیں۔ ان میں سے ایک لڑکی نے جو "Chummeries" میں جایا کرتی تھی اور یہ اس کے بقول وہ کوٹھیاں تھیں، جہاں، مختلف دفتروں اور فرموں کے جوان انگریز کلرک خوراک اور پیسے بچانے کی خاطر اکٹھے رہا کرتے تھے۔ اس لڑکی نے کسی تردد کے بغیر یہ بتایا کہ ایک مرتبہ اس نے چودہ مردوں کے ساتھ ہم بستری کی تھی۔

"اور تم نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے اس سے پوچھا

اس رات ان کے ہاں دعوت تھی اور میں اکیلی وہاں موجود تھی۔ ان لوگوں نے گراموفون چلا رکھا تھا۔ میں نے ان میں سے ہر ایک کے ساتھ چند قدم رقص کیا اور رقص کے دوران ہم رستے سے بھٹک کر کسی خوابگاہ کا رخ کر لیتے۔ اس طرح سے ہر شخص خوش تھا۔

وہ طوائف نہ تھی بلکہ نو آبادیاتی نظام کی پروردہ تھی۔ اس نظام کے درخت کا ایک بے باک اور فیاض پھل۔ اس کی کہانی نے مجھے متاثر کیا تھا جس کے بعد سے آئندہ کے لئے میرے دل میں اس کی جگہ بن چکی تھی۔

میری تنہا رہائش گاہ کسی بھی رہائشی ٹھکانے سے بہت دور تھی، جب میں نے اسے کرائے پر لیا تو مجھے بیت الخلا کو ڈھونڈنا پڑا تھا کہ وہ کدھر ہے جیسا کہ مجھے وہ کہیں نظر نہ آیا تھا۔ وہ شاور کے نزدیک ہونے کے بجائے گھر کے پچھواڑے بنا ہوا تھا۔ جسے میں نے تحیر کے ساتھ دیکھا۔ یہ ایک لکڑی کا صندوق تھا، جس کے وسط میں ایک سوراخ تھا جیسا کہ میرے بچپن میں چلی کے دیہاتوں میں ہوتا تھا، لیکن ہمارے ہاں بیت الخلا یا بہتے ہوئے پانی پر بنائے جاتے تھے یا پھر گہرے کنوؤں پر۔ جبکہ یہاں اس گول سوراخ کے نیچے دھات کا بنا ہوا ایک برتن پڑا تھا، جو ہر صبح صاف ہو جاتا لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ کس طرح اس کی صفائی ہوتی تھی۔

ایک صبح میں معمول سے کچھ پہلے اٹھ گیا اور جو کچھ میں نے دیکھا اس سے ششدر رہ گیا۔ میرے گھر کے پچھلے صحن میں ایک انتہائی حسین عورت، جیسی ابھی تک میں نے سیلون میں نہ دیکھی تھی۔ ایک تاریک مجسمے کی مانند وہ پرھیا ذات کی ایک تامل تھی۔ اس نے انتہائی سستے کپڑے کی سرخ اور سنہرے رنگوں کی ساری پہنی ہوئی تھی اور اس کے عریاں ٹخنوں میں بھاری کنگن موجود تھے۔ ناک کے دونوں طرف دو سرخ نقطے چمکتے تھے۔ یقیناً، یہ مصنوعی شیشے کے ہوں گے لیکن اس پر وہ یاقوت نظر آتے تھے۔ وہ بیت الخلا کی جانب مجھ پر نظر ڈالے بغیر خاموشی سے چلتی ہوئی گئی اور میرے وجود کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس غلیظ برتن کو سر پر اٹھائے ہوئے ایک دیوی کی طرح چلتی ہوئی غائب ہو گئی۔

وہ اس قدر خوبصورت تھی کہ اس کے اتنے حقیر کام کی نوعیت کے باوجود میں اسے اپنے ذہن سے فراموش نہ کر پایا۔ جنگل کے شرمیلے جانور کی مانند وہ کسی اور ہی دنیا کا ایک مختلف روپ دکھائی دیتی تھی۔ میں نے اسے متوجہ کرنا چاہا لیکن بے سود تھا۔ اس کے بعد کئی بار میں نے اس کی راہ میں مختلف تحائف جیسے ریشمی کپڑا یا پھل وغیرہ رکھے لیکن وہ برابر سے بغیر کچھ سنے یا دیکھے گزر جاتی۔ بے توقیری کا وہ عمل اس کے گہرے رنگ کی خوبصورتی کے باعث ایک لاتعلق ملکہ کا رسمی فرض بن گیا تھا۔ ایک صبح میں نے ارادہ کر لیا اور اس کی کلائی کو مضبوطی سے تھام کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس سے ہم کلام ہونے کے لئے میرے پاس کوئی زبان نہ تھی۔ بغیر مسکرائے اس نے خود کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور جلد ہی وہ میرے بستر میں بے لباس تھی۔

اس کی کمر کس قدر نازک تھی۔ اس کے بھرے بھرے کولہے اور اس کی چھاتیوں کے بھرے ہوئے پیالے۔ ان سب نے اسے جنوبی ہندوستان کے ہزاروں سال پرانے مجسموں میں ڈھال دیا تھا۔ یہ ایک انسان اور مجسمے کا ملاپ تھا۔ اس دوران اس نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں لیکن وہ جذبات سے یکسر عاری تھی۔ وہ مجھ سے نفرت کرنے میں حق بجانب تھی اور یہ تجربہ دوبارہ نہ دہرایا گیا۔

مجھے تار پڑھ کر یقین نہ آتا تھا۔۔۔ وزارت خارجہ کی جانب سے مجھے نئی تقرری کی اطلاع ملی تھی اور یوں مجھے اب کولمبو میں قونصل کے بجائے یہی فرائض سنگاپور اور باٹاویا میں سرانجام دینے تھے۔ اس طرح میں غربت کے ایک دائرے سے نکل کر دوسرے میں داخل ہو گیا تھا۔ کولمبو میں اس وقت تنخواہ ۱۶۶ ڈالر ماہانہ تھی لیکن اب دو جگہوں میں قونصل کی حیثیت سے تنخواہ دگنی ہو گئی تھی یعنی کل ۳۳۳ ڈالر جس کا مطلب یہ تھا کہ اب مجھے کم از کم سفری بستر سے نجات مل جائے گی۔

لیکن میں اپنی مادہ نیولے "کریا" کا کیا کروں گا؟ کیا اسے ہمسائے کے بچوں کے سپرد کر دوں، جنہیں سانپ پر اس کی طاقت میں کوئی اعتماد نہیں رہا۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس کا خیال نہ کریں گے۔ وہ اسے کبھی بھی میری طرح اپنے ساتھ کھانا نہ کھلائیں گے۔ کیا اسے جنگل میں اپنی فطری حالت میں آزاد چھوڑ دوں؟ نہیں، اس کا تو دفاعی نظام ہی بے کار ہو چکا ہے اور اسے پرندے ہی مار ڈالیں گے۔ پھر میں اسے اپنے ہمراہ کیسے لے جا سکتا ہوں؟ اس قسم کے مسافر کو کبھی بھی جہاز پر سوار نہ ہونے دیا جائے گا۔ لہٰذا میں نے اپنے سنہالی نوکر لڑکے "بھرامپی" کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کر لیا۔ ہم ملایا، انڈونیشیا کے ممالک میں جا رہے تھے، جہاں کی زبان بھرامپی نہ بول سکتا تھا۔ مادہ نیولا اس کے ہمراہ ٹوکری میں عرشے پر سفر کر سکتی تھی اور پھر بھرامپی

بھی میری طرح اسے اتنا ہی جانتا تھا اور اس طرح خوشی اور دکھ کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بھرامبی اور نیولے کے ہمراہ، میں نے سیلون کے جزیرے کو ایک نئی اور انجانی دنیا کے لئے چھوڑ دیا۔

یہ سمجھنا مشکل ہو گا کہ کس لئے دنیا بھر میں چلی کے قونصل خانے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ یہ واقعی بے تکا سا لگتا ہے کہ قطب جنوبی کے نزدیک ایک چھوٹی سی ریاست اپنے نمائندے آرکی پلاگو جیسے دور افتادہ ملک اور کرہ ارض کے دوسری جانب بکھرے ہوئے ساحلوں پر رکھنے میں قادر ہے۔ درحقیقت جیسا کہ میں نے جانا، یہ قونصل خانے ہم جنوبی امریکیوں کی خود کو اہمیت دینے اور خام خیالی میں مبتلا رہنے کی ایک عادت ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ان دور افتادہ جگھوں سے چلی کو پٹ سن، موم بتیاں بنانے کے لئے پیرافین اور سب سے بڑھ کر کثیر تعداد میں چائے مل جاتی تھی۔ چلی میں ہم دن بھر میں چار مرتبہ چائے پیتے ہیں لیکن ہم چائے اگا نہیں سکتے۔ ایک مرتبہ تو نائٹریٹ کے کام کرنے والوں میں چائے کی کمیابی پر طویل بحث بھی ہوئی تھی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ایک دن وہسکی کے دور کے بعد انگریز تاجروں نے مجھ سے سوال کر دیا تھا کہ آخر اتنی بڑی چائے کی مقدار کے ساتھ ہم چلی میں کیا کرتے ہیں؟

"ہم اسے پیتے ہیں" میں نے انہیں بتایا

(اگر وہ مجھ سے چلی میں چائے کے کسی صنعتی راز کے بارے میں جاننے کے خواہاں تھے. تو مجھے افسوس تھا کہ میں نے انہیں مایوس کر دیا)

سنگاپور میں قونصل خانہ دس سال سے موجود تھا۔ میں اپنے نوکر بھرامبی نیولے اور تمیں سالہ اعتماد کے ساتھ ساحل پر اتر گیا. جہاں سے ہم سیدھے ریفلز ہوٹل پہنچے. وہاں میں نے اپنے کپڑے، جو خاصی تعداد میں جمع ہو چکے تھے. دھلنے کے لئے بھیجے اور پھر میں بر آمدے میں بیٹھ گیا۔ ایک آرام کرسی پر دراز ہوتے ہوئے جن (Gin) کے دو یا شاید تین گلاسوں کا آرڈر دے دیا۔ یہ بالکل (Somerset Maugham) سامرسیٹ ماھم کی کہانیوں جیسا تھا۔ حتیٰ کہ میں نے ٹیلیفون ڈائریکٹری میں اپنے قونصل کے مرکزی دفتر کو دیکھنا شروع کیا۔ لعنت ہے۔ اس میں نام و نشان تک نہ تھا۔ میں نے فوراً ہی برطانوی سرکاری حکام کے حوالے سے ایک فوری کال بک کرائی۔ وہاں سے جواب ملا کہ چلی کے قونصل خانے کا وہاں وجود نہ تھا۔ میں نے قونصل سینور مین سیلا کے بارے میں معلومات کیں لیکن وہ اس کے بارے میں بے خبر تھے۔ میں سخت مصیبت میں گرفتار تھا، کیونکہ میرے پاس ہوٹل اور لانڈری کے لئے محض ایک دن کے پیسے اور تھے. تب مجھے اچانک خیال آیا کہ مرکزی دفتر یقیناً باٹاویا (Batavia) میں ہو گا اور میں نے اسی بحری جہاز پر

سوار ہونے کا ارادہ کر لیا. جس سے میں یہاں تک پہنچا تھا۔ وہ جہاز فی الحال بندر گاہ میں لنگر انداز تھا۔ میں نے اپنے کپڑوں کی واپسی کا تقاضا کیا. جو بھیگے ہوئے پڑے تھے۔ بھرامبی نے انہیں ایک گیلے بنڈل کی صورت میں لپیٹا اور ہم برق رفتاری سے بندر گاہ کی جانب دوڑے۔

پانچواں باب

اسپین میرا دل

فیڈریکو کس وضع کا تھا؟

دو ماہ کا ایک طویل سمندری سفر ۱۹۳۲ء میں مجھے واپس چلی لے آیا جہاں پہنچ کر میں نے اپنی کتابوں (Residencia en la Tierra) اور (El Hondero Entusiasta) کو، جو میرے کاغذات میں ادھر ادھر ہو گئی تھیں، شائع کرایا۔

۱۹۳۳ء میں مجھے (Buenos Aires) بیونس آئرز میں چلی کا قونصل مقرر کر دیا گیا، جہاں میں اگست کے مہینے میں پہنچا۔ اسی شہر میں تقریباً اسی وقت (Fredrico Garcia Lorca) فیڈریکو گا سیالور کا اپنے المیہ ڈرامے (Blood Wedding) کی ہدایات کے لئے آیا ہوا تھا۔ اس ڈرامے میں (Lola Membrive) لولا میمبرایو کا طائفہ کام کر رہا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ ادیبوں اور دوستوں کے حوالے سے ہماری ملاقات ہوئی جو بیشک ہمارے حادثات کا اپنا حصہ تھا۔ فیڈریکو کے اپنے گمراہ کرنے والے تھے اور بالکل ایسے ہی میرے بھی۔ بلکہ میرے تو اب بھی ہیں۔

یہ گمراہ کرنے والے روشنیاں بجھانے کی آرزو لئے پھرتے ہیں، تاکہ ہم انہیں نہ دیکھ سکیں۔ ایسا ہی اس مرتبہ بھی ہوا۔

(PEN) پی ای این کی طرف سے فیڈریکو اور میرے اعزاز میں پلازہ ہوٹل میں دی جانے والی ضیافت میں لوگ بہت دلچسپی سے لے رہے تھے۔ لیکن کسی نے محض یہ تاثر دینے کے لئے کہ ضیافت منسوخ ہو گئی ہے، فون کو سارا دن مصروف کئے رکھا۔ وہ اس قدر بضد تھے کہ انہوں نے ہوٹل منیجر، ٹیلی فون آپریٹروں اور باورچی وغیرہ سب سے رابطہ کر کے۔ یہ یقین دلا دیا تھا کہ پہلے سے نشستوں کی ریزرویشن نہیں کی جائے گی اور دعوت نہیں ہو گی۔ لیکن ان کی امیدوں

پر پانی پھر گیا، جب میں اور فیڈریکو گارسیالور کا ارجنٹائنا کے سوادیبوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ ہم وہاں ایک تحیر کی حالت میں پہنچے تھے اور (Alalimon) گفتگو کے لئے تیار تھے آپ شاید نہیں جانتے کہ اس لفظ کا کیا مطلب ہے، نہ ہی اس وقت تک مجھے اس کا علم تھا۔ فیڈریکو کے پاس ہمیشہ کوئی نہ کوئی نیا خیال موجود ہوتا ہے اس نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

بعض اوقات دو بل فائیٹر ایک ہی جگہ کو استعمال کرتے ہوئے ایک وقت میں ایک بیل سے لڑ سکتے ہیں۔ بل فائٹنگ میں یہ سب سے اہم بات ہے اور شاید وباید ہی یہ صورت دیکھنے میں آتی ہے۔ ایک صدی میں دو یا تین بار سے زیادہ نہیں اور یہ دو ایسے بل فائیٹر ہوتے ہیں، جو یا تو سگے بھائی ہوں یا پھر نزدیکی رشتے دار اس بل فائیٹنگ کو (Alalimon) کہتے ہیں اور اس انداز میں ہم دونوں اپنی گفتگو کریں گے"

اور ایسا ہی ہم نے کیا بھی، لیکن پہلے سے کسی کو علم نہ تھا۔

جب ہم پی ای این کلب کے صدر کا اس ضیافت کے سلسلے میں شکریہ ادا کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو ہم نے دو بل فائیٹروں ہی کی طرح ایک ساتھ بولتے ہوئے ابتدا کی ہم کھانے والی چھوٹی میزوں پر الگ الگ بیٹھے ہوئے تھے۔ فیڈریکو کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا جب کہ میں دوسرے کونے میں تھا لوگ مجھے بٹھانے کے لئے بار بار میری جیکٹ کو پکڑ کر یہ سمجھتے ہوئے کھینچ رہے تھے کہ شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اور تقریباً کچھ ایسا ہی فیڈریکو کے ساتھ ہوا۔ اکٹھے ہم نے بولنا شروع کیا۔ میں نے خواتین کہا تو فیڈریکو نے حضرات کا لفظ اپنے جملے کو ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک ہی تقریر معلوم ہو۔ یہ فی البدیہہ تقریر (Rubin Dario) رابن ڈاریو کے نام منسوب تھی گو ہمیں کوئی بھی جدیدیت کا علمبردار ہونے کے لئے مورد الزام نہ ٹھہرا سکتا تھا، میں اور فریڈریکو لور کا دونوں رابن ڈاریو کو ہسپانوی زبان کا سب سے عمدہ تخلیقی شاعر تصور کرتے تھے۔

تقریر کا متن کچھ یوں ہے۔

پابلو نرودا:۔ خواتین

فیڈریکو لورکا:۔ اور حضرات، بل فائٹنگ میں (Alalimon) ایک ایسی چیز کا نام ہے، جس میں دو بل فائیٹر اپنے مابین ایک بے آستین کی قبا کو تھامے ہوئے بیل کو بے بس کر دیتے ہیں۔

نرودا:۔ آپس میں یوں مربوط جیسے ایک برقی حس کے ساتھ فیڈریکو اور میں باہم اس شاندار استقبالئے کے لئے آپ سب کا شکریہ ادا کریں گے۔

لور کا:۔ایسی تقریبات میں عموماً ایسا ہوتا ہے کہ شاعر اپنے کلام سے نوازے چاہے یہ کلام نقرئی ہو یا چوبی اور اپنے ساتھیوں اور دوستوں کو اپنی آواز سے خوش کرے۔

نرودا:۔ بہرحال ہم آپ کے درمیان ایک ایسے مردہ شخص کو بٹھائیں گے آپ کی میز کا ساتھی بنانے کو، جو رنڈوا ہے، موت کی تاریکی سے گھرا ہوا زندگی کا مارا ہوا، جو درخشاں عہد میں اس کی ہم نوا تھی۔ ہم اس کے آتشیں سائے میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اس وقت تک اس کا نام لیں گے کہ نامعلوم سے اس کی توانائیاں واپس جست لگائیں۔

لور کا:۔ پہلے تو پینگوئن جیسی نزاھت کے ساتھ ایک علامتی ہم آغوشی اس بلند پایہ شاعر (Amado Villar) کے لئے۔ پھر ہم اس خوشی کے موقع پر ایک اور بڑا نام پیش کرتے ہیں۔ اس آگہی کے ساتھ کہ جام چھلکیں گے، کانٹے اس آنکھ کی جستجو میں اڑیں گے، جس کے وہ متلاشی ہیں۔ ہم آپ کو امریکہ اور اسپین کے اس شاعر کا نام بتاتے ہیں رابن

نرودا:۔ ڈاریو، کیونکہ خواتین

لور کا:۔ اور حضرات

نرودا:۔ بیونس آئرز میں کیا کہیں روبن ڈاریو کا کوئی چوک ہے؟

لور کا:۔ کہاں ہے روبن ڈاریو کا مجسمہ؟

نرودا:۔ اسے پارکوں سے عشق تھا، کہاں ہے روبن ڈاریو پارک

لور کا:۔ کون گل فروش روبن ڈاریو گلاب رکھتا ہے؟

نرودا:۔ روبن ڈاریو کے سیبوں کے درخت کہاں ہیں۔ روبن ڈاریو سیب؟

لور کا:۔ روبن ڈاریو کے ہاتھ کا سانچہ کہاں ہے؟

نرودا:۔ کہاں

لور کا:۔روبن ڈاریو (Nicaragua) نکاراگوا میں اپنی پیدائش کے وقت سے پلاسٹر کے بنے ہوئے ایک ہیبت ناک شیر کے نیچے سو رہا ہے۔ شیر جسے امیر لوگ اپنے گھروں کے دروازے پر سجا لیتے ہیں۔

نرودا:۔ ڈاک کے ذریعے بھیجے جانے والا شیر، اس کے لئے جو شیروں کو بنانے والا تھا۔ ستاروں کے بنا شیر اس شخص کے لئے جس نے دوسروں کے لئے ستارے منسوب کر دیئے۔

لور کا:۔ ایک توصیفی لفظ میں اس نے ہمیں جنگل کی آوزیں عطا کیں لفاظی کے بادشاہ (Fray Luisde Granada) فرے لوئس ڈی گراناڈا کی مانند اس نے لیموں سے کہکشائیں تخلیق کیں۔

اس نے ہمیں ہماری آنکھوں میں سایوں کے ہمراہ جنگی جہازوں کے سمندروں کی طرف بھیج دیا۔ اور سہ پہر کے سلیٹی آسمان پر شراب کی ایک قسم جن (Gin) سے لامحدود مسطح میدان تخلیق کئے اور وہ جنوبی ہوا سے مانوس شرائط میں مخاطب ہوا۔ رومانوی شاعر کی طرح جو وہ تھا. بھرپور دل کے ساتھ اور اس کا ہاتھ یونانی طرز تعمیر (Corinthion) کوری انتھین دارالسلطنت پر تمام ادوار کے بارے میں شکوک اور غم زدہ، طنزیہ انداز میں ہاتھ رکھے ہوئے۔

نرودا:۔ اس کے سنہری نام کو اس کی اصل روح میں اس کے قلبی دکھوں، جہنم کے عذابوں سے اس کے تعلق، شہرت کی بلندیوں تک اس کے مقام، بحیثیت شاعر اس کی عظمت کو جو تب بھی تھی اور کبھی بھی جس کی ہمسری نہ کی جا سکے گی۔ یاد رکھا جائے گا۔

لورکا:۔ ہسپانوی شاعر کی حیثیت سے وہ اسپین میں بڑے فنکاروں اور بچوں دونوں کے لئے آفاقیت کے احساس اور اس فیاضی کے ساتھ جو آج کے عہد کے شاعروں کے ہاں مفقود ہے ایک استاد تھا۔ وہ (Valle-Inllan) (Juan Ramon) اور (Machdo) برادران کا استاد تھا۔ اس کی آواز وقت کے ہاتھوں پذیرائی یافتہ زبان کی دراڑوں میں پانی اور نائیٹریٹ کی مانند تھی۔ (Rodrigo Caro) سے لے کر (Argensolos) اور (Don Jauan) تک ہسپانوی زبان میں لفظوں کا ایسا میلہ حروف کا ایسا ٹکراؤ ایسی ساخت اور ایسی شعلگی جو روبن ڈاریو کے ہاں نظر آتی ہے، کسی کے ہاں نہ تھی۔ (Velazguez) کے مناظر سے (Goya) کے کیمپ فائر تک اور (Quevedo) کی اداسی سے لے کر (Najorca) کے سیب جیسی گالوں والی دیہاتی لڑکیوں تک ڈاریو اسپین کی سرزمین میں اس طرح سفر کرتا ہے۔ جیسے وہ ساری اس کی ذاتی زمین ہو۔

نرودا:۔ شمالی گرم سمندر کی ایک لہر اسے چلی لے آئی تھی اور سمندر اسے وہاں سنگلاخ پتھریلے ساحل پر تنہا چھوڑ گیا۔ پھر سمندر نے اس پر جھاگ اور گھنٹیاں پٹخیں اور والپاریزو کی تاریک ہوا نے اسے نمکین گیتوں سے ڈھک دیا۔ آج کی شب ہمیں اس کا ہوائی مجسمہ بنانا چاہئے۔ اور دھویں، آوازوں، واقعات اور زندگی کو اس میں سے گزرنے دینا چاہئے بالکل اس کی عظیم شاعری کی مانند، جس میں خواب اور آوازیں بہتی ہیں۔

لورکا:۔ لیکن میں اس ہوا کے مجسمے کو خون دینا چاہتا ہوں، گھونگے کی اس شاخ کی طرح جو سمندر سے ٹکراتی ہے۔ تصویر میں چمکتی ہوئی آسمانی بجلی کے گچھوں کی مانند، میناطور کے سر کی طرح جس پر (Gongora) کے گاتے ہوئے پرندے برف کی مانند موجود ہیں۔ ایک لکھی پتی کی آوارگی، اس کی کھوئی ہوئی آنکھوں میں آنسو اور اس کی ناکامی، سرسوں کی باڑھ سے کھائے ہوئے

حصے یا خالی جگہیں جہاں بانسری کی گونج ہے اس کی قابل دید مدہوش حالت کی، کونیاک کی بوتلیں، اس کی دلبہزیرے بے ذوقی اور بے نقاب لفاظی جو اس کی شاعری کو انسانی بناتے ہیں۔ اس کی شاعری کا زرخیز مواد، مدرسوں، صورتوں اور مروجہ قوانین سے بالاتر ہے۔

نرودا:۔ فیڈریکو گارسیالور کا ایک ہسپانوی اور میں چلی کا باشندہ ہوں۔ میں آج کی اس شام کی پذیرائی کو دوستوں میں منتقل کرتا ہوں۔ اس عظیم سائے کے نام، جس نے ہماری تعریف و توصیف سے کہیں بڑھ کر اپنی مخصوص آواز میں ایک بلند آہنگ کے ساتھ ارجنٹینا کی اس زمین پر جہاں ہم کھڑے ہیں۔ اپنے گیت سنائے۔

لورکا:۔ پابلو نرودا چلی کا باشندہ اور میں ہسپانوی ہوں ہم سب ایک زبان اور نکاراگوا، کے عظیم انسان ارجنٹینا، چلی اور اس عظیم ہسپانوی شاعر کی ذات کے باعث آپس میں ایک رشتے میں منسلک ہیں۔

نرودا اور لورکا:۔ جس کی عظمت اور عزت کے لئے ہم اپنے جام اٹھاتے ہیں۔

مجھے ایک شام یاد ہے۔ جب ایک بہت پر تعیش ضیافت میں فیڈریکو نے غیر متوقع طور پر میرا ساتھ دیا تھا۔ ہمیں ان لکھ پتیوں میں سے ایک نے جسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ یا ارجنٹینا میں پیدا کر سکتا تھا، دعوت میں مدعو کیا تھا۔ وہ پیدائشی طور پر باغی تھا۔۔۔۔ ایک ایسا شخص جس نے ایک سنسنی خیز اخبار کی بدولت اپنی قسمت بنالی تھی۔۔۔۔ ایک بہت بڑے باغ میں گھرا ہوا اس کا گھر ایک نو دولیتے امیر شخص کے خواب کی تعبیر نظر آتا تھا۔ کار کے رستے کے دونوں جانب سینکڑوں پنجروں میں دنیا بھر سے لائے ہوئے لاتعداد رنگین پرندے تھے۔ اس کی لائبریری میں بے شمار نادر اور انمول کتابیں تھیں، جو برقیوں کے ذریعے سارے یورپ کے کتب فروشوں سے حاصل کی گئی تھیں۔ مجموعی طور پر لائبریری مکمل اور بھری ہوئی تھی۔ لیکن اس لائبریری کی سب سے بیش قیمت اور شاندار چیز اس کے فرش پر بچھا ہوا وہ قالین تھا جو چیتوں کی کھالوں کو سی کر تیار کیا گیا تھا۔

مجھے معلوم ہوا کہ اس شخص کے نمائندے افریقہ، ایشیا اور ایمزن میں موجود تھے، جو چیتوں، (Ocelots) جنگلی بلوں وغیرہ کی کھالیں جمع کرتے تھے۔ جن کے دھبے اس لائبریری میں اس وقت میرے قدموں تلے تھے۔

اور یہ تھا جو (Natalio Botana) ناتالیو بوتانا کے گھر میں تھا۔ ایک طاقتور سرمایہ دار، جو بیونس آئرز میں رائے عامہ پر حکومت کرتا تھا۔ کھانے کی میز پر میزبان کے ایک طرف میں اور دوسری طرف فیڈریکو بیٹھا تھا جب کہ ہمارے سامنے ایک نازک اندام خاتون شاعرہ تھی، جس نے کھانے کے دوران اپنی سبز آنکھوں کو فیڈریکو کے بجائے مجھ پر مرکوز رکھا تھا۔ ضیافت میں ایک

بڑی ہاتھ گاڑی دہکتے ہوئے کوئلوں تک لائی گئی تھی۔ شام کے نیلے آسمان پر ستارے روشن تھے۔ کھال میں بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو جو ارجنٹینا کی ایک خاص خوراک تھی، لونگ، پودینے اور سبزہ زار کے سانسوں اور سینکڑوں کی تعداد میں شور مچاتے جھینگروں اور مینڈکوں کی آوازوں میں شامل ہو گئی تھی ـــــ خاتون شاعرہ، میں اور فیڈریکو، جو بے حد خوش تھا اور ہر بات پر ہنس رہا تھا کھانے کے بعد میز سے اٹھ کر تیراکی کے روشن تالاب کی طرف چلے گئے۔ گارسیالور کا شور مچاتا اور ہنستا ہوا آگے جارہا تھا۔ وہ خوش تھا درحقیقت وہ ہمیشہ ایسا ہی تھا۔ خوشی اس کی جلد کی طرح اس کے وجود کا حصہ تھی۔ تیراکی کے تالاب پر چمکتا ہوا ایک بلند مینار نمایاں تھا۔ رات کی روشنیوں میں مینار کی سفیدی دودھیا روشنی کے مانند درخشاں تھی۔ ہم آہستہ آہستہ مینار کی باہر کی جانب نکلنے والی بلند ترین جگہ تک چڑھے۔ وہاں اوپر ہم تینوں مختلف وضع کے شاعر دنیا و مافیہا سے کہیں دور تھے۔ تالاب کی نیلی آنکھ نیچے چمک رہی تھی۔ ہم ضیافت میں گائے جانے والے گیت اور گیتار کی آواز کو سن سکتے تھے۔ ہمارے اوپر رات کا سائبان لاتعداد ستاروں کے جمگھٹے میں اس قدر نزدیک تھا کہ لگتا تھا ہمارے سر اس کی گہرائی میں چھپ گئے تھے۔ میں نے بلند قامت سنہری لڑکی کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اور جب میں نے اسے چوما تو اسے بے حد گداز اور شہوت سے بھرپور ایک مکمل عورت پایا۔ اس وقت فیڈریکو کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم دونوں وہیں فرش پر لیٹ گئے اور میں نے اسے بے لباس کرنا شروع کر دیا، تب فیڈریکو کی بڑی بڑی آنکھوں کو میں نے گھورتے ہوئے پایا۔ جیسے اسے اس تمام حرکت کا یقین نہ آرہا ہو۔

"یہاں سے باہر دفع ہو جاؤ اور دیکھو کہ کوئی اوپر نہ آنے پائے" ستاروں کے آسمان کے لئے قربانی کے طور پر رات کے حسن کی دیوی سے مینار کی بلندی پر جلد ہی عشق کی تکمیل ہونے والی تھی۔

فیڈریکو ایک مددگار اور محافظ کے بطور اپنے مشن پر خوش مزاجی کے ساتھ تیزی سے باہر سیڑھیوں کی طرف پلٹا مگر بدقسمتی سے تاریک سیڑھیوں میں پھسل کر گر گیا۔ مجھے اور اس خاتون کو اس کی مدد کی خاطر بمشکل تمام نیچے جانا پڑا۔ لیکن فیڈریکو اس حادثے کے بعد تقریباً دو ہفتے صاحب فراش رہا۔

مگوئیل ہرنانیڈیز (Miguel Hernandez)

بیونس آئرز کے قونصل خانے میں، میں زیادہ عرصہ نہ رہا ۱۹۳۴ء کے آغاز میں مجھے اسی حیثیت میں (Barcelona) بارسیلونا بھیج دیا گیا۔ اسپین میں چلی کا قونصل جنرل (Don Tu

(lio Maquoira) ڈان ٹیولو میکورا میرا افسر تھا۔ اور اتفاقاً چلی کے قونصلر کی حیثیت سے ملازمت میں میرا سب سے بہتر تعلق جس افسر سے رہا، وہ یہی تھا۔ ڈان ٹیولو ایک سخت انسان تھا جس کی شہرت ایک پراسرار انسان کی تھی مگر میرے لئے وہ ایک بہت شفیق ملنسار اور اچھا انسان ثابت ہوا۔ ڈان ٹیولو کو بہت جلد ہی اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ میں حساب کتاب میں بے حد کمزور تھا اور یہی نہیں تقسیم کرنا تو مجھے آتا ہی نہ تھا (میں اسے شاید کبھی نہ سیکھ سکا) لہٰذا اس نے مجھ سے کہا " پابلو تمہیں میڈرڈ (Madrid) میں جا کر رہنا چاہئے۔ وہ ایسی جگہ ہے جہاں شاعری ہے، یہاں بار سیلونا میں ہمارے لئے محض جمع تفریق اور تقسیم ہی ہے جس کے لئے تمہاری ضرورت نہیں، یہ میں خود کر سکتا ہوں " دوسری رات جیسے کسی جادو کے اثر سے میں اسپین کے دارالحکومت میڈرڈ میں بحیثیت قونصل کے پہنچ گیا تھا اور وہاں میری ملاقات گارسیالور کا اور البرتی کے دوستوں سے ہوئی۔ یہ بہت سے لوگ تھے اور کچھ ہی دنوں میں ہسپانوی شاعروں میں سے ایک میں بھی تھا ہسپانوی اور لاطینی امریکی بیشک خاصے مختلف ہیں۔ دونوں جانب ایک فرق، جو فخر یا مغالطے کی پیداوار ہے، موجود ہے۔

میری نسل کے ہسپانوی، لاطینی امریکیوں کے مقابلے میں خوش مزاج، آپس میں مربوط اور زیادہ برادرانہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ ہم لوگ بین الاقوامیت کے زیادہ قریب ہو گئے تھے اور دوسری ثقافتوں اور زبانوں میں اتر گئے تھے۔ ان میں محض چند ہی ایسے تھے۔ جو ہسپانوی زبان کے علاوہ کوئی اور زبان بھی بول سکتے تھے۔ جب (Desnos) ڈیسناس اور (Crevel) کریول میڈرڈ آتے تو مجھے بحیثیت ترجمان کے کام کرنا پڑتا تاکہ وہ اور ہسپانوی آپس میں رابطہ کر سکیں۔ نوجوان شاعر میگوئل ہرنانیڈیز فریڈریکو اور البرتی کے دوستوں میں سے تھا۔

جب اس سے میری ملاقات ہوئی تو وہ دیہاتیوں والی مخصوص کوڈرائے کی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ ایک چرواہا تھا میں نے اس کی نظموں کو اپنے تبصرے (Caballo Verde) " سبز گھوڑے " میں شائع کیا۔ میں اس کی شاعرانہ توانائی اور چمک کے بارے میں خاصا متجسس تھا۔ میگوئیل جو ایک کسان تھا، اپنے گرد زمین کی خاص مہک لئے ہوتا۔ اس کا چہرہ مٹی کے ایک ڈھیلے یا اس آلو سے مشابہ تھا، جسے جڑوں سمیت زمین سے کھینچ لیا ہو، لیکن جو مٹی کی خوشبو کی تازگی سے پر ہو۔ وہ میرے ہاں قیام پذیر تھا اور وہیں لکھ بھی رہا تھا۔ میری امریکی شاعری نے اپنے مختلف افقوں اور میدانوں سے اسے متاثر کیا تھا، جس سے بتدریج اس کے ہاں تبدیلی آنی شروع ہو گئی۔ اس نے مجھے پرندوں اور جانوروں کی زمینی کہانیاں سنائیں۔ وہ ایک ایسا لکھنے والا تھا، جو فطرت سے ملنے والے ایک ناتراشیدہ پتھر کی مانند جنگل کی تازگی اور ایک ناقابل برداشت قوت رکھتا تھا۔ وہ

مجھے بتاتا کہ خوابیدہ بکری کے پیٹ سے کان لگانا کس قدر دلچسپ ہے۔ آپ دودھ کی دھار کو تھن تک جاتے ہوئے محسوس کر سکتے ہیں۔ ایک مخفی آواز، جسے بکریوں کے شاعر کے علاوہ کوئی نہ سن سکا تھا کبھی وہ مجھ سے بلبل کے نغموں کی بات کرتا مشرقی اسپین جہاں سے وہ آیا تھا، سنگترے کے باغوں اور بلبلوں سے بھرا ہوا تھا، چونکہ گانے والا وہ پرندہ (بلبل) میرے ملک میں نہیں تھا تو پاگل میگوئیل اس کی آواز کی نقل اتار کر مجھے سنانے کی کوشش کرتا۔ وہ گلی میں موجود ایک درخت کی بلندی پر چڑھ جاتا اور اس کی اونچی شاخوں میں اپنے محبوب پرندے کی طرح سیٹیاں بجاتا اس کے پاس گزر بسر کے لئے کچھ نہ تھا، میں نے اس کی ملازمت کے لئے کوشش کی۔ اسپین میں ایک شاعر کے لئے ملازمت کا حصول آسان کام نہ تھا۔ آخر کار وزارت خارجہ کے ایک بڑے افسر نے اس میں دلچسپی لیتے ہوئے مجھے یقین دلایا۔ اس افسر نے میگوئیل کی نظمیں پڑھی ہوئی تھیں۔ اور وہ اس کا مداح تھا۔ میگوئیل کو محض یہ بتانا تھا کہ اسے کس قسم کی ملازمت درکار ہے اور وہ اسے مل جائے گی میں خوش ہوا اور مگوئیل کو بتایا کہ اس کا مستقبل تابناک ہے افسر نے تمہارے لئے ہاں کر دی ہے۔ اب تم ایک اچھی ملازمت پالو گے۔ مجھے بتاؤ کہ تم کس قسم کا کام چاہو گے۔

میگوئیل کچھ دیر سوچتا رہا، اس کا چہرہ اضطراب کے بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ گھنٹے گزر گئے اور کہیں سہ پہر کو اس نے چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ جیسے اس نے اپنی زندگی کا حل تلاش کر لیا ہو۔ جواب دیا "کیا وہ افسر میڈرڈ کے نزدیک مجھے بکریوں کے گلے کا مالک بنا دے گا۔"

مگوئیل ہرنلنیڈیز کی یاد میرے دل سے کسی طرح نہیں نکل سکتی بلبلوں کے گیت تاریکی اور سنگتروں کے پھولوں کے درمیان ان کی آوازوں کے چکر اس کا پاگل پن تھے جو اس کے خون اور شاعری میں رچے بسے تھے، جہاں رنگوں کی چھوٹ، مہک اور ہسپانوی بحیرہ روم کا مشرقی ساحل (Levant) کی آواز ایک وحشی اور توانا جوان کی خوشبو کے ساتھ ملتی تھی۔ اس کا چہرہ اسپین کا چہرہ تھا۔ روشنی سے گھڑا ہوا اس کے چہرے میں روٹی یا زمین کی سی گولائی تھی۔ آگ سے بھرا جو اپنی سطح میں جل رہی تھی اور ہواؤں کے باعث چمڑے کی مانند ہو چکی تھی اس کی آنکھیں محبت اور توانائی کی دو روشن لکیریں تھیں مجھے اس کے لفظوں میں شاعری کے وہ عناصر ایک نئی عظمت میں بدلتے دکھائی دیتے نظر آتے جو وحشی روشنی اور ایک معجزے کے باعث بوڑھے خون کو نومولود بیٹے میں ڈھال دیتی ہے۔ بحیثیت ایک سیلانی شاعر کے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ زندگی نے مجھے لفظوں کے بارے میں اس جیسی رفعت کسی اور کے ہاں دیکھنے کا موقع فراہم نہ کیا۔

سبز گھوڑا

فیڈریکو اور البرٹی میرے گھر کے نزدیک درختوں سے گھری سڑک پر واقع ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ (Toledo) نان بائی ٹولیڈو تجریدی مجسمہ سازی میں ماہر تھا۔ الٹولیگوئری (Altoa guirre) برگامن (Bergamin) عظیم شاعر لوئس سرنوڈا (Luis Cernuda) نہ ختم ہونے والی جہت کا شاعر الیگزاندرے (vi Cante Alexzandre) اور فن تعمیر کا ماہر لوئس لاکسا (Luis Lacasa) ہم سب کبھی اکیلے اور کبھی مل کر روزانہ کسی نہ کسی کے گھر یا پھر کسی کیفے میں جمع ہوتے۔ خیابان کیسالانا یا کورسیو کے شراب خانے سے ہم سب اگولاس سکیٹر میں واقع میرے پھولوں کے گھر چلے جاتے۔ دو منزلہ بسوں (جنہیں میرے ملک کے لوگ (Bomba rdones) بمبارڈونز کہا کرتے) میں اوپر والی چھت پر ہم کھانے پینے اور گانے کے لئے گروہوں میں جمع ہو جاتے۔ شاعری اور خوش وقتی کے لئے میں اپنے نوجوان ساتھیوں میں سے شاعر (Ce rano Plaja) سیرانو پلاجا، ایک ذہین مصور (Jose Caballero) جوسے کیبالارو اور ایک دلچسپ شخص (Antonio) انتونیو کو جو اندلس سے سیدھا میرے گھر آیا تھا اب بھی یاد کرتا ہوں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے دوسرے، جو یا تو نزدیک نہیں یا اب موجود نہیں لیکن جن کی دوستی کی کمی کو میں اب بھی بالکل اپنے جسم کے کسی حصے یا اپنی روح کی طرح محسوس کرتا ہوں۔

آہ ان دنوں کا میڈرڈ! میں گلیسیا کے مصور مارو جاالو کے ہمراہ کاریگروں کے علاقوں میں، جہاں گھاس کی بنی ہوئی چٹائیاں اور بندوق کی نالیاں بنانے والے ہوتے۔ چلا جاتا اور گلیوں میں گھومتا، گلیاں، جہاں اسپین کی خشک اشیاء کا کاروبار ہوتا تھا۔ وہ چیزیں جو اسپین کے دل کو جکڑے رکھتی ہیں۔ اسپین خشک اور سنگلاخ چٹانوں کا ملک ہے اور بلند سورج اس کی سطح زمینوں پر جلاتے ہوئے دھول کے غبار میں سے چنگاریاں اڑاتا ہے۔ اسپین کے اصل دریا اس کے شاعر ہیں (Quevedo) کوویڈو اپنے سبز پانیوں اور سیاہ جھاگ کے ساتھ (Calderon) کالیڈرون کے گنگناتے ہوئے حروف نقرئی (Argensolas) ارجنولاس اور یاقوتوں کا دریا (Gongora) گنگورا۔ میں نے (Valle Inclan) ویلے انکلان کو محض ایک بار دیکھا تھا۔ بے حد دبلا پتلا، نہ ختم ہونے والی سفید داڑھی کے ساتھ، جس کے چہرے کی رنگت زرد ہوتے ہوئے کاغذ کی مانند تھی۔ ایسا لگتا تھا، جیسے وہ خود اپنی کتابوں میں سے جس نے دبا کر اسے باریک کر دیا تھا باہر نکل آیا تھا ــــــ

میں (Ramon Gomez) رامون گومیز سے ایک بار پومبو کیفے میں اور پھر ایک مرتبہ اس کے گھر میں ملا تھا۔ کبھی بھی میں رامون کی رہنمائی کرنے والی نزدیک آتی آواز کو نہیں بھلا

سکتا۔ گفتگو اور قہقہے خیال اور دھویں کے بدلتے ہوئے انداز. میرے لئے رامون گومیز ہسپانوی زبان کے نفیس ترین ادیبوں میں سے ایک تھا اور بطور ایک نابغہ کے وہ عظمت میں کوویڈو اور پکاسو کا ہم پلہ تھا۔

رامون کی تحریر کا ہر صفحہ ایک بل کی مانند طبعی اور مابعد الطبیاتی صورت حال میں جھا نکتا ہے۔ سچائی اور وسعت اور اسپین کے بارے میں جو بھی وہ جانتا ہے۔ اور جو کچھ اس نے لکھا ہے. کوئی دوسرا ایسا نہ لکھ سکا۔ اس نے زبان کے اسلوب کو اپنے ہاتھوں سے ایسے بدلا ہے کہ اب اس میں اس کی انگلیوں کے ایسے نشانات رہ گئے ہیں کہ کوئی انہیں مٹا نہیں سکتا۔

کئی بار میری ملاقات ڈان انٹونیو ماشاڈو سے اس کے پسندیدہ کیفے میں ہوئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح کسی پرانے ہسپانوی درخت کی مانند اپنے قابل ذکر سیاہ سوٹ میں ملبوس. خاموش اور کھچا ہوا نظر آیا۔ اتفاقیہ طور پر گندہ دہن، جان رامون شاعری کے پرانے بدمعاش نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ وہ راکھ میں ملفوف پھرتا تھا۔ اور اس کی جیبوں میں سوائے سگرٹ کے ٹکڑوں کے کچھ نہیں۔ خود جان رامون جیمز، ایک خوشگوار شاعر تھا جس نے مجھے روایتی ہسپانوی رشک کے بارے میں سبق پڑھائے۔ یہ شاعر جسے کسی پر رشک کرنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس کا کام صدی کی تاریک ابتدا پر ایک درخشاں کرن کی مانند چمکا تھا لیکن اس نے ایک گوشہ نشین کی زندگی کو اپنی کمین گاہ سے باہر ہر اس چیز پر حملہ کرتے ہوئے. جس کے بارے میں اسے ذرا سا بھی یہ شبہ ہو جاتا کہ وہ اس پر اثر انداز ہو گی، متاثر کیا تھا۔ نئی نسل گارسیالور کا اور البرٹی کے علاوہ خورخے گیولین(Jorge Guillen) اور پیڈروسیلیناس (Pedro Salinas) کو بھی بارلیش بلا جون رامون، کو اشد احتیاج تھی. جو روزانہ کسی نہ کسی پر حملہ آور ہو جاتا ___ میرے بارے میں اس نے اپنے اخبار (Elsol) ایلسول کے تنقیدی کالموں میں جو ہر اتوار کو شائع ہوتے تھے. خاصی نامناسب باتیں لکھی تھیں میں نے کبھی ادبی جملوں کا جواب نہیں دیا اور اب بھی نہیں دیتا شاعر (Manuel Alto Laguirre) مینویل آلٹو لیگوری جس کا اپنا چھاپہ خانہ تھا ایک دن میرے پاس یہ بتانے آیا کہ وہ انتہائی دیدہ زیب شکل میں اعلیٰ ترین خوبصورت شاعری پر تبصرہ کرنے والا ہے. اس میں اسپین کا شاندار تخلیقی سرمایہ شامل ہو گا اور اس کی ادارت صرف ایک شخص کر سکتا ہے اس نے مجھ سے کہا اور وہ شخص تم ہو۔

میں اس وضع کے رسائل کا. جنھوں نے انہیں گرا دیا یا جن کو انہوں نے ختم کر دیا. ایک پرجوش اجرا کنندہ تھا۔

۱۹۲۵ء میں میں نے (Jack of clubs) نامی رسالے کا اجراء کیا۔ اس زمانے میں ہم

پنکچوئیشن کے بغیر لکھا کرتے تھے اور ڈبلن کی گلیوں کو ہم نے (James Joyce) جیمز جوائس کے حوالے سے دریافت کیا تھا۔ ہمبرٹوڈیاز ہائی نیک کا سویٹر پہنتا تھا. جو اس وقت کے شاعر کے لئے جرات مندانہ بات تھی۔ اس کی شاعری خوبصورت اور بے داغ تھی اور ہمیشہ ایسی ہی رہی۔ روز امیل ڈیل ہمیشہ شاعروں کے انداز میں سر سے پیر تک سیاہ لباس میں ملبوس رہتا۔ اپنے یہ معزز مدد گار مجھے یاد ہیں کچھ مجھے یاد نہیں رہے۔ ہر حال میں ہمارے دوڑتے ہوئے گھوڑے نے وقت کا ساتھ دیا۔

ہاں (Manolito) مینولیٹو میں تبصرے کی ادارت کروں گا" مینولیٹو ایک عمدہ چھاپنے والا تھا. جس کے اپنے ہاتھ چھاپنے کے عمل میں شامل رہتے۔ وہ اپنے ہاتھوں اور اپنی نظموں کے ساتھ شاعری کی عزت کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ ایک سخت محنت کش کے ہاتھ تھے۔ اس نے Pe) (Fabel of the Genil River)پیڈرو ڈی اسپینوزا کی کتاب dro De Espinosa) - بھی شائع کی تھی اس کی خوبصورت چھپائی میں سنہری نظموں کے حروف ایک شاندار انداز میں یوں نمایاں ہو جاتے. جیسے انہیں کسی بھٹی میں سے نکالا گیا ہو۔ (Cabauo Verde) کے پانچ حسین شمارے کتابوں کی دکانوں میں نظر آئے۔ مجھے مینولیٹو کو دیکھنے میں لطف آتا. جو ہمیشہ مسکراتا ہوا حرفوں کو چن کر انہیں کیس میں سجاتا اور پھر اپنے پاؤں سے مشین کو چلاتا کبھی وہ "تبصرے" کی کاپیاں اپنی نواسی کی ہاتھ گاڑی میں ڈال دیتا اور لوگ گلیوں میں کہتے۔

"کیا زبردست باپ ہے. اس بیہودہ ٹریفک میں وہ اپنی بچی کو لئے جا رہا ہے" ۔ اور یہ بچی شاعری تھی۔ اس تبصرے میں میگوئیل ہرنانیڈیز کی نئی نظم شائع ہوئی تھی۔ اور اس کے علاوہ فیڈریکو. سرنوڈا اور گیولین کی شاعری بھی تھی۔ اس صدی کا خبطی جون رامون اپنے ہفتہ وار تبصروں میں مجھ پر طنز کے تیر چلاتا رہا۔ رافیل البرٹی کو یہ عنوان پسند نہ آیا۔ سبز گھوڑا۔ اسے تو سرخ گھوڑا کہنا چاہئے۔ میں نے اس کا رنگ نہ بدلا اور رافیل اور میں اس پر جزبزنہ ہوئے. کبھی بھی ہمارے مابین کبھی بھی کسی بات پر تکرار نہ ہوئی۔

دنیا میں قوس قزح کے بکھرے ہوئے رنگوں جیسے شاعروں اور گھوڑوں کے ئے وافر جگہ موجود ہے (Caballo Verde) کا چھٹا شمارہ جس کی کاپیاں ابھی نہ جڑی تھیں (Viriatio Street)میں رہ گیا۔ یہ شمارہ (Jullo Herera) کے نام منسوب تھا اور اس میں اسپین کے بہت سے شاعروں نے اس کی تعریف و توصیف میں لکھا تھا۔ لیکن رسالے کو اپنی تمام خوبصورتی کے باوجود پیدا ہونے سے پہلے ہی مرنا پڑ گیا۔ اس رسالے کو ۱۹ر جولائی ۱۹۳۶ء کو منظر عام پر آنا تھا لیکن اس دن اسپین کی گلیوں میں گولیاں چل رہی تھیں۔ افریقی گریزن کا ایک غیر معروف جنرل

فرانسسکو فرانکو (Gen Frncisco Franco) جمہوریہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

غرناطہ میں جرم

اس وقت جب کہ میں یہ سطور رقم کر رہا ہوں، اسپین میں سرکاری طور پر کامیاب انقلاب کا جشن منایا جا رہا ہے۔

میڈرڈ میں اس لمحے اطلسی اور نیلے رنگوں میں ملبوس اپنے مور محافظوں کے نرغے میں اور ارد گرد ریاست ہائے متحدہ امریکہ، انگلستان اور بہت سے دوسرے ممالک کے سفیروں کے ہمراہ سپریم کمانڈر اپنی فوج کا معائنہ کر رہا ہے فوجی، جن میں بیشتر ایسے لڑکے شامل ہیں، جنہوں نے کبھی جنگ نہیں دیکھی لیکن میں نے تقریباً دس لاکھ مردہ ہسپانویوں اور کم و بیش اتنی ہی تعداد میں ملک چھوڑنے والوں کو دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے لہو میں ڈوبا ہوا وہ کانٹا انسانی ضمیر سے کبھی نہ نکالا جا سکے گا۔ اس کے باوجود فوجی لڑکے، جو مور محافظوں کے سامنے سے گزر رہے ہیں، اس ہولناک جنگ کی صداقت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

میرے لئے اس کا آغاز ۱۹ر جولائی ۱۹۳۶ء کی شام کو ہوا چلی کا خوش مزاج (Boby Deglane) بوبی ڈیگلانے میڈرڈ کے مشہور اکھاڑے (Circo Price) میں پہلوانی کا ممدو مدد گار تھا۔ اس کھیل کے بارے میں میری ذاتی رائے محفوظ ہے۔ لیکن اس نے مجھے گارسیالورکا کے ہمراہ اس شام اکھاڑے جانے کے منوالیا تھا تاکہ میں دیکھ سکوں کہ کھیل کتنا کامیاب رہا۔ اس کے بارے میں لیوسکا سے میری بات چیت ہو گئی تھی اور ہم نے وہاں پہنچنے کا وقت طے کر لیا تھا۔ ہم ایبسی سنیا کے نقاب پوش پہلوان اور بدنام زمانہ پہلوان (Orangutan) ارنگٹن کے مقابلے کو دیکھنے جا رہے تھے۔ فیڈریکو نہ آسکا۔ اس وقت وہ اپنی موت کی جانب رواں دواں تھا۔ اس کے بعد ہم کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ اس طرح ہسپانوی جنگ، جس نے میری شاعری کو بدل ڈالا میرے لئے ایک شاعر کے غائب ہو جانے سے شروع ہوئی۔ کیا شاعر تھا وہ! اس جیسی ذہانت اور سلیقہ میں نے نہ دیکھا فیڈریکو گارسیالورکا ایک بے مثال انسان تھا۔ اس کی مقناطیسی حس مزاح اس کے قلب میں جینے کی تمنا کو بیدار رکھتی تھی اور وہ ایک سیارے کی مانند دمکتا رہتا۔ وسیع القلب اور ہنس مکھ ایک دنیا دار انسان عجب مجموعہ اضداد تھا وہ۔ غیر معمولی طور پر موسیقی کی قابلیت بھی رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ بے حد شریف النفس اور توہم پرست بھی تھا اور باآسانی کسی بھی بات پر چونک پڑتا۔ وہ اپنے وطن! اسپین کی مقبول عام روایات کی مختلف ادوار میں ایک مثال تھا۔ عرب اور اندلسی ماخذ کا ایک شاندار شخص، جو چنبیلی کی طرح مہکتا لیکن افسوس کہ اسپین کی وہ روایت ہمیشہ

کے لئے ختم ہو گئی۔

گارسیالور کا کے استعارے پر یاد گار محاکے نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا اور ہر چیز جو اس نے تحریر کی اس نے مجھے اپنی طرف مائل کیا۔ وہ خود مجھ سے میری تازہ نظمیں سنا کرتا اور سنتے ہوئے درمیان میں چیختے ہوئے رکورکو کا شور مچا دیتا "لگتا ہے میں تم سے متاثر ہو رہا ہوں۔" تھیٹر میں یا خاموشی میں، ہجوم میں یا مختصر سے گروہ میں وہ خوبصورتی کی تخلیق کرتا۔ آج تک میں نے اس جیسے جادوی ہاتھ نہ دیکھے۔ میرا کوئی ایسا بھائی نہیں، جو قہقہوں سے اس قدر محبت کرتا۔ وہ ہنستا، گاتا، پیانو بجاتا، اختراع کرتا، اچھلتا اور چمکتا غریب دوست اس کے پاس سارے فطری تحائف موجود تھے۔ وہ ایک زرگر تھا شاعری کے چھتے میں وہ ایک ستارے کی مانند تھا، لیکن کبھی کبھار وہ اپنی صلاحیت کو ضائع بھی کر دیتا۔

"سنو ــــ وہ میرے ہاتھ کو تھامتے ہوئے کہتا۔ "کیا تمہیں وہ کھڑکی نظر آتی ہے؟" کیا تمہارے خیال میں وہ Chorpatelic نہیں ہے؟"

اور اس لفظ (Chorpatelic) کا کیا مطلب ہے؟

مجھے بھی اس کا علم نہیں، لیکن اس کا مطلب معلوم ہونا چاہئے ورنہ تم گم ہو جاؤ گے۔ اس کتے کو دیکھو، وہ درحقیقت (Chor Patelic) ہے یا پھر وہ مجھے بتاتا کہ وہ کسی تقریب میں مدعو ہے، بچوں کے کسی اسکول میں جہاں شہرہ آفاق ہسپانوی ادیب (Cervantes) سروانتے کی تخلیق (Don Quixote) ڈان کوخوتے کو اسٹیج کیا جا رہا ہے اور جب وہ کلاس روم میں داخل ہوتا تو بچے ہیڈ مسٹریس کے ہمراہ گاتے۔

"یہ کتاب جس کی (F.Rodriguez Marin Ph.D) ایف روڈریگز مارین (پی ایچ ڈی) نے وضاحت کی تھی، ہر جگہ اور ہمیشہ ہمیشہ کامیاب و کامران رہے گی ــــ (آمین)"

اس کی موت کے برسوں بعد ایک بار میں نے گارسیالور کا پر ایک تقریر کی اور مجمع میں سے کسی نے مجھ سے سوال کر دیا کہ گارسیالور کا کے نام نظم میں تم یہ کیوں کہتے ہو کہ انہوں نے اس کے لئے ہسپتال کو نیلا رنگ کر دیا تھا جواب میں، میں نے کہا تھا۔ سنو میرے دوست، کسی بھی شاعر سے اس قسم کا سوال کرنا، کسی عورت سے اس کی عمر پوچھنے کے مترادف ہے۔

شاعری کوئی جامد مادہ نہیں بلکہ بہتی ہوئی ایک رو ہے، جو بسا اوقات خود تخلیق کار کے ہاتھوں سے بھی نکل جاتی ہے۔ تخلیق کار کا مواد ان عناصر پر ہے، جو کبھی ہوتے ہیں اور کبھی نہیں ہوتے۔ وہ اشیاء، جن کا وجود ہوتا ہے اور جو وجود نہیں رکھتیں۔ اس کے باوجود میں تمہیں ایک سچا جواب دوں گا ــــ میرے لئے نیلا رنگ حسین ترین رنگ ہے جب انسان اسے دیکھتا ہے تو یہ اسے فضا کا

تاثر دیتا ہے۔۔۔ آسمان کے ایک گنبد کی مانند، جو آزادی اور خوشی کی جانب بلند ہو رہا ہے۔ فیڈریکو کی موجودگی اس کا ذاتی سحر اس کے گرد ایک خوش مزاجی کی کیفیت کو قائم رکھتا تھا۔ شاید میری سطر کا مطلب یہ ہو کہ ہسپتال تک کی اداسی اس کے ساحرانہ مزاج کے باعث اچانک خوبصورت نیلے رنگ کی عمارت میں ڈھل جاتی ہے۔

فیڈریکو گارسیالورکا کو اپنی موت کے بارے میں پہلے سے علم تھا۔ ایک بار ایک تھیٹر سے واپسی کے فوراً بعد اس نے ایک عجیب اتفاق کو سنانے کے لئے مجھے بلا بھیجا وہ Labarr) aca) کے طائفے کے ہمراہ کیسٹائل (Castile) کے مضافاتی گاؤں میں خیمہ زن تھے۔ سفر کی تکان کے باعث فیڈریکو سو نہ سکا تھا صبح سویرے ہی اٹھ کر وہ تنہا سیر کے لئے باہر نکل گیا۔ سرد صبح جسم کو چاقو کی طرح کاٹ رہی تھی۔ دھند نے ہر شے کو سفید حصوں میں منقسم کر رکھا تھا اور ہر چیز بھوتوں کی مانند دکھائی دیتی تھی ۔۔۔ ایک بہت بڑا زنگ خوردہ لوہے کا دروازہ، سوکھے پتوں میں ٹوٹے ہوئے بت اور گرے ہوئے ستون وہ ایک بڑی حویلی کے گیٹ پر رک گیا۔ یہ کسی جاگیردار کی وسیع و عریض حویلی کے باغ کا سامنے کا حصہ تھا۔ اس کی ویرانی کی حالت، وقت اور سخت سردی نے تنہائی کو اور بھی موثر بنا دیا تھا۔ اچانک فیڈریکو کو احساس ہوا کہ سورج کے طلوع ہونے کے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔ وہ وہیں گرے ہوئے ایک شکستہ ستون کے سرے پر بیٹھ گیا۔

ایک ننھا سا میمنا کھنڈرات میں اگی ہوئی گھاس کھانے نجانے کہاں سے آ گیا تھا۔ اس ویرانے کی تنہائی میں ایک کومل پتی کی طرح گرتے ہوئے دھند کے فرشتے کی مانند تنہائی کو جاندار ماحول میں ڈھالنے کے لئے ظاہر ہوتے ہوئے۔ شاعر اب خود کو اکیلا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ لیکن اچانک سوروں کا ایک غول کہیں سے اس جگہ آ گھسا۔ یہ چار یا پانچ سیاہ رنگ کے جنگلی سوّر تھے۔ جن کی وحشت ناک بھوک ان کے وجود سے عیاں تھی۔ ان کے سم چٹانوں کی مانند تھے۔ پھر فیڈریکو نے یہ خون آشام منظر دیکھا۔ وہ سوّر اس میمنے پر پل پڑے اور شاعر کے خوف کی انتہا نہ رہی، جب انہوں نے وہیں اس میمنے کو چیر پھاڑ کر کھا لیا اس ہولناک منظر نے فیڈریکو کو اپنے طائفے کو وہاں سے منتقل کرنے پر مجبور کر دیا۔

خانہ جنگی سے تین ماہ قبل جب اس نے مجھے یہ سن کر دینے والی کہانی سنائی تو فیڈریکو اس وقت تک اس واقع کے خوف کے زیر اثر تھا۔ بعد میں مجھے یوں لگا بلکہ بتدریج یہ واضح ہوتا گیا۔ جیسے یہ واقع خود فیڈریکو گارسیالورکا کی اپنی موت کی پیش بینی تھی۔ اس ناقابل یقین المیے کی آگہی فیڈریکو گارسیالورکا کو محض گولی نہیں ماری گئی تھی بلکہ اسے قتل کیا گیا تھا۔۔۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ وہ لوگ اسے ایک دن مار دیں گے۔ ہسپانوی شاعروں میں وہ سب سے

زیادہ محبت کیا جانے والا اور بے حد پسندیدہ شاعر تھا اور اپنی خوش مزاجی کے باعث وہ بالکل ایک بچے کی طرح تھا ـــ کس کو یقین آ سکتا تھا کہ اس زمین پر عفریت بھی ہیں، خود اس کے اپنے شہر غرناطہ میں ایسے ناقابل فہم جرم کے سرزد کرنے والے؟

یہ مجرمانہ فعل اس طویل جدوجہد میں میرے لئے بے حد اذیت ناک تھا اسپین سدا سے قیدیوں کے لئے ایک میدان کارزار رہا تھا۔ ایک ایسا ملک، جہاں بہت خون بہا تھا ـــ بیلوں کا اکھاڑہ، ان کی قربانی اور اکھاڑے کی ظالمانہ وجاہت ـــ تکرار، بھڑکیلے سورماؤں والا منظر نامہ ـــ زمانہ ازل سے تاریکی اور روشنی کے مابین موت سے جدوجہد ـــ

(Fray Luis de Leon) فرے لوئیس ڈی لیون کی قید کے زمانے میں محکمانہ تفتیش کے دوران (Queuedo) کوویڈو کو زیر زمین تہہ خانے میں اذیتیں برداشت کرنا پڑیں۔ (Columbus) کولمبس کو اپنے ٹخنوں پر لوہے کے کڑوں کے ساتھ اچھلنا پڑا اور عظیم ترین نمائش گاہ (El Escorial) ایل ایسکوریئل کا مردہ گھر لاکھوں مرے ہوؤں اور ان گنت سیاہ یادوں پر اپنی ایستادہ صلیب کے ساتھ موجود تھا۔

اسپین پر میری کتاب

وقت گزر گیا ـــ ہم جنگ ہارنے کی شروعات میں ہیں شاعروں نے ہسپانوی عوام کا ساتھ دیا۔ فیڈریکو غرناطہ میں قتل کر دیا گیا تھا۔ چرواہے مگوئیل ہرنانڈیز کو ایک لڑنے والے میں تبدیل کر دیا گیا ـــ سپاہی کی وردی پہنے ہوئے وہ اگلے مورچوں پر اپنی نظمیں سنایا کرتا۔ منیوئیل آلتو لیگوائرے نے اپنے چھاپے خانے کو جاری رکھا اس نے چھاپے خانے کو (Gerona) جیرونا کے قریب مشرقی محاذ پر ایک عبادت گاہ میں رکھا ہوا تھا۔ میری کتاب (Espana Enel corazona) ایک انوکھے انداز میں یہیں چھپی۔ مجھے یقین ہے کہ کتابوں کی غیر معمولی تاریخ میں شاید ہی کسی کتاب کی پیدائش اور مقدر ایسا رہا ہو۔

محاذ پر سپاہیوں نے حروف کو سجانا سیکھ لیا تھا، لیکن وہاں کاغذ فراہم نہ تھا۔ انہوں نے ایک پرانا کارخانہ تلاش کر لیا اور وہاں اسے تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنگ کے عین وسط میں گولوں کے گرنے کے دوران ایک عجیب و غریب آمیزہ تیار کیا گیا۔ ہر چیز جو ان کے ہتھے چڑھی اسے انہوں نے کارخانے میں شامل کر دیا۔ دشمن کے جھنڈے سے لے کر کسی مور سپاہی کی خون آلود وردی تک اور غیر معمولی مواد اور ناتجربہ کاری کے باوجود جو کاغذ تیار ہوا وہ بہت خوبصورت تھا۔ اس کتاب کی چند کاپیاں جو اب بھی موجود ہیں اس کی چھپائی اور پراسرار انداز میں تیار کئے گئے کاغذ

کے بارے میں حیران کر دیتی ہیں بہت سالوں کے بعد میں نے اسی کتاب کی ایک نقل واشنگٹن کی لائبریری آف کانگریس کے شوکیس میں سجی دیکھی، جس پر درج تھا، ہمارے عہد کی ایک نادر ترین کتاب۔ میری کتاب اس وقت چھپ کر اور جلد بندی کے بعد سامنے آئی تھی جب جمہوریہ کو شکست کا سامنا تھا لاکھوں کی تعداد میں مہاجر اسپین سے باہر جانے والی سڑکوں پر جمع تھے یہ ایک انخلا تھا۔ اس ملک کی تاریخ کا سب سے دردناک واقعہ اس ملک سے وطن چھوڑنے والوں کی قطاروں میں مشرقی محاذ پر بچ جانے والے موجود تھے اور انہی میں مینویل آلٹو لیگورائرے اور وہ سپاہی بھی شامل تھے، جنہوں نے کاغذ تیار کر کے میری کتاب کو شائع کیا تھا۔ میری کتاب ان لوگوں کا سرمایہ افتخار تھا، جنہوں نے میری شاعری کو موت کا سامنا کرتے ہوئے چھاپا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ان میں سے بہت سوں نے میری کتاب کی کاپیوں کو اپنے تھیلوں میں خوراک یا کپڑوں کی بجائے رکھا تھا اپنے کندھوں پر ان تھیلوں کو اٹھائے ہوئے وہ فرانس کی جانب ایک طویل مسافت کے مرحلے میں تھے۔ ملک بدر ہونے والے نامختتم پیادہ قافلوں پر سینکڑوں بار بمباری کی گئی سپاہی گرے اور کتابیں شاہراہ پر بکھر گئیں۔ بچنے والوں نے اپنی نہ رکنے والی مسافت کو جاری رکھا۔ سرحد کے دوسری طرف ہسپانوی جو ملک بدر ہوئے انہیں وحشیانہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جذبے سے لکھی گئی کتاب کی آخری کاپیاں خوفناک جنگ کے دوران ایک بھڑکتی ہوئی آگ کی نذر ہو گئیں۔

میگوئیل ہرنانینڈیز نے چلی کے قونصل خانے میں پناہ حاصل کرنا چاہی اس قونصل خانے نے جنگ کے دوران فرانکو کے چار ہزار مقلدین کو سیاسی پناہ دی تھی۔ سفیر (Carlos Morla Lynch) کارلوس مورلانچ گو خود کو شاعری کا دوست بتاتا تھا، لیکن اس نے عظیم شاعر کو پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ چند دن بعد اسے گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا گیا تین سال بعد وہ جیل ہی میں تپ دق کے باعث ہلاک ہو گیا۔

بلبل قید کی صعوبت کو برداشت نہ کر سکی۔

بحیثیت قونصل میرے فرائض منصبی ایک اختتام کو پہنچے، کیونکہ میں نے ہسپانوی جمہوریہ کے دفاع میں حصہ لیا تھا، اسی لئے چلی کی حکومت نے مجھے میرے موجودہ منصب سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔

جنگ اور پیرس

ہم پیرس پہنچ گئے۔ جہاں میں نے (Quaide Ihor loge) کے شاندار پرسکون علاقے میں رافیل البرٹی اور اس کی بیوی ماریا ٹریسا لیون (Maria Teressa Leon) کے ساتھ

مل کر ایک گھر حاصل کر لیا۔ اپنے گھر سے میں (Pont-neuf) ہنری چہارم کے مجسمے اور دریائے سین (Seine) کے کنارے بیٹھے ہوئے مچھیروں کو دیکھ سکتا تھا (Duphinue) ڈ وفین اپنے ریستورانوں اور پتوں کی مخصوص مہک کے ساتھ بالکل ہمارے گھر کے پچھواڑے میں تھا۔ ایک فرانسیسی ادیب (Alejo Carpentier) ایجو کارپینٹر جس سے زیادہ غیر جانب دار شخص میں نے نہیں دیکھا، وہیں رہتا تھا۔ وہ کسی بھی بات پر اپنی رائے دینے سے باز رہتا، حتیٰ کہ نازیوں تک پر بھی نہیں، جو جلد ہی پیرس پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح حملہ کرنے والے تھے۔

اپنی بالکونی سے دائیں جانب، میں (Coneiehgerie) کے سیاہ میناروں کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کا بڑا سنہری کلاک میرے لئے پڑوس کی آخری حد تھا۔ فرانس میں تب اور بہت سال بعد تک میں فرانس کے دو بڑے مشہور ادیبوں کو اپنا عزیز دوست سمجھنے پر نازاں تھا۔ اور وہ Paul) (Eluard پال الیارڈ اور (Aragon) ایراگون تھے ـــــ یہ لوگ غیری معمولی حد تک فطری انداز کی مثال تھے۔ ایک بے حد اہم وثوق کے ساتھ، جو انہیں فرانس کے گونج دار جنگل میں جگہ دیتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ تاریخی اقدار کے غیر متزلزل باطنی جزو بھی تھے۔ بہت کم انسان ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوں گے جیسے کہ یہ دونوں اکثر میں پال الیارڈ کے ساتھ خوش وقت ہو کر شاعرانہ حظ اٹھاتا۔ اگر شاعر حضرات رائے عامہ کا سچ جواب دیتے تو وہ راز سے پردہ اٹھا دیتے ـــــ وقت ضائع کرنے سے زیادہ خوبصورت کوئی بھی شے نہیں۔ ہر شخص کا خوش وقت ہونے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ اور یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ وقت بذات خود ـــــ پال کے ہمراہ میں دن رات کے گزرنے کے احساس تک کو بھول جاتا، اور کبھی بھی مجھے معلوم نہ ہوتا کہ ہم کس بات پر بحث کر رہے ہیں اور آیا کہ وہ ضروری بھی ہے یا نہیں۔ ایراگون ذہانت کی ایک برقی مشین تھا۔ جس کے ہاں سیکھنے کا عمل شدت اور تیز رفتاری کے باوجود سلیقے سے رواں رہتا۔ میں نے ہمیشہ الیارڈ کے گھر کو مسکراتے ہوئے چھوڑا یہ جانے بغیر کہ کیوں۔ ایراگون کے ساتھ چند ہی گھنٹوں کے بعد میں تھکا ماندہ باہر آتا کیونکہ یہ جن قسم کا آدمی مجھے سوچنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ یہ دونوں حضرات میرے عزیز ترین دوست رہے اور شاید جس بات نے مجھے ہمیشہ ان کا گرویدہ کئے رکھا وہ ان دونوں کے مزاجوں اور صلاحیتوں میں واضح فرق تھا۔

نینسی کیونارڈ (Nancy Cunard)

نینسی کیونارڈ اور میں نے شاعری پر تبصرہ شائع کرنے کا ارادہ کر لیا اسے میں نے Les) Poetes do Monde Defendent le puple espagnol) کا نام دیا، جس کا مطلب

ہے (دنیا بھر کے شاعر جو ہسپانوی عوام کا دفاع کرتے ہیں) نینسی کا ذاتی ایک چھوٹا سا چھاپہ خانہ فرانس کے صوبائی گاؤں والے گھر میں تھا جو پیرس سے خاصے فاصلے پر تھا. جب ہم اس کے گھر پہنچے تو رات کا وقت تھا اور چاند نکلا ہوا تھا۔۔۔ برف اور چاندنی سارے علاقے کے گرد پردے کی مانند پھڑپھڑا رہی تھی۔ میں اس سے متاثر ہو کر سیر کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ واپسی پر گرتی ہوئی برف کے گالے میرے سر کے ارد گرد شدید سردی میں رقصاں رہے۔ میں اپنے آپ کو بھول چکا تھا اور بدقت تمام برف کی سفیدی میں اپنے راستے کو رات میں آدھا گھنٹہ ڈھونڈتا رہا۔

نینسی کے ہاں چھپائی کا تجربہ تھا۔ ایراگون سے قریبی تعلقات کے دوران اس نے اپنے اور ایراگون کے مشترکہ ترجمے کو (The Hunting of the Snarg) کے نام سے شائع کیا تھا (Lewis Carole) لوئیس کیرول کی نظم حقیقتاً ناقابل ترجمہ ہے اور میرے خیال میں صرف (Gongora) ہی میں ہم اس پاگل پن کے مترادف کو ڈھونڈ سکتے ہیں۔

پہلی بار میں نے حرفوں کو جوڑنا شروع کیا اور مجھے یقین ہے کہ مجھ سے زیادہ خراب (Type Setter) کوئی اور نہ ہو گا۔

میں نے "p" کے حرف کو الٹا جوڑ کر چھاپ دیا اور میرے غلط جوڑنے کے باعث یہ حرف ہر جگہ "d" میں تبدیل ہو گیا۔

مثلاً ایک سطر جہاں لفظ (Parpados) جس کا مطلب ,پپوٹے, ہے, دوبارہ آتا ہے, دونوں جگہ یہ لفظ (Dardapos) میں تبدیل ہو گیا برسوں بعد نینسی نے مجھے میرے عزیز (Dardapos) مخاطب کرتے ہوئے اس کی سزا دی۔ وہ اپنے خطوط لندن سے لکھا کرتی تھی۔ یہ اشاعت خاصی توجہ کی حامل رہی اور یوں ہم چھ سات شمارے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔

جوشیلے شاعروں (Gongalez Tunon) گونزالیز ٹیونان اور البرٹی کے علاوہ ہم نے کچھ فرانسیسی شاعروں کو بھی شامل کیا۔ ان کے علاوہ ہم نے (W.H.Auden) ڈبلو ایچ آڈن اور (Spencer) اسپنیر کی نظمیں بھی اس میں شائع کیں۔ یہ انگریز شعراء شاید کبھی بھی نہ جان سکیں گے کہ میری ست انگلیاں ان کی نظموں کو ترتیب دینے میں کس قدر آرزدہ رہیں۔ وقتاً فوقتاً وہاں انگلستان سے شاعر آتے نینسی کے وہ دوست جنہوں نے فرانکو کے خلاف نظمیں لکھیں اپنے کوٹ کے کالروں میں سفید پھول لگائے ہوتے۔ علم و دانش کی تاریخ میں شاید ہسپانوی خانہ جنگی سے زیادہ فعال موضوع کبھی نہیں رہا۔

اسپین میں بہے ہوئے خون نے مقناطیس کا کام کیا, جس نے ایک طویل مدت کے لئے

شاعری کو لرزا کے رکھ دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے رسالے کی اشاعت کامیاب رہی یا ناکام،
کیونکہ اسپین میں جنگ اس وقت اپنے ہولناک انجام کو پہنچی جب دوسری جنگ عظیم کی ہیبت ناک
ابتدا کا آغاز ہو رہا تھا — اپنی وسعت اور ناقابل پیمائش مظالم اور اس سارے لہو کے بہنے کے باوجود
یہ جنگ شاعری کے اجتماعی احساس کو اپنی گرفت میں یوں نہ لے سکی جیسے کہ اسپین کی خانہ جنگی میں
ہوا تھا۔ کچھ عرصے بعد مجھے یورپ سے اپنے وطن کے لئے واپس جانا تھا نینسی بھی اپنے بل فائیٹر کے
ہمراہ چلی کے لئے عازم سفر تھی، جو اسے اور بیلوں کو سانتیاگو میں چھوڑ کر گوشت کی تجارت میں
مصروف ہو گیا تھا لیکن میری عزیز دوست جو بہت مدبع انسان تھی اتنی آسانی سے ہار ماننے والی نہیں
تھی۔ چلی میں جلد ہی اسے ایک شاعر بطور عاشق کے مل گیا کو خوتے کی مانند ناقابل متزلزل، بے
خوف اور قابل رحم نینسی ان عجیب و غریب لوگوں میں سے تھی جن سے کبھی میرا تعلق رہا کیونارڈ
ورثے کی واحد مالکہ نینسی لیڈی کیونیارڈ کی بیٹی تھی، جس نے ۱۹۳۰ء میں (Savoy) سیوائے
ہوٹل میں بلائے جانے والے جاز بینڈ کے ایک سیاہ فام رکن کے ساتھ بھاگ کر سارے لندن کو
ایک سیکنڈل میں پھنسا دیا تھا۔

جب لیڈی کیونارڈ نے اپنی بیٹی کے بستر کو خالی پایا اور اس کے ایک خط نے فخر کے ساتھ
اپنے سیاہ مستقبل کی نوید سنائی تو اس نیک خاتون نے اپنے وکیل کے پاس جا کر اپنی بیٹی کو پائی پائی کے
لئے محتاج کر دیا اور یوں برطانوی شرافت سے عاق شدہ اس جوان لڑکی سے تیسری دنیا میں گھومتے
ہوئے میری ملاقات ہوئی۔ اس کی ماں کے ہاں جارج مور (جس کے بارے میں یہ خبر عام تھی کہ
وہ ہی نینسی کا اصل باپ ہے) سر تھامس بیچم جوان آلڈس ہکسلے اور مستقبل کا ڈیوک آف ونڈسر،
جو نی القوت پرنس آف ویلز تھا آتے رہتے تھے۔

نینسی کیونارڈ نے جوابی حملہ کیا۔ اسی سال کے دسمبر میں جب اس کی ماں نے اسے جائیداد
اور ترکے سے عاق کر دیا تھا، انگریز اشرافیہ کو کرسمس کے تحفے کے طور پر سرخ لفافے میں ملفوف
ایک کتابچہ ملا جس پر نیگرو مرد اور سفید خاتون درج تھا۔ میں نے اس سے زیادہ تلخ شے کبھی نہ
دیکھی تھی۔ یہ کتابچہ اپنے بعض حصوں میں آئیرلینڈ کے شہرہ آفاق ناول (Gulliver,s Tra
vels) کی طرح معنی خیز تھا۔ سیاہ لوگوں کے دفاع میں نینسی کے دلائل لیڈی کیونارڈ اور انگریز
معاشرے پر ڈنڈوں کی طرح برسے مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس نے کہا تھا — یہ میں اپنی یادداشت سے
بیان کر رہا ہوں۔ جب کہ نینسی کے الفاظ زیادہ مؤثر اور معنی خیز تھے۔

"فرض کریں کہ آپ کی گوری نسوانیت کو یا آپ کے لوگوں کو اغواء کر لیا جاتا۔ پھر انہیں
مارا جاتا اور ایک زیادہ طاقتور قبیلے کے زیر نگیں پابہ زنجیر کر دیا جاتا اور پھر انگلستان سے کہیں دور

غلاموں کی حیثیت میں فروخت کر کے انسانی گندگی کے نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا۔ کوڑے مار کر کام کرایا جاتا اور کم مقدار میں معمولی غذا کھانے کو ملتی تو تمہاری نسل کا کیا باقی رہتا؟"

سیاہ فام لوگوں نے اس استبداد اور ظلم کے علاوہ جانے کیا کچھ سہا ہے صدیوں کے مصائب کے باوجود اب بھی کھیل کے میدان میں ان سے اچھا کھلاڑی نہیں اور جو موسیقی انہوں نے تخلیق کی ہے. وہ نہ صرف آفاقی ہے بلکہ کسی بھی موسیقی سے بہتر ہے ـــــ کیا تم اور تمہارے جیسے دوسرے گورے اس وضع کی غیر مساویانہ صورت حال میں فاتح کی حیثیت میں ابھرتے؟" اور اسی قسم کے تیس صفحات ـــــ

اس کے بعد سے نینسی کبھی انگلستان میں نہ رہ سکی اور تبھی سے اس نے مظلوم سیاہ فام نسل کے مقصد کو اپنا مشن بنا لیا۔ ایتھوپیا میں فوجی مداخلت کے دوران وہ ایدس ابابا گئی. جہاں سے وہ امریکہ چلی گئی تاکہ (Scottsboro) سکاٹس برو کے ان سیاہ فام جوانوں کے لئے کچھ کر سکے، جن پر ناکردہ جرائم کا الزام تھا۔

"سیاہ فام جوان ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے نسل پرست انصاف کی وجہ سے قید میں ڈال دیئے گئے تھے۔ اور نینسی کیونارڈ کو شمالی امریکہ کی جمہوری پولیس نے ملک سے واپس بھیج دیا تھا۔

میری دوست نینسی کیونارڈ ۱۹۶۹ء میں پیرس میں مر گئی۔ موت کے اچانک عذاب نے اس میں ایک عجیب تبدیلی پیدا کی اور وہ اپنے ہوٹل کی لفٹ میں برہنہ نیچے چلی گئی. جہاں پہنچ کر وہ فرش پر گر گئی اور اس کی خوبصورت نازک آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔ اپنی موت کے وقت اس کا وزن ۳۵ کلو گرام تھا۔ وہ محض ایک ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ اس کا جسم دنیا میں ناانصافی کے خلاف طویل جنگ میں ضائع ہو گیا تھا۔ جس کا انعام وہ زندگی تھی. جو بتدریج تنہا ہوتے ہوئے ایک دور افتادہ موت پر منتج ہوئی۔

میڈرڈ میں اجتماع

اسپین میں جنگ بد سے بدتر صورت اختیار کر رہی تھی۔ لیکن ہسپانوی عوام کے مدافعت کے جذبے نے ساری دنیا کو مسحور کر رکھا تھا۔ بین الاقوامی بریگیڈ پہلے ہی اسپین میں لڑ رہے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں، میں نے انہیں وردیوں میں ملبوس میڈرڈ میں آتے دیکھا۔ یہ مختلف عمروں، رنگ اور نسل کے شاندار لوگوں کا گروہ تھا۔

۱۹۳۷ء میں ہم پیرس میں تھے اور سب سے بڑا کام ایک فاشسٹ نظام کے خلاف دنیا بھر

کے ادیبوں کو مجتمع کرنا تھا ـــ یہ اجتماع میڈرڈ میں ہوا اور تب میں نے اراگون کو جاننا شروع کیا پہلی بات جس نے مجھے متاثر کیا وہ اس کی ناقابل یقین حد تک کام کرنے کی اہلیت اور تنظیمی صلاحیت تھی۔

وہ اپنے تمام خطوط لکھواتا، انہیں درست کرتا اور پھر یاد رکھتا، کوئی معمولی سی تفصیل بھی اس کی نظر سے نہ بچتی۔ ہمارے مختصر سے دفتر میں وہ گھنٹوں بیٹھا کام کرتا رہتا۔ باوجویکہ سب جانتے تھے کہ وہ نثر کے دفتر کے دفتر لکھ دیتا تھا لیکن فرانسیسی زبان میں اس کی شاعری سب سے خوبصورت تھی میں نے اسے روسی اور فرانسیسی ادیبوں کے تراجم کو صحیح کرتے دیکھا تھا اور پھر انہی کے پروف دیکھتے ہوئے دوبارہ غلطیاں نکالتے بھی دیکھا وہ واقعی ایک غیر معمولی انسان ہے۔ اور اس لمحے میں نے اس حقیقت کو پہچاننا شروع کیا۔

میں قونصل خانے سے نکالا جاچکا تھا اور بتدریج جیب بھی خالی ہو گئی تھی ایک ایسے ادارے میں چار سو فرانکس کے مشاہرے پر میں ملازمت کے لئے چلا گیا، جہاں آراگون کی نگرانی میں ثقافت کا دفاع ہوتا تھا۔ اس وقت میری بیوی (Delia del carril) ڈیلیا ڈیل کریل تھی جو کئی سالوں تک رہی۔ وہ ایک امیر مالک مکان کی شہرت رکھتی تھی حالانکہ وہ بیچاری مجھ سے زیادہ غریب تھی۔ مہینوں ہم دونوں ایک خستہ حال اور مشکوک نوعیت کے ہوٹل میں مقیم رہے، جہاں پہلی منزل ان جوڑوں کے لئے مختص تھی، جو آتے جاتے رہتے تھے۔ مہینوں ہم دونوں نے کم مقدار میں گھٹیا کھانا کھایا، لیکن فاشسٹ نظام کے خلاف اجتماع ایک حقیقت بن گیا، ساری دنیا سے خطوط موصول ہوئے ان میں سے ایک آئرلینڈ کے قومی شاعر (Yeats) ییٹس کا تھا دوسرا سویڈن کے مشہور ادیب (Selma Lagerlof) سیلما لیگرلوف کا۔ یہ دونوں اس قدر بوڑھے تھے کہ توپوں کی گھن گرج میں محصور میڈرڈ تک آنا ان کے لئے محال تھا، لیکن یہ ہسپانوی جمہوریہ کے دفاع میں، ساتھی تھے۔

میں نے خود کو ہمیشہ بہت کم خوبیوں کا انسان تصور کیا ہے، بطور خاص عملی کاموں اور اعلیٰ مقاصد کے مشن میں۔ لہٰذا جب مجھے ہسپانوی حکومت کی طرف سے کانگریس کے اخراجات کے لئے (جس میں دنیا بھر سے آنے والے ادیبوں کا سفر خرچ بھی شامل تھا) ایک معقول رقم کا ڈرافٹ ملا تو میں انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔ درجنوں ادیب پیرس پہنچ رہے تھے میں خاصا پریشان تھا اور سمجھ نہیں آرہا تھا کہ مجھے اس رقم سے کیا کرنا ہے؟ میں نے فیصلہ کیا کہ رقم کو اس تنظیم کے لئے جمع کر دیا جائے، جو صحیح معنوں میں اس ہونے والے اجتماع کے پس پشت تھی۔

"میں نے رقم نہیں دیکھی تھی اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ مجھے اس سے کیا کرنا

ہے ؟" میں نے رافیل البرٹی (Rafael Alberti) کو بتایا جو پیرس سے گزر رہا تھا رافیل نے کہا "تم پرلے درجے کے احمق ہو. تم نے اپنی قونصل کی ملازمت کو ہسپانوی مقصد کے لئے کھو دیا اور اب اپنے جوتوں کے تلووں میں سوراخ لئے پیدل پھرتے ہو اور یہ بھی نہیں چاہتے کہ اس میں سے کچھ ہزار فرانکس اپنی چھوٹی ضروریات اور کاموں کے لئے الگ کر لو۔ میں نے اپنے جوتوں کی طرف دیکھا ___ واقعی ان کے تلووں میں سوراخ تھے۔ البرٹی نے مجھے نئے جوتوں کا تحفہ دیا چند گھنٹوں میں، ہم باقی آنے والے مندوبوں کے ہمراہ میندرڈ کے لئے چلنے والے تھے (Delia) ڈیلیا اور (Amparo Gonzalez) ایمپارو گونزالیزاور میں ان ادیبوں کے کاغذات مکمل کر رہے تھے. جنہیں جانا تھا۔ فرانسیسی ویزا والوں نے بے شمار مسائل کھڑے کر رکھے تھے۔ لہٰذا ہم نے پیرس کی پولیس سے رابطہ کیا، جہاں سے ضروری معلومات کے کاغذات فراہم کر دیئے گئے۔ کبھی ہم نے خود بھی فرانس کے اعلیٰ اختیاری ادارے (Tampon) کی مہر کو پاسپورٹوں پر لگایا۔ ناروے. اٹلی اور ارجنٹینا کے ادیبوں کے ہمراہ میکسیکو سے (Octavio Paz) آکٹویو پاز ہزاروں مہمات کے بعد موجود تھا۔ اور مجھے فخر تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہو گیا تھا اس کی ایک کتاب شائع ہو چکی تھی، جو مجھے صرف دو ماہ قبل ملی تھی اور جس میں مستقبل کی نوید موجود تھی۔ فی الحال اسے کوئی اور نہ جانتا تھا۔

میرا پرانا دوست (Cesar Vallejo) سیزار والیجو چہرے پر بیزاری کے تاثرات لئے مجھے دیکھنے آیا۔ وہ ناراض تھا، کیونکہ اس کی بیوی کو جسے باقی سب نے ناقابل برداشت تصور کیا تھا، ٹکٹ نہ مل سکا تھا، جس کا بندوبست میں نے فوراً کر دیا، جو ہم نے والیجو کو دیا اور وہ وہاں سے اتنی ہی تیزی سے جیسے وہ آیا تھا چلا گیا۔ اسے کوئی چیز پریشان کر رہی تھی، جس کا علم کئی ماہ بعد ہوا میرا ہم وطن (Vicente Hudobro) وی سینتے ہوڈوبرو اسی کانگریس میں شرکت کے لئے پیرس پہنچا ہوا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بات چیت نہ کرتے تھے لیکن وہ والیجو کا دوست تھا، جس کے دماغ میں اس نے پیرس کے چند روزہ قیام کے بارے میں نجانے کیا کیا داستانیں بھر دی تھیں۔ بعد میں والیجو سے ایک طویل گرما گرم بحث کے دوران سب کچھ صاف ہو گیا تھا۔ پیرس کے اسٹیشن سے کبھی بھی ادیبوں سے بھری ہوئی ایسی ٹرین نہ چلی ہو گی۔ ٹرین کی راہ داریوں میں ہم بہت سوں کو پہچانتے اور بہت سوں کو نظر انداز کر دیتے بہت سے مندوب سوتے رہتے، دوسرے سگرٹیں پھونکتے۔ بے شمار دوسروں کے واسطے اسپین ایک ہی وقت میں ایک راز بھی تھا اور اس لمحے کی تاریخ کی کلید بھی۔

والیجو اور ہوڈوبرو ٹرین میں کسی اور طرف تھے (Andrre Malraux) آندرے

مارو ایک لمحے کے لئے مجھ سے بات کرنے کو رکا۔ اپنے چہرے پر مخصوص اعصابی جھٹکوں اور کندھوں پر برساتی ڈالے ہوئے اس مرتبہ وہ تنہا سفر کر رہا تھا۔ اس سے پہلے، ہمیشہ میں نے اسے ہوا باز کورنگلیون (Coringlion Molinier) کے ہمراہ دیکھا تھا، جو ہسپانوی فضاؤں شہروں کے گم ہونے، دوبارہ دریافت ہونے یا جمہوریہ کو جہازوں کی اہم فراہمی کی مہمات میں ہمیشہ اس کا دست راست تھا۔

مجھے یاد ہے، ٹرین کو سرحد کے نزدیک بہت دیر تک روکے رکھا گیا تھا بظاہر ہوڈوبرو کا صندوق گم ہو گیا تھا۔ ہر شخص گاڑی کے لیٹ ہونے کی وجہ کے بارے میں پریشان تھا اور کوئی بھی اسے سننے کے موڈ میں نہ تھا۔ اب اسے بدقسمتی کہیے کہ چلی کے شاعر نے وقت کا غلط انتخاب کرتے ہوئے پلیٹ فارم پر اس وقت اپنا صندوق ڈھونڈنا شروع کر دیا، جب کہ مہم کا سربراہ آندرے مارو وہاں موجود تھا اور یہی نہیں بلکہ اس نے براہ راست مارو سے اپنے صندوق کے بارے میں سوال کر ڈالا۔ ممکن ہے مارو اس کے نام سے ناواقف ہو، مگر یہ سنتے ہی اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں نے اسے چیختے ہوئے سنا۔

"کیا یہ وقت کسی بھی شخص پر دباؤ ڈالنے کا ہے، دفع ہو جاؤ" یہ بہت برا ہوا تھا کیونکہ میں اس سارے واقعہ کا واحد عینی شاہد تھا جس نے چلی کی انا کی ہوا نکال دی تھی۔ کاش اس لمحے میں اس سے ہزاروں میل کی دوری پر ہوتا لیکن زندگی بھی عجیب شے ہے۔ میں ہی وہ واحد شخص تھا، جسے ہوڈوبرو اس ٹرین میں سب سے زیادہ ناپسند کرتا تھا اور برا ہوا کہ مجھے ہی اس کا ہم وطن ہوتے ہوئے اس سارے سانحے کا عینی شاہد بننا پڑ گیا۔

دوبارہ سفر کے دوران جب ٹرین اسپین کے دیہاتی علاقوں سے گزر رہی تھی اور رات گہری ہو چکی تھی، مجھے ہوڈوبرو کے صندوق کا خیال آیا کہ وہ بیچارہ کس ناخوشگوار حالت میں ہے۔ اس وقت میں نے جوان امریکی ادیبوں سے، جو میرے ڈبے میں آ گئے تھے، کہا کہ وہ جا کر ہوڈبرو کو دیکھیں، کیونکہ وہ اکیلا اور افسردہ ہو گا۔

بیس منٹ بعد وہ لوگ واپس آ گئے اور کہنے لگے کہ ہوڈوبرو نے ان سے کہا ہے۔

"مجھ سے گمشدہ صندوق کی بات نہ کرو، وہ اہم نہیں، جو بات ضروری ہے، وہ یہ کہ باوجویکہ شکاگو، برلن، کوپن ہیگن اور پراگ کی یونیورسٹیوں نے مجھے اعزازی خطابات سے نوازا ہے، لیکن جس چھوٹے سے ملک سے تم آئے ہو، اس کی چھوٹی سی یونیورسٹی نے مجھے مسلسل نظر انداز کئے رکھا ہے، حتیٰ کہ مجھے تخلقیت کے موضوع پر لیکچر دینے کو بھی نہیں کہا گیا"

میرا ہم وطن عظیم شاعر ہوڈوبرو یقیناً ایک مایوس انسان تھا آخر کار ہم میڈرڈ پہنچ

گئے۔ جب مہمانوں کا استقبال ہو چکا اور انہیں ٹھہرانے کی جگہ کا تعین ہو رہا تھا، میں نے اس گھر کو دیکھنے کا فیصلہ کیا، جسے میں ایک سال پہلے چھوڑ چکا تھا۔ میری تمام کتابیں، تمام اشیا، جنہیں میں وہاں چھوڑ آیا تھا، یونیورسٹی کیمپس کے نزدیک "پھولوں کا گھر" نامی عمارت کے ایک فلیٹ میں تھیں۔ فرانکو کے ہراول دستے یہاں پہنچ چکے تھے اور ان فلیٹوں کے بلاک کئی رنگ بدل چکے تھے۔ میگوئیل ہرنانیڈز نے، جو ملیشیا کی وردی میں ملبوس تھا، اپنی بندوق لئے ہوئے ایک گاڑی لے کر آ گیا تاکہ میری کتابوں، اوزاروں، جن میں میں دلچسپی رکھتا تھا کو مجھ تک پہنچانے کا فرض نبھا سکے۔ ہم عمارت کی پانچویں منزل تک پہنچے اور جونہی دروازے کو متوقع انداز میں کھولا تو دیکھا کہ وہاں توپوں سے نکلا ہوا گولہ بارود کھڑکیوں دروازوں اور دیواروں پر دستک دے چکا تھا۔

کتابیں شیلف سے زمین پر بکھری پڑی تھیں۔ اس ملبے کے ڈھیر میں رستہ بنانا دشوار تھا، میں نے بے تکے پن سے اپنی چیزوں کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ عجب اتفاق تھا کہ ساری بے کار، اور غیر ضروری چیزیں، حملہ آور یا دفاع کرنے والے سپاہی لے جا چکے تھے۔ برتن، گھڑے، سلائی کی مشین، پلیٹیں وہاں موجود تھیں۔ یہ ہر طرف بکھری ہوئی تھیں لیکن بچ گئی تھیں، البتہ میرا قونصل والا ٹیل کوٹ، پولی نیشن نقاب اور سارے مشرقی چاقو غائب تھے۔

"مگوئیل جنگ خوابوں کی مانند بے حد عجیب و غریب ہے" مگوئیل کو اس بکھرے ہوئے کباڑ میں میرے کچھ مسودے مل گئے تھے یہ ابتر حالت میری زندگی پر بند ہوتا ہوا آخری در تھی۔

میں نے مگوئیل سے کہا۔

"میں اپنے ساتھ کچھ نہیں لے جانا چاہتا"

"کچھ بھی نہیں حتیٰ کہ ایک کتاب تک نہیں؟"

"ایک کتاب تک نہیں"

اور ہم خالی گاڑی کو لئے ہوئے واپس لوٹ آئے۔

جنگ اور نقاب

.... میرا گھر دو محاذوں میں پھنسا ہوا تھا.......... ایک جانب موروں اور اطالویوں نے چڑھائی کی تھی...... دوسری طرف میڈرڈ کے دفاع کرنے والے تھے۔ جن میں سے کچھ گر چکے تھے، کچھ کو روک دیا گیا تھا...... توپ خانے نے دیواروں کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا کھڑکیاں، چیتھڑوں میں تبدیل ہو گئی تھیں...... فرش پر میری کتابوں کے درمیان، مجھے گولوں کے ٹکڑے ملے...... لیکن

میرے نقاب غائب تھے...... پالی، سیام، سماٹرا، ملایا، آرکی پلاگو، ہین ڈانگ سے اکٹھے کئے جانے والے نقاب، اطلس، راکھ جیسے ٹماٹر کی طرح سرخ، نقرئی ابروؤں والے، نیلے خوفناک پلکوں کے ہمراہ، خیالوں میں گم، مشرق سے، جہاں میں پہلی بار تنہا گیا تھا، میرے نقاب ہی میری کل متاع تھے۔ وہ مشرق جس نے اپنی چائے کی مہک، افیم، گوبھر، پسینے کی بو، گلیوں میں سڑے ہوئے پھلوں کی بساند اور چنبیلی کی تیز خوشبو مجھے دی تھی۔

وہ نقاب...... مندروں میں رقص کرتے ہوئے، سچے ناچوں کی یاد دلانے والے...... لکڑی کے قطرے، دیومالائی رنگوں میں ڈوبے، اس دیومالا کی باقیات، جو خوابوں کی ہوا میں تصویر بناتے ہیں—— رسومات بلائیں، میری امرکی طبع کے لئے اجنبی اسرار...... اور تب ملیشیا کے سپاہیوں نے گولیوں کی بوچھار میں میرے نقابوں کو چہروں پر سجائے کھڑکیوں سے جھانک کر موروں کو ڈرایا ہو گا...... بہت سے نقاب شکستہ حالت میں وہیں رہ گئے تھے، جن پر خون کے دھبے ہیں۔ باقی پانچویں منزل والے میرے فلیٹ سے گولہ باری کے باعث نیچے جا پڑے ہیں۔ فرانکو کی بڑھتی ہوئی سپاہ ان کے سامنے مورچہ بند ہے۔ جاہل اجرتی قاتلوں کی بھیڑ ان کے برابر سے شور کرتی گزر گئی ہے۔ ایشیائی دیوتاؤں کے تیس نقاب میرے گھر سے ابھرتے ہوئے اپنے آخری رقص میں۔ موت کا رقص آرام کا ایک لمحہ...... صورت حال بدل گئی ہے۔

میں ملبے پر بیٹھا کوڑے کے ڈھیر کو تکتا ہوں، چٹائی پر خون کے دھبے اور نئی کھڑکیوں میں سے بندوق کی گولیوں کے بنے ہوئے سوراخ، میں نے دور تلک دیکھا۔ کیمپس سے پرے، سطح زمین کی طرف، قدیم محلات کی جانب——

اسپین مجھے خالی نظر آیا...... ایسا لگا جیسے میرے آخری مہمان ہمیشہ کے لئے جا چکے ہیں۔ نقابوں کے ساتھ یا ان کے بغیر لڑائی کے وسط میں جنگ کی ہولناکی کے ہمراہ پاگلوں کی خوشی—— ناقابل یقین دفاع...... موت اور زندگی...... وہ سب کچھ میرے لئے ختم ہو چکا تھا...... دعوت کے بعد یہ آخری سکوت تھا...... دعوت کے بعد...... نقاب جو جا چکے، جو گر چکے ان سپاہیوں کے ہمراہ جنہیں میں نے مدعو نہ کیا۔

میرے لئے اسپین ختم ہو گیا تھا——

چھٹا باب

منظر افتادگان

میں نے ایک سڑک منتخب کی

کچھ عرصہ بعد چلی میں، میں سرکاری طور پر پارٹی میں شامل ہو گیا تو مجھے سرگرم کارکن کا کارڈ موصول ہوا، لیکن میرے خیال میں، میں نے خود کو اسپین میں جنگ کے دوران اشتراکی تصور کیا تھا۔ بہت سی باتیں میری گہری وابستگی میں شامل رہیں۔ میرا مجموعہ اضداد دوست نطشے کی طرز کا شاعر (Leon Felipe) لیون فیلپی ایک پسند کیا جانے والا شخص تھا، جس کی سب سے دلچسپ خوبی بد نظمی سے اس کے انتشار پسندی کے جذبے کا میلان اور باغیانہ رویہ تھا۔ خانہ جنگی کے عروج کے دوران وہ آسانی سے (FAI) آئرش انارکسٹ فیڈریشن کے زیر اثر آ گیا تھا۔
وہ اکثر انتشار پسندوں کے محاذ پر ہوتا، جہاں وہ اپنے نظریات پر لیکچر دیتا اور عقائد کے خلاف اپنی نظمیں سناتا، جو ایک مبہم نظریئے کی آزاد کلر کانہ ذہنیت کے برعکس گستاخانہ انداز لئے ہوتیں۔ اس کے الفاظ انارکسٹوں کو، جو ان دنوں میڈرڈ میں گرم گھر کے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے اپنی گرفت میں لے لیتے جبکہ دوسرے لوگ محاذ جنگ پر تھے۔ جنگ جو بتدریج نزدیک آتی جا رہی تھی۔ غیر قانونی گروہوں نے بسوں، ٹرالیوں کو آدھا سرخ اور آدھا زرد رنگ کر دیا تھا۔ اپنے بڑھے ہوئے لمبے بالوں اور داڑھیوں کے ساتھ گولیوں کے بنے ہوئے گلوبند اور کلائیوں میں کنگن پہنے ہوئے ان لوگوں نے اسپین کے موت کے میلے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان میں سے کئی کو میں نے چمڑے کے آدھے سرخ آدھے سیاہ علامتی جوتے پہنے ہو۔۔ ۔یکھا۔ جن کو بناتے

ہوئے یقیناً موچیوں کو خاصی تکلیف ہوئی ہو گی۔ یہ خیال ہرگز نہ کیا جائے کہ یہ سب کچھ معصومانہ تھا۔ یہ لوگ چھرے، پستولیں، بندوقیں اور مشین گنیں اٹھائے پھرتے۔ ان میں سے اکثر بڑی عمارتوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور سارا سارا دن اپنے ساز و سامان کی نمائش کرتے ہوئے سگرٹ پیتے اور تھوکتے رہتے۔ اصل کام خوفزدہ مکینوں سے کرائے کی وصولی یا زبردستی ان سے ہیرے، جواہرات، زیورات اور گھڑیوں کا حاصل کرنا تھا۔

لیون فیلپی ایک رات اسی قسم کے اناکسٹوں میں لیکچر دینے کے بعد واپس آرہا تھا کہ ہم دونوں کا ایک کیفے کے نزدیک آمنا سامنا ہو گیا۔ شاعر نے مخصوص ہسپانوی لبادہ پہنا ہوا تھا، جو اس کی نزارئین وضع کی داڑھی کے ساتھ اچھا لگتا تھا۔ باہر نکلتے ہوئے اس کا خوبصورت لباس اس کے ایک مذہبی ساتھی کے کندھے کو چھو گیا۔ مجھے علم نہیں کہ لیون فیلپی کی شخصیت نے اس محافظ کو ناراض کیا یا نہیں لیکن مجھے یہ پتہ ہے کہ چند قدم آگے چل کر چند مسلح انتشار پسندوں نے جن کا لیڈر وہی شخص تھا، ہمیں روک لیا۔ وہ ہمارے کاغذات کی پڑتال کرنا چاہتے تھے اور جب وہ ان پر نظر ڈال چکے، تو ہسپانوی شاعر کو مسلح افراد میرے ہی گھر کے قریب اس جگہ لے گئے، جہاں فائرنگ اسکواڈ کے لوگ گولیاں چلا کر مجھے راتوں کو جگائے رکھتے تھے۔ میں نے محاذ سے دو ملیشیا کے مسلح سپاہیوں کو آتے دیکھا، جن سے مل کر میں نے لیون فیلپی کے بارے میں وضاحت کی کہ وہ کون ہے اور اس سے کیا جرم سرزد ہوا ہے اور اس طرح میں اپنے دوست کو چھڑا لانے میں کامیاب ہوا۔ نظریاتی انتشار اور ایک آزاد تباہی نے مجھے خوب سوچنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ میں نے آسٹریا کے انتشار پسندوں کی حرکتوں کے بارے میں سنا تھا ایک بوڑھا چشمے والا آدمی، جو لوگوں کو "ٹہلانے" کے بہانے اپنے ساتھ لے جاتا تھا، اس نے ایک اسکواڈ بنا رکھا تھا، جس کا نام "ڈان" تھا، کیونکہ یہ سورج کے طلوع ہونے پر سرگرم عمل ہوا کرتے۔

وہ اپنے شکار سے پوچھا کرتا، کیا تمہیں کبھی سر میں درد ہوا ہے؟ ہاں۔ بالکل کبھی کبھار تو میں تمہیں درد کی ایک بہت عمدہ دوا دے رہا ہوں۔ آسٹرین یہ کہتے ہوئے اپنا پستول اس شخص کے ماتھے پر رکھ کر ٹریگر دبا دیتا۔ اس وضع کے بدمعاشوں کے گروہ میڈرڈ کی تاریک راتوں میں گھومتے رہتے۔ اشتراکی واحد منظم گروہ تھے، جنہوں نے مل کر ایک فوج بنائی تھی تاکہ اطالویوں، جرمنوں، موروں اور فیلنجسٹوں سے نمٹا جا سکے۔ وہ ہی اخلاقی قوت بھی تھے جس نے مزاحمت اور فسطائیوں کی مخالفت کو زندہ رکھا تھا۔ اور اس طرح آپ کو اپنے لئے، خود راستے کا انتخاب کرنا تھا۔ ایسا ہی میں نے کیا اور مجھے اپنے اس انتخاب پر جو میں نے اس دردناک لمحے میں تاریکی اور امید کے درمیان کیا، کبھی افسوس نہ کرنا پڑا۔

رافیل البرٹی (Rafeel Alberti)

شاعری امن کا ایک فعل ہے. امن شاعر کی تکمیل میں ایسے ہی معاون ثابت ہوتا ہے. جیسے روٹی کے بننے میں آٹا۔ آگیں لگانے والے جنگ کے عاشق بھیڑیئے شاعر کو تلاش کر کے مار دیتے، جلاتے اور اپنے دانت اس میں گاڑتے۔ ایک شمشیرزن نے (Pushkin) پشکن کو ایک اداس پارک کے درختوں تلے تقریباً مار ہی ڈالا تھا۔ جنگ کے آتشیں گھوڑے (Petofi) پٹوفی کے بے جان جسم کو روند چکے تھے۔ (Byron) بائیرن یونان میں جنگ کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ ہسپانوی فطائیوں نے اسپین میں اس کے عظیم ترین شاعر کو مار کر جنگ کا آغاز کیا تھا۔

رافیل البرٹی ایک طرح سے بچ جانے والا ہے، ہزاروں مرتبہ اسے مار دینے کا اشارہ ہوا، بالکل لورکا کی طرح، ایک بار تو غرناطہ ہی میں اور ایک بار موت نے اس کا (Badajoz) بڈاجوز میں انتظار کیا انہوں نے سورج سے جلتے ہوئے شہر (Seville) سیویل اور (Cadiz) کیڈیز اور پھر اس کے آبائی شہر Puertode Santa Maria پیورٹوڈی سانتاماریا میں اسے ڈھونڈا تاکہ اسے مار ڈالیں یا پھانسی پر لٹکا دیں اور اس طرح شاعری پر موت کی ایک ضرب اور لگا سکیں لیکن شاعری نہیں مری۔ بلی کی طرح اس کی نو زندگیاں ہیں وہ اسے ڈراتے ہیں، وہ اسے گلیوں میں گھسیٹتے ہیں، وہ اس پر تھوکتے ہیں اور اسے اپنی تفنن طبع کا ہدف بناتے ہیں۔ وہ اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسے جلاوطن کر دیتے ہیں۔ اسے جیل میں پھینک دیتے ہیں اس میں سیسہ بھرتے ہیں، لیکن شاعری ہر حملے سے بچ نکلتی ہے اور چاول کے چمکدار دانوں کی مانند ایک صاف شفاف چہرہ لئے مسکراتی ہے۔

میں البرٹی کو جانتا ہوں جب وہ میڈرڈ کی گلیوں میں قمیص پر سرخ ٹائی لگا کر پھرا کرتا تھا۔ میں اس سے اس وقت سے ہی واقف تھا، جب وہ عوام میں، دشوار حالات میں لڑتا رہا اور بہت سے دوسرے شاعروں نے تب ایسا کرنے سے اجتناب کیا۔ ابھی تک اسپین کے لئے گھنٹیاں نہیں بجی تھیں، لیکن اسے علم تھا کہ کیا ہونے والا ہے وہ جنوب کا باشندہ ہے، گنگناتے ہوئے سمندر کے نزدیک وہ پیدا ہوا۔ جہاں گھروں کے تہہ خانے زرد ٹوپاز جیسی سنہری شراب سے بھرے تھے وہاں اس کے دل نے آگ انگور سے پائی اور گیت لہر سے حاصل کیا۔ وہ ہمیشہ سے ایک شاعر تھا، لیکن شروع کے برسوں میں خود اسے بھی یہ علم نہ تھا، جس کا بعد میں سارے اسپین کو علم ہوا اور پھر تمام دنیا نے یہ جانا ہم میں سے وہ لوگ جنہیں قسمت نے (Castile) کاسٹائل کی زبان کو بولنے اور سمجھنے کا موقع دیا وہ رافیل البرٹی کی ہسپانوی شاعری کی ساری درخشاں خوبیوں سے واقف ہوں

گے۔ وہ محض پیدائشی طور پر ہی شاعر نہیں ہے، بلکہ صناعی کے فن میں بھی یکتا ہے۔ سردیوں میں معجزانہ طور پر کھلتے ہوئے سرخ گلاب کی مانند. اس کی شاعری میں گونگورا (Gongora) کی برف (Jorge Manrique) خورفے میزک کی جڑ (Garcilaso) گارسی لاسوکی پتی اور سوگواری کی مہک (Gustavo Adolfo Belqver) گستاواڈالفو کے ہاں سے موجود ہے۔ ہسپانوی شاعری کی اصل روح اس کے شراب کے نقرئی جام میں اکٹھی ہوئی۔ اس کے سرخ گلاب نے اپنی چمک کو اس سڑک پر ان لوگوں کے لئے بکھیر دیا جنھوں نے اسپین میں فاشزم کی مزاحمت کی۔ ساری دنیا اس دلیرانہ المناک کہانی سے واقف ہے۔

البرٹی نے رزمیہ نظمیں لکھیں۔ اس نے انہیں بارکوں اور محاذ پر پڑھا۔ اس نے شاعری کی گوریلا جنگ کی اختراع کی۔ جنگ کے خلاف شاعری کی جنگ کے لئے اس نے گیت تخلیق کئے، جن کے پر توپخانے کی آگ تلے نکل آئے اور جو بعد میں اس کرۂ ارض پر پھیل گئے۔ ایک مکمل اور بھرپور شاعر، جس نے دکھایا کہ شاعری کس طرح اس انتہائی اہم لمحے میں دنیا بھر کے لئے کار آمد ہو سکتی ہے۔ اس طرح وہ (Mayakovsky) مایاکواسکی سے مشابہ ہے۔ کثیر تعداد کے فائدے کے لئے شاعری کا یہ اطلاق طاقت، نرمی، خوشی اور انسان کی اصل فطرت پر منحصر ہے۔ اس کے بغیر شاعری سے آواز تو آتی ہے لیکن وہ گاتی نہیں البرٹی کی شاعری ہمیشہ نغمہ زن ہے۔

چلی میں نازی

ایک بار پھر میں اپنے تیسرے درجے کے ملک میں واپس آگیا تھا۔ لاطینی امریکہ میں (Celine) سیلائن (Drieu Larocheu) ڈرایو لاروشیو (Ezra Pound) ایذرا پاؤنڈ جیسے بڑے ادیب نہ تھے، جنہیں فاشزم کی خدمت کے صلے میں باغی قرار دیا گیا۔ لیکن ہٹلرازم کے باعث کسی مالی امداد کے بغیر فاشٹ تحریک خاصی پھولی پھلی۔ ہر طرف گروہ پھیل گئے، جن کے کارکن طوفانی سپاہیوں کے لباس میں ملبوس نظر آتے اور جو فاشٹ انداز میں اپنا بازو اٹھا کر سلوٹ کرتے۔ براعظم کی قدیم ترین جاگیردار قوتوں نے کسی بھی وضع کی اشتراکیت کی مخالفت کی اور اب بھی مخالف ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ جرمن نسل کے لوگ چلی برازیل اور میکسیکو میں آبادی کا ایک بڑا حصہ بناتے ہیں اور یہ علاقے ہٹلر کی بڑھتی ہوئی طاقت اور جرمن نسل کی برتری اور عظمت کے نظریئے سے باآسانی بہلائے گئے ہیں۔

ایک بار سے کہیں زیادہ ہٹلر کے ان فتح یاب دنوں میں مجھے چلی کے جنوبی دیہات کی گلیوں میں جھنڈوں کے سائے تلے سواستیکا کا بلا لگائے ہوئے چلنا پڑا۔ ایک مرتبہ ایک چھوٹے سے

جنوبی قصبے میں مجھے فون کو استعمال کرنے کے لئے فیوہرر کو زبردستی سلام کرنا پڑا۔ اس جگہ کے جرمن مالک نے، جس کے پاس قصبے میں واحد فون تھا، کچھ ایسا بندوبست کر رکھا تھا کہ آپ کو کریڈل سے ریسور نکالنے کے لئے بازو کو ہٹلر کی تصویر کی طرف مجبوراً اٹھانا پڑتا، جس کا تصویر میں اپنا بازو بھی اٹھا رہتا۔

میں (Auroradechille) کا مدیر تھا۔ اس کے تمام ادبی معیار (کہ ہمارے پاس اور کچھ نہ تھا) نازیوں کے خلاف تھے، جو ملک کے بعد ملک ہڑپ کئے جا رہے تھے، چلی میں ہٹلر کے سفیر نے نیشنل لائبریری کے لئے نام نہاد جرمن ثقافت پر لکھی ہوئی کتابیں تحفے میں دی تھیں۔ اس کے جواب میں ہم نے اپنے پڑھنے والوں سے کہا کہ وہ ہمیں وہ جرمن کتابیں بھیجیں جو اصل جرمنی سے وفادار ہیں، وہ جرمنی جسے ہٹلر نے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ یہ ایک لمحاتی تجربہ تھا، مجھے مار دینے کے دھمکی آمیز خطوط ملنے لگے، جس میں غلاظت میں لتھڑی ہوئی کتابیں موجود ہوتیں، ہمیں (Der Stormer) کے فحش رسالے بھی موصول ہوتے جو یہودیوں کے خلاف تشدد پسندی پر مبنی ہوتے، ان رسالوں کا مدیر (Julius Strekher) جولئس سٹریکھر تھا جو چھ سال بعد (Nur emberg) نورمبرگ میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا، جس کا وہ مستحق تھا۔ جرمن زبان میں (Heinr ich Heine) ہینرک ہائین (Thomas Mann) تھامس مان (Anna Seghers) آنا سیگھرز (Einstein) آئن سٹائن (Arnold Zweig) آرنلڈ زویگ کی کتابیں بھی ملیں اور جب ان کی تعداد تقریباً پانچ سو کے قریب ہو گئی تو ہم انہیں لے کر فوری لائبریری گئے، لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب قومی لائبریری کے دروازے ہم پر بند کر دیئے گئے اس کے بعد ہم نے ایک مارچ کا انتظام کیا اور عزت ماب ٹی مولیر اور کارل وون کی تصاویر اٹھائے یونیورسٹی کے ہال میں داخل ہو گئے ایک طرح کا رسمی فعل سرزد ہو رہا تھا، جس کی صدارت وزیر خارجہ ڈان میگوئیل کر رہے تھے۔ ہم نے کتابوں اور تصاویر کو مقرر کے ڈائس کے سامنے آہستگی سے رکھا، جنگ جیت لی گئی تھی۔ کتابوں کو قبول کر لیا گیا تھا۔

ازلا نیگرا (Isla Negra)

میں نے خود کو اپنی تحریر میں جذبے اور قوت کے ساتھ مستغرق کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اسپین کے قیام نے مجھے ایک نئی طاقت اور پختگی دی تھی۔ میری شاعری میں موجود تلخی کو ختم ہونا چاہئے۔ میری کتاب (Veinte Pomeas deamor) میں ذاتیات کے بارے میں بڑبڑانا اور (Residencia enla tierra) میں اذیت ناک افتاد طبع اب اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھیں۔

میرے خیال میں، ان کتابوں میں، میں نے زیر زمین پتھروں پر چوٹ مارنے کے بجائے، ان کتابوں کے صفحات میں آگ پر چوٹ ماری تھی۔

کیا شاعری ہمارے ساتھی انسانوں کی خدمت کر سکتی ہے؟

کیا یہ انسان کی جدوجہد میں کوئی جگہ بنا سکتی ہے؟

میں اس سے پہلے ہی منفی اور غیر منطقی باتوں کے لئے خاصی آوارہ گردی کر چکا تھا۔ مجھے ٹھہر کر انسانیت کی بابت راہ کو تلاش کرنا تھا، جسے عصری ادب نے غیر قانونی بنا رکھا تھا، لیکن جو انسانی خواہشات میں گہری جڑیں پکڑے ہوئے تھی۔

میں نے اپنی طویل نظموں (Canto General) پر کام شروع کر دیا اس کے لئے مجھے کام کرنے کی خاطر کوئی جگہ چاہئے تھی۔

سمندر کے روبرو ایک جگہ ازلا نیگرا کے نام سے ہے، جسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں نے یہاں پتھروں سے بنا ہوا ایک گھر تلاش کر لیا۔ اس کا ہسپانوی مالک جو ایک بحری کپتان تھا اور نظریاتی طور پر پرانا سوشلسٹ بھی اس گھر کو اپنے خاندان کے لئے بنا رہا تھا۔ لیکن وہ یہ گھر مجھے فروخت کرنے پر رضامند ہو گیا۔ مگر میں اسے کیسے خرید سکتا تھا؟ میں نے (Canto General) کا مسودہ اپنے پبلشر کو دیا، جس نے اسے رد کر دیا۔ ۱۹۳۹ء میں ایک اور ناشر نے، جس نے خود ہی مالک مکان کو مکان کی قیمت دے دی تھی، مجھے ازلا نیگرا میں کام کرنے کے لئے اس گھر کو حاصل کرنے کے قابل بنا دیا۔

ایک شدید خواہش کے تحت، میں ایک ایسی مرکزی نظم لکھنا چاہتا تھا، جو تاریخی واقعات اور سرزمین حالات زندگی کو ہمارے عوام کی جدوجہد سے یکجا کر سکے۔

ازلا نیگرا کی جنگلی ساحلی پٹی اور سامنے لہریں لیتا ہوا سمندر ہی ایسی جگہ تھی، جو مجھے اپنے نئے گیت کو ایک جذبے کے ساتھ لکھنے کے لئے مجبور کر سکتی تھی۔

"مجھے ہسپانوی لا کر دو"

لیکن زندگی نے فوراً ہی مجھے وہاں گھسیٹ لیا

ہسپانویوں کے انخلا کی دہشت ناک خبر چلی تک پہنچ گئی تھی۔ پانچ لاکھ سے زیادہ مردوں، عورتوں، سپاہیوں اور شہریوں نے فرانسیسی سرحد کو عبور کر لیا تھا۔ فرانس میں رجعت پسند جماعتوں کے دباؤ کے تحت (Leon Blum) لیون بلم کی حکومت نے ان سب کو بیگار کیمپوں میں دھکیل دیا، جہاں سے انہیں قلعوں، جیلوں اور افریقہ میں صحرا کے نزدیک قابض بعض علاقوں میں منتقل کر

دیا گیا۔ چلی میں حکومت بدل چکی تھی۔ ہسپانوی عوام کے غیر متوقع رویوں نے چلی کی مقبول طاقتوں کو تازہ قوت عطا کی تھی، جس کے نتیجے میں وہاں ایک ترقی پسند حکومت آگئی تھی۔ چلی کی نئی حکومت نے مجھے ایک نیک مقصد کی خاطر فرانس بھیجنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ میں فرانسیسی جیلوں سے ہسپانویوں کو آزاد کرا کے اپنے ملک تک بھیج سکوں اور اس طرح امریکہ سے ایک چمکتی ہوئی روشنی کی طرح میری شاعری، ان لوگوں میں جو انسانی مصائب میں گرفتار تھے گونجے گی۔ امریکہ سے ساری امداد میں میری شاعری شامل ہو جائے گی جو ہسپانوی عوام کو اپنے ساتھ لے کر ایک عہد پرانا قرض چکائے گی۔

صحیح معنوں میں ایک معذور شخص، جو آپریشن سے صحت یاب ہو رہا ہو اور جس کی ٹانگ ابھی پلستر میں ہو۔ کچھ ایسی ہی حالت میری اس وقت تھی۔ میں نے اپنی جنت کو چھوڑا اور جمہوریہ کے صدر سے ملنے کے لئے چلا گیا (Don Pedro) ڈان پیڈرو صدر جمہوریہ چلی مجھ سے گرم جوشی سے ملا۔ ہاں میرے لئے ہزاروں ہسپانوی لے آؤ۔ ہمارے پاس ان سب کے لئے کام ہے۔ مجھے مچھیرے لا کر دو (Basque) باسک (Castile) کیسٹائل اور (Extremadura) کے عوام لا کر دو"

چند دن کے بعد میں پلستر کے باوجود ہسپانوی عوام کو چلی لانے کے لئے فرانس چلا گیا۔ میرا ایک خصوصی مقصد تھا۔ میری تقرری کے کاغذات میں مجھے ہسپانویوں کی نقل مکانی کے قونصل انچارج کی حیثیت دی گئی تھی۔ پیرس میں چلی کے سفارت خانے میں جاکر میں نے اپنی تقرری کے کاغذات پیش کئے۔ میرے ملک کی حکومت اور سیاسی صورتحال پہلے جیسی نہیں تھی۔ لیکن پیرس میں چلی کا سفارت خانہ اب بھی ویسے کا ویسا ہی تھا۔ ہسپانویوں کو چلی بھیجے جانے کے خیال نے ہمارے خوش وضع لباس پہنے ہوئے سفارت کاروں کو آگ بگولہ کر دیا تھا انہوں نے میرا دفتر باورچی خانے کے نزدیک ایک کمرے میں بنا دیا۔ ممکن طور پر جتنا وہ کر سکتے تھے، انہوں نے مجھے ڈرایا، دھمکایا، حتیٰ کہ مجھے لکھنے سے بھی روکا گیا۔ ناپسندیدگی کی لہر نے سفارت خانے کے دروازوں پر پہلے ہی کھٹکھٹانا شروع کر دیا تھا۔ زخمی سپاہی، قانون ساز اور ادیب، پیشہ ور لوگ، جن کا کاروبار ختم ہو چکا تھا۔ دوسری وضع کے کاموں کے ماہرین۔ سب کو میرے دفتر تک پہنچنے کے لئے جہنم اور سیلاب سے گزرنا پڑتا اور چونکہ میرا دفتر عمارت کی چوتھی منزل پر تھا۔ ہمارے سفارت خانے والوں کے دماغ میں ایک اور مکروح ترکیب آئی اور انہوں نے اوپر جانے والی لفٹ کو کاٹ دیا۔ بہت سے ہسپانوی جنگ کے زخموں سے چور تھے اور یہ افریقہ کے بیگار کیمپوں سے بچ کر نکلنے والے تھے۔ انہیں اس اذیت ناک کیفیت میں چوتھی منزل تک چڑھ کر آتے ہوئے دیکھ کر میرا دل ٹوٹ

گیا جب کہ ظالم افسران میری دشواریوں پر خوش ہوتے رہے۔

ایک شیطانی کردار

میری زندگی کو مزید پیچیدہ کرنے کے لئے پاپولر فرنٹ کی حکومت نے مجھے ناظم الامور کی آمد کے بارے میں مطلع کیا، جسے سن کر میں خوش ہو گیا تھا، کیونکہ سفارت خانے میں ایک نیا دفتری سربراہ میری راہ میں پرانے سفارت کاروں کی کھڑی کی ہوئی رکاوٹوں کو، جن کے باعث ہسپانویوں کی نقل مکانی کا کام مشکل ہو رہا تھا، دور کرنے میں میری مدد کرے گا ایک دبلا پتلا نوجوان، جو شکل و صورت سے کتابی کیڑا لگتا تھا، آ پہنچا وہ یقیناً چوبیس یا پچیس برس کا ہو گا۔ اپنی چبھتی ہوئی تیز آواز جس میں جذبات کے باعث لرزش موجود تھی، اس نے مجھے بتایا کہ اس نے مجھے اپنا افسر تسلیم کر لیا ہے۔ اور اس کے یہاں آنے کا واضح مقصد میرے مددگار کی حیثیت سے کام کرنا ہے تاکہ "جنگ کے شاندار مفتوحین" کو چلی بھیجنے کا بڑا کام سرانجام ہو پائے۔ ایک نئے نائب کو پالینے سے مجھے تسلی ہوئی، لیکن اس کے کردار نے مجھے پریشان کر دیا۔ تمام تر توجہ کے باوجود وہ مجھ پر چھایا رہا اس میں کوئی بات تھی جو صحیح نہیں لگ رہی تھی۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ چلی میں پاپولر فرنٹ کی فتح کے ساتھ ہی اس نے (Knights of Columbus) کی تحریک کو چھوڑ کر جوان اشتراکیوں کی تحریک کی رکنیت حاصل کر لی ہے۔ یہ تحریک اس وقت دھڑا دھڑ اپنے رکن بڑھانے میں مصروف تھی اور اس کی دانشورانہ صلاحیتوں سے خوش تھی۔ (Arellano Marin) آریلینو مارین نے مضامین اور ڈرامے لکھے پیشے کے لحاظ سے وہ لیکچرار تھا اور لگتا تھا جیسے سب کچھ جانتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم بس ہمارے سروں پر تھی۔ پیرس ہر رات جرمن بمبار طیاروں کا انتظار کرتا۔ ہر گھر کو ہدایات دی جا چکی تھیں کہ کس طرح وہ ہوائی حملوں سے اپنا دفاع کرے۔ میں شام کو ویلے تیز پر سین میں واقع اپنے چھوٹے سے گھر چلا جاتا۔ اس گھر کا رخ دریا کی طرف تھا۔ جسے ہر صبح سفارت خانے آتے ہوئے میں بوجھل دل کے ساتھ چھوڑتا کچھ ہی دنوں میں نئے آنے والے آریلینو مارن نے ایسی اہمیت حاصل کر لی۔ جو مجھے کبھی نہ مل سکی تھی۔ میں نے اس کا تعارف (Negrin) نیگرن (Alvarezdelvayo) ایلواریز ڈیل وائیو اور چند دوسرے ہسپانوی رہنماؤں سے کرا دیا تھا۔ ایک ہی ہفتے میں نیا کام کرنے والا ان سب کے ساتھ گھل مل چکا تھا۔ ہسپانوی رہنما جن سے میں ناواقف تھا اس کے دفتر میں ہر وقت آتے جاتے رہتے تھے۔ وقتاً فوقتاً۔ وہ مجھے بھلا کر کبھی کوئی ہیرا اور کبھی زمرد دکھاتا جو اس نے اپنی ماں کے لئے خریدے تھے۔ یا

کبھی مجھ سے ایک بہت ہی پیاری سی سنہرے بالوں والی لڑکی کا ذکر ہوتا جو اسے پیرس کی رقص گاہوں میں اس سے کہیں زیادہ وقت جو اسے صرف کرنا چاہئے تھا اپنے ہمراہ خرچ کراتی۔ آرملینو مارن آراگونز کا گہرا دوست بن گیا بطور خاص (Elsa) ایلسا کا. جب سفارت خانے نے انہیں اشتراکیوں کے خلاف دباؤ میں حفاظت فراہم کی تھی اور اس نے انہیں خصوصی توجہ اور تحائف سے نوازا تھا اس شخص کی نفسیات نے (Elsa Triolet) ایلسا ٹرائیولیٹ کو ضرور متاثر کیا ہو گا. کیونکہ اس نے اپنے ایک یا دو ناولوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔

بعد میں پتہ چلا کہ عیاشی اور دولت کے لئے اس کی ہوس، میری نظروں کے سامنے دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ایک گاڑی سے دوسری گاڑی بدلتا اور شاندار وضع کے گھر کرائے پر لیتا اور ہر روز ایک حسین سنہرے بالوں والی لڑکی نے اپنی ضروریات کے لئے اس کو پاگل بنا رکھا تھا۔ مجھے تارکین وطن کے سلسلے میں ایک اہم اجلاس میں شرکت کے لئے (Brussels) برسلز جانا تھا۔ جب میں اپنے ہوٹل سے نکل رہا تھا تو اپنے شاندار نائب آرملینو مارن سے ملاقات ہوگئی جس نے چلاتے ہوئے مجھے شام کی دعوت کے لئے مدعو کر لیا۔ ہماری ملاقات برسلز کے سب سے مہنگے ہوٹل میں ہوئی، جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ کھانے کی میز پر اس کی جانب سے پھولوں کا گلدستہ رکھا تھا۔ خاویار اور شیمپین کا آرڈر اس نے پہلے سے دے رکھا تھا۔ کھانے کے دوران، میں خاموش اپنے میزبان کے بڑے بڑے پروگراموں اس کی تفریحاتی مہمات اور ہیروں کے بارے میں جو اس نے خریدے تھے، سن رہا تھا۔

میں ایک ایسے نودولیتے کو سن رہا تھا. جس میں پاگل پن کی بعض علامات واضح تھیں اس کی چبھتی ہوئی نگاہیں۔ اس کا اونچی آواز میں ایک مخصوص لہجے میں بولنا. مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میں نے فی الفور فیصلہ کیا کہ اسے صاف طور پر بتا دوں کہ میرے ذہن میں کیا ہے کیونکہ. مجھے کچھ تو اس سے کہنا تھا۔

جب ہم سیڑھیوں پر اوپر چڑھ رہے تھے تو دو اجنبی، سیڑھیاں شروع ہونے سے پہلے اس کے پاس پہنچے۔ اس نے انہیں ہسپانوی زبان میں انتظار کرنے کو کہا اور بتایا کہ وہ کچھ ہی دیر میں نیچے آئے گا۔ جونہی ہم کمرے میں پہنچے تو میں نے کافی کے بارے میں نہ سوچا بلکہ اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے اس سے کہا "میرے خیال میں تم ایک غلط راستے پر چل رہے ہو۔ تم دولت کے دیوانے ہو رہے ہو۔ ممکن ہے یہ سب سمجھنے کے لئے تم ابھی کم عمر ہو، لیکن ہماری سیاسی وابستگیاں ایک سنجیدہ مسئلہ ہے۔ ہزارہا تارکین وطن کی قسمت ہمارے ہاتھوں میں ہے اور اسے مذاق نہیں سمجھنا چاہئے۔ مجھے تمہارے معاشقوں سے دلچسپی نہیں، لیکن میں تمہیں نصیحت کرنا چاہتا ہوں بہت سے لوگ اپنی

ناکام زندگی کے خاتمے پر کہتے ہیں۔

"کسی نے مجھے نصیحت نہیں کی، کسی نے مجھے انتباہ نہیں کیا" کم از کم تم یہ نہیں کہہ سکو گے۔ میں نے اپنی تقریر کر لی۔ اب میں جا رہا ہوں" خدا حافظ کہتے ہوئے، میں نے اسے دیکھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ کر ہونٹوں تک آ گئے تھے۔ کیا میں نے کچھ زیادتی کر دی ہے؟ میں اس کے نزدیک گیا اور اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولا "روؤ مت" "مجھے بس غصہ آرہا ہے" اس نے کہا۔

میں ایک لفظ کہے بغیر وہاں سے نکل آیا۔ میں پیرس واپس آگیا اور دوبارہ اسے کبھی نہ دیکھا۔ نیچے آتے ہوئے جب ان دو اجنبیوں نے جو اس کے منتظر تھے، مجھے دیکھا تو وہ تیزی سے اس کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ اس کہانی کا اختتام بہت بعد میں میکسیکو میں ہوا، جب میں وہاں چلی کا قونصل جنرل تھا۔ ایک روز مجھے ہسپانوی مہاجرین کے ایک گروہ کی طرف سے دوپہر کے کھانے پر بلایا گیا تھا۔ وہاں ان دو حضرات نے مجھے پہچان لیا۔

"آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟" میں نے پوچھا

"ہم وہی لوگ ہیں جو آپ کے ہم وطن آر یلینو مارن سے ملنے گئے تھے، جب آپ برسلز کے ہوٹل میں اس سے مل کر واپس آرہے تھے"

اوہ! پھر کیا ہوا تھا، میں ہمیشہ اس کے بارے میں متجسس رہا تھا انھوں نے مجھے ایک دلچسپ کہانی سنائی۔

جب وہ اس کے کمرے میں پہنچے تو انھوں نے اسے روتے ہوئے ایک اعصابی کیفیت میں پایا۔ سسکیاں لیتے ہوئے اس نے ان سے کہا "اس وقت مجھے زندگی کا سب سے بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ نرودا تمھیں ہسپانوی اشتراکی کے بطور گیسٹاپو کے حوالے کرنے گیا ہے۔ میں اسے چند گھنٹوں کے لئے بھی رکنے کا نہ کہہ سکا۔ اب تم لوگوں کے پاس بھاگنے کے لئے بس چند منٹ ہیں۔ اپنے صندوق یہاں میرے پاس چھوڑ دو۔ میں ان سب کا خیال رکھوں گا اور یہ تمھیں بعد میں مل جائیں گے"

"حرامزادہ" میں نے کہا۔ خدا کا شکر کریں کہ آپ لوگ جرمنوں کے ہتھے نہیں چڑھے"

"ہاں، لیکن ان صندوقوں میں نوے ہزار ڈالر تھے، جو ہسپانوی مزدوروں کی یونین کی امانت تھے اور وہ رقم ہمیں کبھی دوبارہ نہ مل سکی" اس کے کچھ عرصے کے بعد میں نے سنا کہ اس شیطانی کردار نے اپنی پیرس کی محبوبہ کے ہمراہ مشرق کا ایک طویل دورہ کیا۔ اتفاق سے وہ نازک سنہرے

بالوں والی حسینہ (Sorbonne) سوربون یونیورسٹی کا ایک مرد طالب علم نکلا۔ اس کے بھی کچھ عرصے بعد آریلینو ملارن نے کیمونسٹ پارٹی سے مستعفی ہو کر یہ بیان دیتے ہوئے چلی میں سب کو حیران کر دیا
شدید نظریاتی اختلافات کی بنا پر میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوا ہوں۔ اس نے یہ بیان اپنے خط میں ایک اخبار کو دیا تھا۔

ایک جنرل اور ایک شاعر

ہر شخص جو قید یا شکست سے ابھرا، وہ تنہائی، آنسوؤں اور قہقہوں پر مشتمل ابواب کا ایک ناول تھا، ان میں سے بعض کی کہانیوں نے مجھے ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ مجھے ہوائی فوج کا ایک جنرل ملا دراز قامت، دبلا پتلا، ملٹری اکیڈمی سے ہر وضع کے خطابات کو حاصل کئے ہوئے ایک فوجی

وہ وہاں پیرس کی گلیوں میں گھوم رہا تھا (ہسپانوی مٹی سے کوخوتے کا سایہ ——
کیسٹائل کے سفید درختوں کی مانند پرانا اور سیدھا جب فرانکو کی فوج نے جمہوریہ کو دو حصوں میں منقسم کر دیا تو اس جنرل (Herrera) ھریرا کو اندھیری راتوں میں مورچوں کو دیکھنے کے لئے دورے کرنے اور احکامات جاری کرنے پڑتے

گھپ اندھیری راتوں میں، اس نے اپنے جہاز کی ساری بتیاں بجھا کر دشمن کے علاقے پر اڑایا۔ ہر مرتبہ فرانکو کی طرف سے توپ کے گولے اس کے جہاز پر برستے رہے۔ لیکن جنرل ہریرا تاریک راتوں میں جہاز اڑانے سے اکتا گیا تھا۔ لہٰذا اس نے بریل کے طریقے کو سیکھا ایک بار جب اس نے اندھوں کے لئے لکھائی کے اس طریقے پر دسترس حاصل کر لی تو وہ اپنے خطرناک دوروں پر اپنی انگلیوں کی مدد سے پڑھتا ہوا دورے کرتا رہا جب کہ اس کے نیچے خانہ جنگی کی آگ اور کرب کا کھیل جاری رہا۔ جنرل نے مجھے بتایا کہ اس نے (The count of Montecristo) کا مطالعہ کر لیا ہے اور آج کل جب راتوں کو اس کا بریل پر لکھنا اور پڑھنا، شکست اور جلاوطنی کے باعث رک گیا تھا، تو وہ (The Three Musketeers) کے مطالعے میں مصروف ہے۔
ایک اور کہانی جو مجھے یاد آتی ہے، وہ اندلس کے شاعر (Pedro Garfias) پیڈرو گارفیاز کی ہے، جس کی جلاوطنی سکاٹ لینڈ میں کسی لارڈ کے محل میں ختم ہوئی۔
یہ محل ہمیشہ سے ویران تھا اور گارفیاز ایک بے چین اندلسی، جو انگریزی زبان سے بھی نابلد تھا اور ہسپانوی خانہ بدوشوں کی زبان، جسے میں بھی نہ سمجھ سکتا تھا بولتا تھا، روزانہ مقامی شراب خانے

میں جا کر خاموشی سے بیئر پیتا رہتا۔ دنیا سے بیزار اس گاہک نے جلد ہی شراب خانے کے مالک کی توجہ حاصل کر لی، جس نے ایک رات تمام گاہکوں کے جانے کے بعد اسے وہاں ٹھہرنے پر مجبور کیا اور پھر وہ آتش دان کے پاس بیٹھ کر شراب پیتے رہے۔ جب کہ آتش دان میں بھڑکتی ہوئی آگ ان دونوں کے بجائے باتیں کرتی رہی۔ یہ دعوت بعد میں ایک رسم بن گئی۔ ہر رات کو گارفیاز کو شراب پلانے والا جو خود بھی گارفیاز ہی کی طرح شراب پیتا تھا اسے خوش آمدید کہتا۔ آہستہ آہستہ ان کی زبانوں نے کھلنا شروع کیا۔ گارفیاز نے اسے ہسپانوی جنگ کے بارے میں تحیر، وعدے اور لعنتوں کے ساتھ سب کچھ اندلسی انداز میں بتلایا جب کہ دوسرے سننے والے نے وہ سب کچھ ایک مذہبی سکوت کی حالت میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی سنا۔ سکاٹ مین نے اس کے بدلے میں اپنے دکھ سنا ڈالے، شاید اس کی بیوی کی کہانی، جو اسے چھوڑ کر چلی گئی اور اپنے بیٹوں کی زیادتیاں، جن کی فوجی وردی میں تصاویر آتش دان پر سج رہی تھیں۔ میں "شاید" کہہ رہا ہوں کیونکہ ان طویل مہینوں کی کی گئیں عجیب و غریب باتیں ختم ہو گئیں جبکہ گارفیاز کے پلے بھی کچھ نہ پڑا۔

اس کے باوجود ان دونوں تنہا مردوں کے درمیان دوستی کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ ہر ایک اپنے دکھوں کا اظہار اپنی زبان میں کرتا رہتا حالانکہ دونوں کی زبان ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھی۔ ہر رات وہ ایک دوسرے سے ملتے اور گئی رات تک ایک دوسرے سے ہمکلام رہنا دونوں کی ضرورت بن گئی تھی۔ جب گارفیاز کو میکسیکو کے لئے جانا پڑا تو انہوں نے باتوں کے دوران شراب نوشی کرتے اور روتے ہوئے ایک دوسرے کو الوداع کیا، وہ احساس، جس نے انہیں ایک دوسرے سے مربوط رکھا ان دونوں کی تنہایوں کی اداسی تھی

"پیڈرو" میں اکثر شاعر سے پوچھتا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، وہ تمہیں کیا بتاتا رہا تھا؟"

"پابلو، میں کبھی بھی ایک لفظ نہ سمجھ پایا، لیکن جب میں نے اسے سنا تو مجھے ہمیشہ محسوس ہوا اور مجھے یہ یقین رہا کہ میں وہ سب کچھ سمجھتا رہا، جو وہ کہتا تھا اور جب میں بولتا تو وہ بھی میری ہی طرح سب کچھ نہ جاننے کے باوجود سمجھتا رہا۔"

ونی پیگ (Winnipeg)

ایک صبح جب میں سفارت خانے پہنچا تو مجھے حکام نے ایک خاصا طویل برقیہ تھما دیا، ہر شخص مسکرا رہا تھا، جو خاصا بے تکا دکھائی دیتا تھا۔ کیونکہ ان لوگوں نے تو مجھے کبھی خوش آمدید بھی نہ کہا تھا۔ یقیناً اس برقیے میں کوئی ایسا پیغام، کوئی ایسی بات ہو گی جو ان کی خوشی کا باعث ہے۔ یہ برقیہ چلی سے آیا تھا، جس پر خود چلی کے صدر ڈان پیڈرو کے دستخط موجود تھے، وہی صدر، جس سے مجھے

واضح احکامات ملے تھے کہ میں ہسپانوی جلاوطنوں کو چلی کے لئے بحری جہاز پر سوار کراؤں۔ میں یہ برقیہ پڑھ کر ششدر رہ گیا تھا، کہ ہمارے محبوب صدر ڈان پیڈرو کو میری حیرانی کے لئے اسی صبح یہ خبر ملی تھی کہ میں ہسپانوی تارکین وطن کے لئے چلی جانے کا بندوبست کر رہا تھا اور صدر نے مجھ سے اس بے تکی خبر کے لئے فوری طور پر منحرف ہونے کو کہا تھا خود میرے لئے صدر کا یہ برقیہ بے سروپا تھا۔

تارکین وطن ہسپانویوں کو جمع کرنا، ان کا انتخاب کرنا بذات خود ایک خاصا کٹھن اور صبر آزما کام تھا۔ خوش قسمتی سے اسپین کی جلاوطن حکومت میرے مقصد کی اہمیت کو سمجھ گئی تھی۔

اس کے باوجود روزانہ غیر متوقع اور نئے نئے مراحل راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں مہاجرین یا تو فرانس اور افریقہ میں موجود بیگار کیمپوں کو چھوڑ چکے تھے یا چھوڑنے کی تیاریوں میں مصروف تھے، جہاں ہزاروں کی تعداد میں وہ چلی جانے کے لئے وہاں جمع تھے۔

جلاوطن حکومت ایک بحری جہاز "ونی پیگ" خریدنے میں کامیاب ہو گئی تھی، جسے زیادہ مسافروں کے لئے تبدیل بھی کر لیا گیا تھا اور جو بورڈیو کی چھوٹی سی بندرگاہ کے نزدیک ٹروسپے لوپ میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔

مجھے کیا کام کرنا چاہئے؟ یہ بے حد اہم اور طولانی کام عین دوسری جنگ عظیم کے موقع پر زندگی کے لئے آزمائش بن گیا تھا۔ جو ہاتھ میں نے ان مجبور لوگوں کی طرف اٹھایا تھا، اس کا مطلب ان کی فلاح اور ان کے لئے میرے ملک کے صحیح مزاج کی ترجمانی کرنا تھا، جس نے نہ صرف انہیں خوش آمدید کہا بلکہ انہیں ہیرو قرار دیا، لیکن صدر کا یہ برقیہ ان تمام خوابوں کو چکنا چور کرنے کے مترادف تھا میں نے (Negrin) سے گفتگو کا فیصلہ کیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں صدر جان نیگرین اور وزیر الواریز اور ہسپانوی ری پبلکن حکومت کے کچھ اور اہم لوگوں سے دوستانہ مراسم رکھتا تھا۔ نیگرین ان سب میں سے بے حد دلچسپ شخص تھا۔ ہسپانوی سیاست میرے لئے ہمیشہ تنگ نظر اور صوبائیت پر مبنی نظر آئی ہے۔ نیگرین بہرحال بین الاقوامی یا یورپی تھا۔ اس نے (Leipzig) لیپ زگ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ پیرس میں اس نے جلاوطن حکومت کے وقار کو عمدگی سے قائم رکھا۔ ہم نے بات چیت کی اور میں نے اسے چلی کے صدر کے ارسال کردہ برقیے اور ساری صورتحال سے واضح کیا۔ جس کے باعث میں ان لوگوں کے سامنے جنہیں میں سیاسی پناہ فراہم کرنا چاہ رہا تھا، ایک بہروپیا بن گیا تھا۔ ہمارے سامنے تین ممکن راستے تھے۔

پہلا راستہ باغیانہ تھا جس میں بس اس بات کا اعلان کرنا تھا کہ ہسپانوی تارکین وطن کی چلی روانگی منسوخ ہو گئی ہے۔ دوسرا ایک ڈرامائی راستہ تھا جس میں ریڈیو پر اپنے اعترافات پیش کرتے

ہوئے اپنے مقصد کا خاتمہ اور اپنے سر میں گولی مارنا تھا۔ تیسرا ایک واضح مقصد تھا جس میں جہاز کو تارکین وطن سے بھر کر ان کے ہمراہ وطن کی طرف روانگی تھی۔ کسی بھی سرکاری حکم نامے کے بغیر نتیجہ چاہے جو بھی ہو۔

نیگرین اپنی آرام کرسی میں تقریباً لیٹتے ہوئے سگار کے کش لگاتا رہا۔ پھر اچانک ایک اداس مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی اور اس نے کہا "کیا تم یہ فون استعمال نہیں کر سکتے؟"

ان دنوں یورپ اور امریکہ کے درمیان ٹیلیفون کا رابطہ گھنٹوں کے انتظار کی وجہ سے ناقابل برداشت حد تک دشوار تھا۔ کانوں کو بہرہ کر دینے والا شور اور اچانک مداخلت کے درمیان، میں وزیر خارجہ کی مدد سے آتی ہوئی آواز کو سن سکا۔ ٹوٹی پھوٹی گفتگو کے درمیان جس میں، بارہا جملوں کو دہرانا پڑتا تھا، یہ جانے بغیر کہ ہم ایک دوسرے کے مفہوم کو سمجھ بھی رہے ہیں یا نہیں۔ شور مچاتے ہوئے اور جواب میں سمندر کے شور مچاتے ہوئے بگل۔ میں نے یہ سمجھ لیا کہ میں وزیر خارجہ (Ortega) آرتیگا کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گیا ہوں کہ میں صدر کے احکامات کو نہیں مان رہا۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ میں نے اسے یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اگلے روز تک انتظار کروں

پیرس کے ہوٹل میں وہ رات میں نے درحقیقت کرب میں گزاری۔ اگلی سہ پہر مجھے معلوم ہوا کہ وزیر خارجہ آرتیگا نے صبح ہی کو استعفیٰ دے دیا تھا۔ وہ میری حیثیت کو ہٹانے کے حق میں نہیں تھا۔

کابینہ میں ہل چل مچ گئی اور ہمارے صدر نے ایک ناقابل برداشت دباؤ کے تحت عارضی تعطل کے بعد اپنی طاقت کو برقرار کیا اور مجھے ایک نیا برقیہ مل گیا، جس میں سفر شروع کرنے کے احکامات درج تھے۔ آخر کار ہم نے تارکین وطن کو ونی بیگ پر سوار کرایا۔ شوہر اور بیویاں، والدین اور بچے جو ایک دوسرے سے عرصہ دراز سے جدا تھے اور افریقہ یا یورپ کے دوسرے شہروں سے یہاں پہنچ رہے تھے۔ منتظر ہجوم ہر بار ٹرین کے آنے پر آگے بڑھتا۔ شور مچاتے ہوئے روتے ہوئے وہ ٹرین کے ڈبوں کی کھڑکیوں سے سر نکالتے اور اپنے عزیزوں کو پہچانتے۔ بالآخر سب کے سب جہاز پر سوار ہو گئے۔

ان میں مچھیرے تھے، کسان تھے، مزدور تھے، دانشور تھے، محنت کش تھے، ہیرو ازم اور طاقت کا ایک نمائندہ حصہ ——

میری شاعری انہیں اپنے لئے وطن دلانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اور میں ایک فخر سے سرشار تھا۔ دریائے سین کے کنارے ایک سڑک پر ٹہلتے ہوئے میں نے ایک اخبار خریدا۔ میں

ایک قدیم قلعہ کے برابر سے گزر رہا تھا. جس کے کھنڈر انگور کی بیلوں سے کاسنی تھے اور جس کے پتھریلے مینار آسمان کی جانب بلند تھے۔ وہ قدیم قلعہ جہاں (Ronsard) رونسرڈ اور (Pleia de)پلی ایڈ شاعر صدیوں پہلے کبھی ملے تھے۔ اس منظر نے میرے تخیل میں جگہ لے لی تھی۔

میں نے اخبار کھولا —— دوسری جنگ عظیم نے دن کا آغاز کیا تھا اس پرانے کھوئے ہوئے گاؤں میں میرے ہاتھوں سے وہ اخبار جس میں سیاہ روشنائی نے اس خبر کو نمایاں کیا تھا گر گیا تھا۔

ہر شخص اس کی توقع کر رہا تھا۔ ہٹلر سرحدوں کو روند رہا تھا۔ جب کہ انگریز اور فرانسیسی سیاست دان اپنی چھتریاں تانے ہوئے اسے مزید شہر، سلطنتیں اور انسان بھینٹ کر رہے تھے۔ انسانوں کے ضمیر پر ابہام کا ایک بہت بڑا دھواں چھا چکا تھا۔ پیرس میں اپنے گھر کی کھڑکی سے میں نے پہلی کھیپ کو جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ نوجوان جنھوں نے اپنی فوجی وردی کو سلیقے سے پہننا بھی نہ سیکھا تھا اب موت کے منہ کی طرف قدم ملا کر چل رہے تھے۔ ان کا جانا افسوس ناک تھا۔ لیکن کوئی شے اسے نہ بدل سکتی تھی۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی جو پہلے ہی سے ہاری جا چکی تھی —— ایک ناقابل بیان صورتحال۔

شدت پسند گروہ گلیوں میں ترقی پسند دانشوروں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ ان کی دانست میں دشمن ہٹلر کے مقلدین کے بجائے فرانسیسی فکر کے پھول تھے۔ سفارت خانے میں جہاں واضح تبدیلی آچکی تھی ہم نے عظیم شاعر (Louis Aragon) لوئس آراگون کا استقبال کیا تھا۔ اس شاعر نے وہاں چار روز قیام کیا اور اس دوران شب و روز وہ لکھنے میں مصروف رہا۔ جب کہ غول اس کی زندگی ختم کرنے کے لئے اس کی تلاش میں پھرتے رہے۔ چلی کے سفارت خانے میں ہی اس نے اپنا ناول (Passenger of Destiny) مکمل کیا تھا۔ پانچویں روز وہ وردی میں ملبوس محاذ پر چلا گیا۔ جرمنوں کے خلاف یہ اس کی دوسری جنگ تھی۔

شفق کے ان دنوں میں، میں یورپ کے مسئلہ کو حل نہ کرنے کی کیفیت کا عادی ہو گیا تھا، جو مسلسل حرکت یا زمین پر زلزلوں کی اجازت نہیں دیتی لیکن پھر بھی جنگ کے مہلک زہر کو اس ہوا میں، جس میں ہم سانس لیتے ہیں اور جو روٹی ہم کھاتے ہیں، سرایت کرنے دیتی ہے۔

بمباری کے مسلسل خوف سے عظیم دارالحکومت رات کو تاریکی میں ڈوب جاتا اور ستر لاکھ لوگ اس تاریکی کا حصہ بنتے۔ روشنیوں کے شہر کے مرکز میں گھپ اندھیرا اب بھی میری یاد سے چمٹا ہوا ہے۔

اس دور کے خاتمے پر میں ایک بار پھر نئی دریافت شدہ زمینوں میں تنہا ہوں، جیسے یہ تمام

طویل سفر رائیگاں رہا۔

میں ایک عذاب سے دوچار ہوتا ہوں۔ ایک اور تنہائی بالکل جیسے پیدائش کے کرب میں۔ ایک اطلاع دیتی ہوئی ابتداء، جو مابعدالطبیعاتی خوف سے پر ہے، جس سے میری اوائل کی نظموں کی شروعات ہوئی نئی شفق میں میری اپنی تخلیق نے اسے مہمیز دی۔

مجھے کہاں جانا ہے؟ کس راستے سے مجھے مڑنا ہے؟ کیا نشانہ لینا ہے؟ سکوت کے کس راستے یا کون سی سانس لیتی ہوئی جگہ پر؟

میں روشنی کرتا ہوں۔ اوپر نیچے، اندر باہر ہر سمت تاریکی ہوتی ہے اور میں سوائے خالی پن کے، جسے میرے ہاتھوں نے خود ایک محتاط انداز میں بنایا ہے، کچھ نہیں پاتا

اس کے باوجود جو شے مجھ سے قریب ترین رہی ہے، بے حد بنیادی، انتہائی قیمتی، مکمل طور پر غیر متوقع، میرے راستے میں پہلی بار ظاہر ہوگی۔ میں نے ساری دنیا کے بارے میں بہت سوچا ہے، لیکن انسان کے بارے میں نہیں سوچا۔ ظالمانہ اور دردناک طور پر میں نے انسان کے دل میں تو جھانکا ہے، لیکن انسانیت کی پرواہ نہیں کی

میں نے شہر دیکھے ہیں، لیکن خالی شہر، میں نے فیکٹریاں دیکھی ہیں جن کا وجود، محض ایک المیہ تھا، لیکن میں نے ان چھتوں تلے گلیوں میں، اسٹیشن پر، شہروں اور دیہاتوں میں دکھ کو نہیں دیکھا جونہی گولیوں نے اسپین کے پہلے گیتار کو چھلنی کیا اور جب موسیقی کی جگہ اس سے خون رسنے لگا، تو میری شاعری اس انسانی کرب کے باعث سڑکوں پر ایک مردہ بھوت کی مانند رک گئی اور خون اس میں سرایت کر گیا۔ اس وقت سے میری سڑک ہر انسان کی سڑک سے جاملتی ہے اور اچانک میں دیکھتا ہوں کہ میں تنہائی کے جنوب سے شمال کی طرف چلا گیا ہوں، جو عوام ہیں، عوام جن کی تلوار، جن کا رومال میری شاعری بننا چاہتی ہے تاکہ وہ ان کے پسینے کو خشک کر سکے اور ان کے ہاتھ میں روٹی کی جدوجہد کے لئے ہتھیار فراہم کر سکے۔

تب خلا میں جگہ بنتی ہے اور خود کو گہرا اور دائمی بناتی ہے اب ہم زمین پر ثابت قدم ہیں۔ ہم ہر شے جو اس پر موجود ہے اسے انتہائی حد تک حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کسی اسرار کے خواہاں نہیں۔ ہم خود ایک اسرار ہیں۔ میری شاعری ایک ایسے ماحول کا مادی حصہ بن رہی ہے، جو حد نظر تک پھیلا ہوا ہے، جو سمندر اور زمین دونوں کے نیچے رواں ہے۔ یہ ابھرتے سبزے کی قطاروں میں داخل ہوتی ہے تاکہ سورج کے تماشائیوں کے ساتھ دن کے اجالے میں بول سکے۔ زمین کی گہرائی میں پوشیدہ معدنیات کو کھوج سکے انسان اور موسم خزاں کے مابین بھلا دینے والے رابطے کو قائم کر سکے۔ ہوا مدھم ہوتی ہے اور وقفوں سے روشنی اور خوف کے دھماکے اسے روشن کرتے ہیں ایک

نئی وضع، جو ظاہر سے کہیں دور ہے افق پر نمودار ہوتی ہے۔ ایک نیا براعظم میری شاعری کے اندرونی مواد سے ابھرتا ہے۔

ان زمینوں میں آباد ہوتے ہوئے، میں نے برس ہا برس لگا دیئے اس سلطنت کو تقسیم کرتے ہوئے اس کے پراسرار ساحلوں کو چھوتے ہوئے۔ اس کے جھاگ کے لمس، اس کی حیوانی زندگی اور اس کے جغرافیے کے طول و عرض تک پہنچتے ہوئے اس سب میں، میں نے تاریک تنہا اور دور افتادہ برس خرچ کر دیئے ہیں۔

ساتواں باب

پھولوں اور کانٹوں سے بھرا میکسیکو

میری حکومت نے مجھے میکسیکو بھیج دیا۔ بہت سے کربناک تجربات کی یادوں میں تقریباً ٹوٹ جانے کی حد تک دبا ہوا، اس حالت انتشار میں، میں ۱۹۴۰ء میں (Anahuac) آناہواک کی سطح مرتفع میں پہنچا ایک ایسے علاقے میں سانس لینے کے لئے، جس کی تعریف کرتے ہوئے Alf) (onso Reyes الفونسو ریز نے اسے ہوا کا مصفےٰ ترین علاقہ قرار دیا تھا۔

میکسیکو اپنی کانٹے دار ناشپاتی اور سانپ کے ساتھ کھیلتا ہوا اور کانٹوں سے بھرا، خشک اور طوفانی ہواؤں سے پٹا ہوا اپنی حدود اور رنگ میں پرجوش، تخلیق اور ابال میں منفرد میکسیکو نے مجھے اپنے سحر اور اپنی غیر معمولی روشنی کے حصار میں لے لیا تھا۔

برسوں میں نے بازار بازار اس میں سفر کیا، کیونکہ میکسیکو، فلموں کے بیہودہ گانوں، کسی میکسیکی باشندے کے مخصوص لباس، مونچھوں اور پستول کے بجائے اپنے بازاروں میں پایا جاتا ہے۔ میکسیکو کاسنی اور اندھیرے میں روشنی دیتی ہوئی مونگیا شالوں کی سرزمین ہے۔ میکسیکو مٹی کے برتنوں، گھڑوں اور کیڑوں کے دل تلے سڑتے ہوئے پھلوں کی سرزمین ہے۔ میکسیکو حد نظر تک پھیلے ہوئے دیہاتی علاقے میں نیلے درختوں اور زرد کانٹوں کی سرزمین ہے۔ دنیا کے خوبصورت ترین بازاروں میں دکھانے کو یہی کچھ ہے۔ پھل اور اون، مٹی اور بنتی ہوئی کھڈیاں، میکسیکو کے کاریگروں کی صناعی اور صلاحیتوں کا اظہار ہیں۔ میں میکسیکو سے گزرا، اس کے تمام ساحلوں پر پھرا۔ ڈھلواں ساحل جو کبھی نہ رکنے والی روشنیوں کی جھلملاہٹ میں تپے ہوئے تھے۔ میں (Topolobampo) ٹوپولوبامپو سے (Sinaloa) سینالوا میں نیچے آیا اور ان ناموں کے

برابر سے گزرا، جو اس نصف کرۂ ارض کے علاقائی نام ہیں، سخت نام، جو میکسیکو کے لئے دیوتاؤں کی طرف سے اس کا مقدر ہیں، جب ان دیوتاؤں سے کم ظالم انسان ان زمینوں پر حکومت کرنے کو آئے۔ میں نے ان تمام پراسرار اور شاندار حرفوں میں سفر کیا، جو وقت کے طلوع ہونے سے اب تک موجود ہیں۔ (Sonora) سونورا اور (Yucatan) یوکاٹان (Anahuac) اناہواک، ایک سرد کوئلوں کی بھٹی کی مانند ہے جو اپنی طرف زمین کی ملی جلی خوشبوؤں کو (Nayarit) نیارت سے لے کر (Gichoacan) جی شواکان تک، جہاں سے آپ (Janitzio) جینیٹزو کے جزیرے سے اٹھتا ہوا دھواں دیکھ سکتے ہیں اور غلے کی مہک کو (Jalisco) جیلیسکو سے ابھرتے ہوئے محسوس کر سکتے ہیں جس میں گندھک کی بو نئے آتش فشاں پیری کوئن سے اور بھیگی ہوئی مچھلیوں کی مہک جھیل پیٹز کوارو سے شامل ہوتی ہے۔ میکسیکو اپنی تاریخ، عمر، موسیقی اور جغرافیے کے باعث سحر انگیز ممالک میں سے آخری ہے۔

ان چٹانوں میں سے ایک سیلانی کی مانند اپنا رستہ بناتے ہوئے جہاں ہمیشہ لہو بہا، چٹانیں، جو خون اور کائی کی چوڑی پٹی سے منقطع تھیں۔ یہاں میں نے خود کو ایسی کہنہ چیزوں کے پاس سے گزرتے ہوئے، بہت طاقتور اور قدیم پایا۔ اچانک سامنے آجانے والی وادیاں، جو سنگلاخ چٹانوں کی دیواروں سے منقسم تھیں، بلند پہاڑیاں جو دیکھنے میں یوں نظر آتیں، جیسے انہیں چاقو سے کاٹ دیا گیا ہو۔ گھنے بارشوں والے جنگلات، جو استعمال میں آنے والی لکڑی، سانپوں، پرندوں اور روایات سے بھرے ہوئے تھے۔ اس وسیع و عریض زمین میں حد نظر تک انسانی جدوجہد نے قرنوں میں اسے اپنے رہنے کے قابل بنایا تھا۔

میں نے غور کیا کہ چلی اور میکسیکو، تمام براعظم امریکہ میں بالکل دو متضاد ملک ہیں۔ میں کبھی بھی روایتی خصوصیات سے، جنہیں جاپان کے سفیر کا رسما" چلی میں چیری کے درختوں کو دیکھتے ہوئے اس کو جاپان سے مماثل بتانا یا کسی برطانوی کو ہمارے ساحلوں پر پھیلی ہوئی دھند کو دیکھ کر یا کسی جرمن کو ہمارے پہاڑوں پر برف کو دیکھ کر یہ کہنا کہ ہمارے ملک جیسے ہیں قطعاً متاثر نہ ہوا تھا۔

اس کرہ ارض پر پھیلی ہوئی زمینی تضادات اور اس کے طول و عرض میں پائے جانے والی مختلف النوع پیداوار مجھے خوش کرتی تھیں۔ کسی بھی طور پر میں میکسیکو سے، جس سے مجھے محبت ہے اور جو باوجودیکہ ہمارے دھلے ہوئے ساحلوں اور غلے سے بھرپور زمین سے یکسر مختلف ہے، اپنی توجہ کو کسی اور طرف مبذول نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو محض اس کے فرق کو دکھلانا چاہتا ہوں تاکہ ہمارے براعظم امریکہ کو اپنے تمام سیاق و سباق میں یعنی اس کے میدانوں، سطح مرتفع، بلندیوں اور گہری

وادیوں کے طور پر دیکھا جا سکے اور امریکہ ہی نہیں میرے خیال میں اس سارے سیارے میں کوئی بھی ملک اس قدر بھرپور انداز میں انسانی نہیں، جتنا میکسیکو اور اس کے عوام
اپنی درخشاں کامیابیوں، نمایاں غلطیوں کے باوجود دیکھنے والے کو ہر طرف عظیم سخاوت، بہت گہری توانائی، کبھی نہ تھکنے والی تاریخ اور لامحدود نشوونما نظر آتی ہے۔

ایک دن ہم مچھیروں کے گاؤں میں چلے گئے۔ جن کے جال اس قدر بڑے ہیں کہ وہ بہت بڑی تتلیاں لگتے ہیں، جو پانیوں سے ان نقرئی چھلکوں کو حاصل کرنے واپس آگئی ہیں، جن کی کمی کو وہ محسوس کر رہی تھیں۔ وہاں سے کان کنوں کے مراکز میں پہنچے، جہاں کا لوہا خام صورت میں زمین کی گہرائیوں سے نکلتے ہی جیومیٹری کی اشکال میں ڈھل جاتا۔ سڑکوں پر جہاں کیتھولک کانونٹس گھنے اور خاردار کیکٹس کی مانند پھلتے پھولتے۔ بازاروں میں جہاں سبزیوں کے رنگ اور ذائقے سجے ہوئے پھولوں کی مانند آپ کو مدہوش کر دیتے۔ اور اس طرح میکسیکو سے گزرتے ہوئے ہم یوکاٹان پہنچ گئے۔ دنیا کی قدیم مایا تہذیب کا مدفون گہوارہ، جہاں زمین، تاریخ اور پھوٹتے ہوئے بیج کے ہاتھوں ہلائی گئی ہے۔ (Century) کے پودوں کے ساتھ ساتھ منہدم آثار انسانی ذہانت اور قربانیوں میں اترتے ہوئے اب بھی بڑھ رہے ہیں۔ آخری سڑکوں کو عبور کرتے ہوئے ہم ایک وسیع و عریض حدود میں داخل ہوتے ہیں، جہاں میکسیکو کے قدیم باشندوں نے اپنی کاڑھی ہوئی تاریخ کو جنگل میں چھپا ہوا چھوڑ دیا ہے۔

یہاں ہمیں ایک نئی قسم کا پانی ملتا ہے۔ زمین پر سب سے زیادہ پراسرار پانی ـــ یہ نہ سمندر ہے، نہ چشمہ، نہ دریا یا کسی اور قسم کا پانی جس سے ہم واقف ہیں۔ یوکاٹان میں پانی سطح زمین کے نیچے موجود ہے۔ اچانک ایک دراڑ کے پھٹ پڑنے سے وسیع اور گھنے جنگلوں کو تالاب میں منتقل کر دیتا ہے، جن کے اطراف میں اگا ہوا گھنا سبزہ آنکھوں کو دعوت نظارہ دیتا ہے اور نیچے گہرائی میں آسمان جتنا گہرا سبز پانی ہے۔

مایا نسل نے زمین میں موجود ان دراڑوں کو دریافت کیا تھا اور ان کا نام (Cenot es) رکھا اور ان سے بچاؤ کے لئے عجیب و غریب رسومات کی اختراعات کیں۔ تمام مذاہب کی طرح ابتدا میں ان کی اشد ضرورت اور پیداوار اور زمین کی خشکی ان چھپے ہوئے پانیوں سے، جو زمین کے کھل جانے سے نمایاں ہو گئے تھے، غالب آچکی تھی۔ پھر ہزارہا سال تک ان مقدس تالابوں کے کناروں پر شروع میں علاقائی اور بعد میں حملہ آوروں کے مذہب نے ان پانیوں کے اسرار کو مزید بڑھا دیا تھا۔ (Cenotes) کے کناروں سے شادی کی رسومات کے بعد سینکڑوں کنواری لڑکیاں، پھولوں، جواہرات اور سونے میں لدی ان پاتال جیسے گہرے پانیوں کی نذر کر دی جاتیں۔ پھولوں

کے ہار اور سنہری تاج گہرائیوں سے پانی کی سطح پر آکر تیرتے، لیکن کنواری لڑکیاں تہہ کی کیچڑ میں اپنی طلسمی زنجیروں میں جکڑی جاتیں۔

ہزارہا سال کے بعد جواہرات کی محض ایک قلیل مقدار دریافت ہو سکی جو میکسیکو اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے عجائب خانوں میں نمائش کے لئے سجے ہیں۔ میں ان ویرانوں میں سونے کی تلاش کے بجائے ڈوبی ہوئی کنواریوں کی چیخیں سننے کی خاطر گیا۔ پرندوں کے چیخنے کی آوازوں میں مجھے ان کنواریوں کے غم و غصے کی بازگشت سنائی دی اور پرندوں کو ان گہرے پانیوں کی سطح پر اڑتے دیکھ کر مجھے ان نوجوان مردہ لڑکیوں کے زرد ہاتھ دکھائی دیئے۔

ایک بار میں نے ایک فاختہ کو ایک مجسمے پر اترتے ہوئے دیکھا، جس کے چمکدار بازو ہوا اور لافانی پانیوں کی جانب اٹھے ہوئے تھے۔ ممکن ہے اس فاختہ کے پیچھے کوئی عقاب ہو۔ کیونکہ یہ پرندہ اس علاقے سے تعلق نہ رکھتا تھا۔ یہاں کے عام پرندوں میں (Quetzal) اپنی رس دار آواز کے ہمراہ (Road Runner) اپنی ہکلاتی آواز کے ساتھ اور (Turquoise) گاتا ہوا پرندہ تھا۔ باقی شکاری پرندوں نے اپنی شان و شوکت اور لوٹ مار کی خاطر جنگل کو فتح کیا ہوا تھا۔

فاختہ مجسمے کے ہاتھ پر بیٹھ گئی۔ بالکل جیسے کسی پہاڑ پر برف کا سفید تکیہ۔ میں نے اسے بغور دیکھا کیونکہ وہ کسی اور دنیا سے آئی ہوئی لگتی تھی، نسبتاً متوازن اور پرسکون دنیا۔ کسی فیثا غورث کے ستون یا بحرالکاہل کے کسی ساحل سے۔ وہ تاریکی کے کنارے پر آکر رک گئی تھی۔ اس نے میری خاموشی کو سراہا، کیونکہ میں اس حقیقی امریکی خون آلود قدیم دنیا کا ایک حصہ بن چکا تھا اور میری نظروں نے اس وقت تک اس کا تعاقب کیا، جب تک وہ اڑتی ہوئی آسمان میں گم نہ ہو گئی۔

میکسیکو کے مصور

میکسیکو کی دانشورانہ زندگی مصوری کے زیر اثر تھی۔ میکسیکو کے مصوروں نے شہر کو تاریخ، جغرافیہ، عوامی احتجاج اور متشدد تضادات سے بھر رکھا تھا۔

دبلے پتلے ایک بازو والے (Josoe Clemente) جوزے کلیمنٹے کی رہائش گاہ ایک اونچی چوٹی پر تھی۔ اپنے تخیلاتی قسم کے ملک کا (Goya) گویا۔ میں نے اکثر اس سے گفتگو کی۔ تشدد کا عنصر جو اس کی تخلیقات میں واضح تھا، اس کی شخصیت کے لئے اجنبی نظر آتا تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک کمہار کی سی نرمی تھی، جس کا ایک ہاتھ برتن بنانے والے چاک کی نذر ہو گیا تھا،

لیکن وہ دوسرے ہاتھ سے نئی دنیائیں تخلیق کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے سپاہی اور ان کی عورتیں ان کے نگران کی گولیوں سے مرنے والے کسان۔ اس کے پتھروں والے تابوت اور خوفناک مصلوب مردے، علاقائی امریکی مصوری میں ہمارے ظلم و ستم کی شہادت ہیں۔

اس وقت تک (Diego Rivera) ڈیگوریوارا نے اس قدر کام کر لیا تھا اور ہر ایک کے ساتھ اتنی بات چیت ہو چکی تھی کہ یہ مصور ایک روایت بن چکا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے مجھے حیرت ہوتی کہ نہ تو اس کی مچھلی کی سی دم تھی اور نہ ہی پیروں کے سم۔ یہ مصور ہمیشہ سے جعل ساز رہا تھا۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل پیرس میں (Ilya Ehrenburg) ایلیا ایہرن برگ نے ایک کتاب اس کی بے سروپا مہمات پر شائع کی تھی اس کتاب کا نام (The Extraodinary Adventures of Julio Jurentio) تھا۔ تیس برس بعد یہی مصور (Diego Rivera) ڈیگوریوارا بلند بانگ کہانیاں سنانے والا ایک بڑا مصور تھا۔ وہ انسانی گوشت کھانے کو ایک صحت مند غذا تصور کرتا تھا، جسے اس کے خیال میں عمدہ کھانا پکانے والے بھی درست سمجھتے تھے۔

وہ ہر عمر کے لوگوں کو پکانے کی ترکیبیں بتاتا اور ایک دفعہ تو حد ہو گئی، جب اس نے ہم جنس پرستی کے اپنے نظریئے کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ دراصل یہی واحد فطری تعلق ہے، جو اس کی سربراہی میں بر آمد کئے جانے والے قدیم ترین تاریخی آثار سے ثابت ہوتا ہے۔ کبھی وہ گھنٹوں اپنی بڑی غلافی انڈین آنکھوں کو جھکائے ہوئے کام کرتا رہتا اور مجھے اپنے یہودی النسل ہونے کے بارے میں بتاتا اور پھر کبھی پرانی گفتگو کو فراموش کرتے ہوئے قسم کھا کر کہتا کہ وہ ہی جنرل رومیل (General Rommel) کا باپ ہے، لیکن اس بات کو ایک راز کی طرح چھپاتا ہے کیونکہ اگر یہ راز فاش ہو جاتا ہے تو بین الاقوامی حالات خوفناک صورت اختیار کر لیں گے۔ قائل کرنے کا اس کا غیر معمولی لہجہ اور کسی بھی بات کی معمولی سی جزئیات کو بیان کرنے کے انداز نے اسے ایک شاندار بہروپیا بنا دیا تھا۔ جس کے سحر کو کوئی بھی، جو ایک بار واقف ہوا، کبھی نہ بھول پایا۔

اس وقت (David Alfaro) ڈیوڈ الفارو جیل میں تھا، کسی شخص نے اسے (Trotsky) ٹراٹسکی کے گھر پر اسلحے کے ساتھ حملے کے لئے بھیجا تھا۔ میری ملاقات اس سے جیل میں اور باہر بھی ہوئی تھی۔ کیونکہ ہم جیل کے کمانڈر وارڈن کے ہمراہ شراب نوشی کے لئے باہر جایا کرتے، جہاں پہچانے نہ جا سکیں۔ گئی رات کو ہم واپس لوٹتے اور میں ڈیوڈ سے گلے ملتے ہوئے اسے خدا حافظ کہتا اور وہ جیل میں چلا جاتا۔ ایک مرتبہ جیل کی طرف واپسی کے دوران گلیوں میں اس کے بھائی (Jesus Siquerios) جیسس سیکوروز سے ملاقات ہوئی۔ یہ ایک بہت غیر معمولی شخص تھا۔ اس کی شخصیت کو بیان کرنے کے لئے صناع، صحیح لفظ ہو گا۔ وہ دیواروں کے بالکل برابر

میں کوئی آواز پیدا کئے بغیر خاموشی سے اتر آتا اچانک اسے آپ اپنے عقب میں یا برابر میں محسوس کرتے۔ خال ہی وہ بات کرتا، لیکن اگر کبھی بولتا تو وہ محض ایک سرگوشی ہوتی اور یہ بات اسے اپنے ہمراہ ایک تھیلے میں چالیس پچاس پستول لئے پھرنے سے نہ روکتی۔ یہ محض میری خوش قسمتی تھی کہ ایک بار میں نے بلاوجہ اس کا تھیلا کھول لیا تھا جس کے اندر سیاہ، نقرئی دستوں کے اسلحے کا ایک انبار موجود تھا۔ اس کا کوئی خاص مطلب نہ تھا کیونکہ جیسس اپنے بھائی ڈیوڈ کے برعکس، جو خاصا خطرناک تھا، ایک امن پسند انسان تھا۔ جیسس کو فطری طور پر مصوری کا عطیہ ہی نصیب ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ ایک اداکار اور نقل اتارنے والا بھی تھا۔ اپنے جسم کو ہلائے بغیر یا کوئی آواز یا حرکت کئے بغیر وہ اپنے چہرے پر موجود لکیروں کو اپنی قوت ارادی سے خوف ناراضگی، خوشی اور نرمی کے جذبات میں ڈھال لینے پر قدرت رکھتا تھا۔ اپنی زندگی کی بھول بھلیوں سے نکلتے ہوئے اس کے چہرے پر مردنی کی پیلاہٹ چھائی رہتی اور وہ اپنے تھیلے میں پستولوں کو اٹھائے پھرتا، جنہیں اس نے کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔

ان آتش فشانی مصوروں نے عوام کو ایک قطار میں لگا رکھا تھا کبھی کبھار وہ مباحثوں میں الجھ جاتے۔ ایسے میں کسی مباحثے میں دلائل ختم ہونے پر (Diego) ڈیگو اور (Siqueiros) سیکیوروز نے اپنے بڑے پستول نکال کر ایک دوسرے کو نشانہ بنانے کی بجائے تھیٹر کی چھت پر موجود پلاسٹر کے بنے ہوئے فرشتوں کے پروں پر گولی چلادی تھی جب پلاسٹر کے بوجھل پر گولی لگنے سے نیچے بیٹھے ہوئے تماشیوں پر گرنے لگے تو تھیٹر خالی ہو گیا اور یوں ان کی بحث اختتام کو پہنچی لیکن خالی ہال میں بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

(Rufino Tamayo) روفینو ٹمائیو اس زمانے میں میکسیکو میں رہائش پذیر نہ تھا۔ مارکیٹ میں بنی ہوئی اشیا یا پھلوں کی طرح پیچیدہ اور کسی میکسیکو کے باشندے کی طرح جذباتی روفینو کی تصاویر ہمارے پاس نیویارک سے آئی تھیں۔

ڈیگوریوارا اور ڈیوڈ الفارو کی مصوری میں کوئی باہمی تقابل نہ تھا۔ ڈیگو کے ہاں کلاسیکی مصوری کا انداز نمایاں تھا۔ اس کی مصوری میں سطر لامحدود انداز میں یوں لہرلیتی جیسے کسی تاریخ دان کے ہاں اپنے ہمراہ آرام کے احساس میں اپنے واقعات، روایات اور المیوں کو لاتی تھی۔ جب کہ ڈیوڈ کے ہاں آتش فشانی مزاج نمایاں تھا جس میں ایک حیران کن تکنیک اور مشقت طلب تحقیق شامل تھی خفیہ حملوں اور ہر موضوع پر گفتگو کے دوران میں نے ڈیوڈ کے لئے جیل سے فرار کا منصوبہ بنایا۔ اس کے پاسپورٹ پر، میں نے خود ویزا لگایا جس کی وجہ سے اس نے اپنی بیوی کے ہمراہ چلی کا سفر کیا۔ میکسیکو کے لوگوں نے چلی کے شہر چلان میں ایک اسکول بنالیا تھا اور اسی اسکول

میں، جو بعد میں زلزلے سے تباہ ہو گیا، ڈیوڈ نے ایک بہت عمدہ میورل بنایا تھا۔ چلی کی حکومت نے ہماری قوم کی ثقافت کی خدمت کے صلے میں مجھے قونصلر کے فرائض سے دو ماہ کے لئے معطل کر دیا تھا۔

نپولین ابیکو (Napoleon Ubico)

میں نے گوئٹے مالا (Guatemala) جانے کا فیصلہ کر لیا اور کار سے سفر شروع کیا۔ ہم میکسیکو کے سنہرے علاقے (Tehuan Fepae) کے تنگ ترین درے سے گزرے۔ جہاں ہر طرف تتلیوں کے سے لباس میں عورتیں تھیں اور شہد اور چینی کی مہک ہوا میں تھی اس کے بعد ہم (Chiapas) کے بڑے جنگل میں چلے گئے رات کے وقت جنگل کے ٹیلی گرافک پیغامات کا شور سن کر ہم کار کو روک لیتے۔ یہاں وہاں ہر طرف سینکڑوں کی تعداد میں (Cicadas) ٹنڈوں کی باعث ایک قسم کا بہرہ کر دینے والا شور تھا۔

پراسرار میکسیکو نے قدیم تعمیرات، دور افتادہ تصاویر، جواہرات، یادگاروں، پتھروں کے جانوروں پر اپنے سبز سایوں کو پھیلا رکھا تھا شاندار میکسیکو کا ناقابل بیان خزانہ ـــــ یہ سب کچھ جنگل میں بکھرا ہوا تھا۔ سرحد کے دوسری پار مرکزی امریکہ کی بلند پہاڑی دیوار پر گوئٹے مالا کی تنگ سڑک مجھے اپنے بے پناہ خود رو سبزے اور نطقہ حارہ میں پائے جانے والی خود رو بیل (Lianas) سے چندھیا رہی تھی اور پھر اوپر پہاڑوں میں اس کی پرسکون جھیلیں، جیسے بے کار دیوتاؤں کی بھولی ہوئی آنکھیں اور آخر میں اس کے چیڑھ کے جنگلات اور قبل از تاریخ زمانے کے دریا، جن کے پانیوں میں سے Manatees (آبی نبات خود میمیل ـــــ جل گائے) انسانوں کی مانند باہر کو ابھر آتے ہیں۔

میں ایک ہفتہ (Miguel Angel) مگوئیل اینجل کے ہمراہ رہا جو اس وقت تک اپنے کامیاب ناولوں کے باوجود شہرت نہ پا سکا تھا ہمیں احساس ہوا کہ ہم دونوں پیدائشی طور پر بھائی ہیں، روزانہ ہم کم و بیش اکٹھے وقت گزارتے۔ شاموں میں ہم کہر میں ملفوف پہاڑی جگہوں یا یونائیٹڈ فروٹ کی بندر گاہوں تک جانے کا پروگرام بناتے گوئٹے مالا کے لوگوں کو آزادانہ طور پر تقریر کرنے کا حق حاصل نہ تھا اور کوئی بھی سیاست کی بات نہ کرتا تھا۔ دیواریں کان رکھتیں تھیں، جو آپ کے خلاف ہو سکتی تھیں، کبھی کبھار ہم بلند سطح مرتفع پر کار کو روک کر یقین کر لیتے کہ کسی درخت کے پیچھے، کوئی ہمیں سن تو نہیں رہا اور پھر ہم صورت حال پر بحث کرتے رہتے۔

مطلق العنان فرماں رواں کا نام (Ubico) ابیکو تھا جو طویل عرصے سے ملک کو چلا رہا

تھا۔ وہ ایک موٹا شخص تھا، جس کی آنکھیں سرد اور بے مہر تھیں۔ اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر حرف قانون تھا اور گوئیٹے مالا میں کوئی بات اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔ میں ایک بار اس کے سیکرٹریوں میں سے ایک سے ملا، جو اب میرا دوست اور ایک انقلابی ہے۔ کسی معمولی سی بات پر اختلاف کے باعث ایکو نے بذات خود اسے ستون سے باندھ کر بے رحمانہ انداز میں کوڑوں سے مارا تھا۔

نوجوان شاعروں نے مجھ سے میری نظمیں سننے کی خواہش کا اظہار کیا تھا انہوں نے ایکو سے اجازت حاصل کرنے کے لئے اسے ایک برقیہ ارسال کیا تھا۔ میرے تمام دوست اور بہت سے نوجوان طلباء ہال میں جمع ہو گئے تھے۔ مجھے اپنی نظمیں پڑھنے کی خوشی تھی کہ اس طرح وہ ایک بڑے جیل خانے کی کھڑکی میں ایک شگاف ڈال سکیں گی پولیس کا سربراہ پہلی قطار میں مشکوک انداز میں بیٹھا ہوا تھا بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ہال میں چار مشین گنیں میری جانب لگائی گئی تھیں۔ اور مجمع اس بات کا منتظر تھا کہ اگر پولیس کا سربراہ پڑھتے ہوئے کسی قسم کی مداخلت کرے تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دیں۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ شخص آخر وقت تک بیٹھا میری نظمیں سنتا رہا۔ بعد میں کسی نے مجھے اس آمر سے متعارف کرانا چاہا۔ ایک شخص جو نپولین کے کمپلیکس کا شکار تھا۔ وہ اپنے ماتھے پر بالوں کی ایک لٹ کو سجائے رکھتا اور کئی بار نپولین بونا پارٹ کے انداز میں اپنی تصاویر کھچوا چکا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ اس دعوت کو ٹھکرانا خطرناک ہو سکتا ہے۔ لیکن میں نے اس شخص سے ہاتھ نہ ملانے کو بہتر سمجھتے ہوئے جس قدر جلدی ممکن ہو سکتا تھا، وہاں سے نکل کر میکسیکو پہنچ گیا۔

پستولوں کا مجموعہ

ان دنوں میکسیکو میں بندوق کی لڑائیوں کے بجائے بندوق نکالنے کا رواج زیادہ تھا۔ ریوالور رکھنے کی ایک رسم سی چل نکلی تھی اعشاریہ ۴۵ کے ریوالور کا تو جیسے مرض لاحق ہو چکا تھا سوئی کے گرتے ہی کولٹ (Colt) (پستول کی ایک قسم) باہر نکل آتے۔ پارلیمانی اراکین اور اخبارات پستولوں کو ختم کرنے کی مہم شروع کرتے لیکن جلد ہی ہمیں اندازہ ہو جاتا کہ کسی میکسیکو کے باشندے کا دانت کھینچ کر نکال لینا اسے اس کی محبوب بندوق یا پستول سے الگ کرنے کی نسبت کہیں سہل ہے۔ ایک بار شاعروں کے ایک گروہ نے میرے اعزاز میں پھولوں سے بھری ہوئی کشتی میں ایک پکنک کا انتظام کیا کشتی کا یہ سفر جھیل (Xochimilco) میں پندرہ بیس دوستوں کے ہمراہ تھا۔ کشتی کا کوئی کونا ایسا نہ تھا، جسے پھولوں سے نہ سجایا گیا ہو میکسیکو کے باشندوں کے ہاتھ بالکل چینیوں کے ہاتھوں کی طرح کوئی بدصورت شے تخلیق نہیں کر سکتے، چاہے کام پتھر کا ہو، چاندی کا ہو یا مٹی

میں۔

اس سفر کے دوران، جس میں بہت سے رقص بھی کئے گئے۔ شاعروں میں سے ایک نے مجھ سے اصرار کیا کہ ایک مخصوص وضع کی عزت کے طور پر مجھے اس کے خوبصورت پستول سے، جس کا دستہ سونے اور چاندی کے خوبصورت نقش و نگار سے مزین تھا، فائر کرنا چاہئے۔ اس شخص کے نزدیک بیٹھے ہوئے دوسرے شاعروں نے بھی اپنے اپنے پستول نکال لئے اور پہلے شخص کے پستول کو اپنے پستول کے دھکے سے ایک طرف کرتے ہوئے اپنے پستول میری طرف بڑھا دیئے۔ اب ہر شخص نے اپنا اپنا پستول باہر نکال لیا تھا اور ان سب کی پستولیں اور بندوقیں میری ناک کے سامنے اور سر پر لہرا رہی تھیں۔ اس وقت مجھے یہ سوجھا کہ میں ایک بہت بڑا تھیلا لے کر شاعروں کی بٹالین سے امن کے نام پر اس میں یہ سارا اسلحہ جمع کر دوں ــــ ہر شخص نے میرا کہنا مانا اور اس طرح میں کئی دنوں تک اس سارے اسلحے کو ضبط کر کے اپنے قابو میں رکھ سکا میرے خیال میں، میں واحد شاعر ہوں، جس کے اعزاز میں پستولوں کا ایک ڈھیر اکٹھا کیا گیا تھا۔

آخر نرودا کیوں؟

زمین کا نمک میکسیکو میں جمع ہو گیا تھا۔

جب کہ یورپ میں ہٹلر کی فوجیں فتح کے ڈنکے بجا رہی تھیں اور فرانس اور اٹلی پہلے ہی ہٹلر کے قبضے میں آ چکے تھے۔ ہر قومیت کے جلاوطن ادیب میکسیکو کی آزادی کے لئے قائم کئے گئے کیمپ میں پہنچ گئے تھے۔ ادیبوں میں دوسروں کے علاوہ (Anna Seghers) اینا سیگھرز اور چیکو سلاوایہ کا مزاح نگار (Egon Erwin Kisch) ایگون اردن کش موجود تھے۔ اس کے بعد ہی کش کا انتقال ہو گیا، جو اپنے پیچھے بے حد دلچسپ کتابیں چھوڑ گیا تھا اور میں اس کی ذہانت جاننے کے بارے میں ایک بچے جیسی صلاحیت کا معترف تھا۔ جونہی وہ میرے گھر میں داخل ہوتا تو اپنے کان سے ایک انڈہ نکالتا یا پھر سات سکے ایک ایک کر کے نگل لیتا۔ جسے یہ غریب جلاوطن اپنے لئے استعمال کر سکتا تھا۔ اسپین میں ہماری ایک دوسرے سے جان پہچان رہی تھی اور تبھی اس نے میرے نام نرودا کے (جو میرا پیدائشی نام نہ تھا) استعمال میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا اور میں نے مذاقاً اس سے کہا۔

"عظیم کش تم تو کرنل ریڈل کے راز کو تقریباً افشا کر سکتے تھے" (۱۹۱۴ء کا مشہور جاسوسی کیس) لیکن تم میرے نام کے اسرار سے کبھی واقف نہ ہونگے" اور تقریباً ایسا ہی ہوا۔ وہ پراگ میں، ہر اس اعزاز کے ساتھ جو اسے اس کا آزاد ملک دے سکتا تھا یہ جانے بغیر

مر گیا کہ نرودا خود کو نرودا کیوں کہتا ہے۔ اس بات کا جواب اس قدر سادہ اور آسان تھا کہ میں اس راز کو چھپانے کے لئے محتاط ہو گیا تھا۔

جب میں چودہ برس کا تھا تو میرا باپ ہمیشہ میری ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں میرے پیچھے لگا رہتا۔ اسے یہ بات کچھ اچھی نہ لگتی تھی کہ اس کا بیٹا شاعر ہو۔ اپنی پہلی پانچ نظموں کی اشاعت کو راز میں رکھنے کے لئے میں نے نام کے آخری حصے کے لئے کسی ایسے نام کو ڈھونڈنا شروع کیا، جو میرے باپ کو گمراہ کر سکے۔ اور یوں میں نے ایک رسالے سے ایک چیک نام کا انتخاب کر لیا۔ یہ جانے بغیر کہ یہ وقت کے بہت بڑے ادیب کا نام تھا، جس سے اس کی ساری قوم پیار کرتی تھی۔ بیانیہ شاعری اور شاندار منظوم ڈراموں کا خالق، جس کی یادگار پراگ کے مشہور علاقے (Mala Strana) میں موجود ہے۔ برسوں بعد پہلا کام جو میں نے چیکوسلاویہ جا کر کیا وہ پراگ میں جا کر اس داڑھی والے مجسمے کے قدموں میں ایک پھول رکھنا تھا۔

پرل ہاربر کا واقعہ

سلامانکا (Salamanca) سے (Wenceslao Roces) اور (Constancia) سے ایک شخص جو ڈیوک آف مارا (Duke of Maura) کا رشتے دار ہونے کے ساتھ ایک ری پبلیکن بھی تھا اور شمالی امریکہ میں مشہور زمانہ کتاب (Inplace of Splendor) کا مصنف بھی ان سب کے علاوہ شاعر لیون فلیپی (Leon Felipe) جان ریجانو (Juan Rejano) مورنیو ولا (Morino Villa) ہریرا پیٹرے (Herrera Petere) اور مصور مگوئیل (Miguel) روڈری گاز لونا (Rodriguez Luna) میرے گھر آیا کرتے تھے۔ یہ سب ہسپانوی تھے۔

پانچویں رجمنٹ کا مشہور کمانڈانٹ ویٹوریو ویڈالی (Vitorio Vidali) (Morio Morio Montagava) موریو مانتیگاوا اطالوی جلاوطن تھے۔ جن کے ہاں بے شمار یادیں، حیران کن کہانیاں اور ایک متزلزل ثقافت موجود تھی (Jacques Soustelle) جیکویز سوسٹلے اور (Gilbert Medioni) گلبرٹ میڈونی بھی وہاں تھا۔ یہ ڈیگال کے چاہنے والے سیاست دان اور آزاد فرانس کے نمائندے تھے۔

میکسیکو یا وسطی امریکہ سے جلاوطنوں کی بھرمار تھی گونیٹے مالا کے باشندے، سلواڈار اور ہنڈاراس کے رہنے والے ان سب کی موجودگی سے سین اینجل کے ہمسائے میں میرا پرانا ولا نہ صرف بین الاقوامیت کے ذائقے سے سرشار تھا، بلکہ یوں لگتا تھا جیسے دنیا کا دل یہیں دھڑکتا ہو

سوسٹیلے (Soustelle) کے بارے میں، جو اس وقت بائیں بازو کا ایک سوشلسٹ تھا اور جس کی وجہ سے چند سال بعد صدر ڈیگال کو خاصی زحمت اٹھانی پڑی تھی، میں ضرور ذکر کروں گا۔

یہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے، نازی جرمنوں نے لینن گراڈ کا محاصرہ کر رکھا تھا اور ان کی فوجیں روسی علاقے میں اندر گھس رہی تھیں لومڑی جیسے جاپانی فوجی رہنما، برلن، روم اور ٹوکیو کے مسئلے پر مرتکز تھے۔ ممکن ہے جرمنی جنگ جیت جائے اور جاپانیوں کو مال غنیمت میں حصہ نہ ملے۔ مختلف قسم کی افواہیں دنیا میں گشت کر رہی تھیں۔ وہ لمحہ جب جاپانی فوجوں کو مشرق میں بے قابو کر دیا جائے گا نزدیک تھا اسی اثنا میں واشنگٹن میں ایک جاپانی امن مشن ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت کے سامنے مودبانہ انداز میں کورنش بجا رہا تھا۔ خفیف سا بھی شبہ نہ تھا کہ جاپانی ایک اچانک حملے سے سب کو حیران کر دیں گے۔ کیونکہ تب ہوائی بمباری ہی وقت کا قانون تھا۔

اپنے بیان کی وضاحت کے لئے میں یہ بتا دوں کہ ایک پرانا نپون دخانی جہاز جاپان کو چلی سے ملا تھا۔ میں ان جہازوں پر کئی بار سفر کر چکا تھا اور ان کے بارے میں اچھی طرح سے واقف تھا وہ ہماری بندر گاہ پر رکے اور ان کے کپتان نے اپنا وقت خام لوہے کی خریداری اور تصویر کشی میں گزارا۔ چلی کے سفر میں ان کے دخانی جہاز (Peru) پیرو (Ecuador) ایکواڈار، حتیٰ کہ میکسیکو کی دور دراز بندر گاہ (Manzanillo) مینزانیلو پر بھی لنگر انداز ہوئے، جہاں انہوں نے اپنی کمانوں کا رخ بحرا کاہل کے اس پار (Yokohama) یوکوھامہ کی طرف رکھاایک روز جب کہ میں ابھی میکسیکو میں چلی کا قونصل جنرل تھا، سات جاپانی، جو چلی کا ویزا حاصل کرنے کی جلدی میں تھے مجھ سے ملنے آئے۔ یہ لوگ سان فرانسسکو، لاس اینجلیس اور شمالی امریکہ کے دوسرے مغربی ساحل سے آئے تھے۔ سب کے سب خوش لباس بھی تھے اور ان کے تمام کاغذات بھی ہر طرح سے مکمل تھے۔ یہ انجینئر یا بزنس ایگزیکٹو بھی ہو سکتے تھے۔ میں نے ان سے معلوم کیا کہ میکسیکو میں آتے ہی وہ چلی کے لئے پہلی پرواز کیوں لینا چاہتے ہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ وہ شمال چلی کی بندر گاہ (Tocopilla) ٹوکوپلا میں موجود ایک جاپانی جہاز میں سوار ہونے کے خواہش مند ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ براعظم کے دوسرے سرے پر موجود جہاز تک جانے کا کوئی تک نہیں تھا، جب کہ قریبی بندر گاہ مینزانیلو میں موجود جاپانی جہاز میں سوار ہونے کے لئے اگر وہ چاہتے تو پیدل بھی جا سکتے تھے۔ انہوں نے آپس میں پریشان نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے اپنی زبان میں باتیں کرتے رہے۔

انہوں نے جاپانی سفارت خانے کے سیکرٹری سے جو ان کے ہمراہ تھا، مشورہ بھی کیا جس نے مجھ سے کھل کر بات کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔

" دیکھیں اس بحری جہاز کے پہلے پروگرام میں تبدیلی آنے کے باعث یہ اب دوبارہ کبھی مینزانیلو نہیں آئے گا۔ اس لئے ان نمائندہ معززین کو چلی کی بندر گاہ سے جہاز پکڑنا ہو گا۔ "

ایک مبہم سی تصویر میرے ذھن میں چمکی۔ یقیناً یہ کوئی بہت اہم کام ہے۔ میں نے ان کے پاسپورٹ تصاویر، ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کام کے بارے میں تفصیلات طلب کیں اور انہیں اگلے روز آنے کے لئے کہا۔

اس پر وہ متعرض ہوئے، جیسے کہ انہیں ہر قیمت پر ویزا درکار تھا میں وقت چاہتا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ویزا جاری کرنے کا اختیار فی الوقت میرے پاس نہیں، اس پر ہم کل بات کریں گے۔ میں اکیلا رہ گیا تھا۔

آہستہ آہستہ اس پہیلی نے میرے ذھن میں کھلنا شروع کیا۔ آخر شمالی امریکہ سے ایک فوری پرواز اور پھر ویزا حاصل کرنے کے لئے اس قدر دباؤ کا کیا مطلب ہے؟ اور آخر تیس برسوں میں پہلی بار جاپانی بحری جہاز اپنا رستہ کیوں بدل رہا ہے؟ اس کا مطلب کیا ہے؟

تب مجھ پر یہ واضح ہوا۔ بیشک یہ بہت ضروری معلومات سے آگاہ ایک گروہ تھا۔ جاپانی جاسوس، جو فوری طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے نکل جانا چاہتے تھے۔ کیونکہ شاید کوئی بہت اہم بات ہونے والی تھی۔ اور یہ سوائے جاپان کے جنگ میں کودنے کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میری کہانی میں جاپانی راز میں تھے۔ جس نتیجے پر میں پہنچا، اس نے مجھے بے حد مضطرب کر دیا تھا میں کیا کر سکتا تھا؟ میکسیکو میں شمالی امریکہ کے اتحادیوں یا انگریزوں کے نمائندوں سے میں واقف نہ تھا۔ میں تو بس ڈیگال کے ان نمائندوں کو جانتا تھا جن کی رسائی میکسیکو کی حکومت تک تھی۔ میں نے فوری طور پر ان سے رابطہ کیا۔ اور انہیں ساری صورت حال سمجھائی۔ میرے پاس ان جاپانیوں کے نام اور ضروری معلومات موجود تھیں۔ اگر فرانسیسی کسی قدم کے اٹھانے کا فیصلہ کرتے ہیں تو جاپانی پھنس جائیں گے۔ میں نے اپنا نقطہ نظر پہلے تو عجلت کے ساتھ ان کے سامنے پیش کیا۔ اور پھر یہی بات ڈیگال کے ان نمائندوں سے بھی کی جو اس بارے میں بے گانہ رویئے کے مالک تھے۔

"جوان سفارت کارو۔ تمہارے لئے یہ سنہری موقع ہے کہ تم خود کو فتح سے ہمکنار کرو اور جاپانی جاسوسوں کے راز سے پردہ اٹھاؤ___ جہاں تک میرا تعلق ہے میں انہیں ویزا نہ دوں گا، لیکن تم لوگوں کو فوری فیصلہ کرنا ہو گا۔

یہ بے بساط اور متحرک کھیل دو دن تک جاری رہا۔ سوسیٹلے نے اس مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ وہ کچھ بھی نہ کریں گے اور میں چلی کے قونصل کی حیثیت سے اس سے زیادہ کچھ کر نہ سکتا

تھا۔

چونکہ میں نے انہیں ویزا دینے سے انکار کر دیا تھا، جاپانیوں نے فوراً سفارتی پاسپورٹ بحال کئے اور چلی کے سفارت خانے پہنچ گئے جہاں سے انہیں بروقت (Tocopilla) کی بندگاہ پر موجود بحری جہاز تک پہنچنے کا موقع مل گیا۔
ایک ہفتے کے بعد ساری دنیا نے (Pearl Harbor) پرل ہاربر پر بمباری کی خبر کو سن لیا تھا۔

میں مالاکولوجسٹ کی حیثیت سے

برسوں پہلے چلی کے ایک اخبار میں میرے ایک اچھے دوست، نامی گرامی پروفیسر (Julian Huxley) جولین ہکسلے کے بارے میں ایک کہانی شائع ہوئی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ پروفیسر موصوف نے سانتیاگو کے ہوائی اڈے پر اتر کر میرے بارے میں دریافت کیا تھا، جس پر صحافی نے اس سے پوچھا کیا شاعر نرودا؟
نہیں میں کسی نرودا شاعر کو نہیں جانتا، میں تو نرودا مالاکولوجسٹ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔
لفظ Malacologist) ایک یونانی لفظ ہے جس کا مطلب (Mollusks) میں خصوصی امتیاز رکھنا ہے۔
اس کہانی سے، جو مجھے تنگ کرنے کی خاطر شائع کی گئی تھی/ میں بہت محظوظ ہوا۔ حقیقت میں ایسا سچ نہ ہو سکتا تھا کیونکہ جس ہکسلے سے میں واقف تھا وہ اپنے معروف بھائی Aldous) (Huxley آلڈس ہکسلے کے مقابلے میں ایک بہت ہی ذہین فطین اور بذلہ سنج شخص تھا۔
میکسیکو میں، میں نے ساحلوں پر آوارہ گردی کی۔ شفاف متعدل پانیوں میں غوطے لگائے۔ بعد میں کیوبا اور دوسری جگہوں سے تحائف وصول کئے اور خریدے (ایمان دار جمع کرنے والا، نام کی کوئی شے نہیں ہوتی) بتدریج میرے سمندری خزانوں نے گھر کے متعدد کمروں کو بھر دیا میرے پاس چین، فلپائین، جاپان اور بالٹک کے سمندروں سے حاصل کئے گئے انمول نمونے موجود تھے۔ انٹارٹک کی چکر دار سیپیاں اور کیوبا سے (Polimytan) کربئین رقصاؤں کی مانند رنگ کی ہوئی۔ سرخ، زعفرانی، نیلے اور کاسنی رنگوں میں ملبوس سیپیاں۔
چند بے حد نادر نمونوں میں سے ایک، جو میرے پاس نہ تھا، جس کا مجھے اعتراف ہے، وہ برازیل کے Motocrosso کا زمینی سنیل، تھا جسے میں نے ایک بار دیکھا، مگر میں خرید نہ سکا اور

دوبارہ جنگل میں جاکر اسے حاصل کرنے کا اتفاق نہ ہوا۔ اس کا رنگ مکمل سبز تھا بالکل کسی نئے زمرد کی مانند۔ میں ایک ایسا حریص جمع کرنے والا بن چکا تھا کہ میں دور دراز سمندروں تک بھی گیا۔ میرے دوستوں نے میرے لئے سیپیاں اور سنیل اکٹھے کرنے شروع کر دیئے۔ جب میں تقریباً پندرہ ہزار سیپیاں اکٹھی کر چکا تو میرے شیلف ان سے بھر گئے۔ لیکن وہ اتنی زیادہ ہو گئی تھیں کہ کرسیوں، میزوں سے نیچے گرنے لگیں۔ (Conchology) اور (Malacology) پر کتابوں نے میری لائبریری کو اٹاٹٹ کر دیا تو ایک روز میں نے اپنا سارا جمع جتھہ بڑی بڑی پیٹیوؤں میں اکٹھا کیا اور یونیورسٹی کے لئے چل پڑا ــــ اپنی ابتدائی درسگاہ کے لئے میرا پہلا عطیہ اس وقت تک میرے مجموعے کی خاصی شہرت ہو چکی تھی۔ کسی بھی جنوبی امریکہ کے ادارے کی طرح میری یونیورسٹی نے اس عطیئے کو تعریف و توصیف کے ساتھ وصول کیا اور اسے ایک تہہ خانے میں دفن کر دیا۔ تب سے اسے کسی نے نہیں دیکھا۔

آراکینیا (Araucania)

جب میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں آرکی پلاگو کے دور دراز جزیروں میں تھا تو سمندر مجھ سے ہم کلام ہوتا اور خاموش دنیا، جو اشیاء سے بھری ہوئی تھی میری تنہائی سے باتیں کرتی لیکن سرد اور گرم جنگیں، قونصلر کی ملازمت کو خراب کرتیں اور بتدریج ہر قونصل ایک شخصیت کے بغیر، حتیٰ کہ خود اپنی ذات کے لئے بھی فیصلہ نہ کرنے کی حالت میں محض ایک خود کار مشین بن جاتا اور یوں اس کا کام مشکوک حد تک پولیس کے کام سے ملنے لگتا۔

وزارت نے مجھے تارکین وطن افریقیوں، ایشیائیوں اور یہودیوں کے بارے میں اس سے قبل کہ وہ چلی میں داخل ہوتے، ان کے بنیادی مذہبی اعتقادات کی چھان بین کے لئے کہا۔

یہ حماقت اس حد تک بڑھ گئی کہ میں بھی اس کا شکار ہو گیا جب میں نے کسی سرکاری مدد کے بغیر ایک بے حد خوبصورت رسالے کو آراکینیا کے نام سے شروع کیا۔ رسالے کے سرورق پر میں نے ایک خوبصورت "آراکینین" کی دانت نکال کر مسکراتی ہوئی تصویر لگائی تھی جس کے لئے وزیر خارجہ کو مجھے سرزنش کرنے کی ضرورت پڑ گئی، کیونکہ یہ اس کے خیال میں انتہائی پست بات تھی۔ باوجودیکہ ڈان پیڈرو جس کا خوش نما اور شریف چہرہ ہماری مخلوط نسل کے تمام تاثرات کو لئے ہوئے تھا، لیکن وہ چلی کی جمہوریہ کا صدر بھی تھا۔

یہ بات سب کے علم میں ہے کہ آراکینیا کے عوام کو بالاخر دبا دیا گیا تھا اور آہستہ آہستہ وہاں کے لوگ یا بھلا دیئے گئے یا فتح کر لئے گئے مزید بر آں تاریخ کو یا فاتحین لکھتے ہیں یا پھر وہ لوگ جو

فتح کی لوٹ مار سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ آراکنین کے مقابلے میں کچھ ہی نسلیں قابل ذکر ہوں گی۔ کسی دن ہم آراکنین کی درسگاہیں دیکھیں گے ان کی زبان میں کتابیں چھپیں گی اور تب ہم اندازہ کریں گے کہ ان کی سچائی، خالص پن اور آتش فشانی قوت کو ہم نے کس قدر کھویا ہے۔
جنوبی امریکہ کے کچھ ملکوں کی نسلی بکواسیات، جو کہ بذات خود بہت سی قوموں اور مخلوط نسلوں کے بہم ہونے کا نتیجہ ہے نو آبادیاتی نظام کا گناہ ہے۔ وہ دراصل ایک ایسا پلیٹ فارم بنانا چاہتے ہیں، جہاں سے گوری رنگت والے مٹھی بھر منافق آریاؤں یا بناوٹی سیاحوں سے مخاطب ہو سکیں۔

یہ سب ایک قصہ پارنہ بن رہا ہے اور جلد ہی اقوام متحدہ سیاہ اور منگول نمائندوں سے بھر رہا ہے۔ جوں جوں ذہانت کا پودا بڑھتا ہے، تمام نسلوں کی کونپلیں اپنے رنگ کو پتوں میں ظاہر کرتی ہیں ایک روز میں نے تنگ آکر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے قونصل جنرل کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

سحر اور اسرار

علاوہ ازیں، میں نے محسوس کیا کہ میکسیکو کی دبی کچلی، جوشیلی قومیت کے جذبے سے سرشار دنیا نو آبادیاتی نظام سے پہلے کی معاشرتی حالت میں تھی، جو میری موجودگی یا میری مرضی کے بغیر چلتی رہے گی جب میں نے وطن واپسی کا ارادہ کر لیا، تو اس وقت میں میکسیکو کی زندگی کو کم سمجھ سکا، بہ نسبت اس وقت کے جب میں میکسیکو میں آیا تھا۔ فنون لطیفہ اور ادب مخالف گروہوں میں پھلا پھولا، لیکن خدا بچائے کسی بھی اجنبی کو، جس نے کسی بھی شخص کا ساتھ دے دیا تو سب مل کر اس کے مخالف ہو گئے۔

جب میں میکسیکو سے جانے والا تھا تو میرے اعزاز میں ایک بہت بڑی عوامی ریلی کا انعقاد ہوا۔ کھانے کی دعوت میں کم از کم تین ہزار لوگ مدعو تھے۔ یہاں ان سینکڑوں کا ذکر نہ ہو گا، جو اندر داخل نہ ہو سکے بہت سے ممالک کے صدور نے مبارک باد کے پیغامات بھیجے۔
اس سب کے باوجود میکسیکو امریکہ کا پہلا قدم ہے اور یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ قدیم امریکہ کا شمسی کلینڈر، جو روشنی، دانائی اور اسرار کا نقطہ انتقال تھا یہیں کھودا گیا تھا۔ سب کچھ ہو سکتا تھا، اور وہاں سب کچھ ہوا۔

حزب اختلاف کا واحد روزنامہ، حکومت کی مدد سے چلتا تھا یہ استبدادی طرز جمہوریت کی انتہا تھی، جس کے بارے میں قیاس کیا جا سکتا ہے۔

مجھے ایک دردناک واقعہ یاد آتا ہے، جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا کسی فیکٹری میں ایک ہڑتال چل رہی تھی، جس کا کوئی حل نظر نہ آتا تھا ہڑتالیوں کی بیویوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اکٹھی ہو کر صدر سے ملیں گی اور اپنی تکالیف بتائیں گی۔ یقیناً ان کے پاس اسلحہ نہ تھا۔ راستے سے انہوں نے کچھ پھول خریدے تاکہ صدر مملکت اور ان کی اہلیہ کو پیش کریں ایک محافظ نے ان عورتوں کو صدارتی محل میں داخل ہوتے ہوئے روکا اور آگے جانے سے منع کر دیا۔ صدر ان سے ملاقات نہیں کرے گا اس کے لئے انہیں متعلقہ حکومتی ادارے سے رجوع کرنا ہو گا۔ انہیں فوری طور پر اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہئے۔ یہ ایک دھمکی تھی۔

عورتوں نے اپنے معاملے کی وضاحت کی اور کسی بھی قسم کی دشواری کے نہ ہونے کا یقین دلایا۔ وہ تو بس یہ چاہتی ہیں کہ صدر کو پھول پیش کریں اور اس سے درخواست کریں کہ وہ اس ہڑتال کو ختم کرانے کے لئے کچھ کر سکے۔ ان کے بچے بھوکے ہیں اور کب تک وہ ایسے رہیں گے، محافظوں کے افسر نے کسی بھی پیغام کو اوپر پہنچانے سے انکار کر دیا۔ اور عورتوں کو نہ جانے دیا۔۔۔ اس کے بعد محل کے محافظوں کی جانب سے گولیوں کی بوچھار نے ہوا کو چھلنی کر دیا۔ چھ یا سات عورتیں وہیں موقع پر مر گئیں اور لاتعداد زخمی ہوئیں اگلے دن جنازے کا جلوس نکلا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان عورتوں کے سوگ میں، تابوتوں کے ہمراہ بہت بڑا ہجوم ہو گا، لیکن بہت کم لوگ جنازے میں شامل ہوئے۔ البتہ یونین کے لیڈر نے ایک تقریر کی وہ ایک، مشہور انقلابی جانا جاتا تھا۔ اگلے روز میں نے اس کی تقریر کا سارا متن اخبار میں پڑھا لیکن اس میں ایک سطر میں بھی غم و غصے کا اظہار نہ تھا اور نہ ہی یہ خواہش کی گئی تھی کہ اس سانحے کے ذمہ دار لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ دو ہفتے بعد کسی نے اس خونی ڈرامے کا ذکر تک نہ کیا۔ اور نہ ہی بعد میں میں نے کسی تحریر میں اس واقعہ کا ذکر کبھی پڑھا صدر ایک (Aztec) فرماں روا تھا، جو برطانوی شاہی خاندان کے مقابلے میں ہزار گناہ زیادہ اچھوت تھا۔ کوئی بھی اخبار اس کی حیثیت پر اتفاقی طور سے یا سنجیدہ انداز میں گزند اٹھائے بغیر تنقید نہیں کر سکتا تھا۔

میکسیکو کے ڈرامے اس قدر حسین ملبوسات میں پیش کئے جاتے کہ اس میں موجود تمثال گری کو دیکھنے والا بے خود ہو جاتا۔۔۔ وہ تمثیل جو روزمرہ کی زندگی اور لہو کی دھڑکن سے کہیں دور ہوتی ہے۔ فلسفی مرصع ہو چکے ہیں اور وجودیت کے ایسے اظہار میں نمایاں ہیں جو کسی آتش فشاں کے تلے حماقت دکھائی دیتا ہے۔ شہری عمل مشکل اور رک رک کر چلتا ہے۔ تخت کے اردگرد سپردگی ہر رخ پر نمایاں نظر آتی ہے۔ ہر وضع کا سحر میکسیکو میں نظر آتا ہے جو اوجھل ہوتا ہے پھر دوبارہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس آتش فشاں سے جو کسان کی آنکھوں کے سامنے اس کے مختصر سے

باغیچے میں اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب کہ وہ مٹر کی کاشت کر رہا تھا۔ (Cortes) کے ڈھانچے کی اس وحشیانہ تلاش کے دوران، جس کے بارے میں یہ افواہ ہے کہ وہ میکسیکو کی زمین میں اپنے اطلسی خود کے ہمراہ ان تمام صدیوں میں (Conquistador) (وہ ہسپانوی فاتحین جنہوں نے سولہویں صدی میں میکسیکو اور پیرو کو زیرِ نگیں کیا) کی کھوپڑی کو آرام پہنچانے کی خاطر خوابیدہ ہے۔ صدیوں پہلے سے گمشدہ، وہ کبھی یہاں کبھی وہاں نمودار ہوتے ہیں، راز رکھنے والے انڈین قبائل کی حفاظت میں محض اس لئے کہ وقتاً فوقتاً ایک گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوب جائیں۔

میکسیکو میری ذات میں ایک بے راہ شاہین کی مانند میری رگوں میں چکر لگاتا ہے، محض موت ہی اس کے پروں کو میرے خوابیدہ سیاہی کے دل پر تہہ کرے گی۔

آٹھواں باب

تاریکی میں میرا وطن

ماشوپشو (Maccho Picchu)

وزارت نے رضاکارانہ طور پر دیئے گئے میرے استعفیٰ کو قبول کرنے میں مطلق دیر نہ لگائی۔ اپنی سفارت کارانہ خودکشی سے، جس نے مجھے چلی واپس جانے کے قابل بنایا، میں بے حد خوش تھا۔ میرے خیال میں انسان کو اپنے ملک میں رہنا چاہئے اور میں سوچتا ہوں کہ نسل انسانی کی بے توقیری، کسی نہ کسی طریقے سے روح کی روشنی کو روکتے ہوئے مایوسی پر منتج ہوتی ہے میں صرف اپنے ملک میں رہ سکتا ہوں۔ میں اپنے ہاتھوں، پیروں کو اس پر رکھے بغیر اور اپنے کان اس سے لگائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کے پانیوں کی حرکت اور اس کے سایوں کو محسوس کئے بغیر، اپنی جڑوں کو اس کی مٹی کی گہرائی میں محسوس کئے بغیر اور ماں جیسی توانائی حاصل کئے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔

لیکن چلی واپس جانے سے پہلے، میں نے ایک نئی دریافت کی جس نے میری شاعری کی نشوونما میں ایک نئی پرت کا اضافہ کیا میں پیرو Peru) میں رک گیا اور ماشوپشو کے کھنڈرات تک سفر کیا۔ اس زمانے میں کوئی شاہراہ نہیں تھی اور ہم نے یہ سفر گھوڑوں کی پشت پر طے کیا۔ اوپر بلندی پر، میں نے پتھر کی قدیم تعمیرات دیکھیں جو کوہ اینڈیز کی بلند و بالا چوٹیوں کے حصار میں گھری ہوئی تھیں۔ صدیوں پرانے، موسموں کی مار کھائے ہوئے قلعہ میں سے گزرتے ہوئے طوفانی چشمے بہہ رہے تھے دریائے وکیامایاؤ سے سفید دھند کے بادل اٹھ رہے تھے۔ اس ویران اور تنہا دنیا میں چٹانوں کے عین وسط میں ـــــ بلند و بالا متبکر چٹانیں جن سے میرا تعلق تھا ـــــ میں خود کو بے حد حقیر

محسوس کر رہا تھا مجھے یوں لگا، جیسے میں نے خود اپنے ہاتھوں سے کہیں دور کسی پرانے وقت میں کھائیاں کھود کر چٹانوں کو چمکانے کی محنت کی ہے مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے میں چلی کا پیرو کا، یا امریکہ کا باشندہ ہوں ان دشوار گزار بلندیوں پر موجود شاندار منہدم بکھرے آثار کے درمیان میں نے عقیدے کے بنیادی اصول دریافت کئے کہ مجھے شاعری کو جاری رکھنا چاہیئے۔ میری نظم (The Heights of Maccho Picchu) نے یہیں جنم لیا تھا۔

نائیٹریٹ کا میدان

۱۹۴۳ء کے اختتام کے قریب، میں ایک بار پھر سانتیا گو گیا تھا یہاں ایک گھر میں، جسے میں نے قسط وار پروگرام کے تحت خریدا تھا، مقیم ہو گیا اور پھر سے دشوار زندگی شروع کر دی۔ ایک بار پھر میں نے اپنے ملک کی خوبصورتی کو دیکھا۔ اس کی عورتوں کا حسن فطرت کی سحر انگیز دلکشی، اپنے ساتھیوں کا کام اور اپنے ملک کے لوگوں کی ذہانت ـــــ ملک بالکل نہیں بدلا تھا۔

کھیت اور خوابیدہ دیہات، کان کنی کے علاقوں میں حوصلہ شکن غربت ـــــ ملک کے کلبوں میں نفیس لوگوں کی بھیڑ ـــــ مجھے فیصلہ کرنا ہو گا۔

میرے فیصلے نے میرے لئے دہشت زدگی اور کامیابی کے لمحات پیدا کئے کیا شاعران پر افسوس کر سکتا تھا؟

(Curizo Malaparte) کیوریزو میلاپارٹ، جس نے چند سال کے بعد میرا انٹرویو لیا تھا، اس نے اپنے مضمون میں کہا تھا۔

"میں اشتراکی نہیں ہوں، لیکن اگر میں چلی کا شاعر ہوتا تو میں پابلو نرودا کی طرح ہوتا ـــــ آپ کو تائید کرنی پڑے گی کیڈلاک کاروں کی یا ان لوگوں کی جن کے پاس پہننے کو جوتے نہیں اور پڑھنے کے لئے اسکول نہیں"

بغیر جوتوں اور اسکول کے عوام نے مجھے ۴ مارچ ۱۹۴۵ء کو سینیٹر منتخب کر لیا۔ میں ہمیشہ اس حقیقت کا اعتراف فخر سے کرتے ہوئے محظوظ ہوں گا کہ چلی کے سب سے غیر مہمان نواز حصے، جس میں تانبے اور نائیٹریٹ کی کانوں کا علاقہ شامل ہے۔ یہاں کے لوگوں نے مجھے اپنا ووٹ دیا۔ اس میدانی علاقے میں چلنا بے حد دشوار اور محنت طلب تھا۔ یہاں نصف صدی سے بارش نہیں ہوئی تھی اور صحرا کے کان کنوں کے چہروں پر موسم نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں، جن کے نقوش جلے ہوئے ہیں۔ ان کی تنہائی اور بے توجہی، جوان کا مقدر ہے، ان کی گہری سیاہ آنکھوں میں بسی ہوئی ہے۔ صحرا سے پہاڑوں کی طرف جاتے ہوئے کسی بھی ضرورت مند گھر میں

داخل ہو کر یہ جانتے ہوئے کہ یہ لوگ کس حد تک غیر انسانی انداز میں محنت کرتے ہیں اور محض یہ احساس کہ ان الگ تھلگ مایوس انسانوں کی امیدیں تم سے وابستہ ہیں، کوئی معمولی ذمہ داری نہیں۔ میری شاعری نے رابطے کا وسیلہ بنایا اور میرے لئے یہ ممکن کیا کہ میں ان کے درمیان چلوں پھروں اور اپنے ان ہم وطنوں کے لئے جو اس قدر کٹھن زندگی گزارتے ہیں، عمر بھر کو ایک بھائی کی طرح قبول کیا جاؤں۔

مجھے معلوم نہیں کہ یہ پیرس تھا یا پراگ، جہاں میں اپنے دوستوں کے انسیکا ئیلو پیڈک علم کے بارے میں شک میں مبتلا ہو گیا تھا ان میں سے زیادہ تر ادیب تھے اور باقی طالب علم۔

"ہم چلی کے بارے میں بہت باتیں کر رہے ہیں۔" میں نے ان سے کہا اور یہ شاید اس لئے کہ میں چلی کا رہنے والا ہوں، لیکن کیا تم میں سے کوئی بھی میرے ملک کے بارے میں، جو یہاں سے بہت دور ہے کچھ جانتا ہے۔ مثال کے طور پر سواری کے لئے ہم کیا استعمال کرتے ہیں؟ ہاتھی، کار، ریل گاڑی، ہوائی جہاز، بائیسکل، اونٹ یا سلیج؟

ان میں سے بیشتر نے فوراً جواب دیا ـــــ "ہاتھی"

چلی میں ہاتھی یا اونٹ نہیں ہوتے، لیکن میں دیکھ سکتا ہوں کہ کوئی ملک کس قدر مہمل ہو سکتا ہے، جو منجمد قطب جنوبی سے شروع ہو کر اوپر کی طرف نمک کی کانوں اور ان صحراؤں تک چلا جائے، جہاں نہ جانے کب سے بارش ہی نہیں ہوئی۔ ان ویرانوں کے لاتعداد باسیوں کے لئے جنھوں نے کبھی سفید کالر کی قمیض نہیں پہنی تھی، ٹائی نہیں لگائی تھی اور نائٹریٹ اور تانبے کی کانوں میں کام کرنے والوں کے نمائندے کے بطور ایک منتخب سنیٹر کی حیثیت سے، ان صحراؤں میں، مجھے برسوں سفر کرنا تھا۔

ان زیریں میدانوں میں آنا، جن کے سامنے ریت کی پھیلی ہوئی بے کراں وسعتیں ہیں، بالکل چاند تک پہنچنے کے مترادف ہے یہ علاقہ جو ایک خالی سیارے کی مانند نظر آتا ہے میرے ملک کی بے پناہ دولت کا امین ہے، لیکن سفید کھاد اور سرخ معدنیات کو پہاڑوں کے پتھروں اور صحرائی زمین سے نکالنا ہو گا دنیا میں کم جگہیں ایسی ہیں، جہاں زندگی اس قدر بے مہر اور ناقابل زیست ہو ـــــ یہاں تک پانی کا پہنچانا، کسی پودے کو پانی دینا کہ وہ ایک مسکین پھول دے سکے، کسی کتے، خرگوش، سوؤر کو پانی پلانا ناقابل بیان قربانیوں کا محتاج ہے۔

میرا تعلق جمہوریہ کے دوسرے سرے سے ہے۔ میں گھنے سرسبز جنگلات کے علاقے میں پیدا ہوا تھا، میرا بچپن بارش اور برف سے بھرا ہے۔ صرف اس قبری صحرا کو دیکھ لینا ہی میری زندگی میں ایک بہت بڑا موڑ تھا۔ پارلیمنٹ میں ان لوگوں کی تنہائی ان کی عظیم زمین کی نمائندگی کرنا ایک

مشکل مرحلہ تھا۔ پانی کے قطرے اور کسی پیڑ کے بغیر برہنہ زمین ہاتھ میں نہ آنے والا ایک بہت بڑا اسرار ہے دریاؤں کے ساتھ ساتھ جنگلوں میں ہر شے انسان سے ہم کلام ہوتی ہے۔ دوسری طرف صحرا ایک لاتعلقی دکھاتا ہے۔ میں اس کی زبان یا اس کی خاموشی کو کبھی نہیں سمجھ سکا۔

کئی برس کے عرصے میں انہی میدانوں میں نائیٹریٹ کی کارپوریشنیں بنیں، ریاستیں یا سلطنتیں وجود میں آئیں۔ برطانوی، جرمن اور ہر قسم کے حملہ آوروں نے ان زرخیز خطوں کو اپنے قابو میں کیا، اور انہیں مختلف کمپنیوں کا نام دیا۔ انہوں نے اپنے سکے کو جاری کیا عوام کے کسی قسم کے اجتماع کو روکا گیا۔ سیاسی پارٹیوں، عوامی چھاپہ خانوں کو ممنوع قرار دیا۔ آپ ان علاقوں میں خصوصی اجازت ناموں کے بغیر داخل نہیں ہو سکتے تھے، جو درحقیقت بہت ہی کم لوگ حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک سہ پہر کو میں نے (Maria Elena) ماریا ایلینا کی پوٹاشیم نائیٹریٹ کی کان میں واقع مشین شاپ میں مزدوروں سے بات چیت کی۔ بڑی ورکشاپ کا فرش ہمیشہ کی طرح تیزاب، پانی اور تیل کی آمیزش سے چمکتا تھا۔ یونین کے لیڈر میرے ہمراہ لکڑی کے اس تختے پر چلتے رہے، جو ہمیں دلدل سے دور کرتا تھا۔ یہ "تختے" مجھے بتایا گیا "ہمیں مسلسل پندرہ ہڑتالوں کے بعد میسر آئے ہیں۔ ہڑتالوں کا عرصہ آٹھ سالوں پر پھیلا ہوا ہے، جن میں سات ہڑتالی مزدور موت کے گھاٹ اتر گئے" یہ اموات اس وقت ہوئیں، جب کمپنی کی پرائیوٹ پولیس، ہڑتال کے دوران سات مزدور لیڈروں کو پکڑ کر لے گئی تھی۔ سپاہی گھوڑوں پر سوار ہوتے، جب کہ مزدور رسوں میں بندھے ان کے پیچھے پیچھے ریت کے پھیلے ہوئے لق و دق صحرا میں پیدل چلتے۔ ان کو مارنے کے لئے محض چند گولیاں چلتیں۔ ان کی لاشوں کو صحرا میں سورج تلے، اور ٹھنڈ میں پڑے رہنے دیا جاتا، حتیٰ کہ ان کے دوسرے مزدور ساتھی انہیں اٹھا کر دفنا دیتے۔

برسوں پہلے حالات اس سے کہیں بدتر تھے۔ مثال کے طور پر ۱۹۰۶ء میں نائٹریٹ کے کان کن اپنے مطالبات براہ راست حکومت تک پہنچانے کے لئے (Iquique) کے شہر تک گئے تھے۔ سفر کے تھکے ماندے کئی ہزار مرد شہر کے چوک میں اسکول کے سامنے آرام کرنے کی خاطر جمع ہو گئے۔ صبح کو انہیں گورنر کے سامنے اپنے مطالبات کے ساتھ حاضر ہونا تھا لیکن اس کا انہیں کبھی موقع نہ ملا۔ صبح سورج نکلنے پر سپاہیوں نے کرنل کی سربراہی میں چوک کا محاصرہ کر لیا اور بغیر کچھ کہے گولیاں چلائی اور لوگوں کو مارنا شروع کر دیا اس قتل و غارت گری میں چھ ہزار سے زیادہ لوگ مر گئے تھے۔ ۱۹۶۵ء میں حالات کچھ بہتر ہوئے لیکن مجھے یوں لگا کہ ان دنوں جب لوگوں کو ملازمتوں سے نکال دیا گیا تھا، وہی لوگ واپس آ رہے تھے۔ مثلاً ایک بار مجھے مزدوروں

کے اجتماع سے یونین کے ہال میں خطاب کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ میں ان سب مزدوروں کو ہال سے باہر نکال کر صحرا کے وسط میں لے گیا، جہاں میں نے انہیں صورت حال کے بارے میں سمجھانا شروع کیا، تاکہ اس جھگڑے سے کسی ممکنہ بہتری کو نکالا جا سکے۔ ہماری تعداد دو سو کے قریب تھی۔ اچانک میں نے موٹروں کے آنے کا شور سنا اور ایک فوجی ٹینک کو اپنے آپ سے چار یا چھ میٹر کے فاصلے پر آتے دیکھا۔ ٹینک کا ڈھکنا کھلا اور ایک مشین گن سوراخ سے بر آمد ہوئی جس کا رخ میری جانب تھا۔ پھر مشین گن کے بالکل نزدیک ایک افسر کو کھڑے پایا جس کے رویئے میں موت کی خاموشی تھی۔ میری تقریر کے دوران وہ مسلسل مجھے گھورتا رہا اور بس اس کے بعد بات ختم ہو گئی۔

محنت کشوں کی کثیر تعداد ان پڑھ تھی اور اشتراکیوں پر ان کے اعتقاد کی وجہ (Luis Em ilio) لوئیس امیوئیلو تھا جس نے اپنی جدوجہد کا آغاز اس صحرائی علاقے سے کیا تھا۔ وہ ایک سادہ محنت کش جھگڑالو اور پرانے انتشار پسند سے ایک قد آور اور عظیم حقیقت بن گیا تھا۔ اس نے سارے ملک کو یونینوں اور فیڈریشنوں سے بھر دیا تھا۔ بتدریج اس نے پندرہ سے زیادہ اخبارات شائع کئے جو سب کے سب ان نئی تنظیموں سے منسوب تھے، جن کی بنا خود اس نے ڈالی تھی یہ سب کچھ کسی پیسے کے بغیر تھا۔ بعد میں محنت کشوں میں بڑھتے ہوئے شعور کے باعث شکریئے کے ساتھ پیسہ جمع کیا گیا۔

مجھے اس کے چھاپہ خانوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، جو چالیس برس بعد بھی اسی تندہی سے کام کر رہے تھے۔ ان میں بعض چھاپہ خانے پولیس نے بری طرح سے توڑ ڈالے تھے، جن کی مرمت کی جا چکی تھی۔ بڑے بڑے زخموں کے نشانات کو بہت محبت سے کی گئی تعمیر میں بھی دیکھا جا سکتا تھا ان طویل دوروں کے دوران، میں سیدھے سادے گھروں اور صحرانشینوں کے جھونپڑوں میں رہنے کا عادی ہو چکا تھا۔ کمپنی کے دروازوں پر میرے استقبال کے لئے بینر اور جھنڈے اٹھائے ہوئے لوگوں کی بھیڑ موجود ہوتی۔ پھر مجھے وہ جگہ دکھائی جاتی، جہاں مجھے ٹھہرنا ہوتا۔ سارا سارا دن میری رہائش گاہ پر مردوں اور عورتوں کی بھیڑ رہتی، جو اپنے ذاتی مسائل اور کام سے متعلق حالات کی شکایات لے کر میرے پاس آتے۔ بسا اوقات ان کی شکایتیں غیر ملکی لوگوں کی نظر میں خاصی مضحکہ خیز اور دلچسپ نوعیت کی ہوتیں مثلاً چائے کی غیر فراہمی، کسی بھی ہڑتال کو ہوا دے دیتی، جس کے نتائج خاصے سنجیدہ ہوتے۔

کیا اس قسم کی مخصوص برطانوی ضروریات کا ایسے دور افتادہ ویران علاقے میں سوچنا بھی ممکن ہے؟

درحقیقت چلی کے لوگ دن میں کئی بار چائے پیئے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ بعض ننگے پیر کام کرنے والے مزدوروں نے مجھ سے ناراض ہوتے ہوئے سوال کیا تھا "کہ آخر ایسا نشہ آور اور ناگزیر مشروب عنقا کیوں ہے؟۔ اگر ہم اسے نہیں پیتے تو ہمارے سروں میں اذیت ناک درد شروع ہو جاتا ہے۔"

ان لوگوں نے ویران ترین علاقے میں تنہا آسمان تلے خود کو خاموشی کی دیواروں میں قید کر رکھا تھا لیکن اس کے باوجود ان میں صحت مند سیاسی تجسس موجود تھا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ یوگو سلاویہ میں کیا ہو رہا ہے؟ چین میں کیا ہو رہا ہے وہ دوسرے سوشلسٹ ممالک میں رونما ہونے والی تبدیلیوں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اطالوی ہڑتالوں کا نتیجہ ـــــ جنگ کی افواہیں دور دراز علاقوں میں ہونے والے انقلابات ایک دوسرے سے خاصے فاصلوں پر مختلف جگہوں میں منعقد ہونے والی ریلیوں میں، میں نے ہر جگہ ایک ہی درخواست سنی کہ میں اپنی نظمیں پڑھوں، اکثر مجھ سے ان کے عنوانات کے بارے میں پوچھا جاتا۔ بیشک، میں نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے سب یا کچھ کو میری نظمیں سمجھ آتی تھیں یا میں اس انتہائی سکوت کے ماحول میں، جس میں تقدس شامل ہوتا وہ مجھے سنتے یہ بتانا مشکل تھا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

ملارمے (Mallarme) اور ہولڈرلین (Holderlin) کی کئی نظمیں ایسی ہیں، جو مجھ جیسا پڑھا لکھا احمق کبھی بھی نہ سمجھ پایا جب کہ میں نے بھی ان کو اسی تقدس کے ساتھ پڑھا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا کہ رات کا کھانا جشن کے انداز میں ہوتا اور ان میدانوں میں مرغ کا اسیٹو تیار کیا جاتا۔ اکثر و بیشتر ہماری پلیٹوں میں سفید چوہوں کا ایسا گوشت ہوتا، جس میں مجھے دانت گاڑنے مشکل ہو جاتے حالات نے اس چھوٹی سی مخلوق کو جیسے لیبارٹریوں میں مرنا پڑتا ہے ایک مقبول عام خوراک بنا دیا تھا۔

بہت سے گھروں میں جہاں میں ٹھہرا، جو بستر مجھے دیا جاتا اس میں دو راہبانہ خصوصیات ضرور ہوتیں۔ برف جیسی چادریں جو اس قدر سخت ہوتیں کہ بذات خود کھڑی ہو جائیں اور ایک ایسی سختی جس کا مقابلہ صرف صحرائی فرش سے کیا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں کو گدے کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ سوائے کچھ سادہ تختوں کے کہ وہ بالکل مسطح ہوتے ـــــ سیدھے لیٹ کر میں کسی بخشے ہوئے انسان کی نیند سو جاتا تھا ان ساتھیوں کی ہمراہی میں، مجھے گہری نیند سونے میں کسی قسم کی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔ دن ایک جلتے ہوئے انگارے کی طرح ہمیشہ خشک ہوتا لیکن رات ایک تاج تلے جس میں بے شمار ستارے جڑے ہوتے، اپنی ٹھنڈک کو صحرا میں بچھا دیتی میری زندگی اور میری شاعری

ایک امریکی دریا کی طرح سے بڑھی ہے چلی کے ایک پر شور چشمے کی مانند، جو جنوب کے پہاڑوں میں جنم لیتا ہے اور جو اپنے بہاؤ میں رستہ بناتے ہوئے سمندر کی جانب رواں رہتا ہے۔ میری شاعری نے کسی بھی شے کو جو اس کے رستہ میں آئی رد نہ کیا۔ اس نے جذبوں اور مستور اسرار کو قبول کیا اور یوں عوام کے دل میں اپنی جگہ بنائی۔ مجھے محبت کرنے اور گانے کے لئے عذاب سہنا اور جدوجہد کرنی پڑی۔ میں نے اپنی دنیاوی کامیابیوں اور ناکامیوں کے حصے حاصل کئے۔ میں نے روٹی اور لہو کو چکھا اس سے زیادہ شاعر کیا چاہ سکتا ہے؟

تمام پسندیدگیاں، آنسو اور بوسے، انسان کی تنہائی اور اخوت میری شاعری میں زندہ ہیں اور اس کا اہم حصہ ہیں کیونکہ میں اپنی شاعری کے لئے زندہ رہا ہوں اور میری شاعری نے ہر اس شے سے توانائی حاصل کی ہے جس کے لئے میں نے جدوجہد کی اور مجھے بہت سے انعامات ملے ہیں—— انعام، جیسے اڑتی ہوئی تتلیاں، زرگل کی طرح بکھر جانے والی —— مجھے ایک بہت بڑا انعام ملا ہے۔ ایک ایسا انعام جسے بہت سے لوگ چاہتے ہیں لیکن اسے پا نہیں سکتے۔ میں ایک دشوار تربیت اور طویل تحقیق کے عمل سے اور لکھے ہوئے لفظ کی بھول بھلیوں سے ہو کر گزرا ہوں تاکہ اپنے عوام کا شاعر بن سکوں یہ میرا انعام ہے—— کتابیں اور نظمیں، جن کا ترجمہ ہوا، یا وہ کتابیں جنہوں نے میرے الفاظ کی چیر پھاڑ کی میرا انعام نہیں ہے میرا انعام وہ لمحاتی لمحہ ہے جب کوئلے کی کان سے ایک انسان سرنگ سے نکل کر آتشیں نائٹریٹ کے میدان میں جلتے ہوئے سورج تلے باہر آتا ہے۔ اس کا چہرہ سخت ترین کام سے بگڑا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں خاک سے متورم ہوتی ہیں اور وہ اپنا کھردرا ہاتھ میری سمت بڑھا کر، جس کی گرہیں اور ریکھائیں کان کنی کے علاقے کے میدان کے نقشے کی مانند ہیں، چمکتی ہوئی آنکھوں سے کہتا ہے "میرے بھائی میں تمہیں عرصہ دراز سے جانتا ہوں۔"

یہ میری شاعری کے انعام کی معراج ہے—— میدان میں وہ تنگ و تاریک، سوراخ، جہاں سے ایک کان کن برآمد ہوتا ہے، جس سے چلی کی ہوا نے رات اور ستاروں نے اکثر کہا ہے۔

"تم تنہا نہیں ہو—— ایک شاعر بھی ہے، جس کے خیالات تمہارے دکھ میں تمہارے ساتھ ہیں۔"

۱۴ر جولائی ۱۹۴۵ء کو میں چلی کی اشتراکی پارٹی کا ممبر رکن بن جاتا ہوں۔

گونزالیز وڈیلا (Gonza'lez Videla)

وہ تلخ باتیں، جو میرے ساتھی اور میں سینیٹ میں زیر بحث لانا چاہتے تھے، انہیں سینٹ تک پہنچنے میں خاصی دشواری ہوئی، سجے ہوئے آرام دہ پارلیمانی کمرے نے ان بے کس ہجوم کی آہوں کو اندر پہنچنے سے روکے رکھا۔ حزب اختلاف میں میرے ساتھی حب الوطنی کے بارے میں عمدہ تقاریر کرنے کے فن میں ماہر تھے۔ اور میں ان کے بچھائے ہوئے بے کار ریشمی صناعی کے جال میں الجھتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

اچانک ہماری امیدیں بر آئیں۔ صدارت کے امیدواروں میں ایک گونزالیزوِیڈیلا نے قسم کھائی کہ وہ صدر بن کر دیکھے گا کہ انصاف کس طرح ہوتا ہے۔ اس کے زور خطابت نے اسے بے حد مقبول کر دیا تھا۔ مجھے اس ساری مہم کا منیجر بنایا گیا اور میں نے یہ اچھی خبر ملک کے ہر حصے تک پہنچا دی۔ عوام نے گونزالیزوِیڈیلا کو بھاری اکثریت سے صدر منتخب کر لیا لیکن ہمارے (Creole) امریکہ میں صدر حضرات غیر متوقع ماہیت قلب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس واقعہ کے بارے میں، جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، نئے سربراہ مملکت نے جلد ہی اپنے دوست بدل لئے اس نے اشرفیہ میں شادی کر لی۔ اور آہستہ آہستہ اپنے جذباتی انداز میں لوگوں کے دل جیتنے والے ناخدا سے مطلق العنان بادشاہ میں تبدیل ہو گیا۔

لیکن گونزالیزوِیڈیلا، جنوبی امریکہ کے مخصوص آمروں کے انداز پر پورا نہیں اترتا تھا۔ بولیویا (Bolivia) کا (Nelgargo) اور وینی زویلا (Venezuela) کے (Gen-Lop ez) کی جڑیں قابل شناخت ہیں۔ ان لوگوں میں کسی حد تک عظمت کی جھلک موجود تھی لیکن یہ کسی حد تک اکیلے پن اور ناقابل تبدیل زبردستی کے ہاتھوں مجبور تھے۔ کم از کم یہ وہ رہنما تھے، جنہوں نے بہادرانہ طور پر گولیوں اور جنگوں کا سامنا کیا تھا۔ گونزالیزوڈیلا دھویں سے بھرے ہوئے سیاسی کمروں کی پیداوار تھا۔ ایک غیر ذمے دار مسخرہ، ایک کمزور انسان، جسے ایک سخت محاذ پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

ہمارے امریکی ماحول میں بڑے آمر دیو قامت تھے جو قبل از تاریخ زمانوں کے عظیم جاگیرداری نظام کی باقیات تھے چلی کا (Judas) محض ایک شوقین غیر منصف آمر تھا جو Saur ian) معیار پر ایک زہریلی چھپکلی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے چلی کو اس قدر خوفناک نقصان پہنچایا تھا کہ ملک سو سال پیچھے کی سمت چلا گیا تھا چلی کے باشندے یہ جانے بغیر کہ سب کیسے ہو گیا، ایک دوسرے کو خفت سے دیکھتے تھے۔ یہ شخص توازن قائم کرنے والا ایک نٹ تھا، جو ہر طرف کھیلتا تھا اس نے کسی طریقے سے بائیں بازو کے شاندار کردار کے لئے رستہ بنا لیا تھا اور جھوٹ کے اس مزاحیہ کھیل میں وہ ایسا غیر متنازعہ ماہر کھلاڑی تھا کہ کوئی اس پر سوال نہیں کرتا۔ ایک ایسے ملک میں

جہاں سیاست دان سنجیدگی کی طرف مائل ہوں یا در حقیقت سنجیدہ ہوں، عوام کرسمس سے پہلے کے غیر سنجیدہ دنوں کا استقبال کرتے اور جب یہ کونگا (Conga) رقاص عین وسط میں اپنا رستہ تبدیل کرتا تو دیر ہو چکی ہوتی جیل خانے سیاسی قیدیوں سے پر تھے اور بیگار کیمپ بنا لئے گئے تھے جیسے کہ (Pisagua) کا بدنام زمانہ کیمپ تھا۔ یوں پورا ملک ایک قومی نمونے کے طور پر پولیس اسٹیٹ بن چکا تھا۔ واحد رستہ جو کھلا تھا وہ اپنے وقت کو اچھے وقت کے لئے استعمال کرنا اور زیر زمین ہو جانا تھا تاکہ اچھے دنوں کی آمد پر لڑا جا سکے۔

گونزالیز ویڈیلا کے بہت سے دوست اور وہ لوگ، جو اس کے الیکشن کی مہم میں ہمراہ رہے تھے، انہیں بلند پہاڑوں پر یا صحرائی جھیلوں میں بھیج دیا گیا تھا۔ کیونکہ وہ گونزالیز کی تبدیلی کو برداشت نہ کر سکے تھے۔ در حقیقت امراء کے طبقے نے جو اس کے ارد گرد تھا اپنی اقتصادی قوت سے ایک بار پھر ہمیشہ کی طرح ہمارے ملک کی حکومت کو ہڑپ کر لیا تھا، لیکن اس مرتبہ نظام ہضم درست نہ تھا اور چلی ایک خراب حالت سے دو چار ہو گیا۔ جو درد اور صدمے کی کیفیت کے مابین تھی۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے تحفظ کے باعث، ہمارے ووٹوں سے منتخب ہونے والا صدر ایک کریہہ، خون آشام چمگادڑ بن چکا تھا۔ اس کے ضمیر نے یقیناً اس کی نیند اڑا دی تھی، حالانکہ گونزالیز ویڈیلا نے اپنے صدارتی محل کے قریب ہی اپنے شہوانی تعیش کی خاطر ذاتی رنڈی خانے بنوائے تھے، جو قالینوں اور آئینوں سے مزین تھے ـــــ قابل توصیف مخلوق کے ذہن میں کجی تھی ـــــ جس شام اس نے اشتراکیوں کے خلاف اپنی عظیم مہم کا آغاز کیا، اسی رات تین مزدور رہنما اس کے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔ کھانے کے بعد جب وہ انہیں چھوڑنے محل کی سیڑھیوں سے نیچے گیا تو ان سے گلے ملتے ہوئے آنسو پونچھ کر کہنے لگا "میں رو رہا ہوں، کیونکہ میں نے تمہاری حراست کا حکم دے دیا ہے جونہی تم باہر نکلو گے، تمہیں گرفتار کر لیا جائے گا اور معلوم نہیں کہ میں تمہیں کبھی دوبارہ دیکھ بھی سکوں گا۔"

ایک جسم جو بٹ گیا

میری تقریروں میں شدت بڑھتی گئی اور سینٹ ہمیشہ مجھے سننے کے لئے بھری رہتی۔ مجھے نکالنے کی کوشش کی گئی، جو پوری ہو گئی اور پولیس کو میری حراست کے احکامات جاری ہو گئے، لیکن ہم شاعروں کے ہاں آگ اور دھوئیں کی خاصی مقدار ہوتی ہے۔

دھواں میری تحریروں میں سما گیا، جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ ڈرامائی طور پر ہمارے قدیم امریکی

مقاصد کے نزدیک تھا. خطرے اور چھپنے کے سال کے دوران میں نے اپنی سب سے اہم کتاب کینتو جنرل (Canto General) کو مکمل کیا تھا۔

ہر روز میں ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہوتا, ہر جگہ کھلے دروازوں نے میرا استقبال کیا۔ یہ ہمیشہ وہ لوگ ہوتے جنہیں میں نہیں جانتا تھا, لیکن پھر بھی وہ مجھے اپنے ہاں چند دن رکھنے کی خواہش رکھتے۔ وہ مجھے چند گھنٹوں یا ہفتوں تک کے لئے سیاسی پناہ دینے کو آمادہ تھے۔ میرا گذر کھیتوں, بندرگاہوں, شہروں اور کیمپوں میں سے ہوا اور میں کسانوں, انجینئروں, وکیلوں, ملاحوں, ڈاکٹروں اور کان کنوں کے گھروں میں ٹھہرا۔

ایک پرانی کہاوت "ایک جسم جو بٹ گیا" ہمارے ملکوں کی عوامی شاعری میں دوبارہ ظاہر ہوتی ہے۔ مقبول گلوکار تصور کرتا ہے کہ اس کے پیر ایک جگہ ہیں اور اس کے گردے کہیں اور ہیں اور یوں وہ اپنے تمام جسم کو بیان کرتا ہے, جو وہ پیچھے چھوڑ آیا ہے, دیہات اور شہروں میں بکھرا ہوا۔۔۔ ان دنوں, ایسا ہی میں نے محسوس کیا۔

قلب کو گرما دینے والی ان جگہوں پر, جہاں میں ٹھہرا, مجھے اب بھی والپاریزیو کی پہاڑیوں میں چھپا ہوا دو کمروں والا گھر یاد ہے۔ کمرے کے ایک حصے میں مجھے رہنا تھا, جہاں ایک کھڑکی کا حصہ تھا جس سے میں بندرگاہ کی گہما گہمی کو دیکھ سکتا تھا۔ اس دیکھنے والے معمولی مینار سے میری آنکھیں گلی کا صرف محدود منظر دیکھ سکتی تھیں۔ رات کے وقت میں لوگوں کی بھیڑ کو گزرتے دیکھتا۔ یہ ایک غریب علاقہ تھا اور تنگ گلی میری کھڑکی سے سو میٹر نیچے سارے ہمسائے کی کل روشنی پر قبضہ رکھتی تھی اس گلی میں چھوٹے چھوٹے اسٹور اور کباڑیوں کی دکانیں تھیں۔

اس کونے میں, جہاں میں پابند تھا, میرے تجسس کی کوئی انتہا نہ تھی ذاتی اندازے اور خیالات, کبھی کبھار تو میں خود کو ایک غیر یقینی کی حالت میں پاتا, مثال کے طور پر راہ چلنے والے چاہے جلدی میں ہوں یا لاتعلق ہمیشہ ایک ہی اسٹور کے سامنے کیوں رکتے ہیں؟ آخر اس شوکیس میں کون سی ایسی دل لبھانے والی شے سجی ہے؟ سارا خاندان اپنے بچوں کو کندھوں پر اٹھائے خاصی خاصی دیر تک کھڑا رہتا۔ جادوئی کھڑکی کو تکتے ہوئے میں ان کے چہرے کے تاثرات کو تو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن تصور ضرور کر سکتا تھا۔ چھ ماہ بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ ایک جوتے کی دکان کا شوکیس تھا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جوتے انسان کی سب سے بڑی دلچسپی ہیں میں مطالعے میں کھو گیا, تحقیق کرنے کے لئے اور اس معاملے کو تحریر کے سپرد کرنے کی خاطر۔ میرے پاس کبھی بھی اتنا وقت نہ تھا کہ اس ارادے کو تکمیل تک پہنچاتا۔ جو ان بے تکے حالات میں اس وعدے نے کیا اس کے باوجود کچھ جوتے میرے شاعری میں جگہ پا چکے ہیں, وہ میری کئی سطروں میں چاپ پیدا کرتے ہوئے اپنا رستہ

بناتے ہیں، حالانکہ میں نے شعوری طور پر کبھی بھی جوتوں کا ذکر اپنی نظموں میں نہیں کرنا چاہا۔
ملاقاتی کسی گھر پر اچانک رک جاتے اور طویل گفتگو میں کھو جاتے. یہ بات کبھی ان کے ذہنوں میں نہ آئی کہ نزدیک ہی محض ایک پتلے سے کارڈ بورڈ کی دوسری جانب ایک شاعر موجود ہے جس کی تلاش میں خدا جانے انسانوں کا شکار کرنے والے کتنے ہی پیشہ ور لگے ہوئے ہیں ہفتہ اور اتوار کی سہ پہروں اور صبحوں کو خاندان کی لڑکیوں میں سے ایک کا محبوب گھر آتا۔ وہ ایک محنت کش جوان تھا. لڑکی کا دل اس کے پاس تھا لیکن ابھی تک وہ باقی گھر والوں کو اپنے اعتماد میں نہ لے سکا تھا۔ میں سوراخ سے اسے ایک طویل راستے سے ہو کر آتے اور سائیکل سے اترتے ہوئے دیکھتا. تھوڑی ہی دیر میں وہ سیٹی میں ایک دھن بجاتا ہوا گھر میں داخل ہوتا۔ میرے سکون کے لئے وہ ایک دھمکی تھا۔ دھمکی میں اس لئے کہوں گا کیونکہ وہ لڑکی سے اپنا حال دل میرے کانوں سے چند سینٹی میٹر کے فاصلے پر بیان کرتا. لڑکی اسے دعوت عشق دیتی اور کہتی کہ وہ اسے لے کر کسی پارک یا سینما میں چلے۔ لیکن لڑکا ہیرو کے سے انداز میں اس بات کی مخالفت کرتا اور میں دل ہی دل میں اس معصوم محنت کش نوجوان کو اتنا سادہ لوح ہونے پر کوستا۔ گھر کے باقی سب لوگ ہمراز تھے۔ بیوہ ماں، دو من موہنی لڑکیاں اور بیٹے جو ملاح تھے. وہ بندر گاہ پر جہاز سے کیلے اتارتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی جہاز ان کی خدمات حاصل نہ کرتا۔ انہی سے میں نے سنا کہ ایک پرانے جہاز کو توڑ دیا گیا ہے۔ اپنے خفیہ کونے سے میرے احکامات کے مطابق انہوں نے جہاز کی پیشانی سے خوبصورت شکل کو اتار کر بندر گاہ کے ایک اسٹور میں چھپا دیا تھا۔ جس کا علم مجھے برسوں بعد ہوا. میری فرار اور جلاوطنی کے قصے ماضی کا حصہ بن چکے تھے۔

اب جب میں سمندر کے کنارے یہ یادداشتیں تحریر کر رہا ہوں تو لکڑی میں تراشی گئی اس خوبصورت عورت کی شبیہ، (بالکل یونانیوں کی مانند جیسا کہ تمام پرانے جہازوں پر ایسی شبہیں ہوتی ہیں) مجھے اپنی بے پناہ خوبصورتی سے گھورتی ہے۔

پروگرام یہ تھا کہ (Guayaqul) کی بندر گاہ پر پہنچتے ہی مجھے ان لڑکوں میں سے ایک کے ہمراہ اس کے کیبن میں چھپا کر کیلوں کے ساتھ ساحل پر اتار دیا جائے۔ ملاحوں نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ جب جہاز ایکواڈار میں اس بندر گاہ پر اپنا لنگر پانی میں ڈالے تو مجھے ایک عمدہ لباس میں ملبوس مسافر کی طرح سگار پیتے ہوئے عرشے پر آنا تھا. حالانکہ میں کبھی بھی سگار پینے کے قابل نہ ہوا چونکہ میں واپس جانے کے قریب تھا۔ خاندان نے میرے لئے بہت عمدہ ٹراپیکل سوٹ تیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا سوٹ بہت مختصر وقت میں تیار ہو گیا تھا۔ جب یہ سوٹ مجھے ملا تو اس سے زیادہ خوشی مجھے کبھی نہ ہوئی تھی۔ گھر کی عورتوں نے سوٹ کا اسٹائل ان دنوں کی ایک مشہور زمانہ فلم

(Gone with the wind) سے لیا تھا۔

جب کہ دوسری طرف لڑکوں نے خوش لباسی کے لئے انداز (Harlem) کی رقص گاہوں اور کریبین کی دنیا کے سستے شراب خانوں اور ناچنے والے علاقوں سے چنا تھا۔ ڈبل بریسٹ جیکٹ جو میرے گھٹنوں تک آتی تھی اس میں ایک بیلٹ بھی تھی اور پتلون میرے ٹخنوں سے نیچے تھی۔ میں اس خوبصورت لباس کو، جو ان نیک دل لوگوں نے میرے لئے تیار کر دیا تھا، کبھی بھی پہننے کا موقع نہ پا سکا۔ میں کبھی جہاز پر اپنی کیبن گاہ سے باہر نہ آ سکا۔ اور بہروپئیے کلارک گیبل کی طرح وہ لباس پہنے ہوئے میں کبھی بھی کیلوں کے ساتھ (Guayaquil) کی بندر گاہ پر نہ اتر سکا۔ اس کے برعکس میں نے ایک سرد راستے کا انتخاب کیا۔ میں چلی کے دور دراز جنوب کے لئے براعظم امریکہ کے جنوبی پہاڑوں کو عبور کرنے کے بعد عازم سفر ہوا۔

جنگل میں ایک سڑک

اس وقت تک (Recardo Fonseca) ریکارڈو فونیسکا میری پارٹی کا سیکرٹری جنرل تھا۔ وہ ایک مضبوط ذہن کا مسکراتا ہوا شخص تھا جس کا میری طرح جنوب کے سرد موسم کے علاقے (Carahue) کراہو سے تعلق تھا۔۔۔ میری زیر زمیں زندگی، میری کمیں گاہیں، میرے خفیہ دورے اور میرے پمفلٹوں کی اشاعت، یہ سب کچھ فونیسکا کے ذمے تھا ان سب سے بڑھ کر اس نے ان تمام جگہوں کو جہاں جہاں، میں ٹھہرا راز میں رکھا ہوا تھا۔ ڈیڑھ سال تک میرے چھپنے کی مدت میں، واحد شخص جو یہ جانتا تھا کہ میں کیا کھاؤں گا، رات کو کہاں سوؤں گا یہ میرا نوجوان اور پرگرم سیکرٹری ریکارڈو فونیسکا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کی صحت گرتی چلی گئی۔ اس کی مسکراہٹ مدھم پڑتی گئی اور واحد چیز جو اس کے چہرے پر نمایاں رہی اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے سبز شعلے تھے۔ ایک روز ہمارا اچھا ساتھی ہمیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلا گیا۔ چونکہ پارٹی زیر زمین تھی ایک نئے رہنما کا انتخاب ہوا۔ یہ والپاریزو کا رہنے والا ایک ساحلی شخص (Galo Gonzalez) گالو گونزالیز تھا ایک پیچیدہ شخص جس کا چہرہ سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ دھوکا دیتا نظر آتا تھا مجھے یہ کہنا چاہئے کہ اس بات کے باوجود کہ ہماری پارٹی ایک ایسی پرانی تنظیم تھی جو محاورتاً تمام کمزوریوں کے باوجود زندہ تھی لیکن اس میں شخصیت پرستی کبھی نہ ہوئی تھی۔

چلی کا ضمیر، عوام کا ضمیر، جنھوں نے سب کچھ اپنے ہاتھوں سے حاصل کیا تھا ہمیشہ بلند رہا اور ہماری پارٹی اس کا آئینہ تھی۔ پارٹی کو ختم کرنے کی کوشش کے باوجود، جو کہ اسٹالن عہد کی

تکونی سیاست کا شاخسانہ تھی، چلی ہی میں اس نے کسی حد تک نہ پائے جانے والے ماحول کو طاری کر دیا تھا۔ گونزالیز پارٹی کے بیشتر حصے سے اپنا تعلق نہ رکھ سکا تھا۔ سزاؤں کو بڑھا دیا گیا تھا ہزارہا قیدی خصوصی نظر بندی کے کیمپوں میں (Pisagua) کے صحرائی حدود کے نزدیک موجود تھے۔

گونزالیز انقلابی حرکات سے پر ایک مفرور بدمعاش کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن رہنماؤں اور پارٹی کی جنرل باڈی کے کارکنوں کے درمیان رابطے کی کمی نمایاں ہو گئی تھی۔ گونزالیز ایک ذہین عوامی انسان اور بہادر لڑنے والا سپاہی تھا یہاں سے میری اگلی منزل تک روانگی کے بارے میں اسے ہدایات خط کے ذریعے مل چکی تھی۔ مجھے دارالحکومت سے ایک ہزار کلومیٹر دور کہیں لے جانا تھا، جہاں سے آگے (Cordillera) تک مجھے گھوڑے پر جانا تھا— ارجنٹینا کے سپاہی راستے میں میرے منتظر ہوں گے۔

سورج غروب ہونے پر ایک کار کے ذریعے جو خوش قسمتی سے ہمیں مل گئی تھی بحفاظت ہم نے سفر شروع کیا۔ میرے دوست Dr Raul Bulnes ڈاکٹر رال بلنز نے جو پولیس کا ڈاکٹر تھا، مجھے اپنی کار میں ساتھ لے کر سانتیاگو تک لے گیا۔ اس کی کار پر شک بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ سانتیاگو میں پارٹی۔ کے کارکنوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک دوسری کار میں جو خصوصی طور پر لمبے سفر کے لئے تیار کی گئی تھی، ایک بار پھر ہمارا سفر شروع ہو گیا سڑک پر ہم دن رات رکتے رہے۔

دن کے وقت، جب ہمیں شہروں اور قصبوں میں پٹرول کے لئے رکنا پڑتا تو میں کمبلوں میں لپٹا رہتا تاکہ چشمے اور بڑھی ہوئی داڑھی سے بدلے ہوئے بھیس کا تاثر زیادہ ہو سکے۔ ٹی میوکو سے میں سہ پہر کو گزرا۔ میں کہیں بھی نہ رکا۔ یہ عجب اتفاق تھا کہ میرا پرانا ٹی میوکو ہی میری واپسی کا راستہ تھا۔ ہم نے پل عبور کیا اور (Padre Las Casas) کے گاؤں سے گزرے۔ شہر سے خاصے فاصلے پر رک کر ہم ایک چٹان پر کھانے کے لئے بیٹھے، بہت دور ڈھلوان پر چشمہ تھا جس کے پانی کی آواز مجھ تک آئی یہ میرا بچپن تھا، جو مجھے الوداع کر رہا تھا۔ میں اسی قصبے میں بڑا ہوا تھا، میری شاعری یہیں پہاڑ اور دریا کے درمیان پیدا ہوئی تھی۔ اس نے اپنی آواز بارش سے حاصل کی تھی اور لکڑی کی مانند اس نے جنگلوں میں سے خود کو آزاد کیا تھا اور اب آزادی کی شاہراہ پر رواں دواں تھی۔ ٹی میوکو کے نزدیک میں لمحہ بھر کو رکا اور پانی کی آواز کو سنا جس نے مجھے گانا سکھایا تھا۔ ہم دوبارہ چل پڑے تھے۔ بس ایک مرتبہ ہم اضطراب کے لمحے سے گزرے جب شاہراہ کے عین وسط میں ایک افسر نے ہماری کار کو روک لیا تھا میں بالکل گونگا بن گیا تھا، لیکن خوف بے بنیاد نکلا،

کیونکہ افسر نے ہم سے سو کلو میٹر آگے تک جانے کے لئے کہا تھا۔ وہ ڈرائیور کے پاس بیٹھ گیا اور اس سے دوستانہ انداز میں باتیں کرنے میں مصروف ہو گیا میں نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ میں سو رہا ہوں، ایک لفظ بھی ادا نہ کیا کیونکہ چلی کے پتھر تک میری شاعرانہ آواز سے واقف تھے۔

کسی غیر معمولی واقعہ کے ہوئے بغیر ہم لوگ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ عمارتی لکڑی کا گڑھ جو غیر آباد نظر آتا تھا۔ اس کے ہر طرف پانی موجود تھا۔ پہلے آپ بڑی جھیل (Ranco) کو عبور کرکے دیو قامت درختوں کے گھنے جنگل کی زمین تک پہنچتے۔ وہاں سے گھوڑے کی پشت پر ایک نئے سفر کے لئے روانہ ہوتے حتیٰ کہ آپ ایسی جگہ پہنچتے جہاں سے (Maihue) کی جھیل کو عبور کرنے کے لئے آپ کو ایک اور کشتی مل جاتی۔ گھر کو بمشکل دیکھا جا سکتا تھا جو پہاڑی دیہات کے گھنے اور قد آور سبزے میں تقریباً چھپا ہوا تھا میں نے لوگوں کو کہتے سنا تھا کہ چلی دنیا کا آخری کونا ہے اور وہ جگہ، جو جنگلات میں ڈھکی ہوئی تھی اور جس کے اطراف میں برف اور جھیلیں تھیں، درحقیقت اس سیارے پر آباد جگہوں میں سے آخری تھی۔

وہ گھر، جس میں مجھے رہنے کے لئے ایک کمرہ دیا گیا تھا۔ علاقے میں دوسری تمام چیزوں کی طرح ایک عارضی سا گھر تھا۔ کچے لوہے کا ایک اسٹوو، جو جلانے کی لکڑی سے بھرا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے اسے جنگل سے کاٹا گیا ہے۔ اور دن رات چلتا رہتا ہے جنوب سے آنے والی شدید بارش کھڑکیوں پر شور مچاتی رہتی۔ جیسے شیشوں کو توڑ کر گھر میں درآنا چاہتی ہو۔ بارش سورج کے بغیر جنگل، جھیلوں، آتش فشاں پہاڑوں اور رات پر حاوی تھی اور اس انسانی پناہ گاہ پر مختلف قوانین کی اطاعت کرنے اور اس کی فتح کو قبول نہ کرنے پر وحشیانہ انداز میں اثر انداز تھی۔ میں دوست (Jorge Bellet) جارج بیلٹ کو جو میرا منتظر تھا بمشکل جانتا تھا۔ یہ ایک سابق پائلٹ تھا۔ ایک عملی انسان جو مستقبل شناسی کے مابین ایک حد تھا۔ سپاہیوں والی جیکٹ اور جوتوں میں ، پیدائشی طور پر ایک رہنما کا مزاج رکھتا تھا ایک فوجی انسان کا دکھاوے کا رویہ، جو ماحول سے بھی مطابقت رکھتا تھا، حالانکہ جنگل کے عظیم درخت ہی وہاں موجود واحد فوجی تھے۔ گھر کی مالکہ ایک دبلی پتلی عورت تھی، جو اعصابی مزاج کی مالک تھی۔ اس جگہ کا بولتا ہوا سکوت، ہمیشہ قائم بارش، سردی، سب جیسے اس کی ذات کے مد مقابل تھے وہ دن کا زیادہ وقت مدھم آواز میں بڑبڑانے میں صرف کرتی اس کے باوجود گھر گھڑی کی مانند چلتا اور خوراک جنگل اور پانی سے تازہ رہتی۔ جارج ایک ایسی کمپنی کو چلاتا تھا جو سوئیڈن اور ڈینمارک کے لئے ریلوے لائنیں بنانے کی مہارت رکھتی تھی۔ بلند و بالا درختوں کے تنوں کو کاٹنے والے آرے سارا دن چبھتی ہوئی دھن الاپتے، پہلے آپ کو گرنے والے درخت کی آواز زمین کی گہرائی سے اٹھتی ہوئی سنائی دیتی۔ پھر پانچ دس منٹ کے بعد

زمین ایک دھماکے سے گونجتی. جیسے اندھیرے میں ڈھول بج اٹھے ہوں ہزاروں سال پہلے ہواؤں سے بکھرے ہوئے بیجوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے یہ رالی. مینو اور لارچ کے کٹتے ہوئے دیو قامت درخت تھے۔ پھر آرے ان کے جسموں کو ٹکڑوں میں منقسم کر دیتے۔ آرے کی مشینی آواز, جو کسی وحشی وائلن کی طرح تیزاور چھبتی ہوئی ہوتی, کسی دیو کو خوش آمدید کہتی ہوئی, زمین سے اٹھنے والی ڈھول کی آواز کے بعد گونجتی رہتی۔ اس سب نے مل کر ایک کھوئی ہوئی روایت کے اعصابی ماحول کو تخلیق کر دیا تھا___اسرار اور کائناتی خوف کا ایک حلقہ___جنگل مر رہا تھا۔ میں نے اس کے نوحوں کو آزردہ دل کے ساتھ سنا جیسے, میں وہاں ان قدیم ترین آوازوں کو, جنہیں کسی نے نہ سنا تھا سننے کے لئے آیا تھا۔

جنگل کا مالک سب سے بڑا افسر سانتیاگو کا ایک شخص تھا جس سے میں نہیں ملا تھا۔ گرمیوں کے آخر میں اس کی متوقع آمد کا خوف طاری تھا۔ اس کا نام (Pepe Rodriguez) پیپے روڈری گاز تھا اور مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑا سرمایہ دار تھا, جس کی بہت سی ملیں اور کھڈیوں کی فیکٹریاں تھیں۔ ایک مصروف توانا اور بے حد عملی انسان, جو مزاجاً پرلے درجے کا رجعت پسند ہونے کے ساتھ چلی کی انتہائی دائیں بازو کی جماعت کا اہم رکن بھی تھا میں اسے اطلاع دیئے بغیر اس کے علاقے سے گزر رہا تھا اور اس کی یہ خوبیاں میرے لئے ایک سرمایہ تھیں۔ اس کا امکان نہ تھا کہ مجھے ڈھونڈنے کے لئے یہاں کوئی آئے گا۔ سول حکام اور پولیس اس عظیم انسان کے طابع دار رعایا میں سے تھے, جس کی مہمان نوازی سے میں لطف اندوز ہو رہا تھا اور اس بات کا کوئی اتفاق نہ تھا کہ میری اس سے ملاقات ہو جائے میری روانگی لازمی تھی۔ (Cordillera) اور (Andes) کے پہاڑوں پر برف پڑنے والی تھی اور یہ کوئی مذاق نہ تھا۔ میرے دوست ہر روز سڑکوں کی حالت کا جائزہ لیتے۔ محض سڑک کہنا بس لفظ کو پھلانے کے مترادف تھا۔ درحقیقت ہمیں ان راستوں پر سے گزرنا تھا, جنہیں زمانہ ہوا برف نے بنایا تھا انتظار اذیت ناک ہوا جا رہا تھا۔ ارجنٹینا میں میرے دوست میرے منتظر ہوں گے۔ جب سب کچھ تیار تھا اس وقت عمارتی لکڑی کی مملکت کے کیپٹن جنرل جارج نے مجھے پہلے سے بتا دیا کہ کچھ ہو گیا ہے۔ یہ الفاظ اس نے منہ نیچے کی جانب کر کے ادا کئے۔

"مالک نے پیغام بھیجا ہے کہ وہ چل پڑا ہے اور دو روز تک یہاں پہنچنے والا ہے۔" میں پریشان ہو گیا۔ ہماری تیاریاں ابھی مکمل نہیں ہوئی تھیں اور اس بات کا خطرہ تھا کہ مالک کو اس بات کا علم ہو جائے گا کہ میں اس کے علاقے میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ ہر شخص جانتا تھا کہ وہ میرے جلاد ویڈیلا کا قریبی دوست تھا اور یہ بھی ہر ایک کو علم تھا کہ ویڈیلا گونزالیز نے میرے سر کی قیمت مقرر کی

ہوئی ہے۔۔۔ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

جارج شروع ہی سے اس بات کے حق میں تھا کہ مالک روڈری گاز سے مل لیا جائے "میں اسے اچھی طرح سے جانتا ہوں، اس نے بتایا وہ ایک اچھا انسان ہے، اور تمہیں کبھی بھی حکومت کے حوالے نہیں کرے گا" میں نے اعتراض کیا۔ پارٹی کی ہدایات، تھیں کہ ہر بات کو مکمل راز میں رکھا جائے اور جارج ان ہدایات کی خلاف ورزی کرنے کے بارے میں اپنی رائے دے رہا تھا ہمارے مابین خاصی گرم گفتگو ہوئی۔ اور سیاسی رائے کی مخالفت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے ایک انڈین کے گھر چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ گھر جنگل کے دامن میں ایک چھوٹا سا کیبن تھا میں اس کیبن میں منتقل ہو گیا۔ اور یہاں میری حالت اس قدر خراب ہو گئی کہ بالاخر بہت سے اعترافات کے بعد میں نے جنگلات اور آرہ مشینوں کے کاروبار کے مالک روڈری گاز سے ملنے کا فیصلہ کر لیا ہم ایک غیر جانبدار حل پر آمادہ ہو گئے کہ نہ اس کا گھر اور نہ ہی انڈین کا کیبن۔

غروب آفتاب کے وقت میں نے ایک جیپ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا ایک مرد، جو پختہ عمر کے ہوتے ہوئے بھی جوان لگ رہا تھا، جس کے بال سفید تھے اور چہرے کے تاثرات سنجیدہ۔ وہ میرے دوست جارج کے ہمراہ جیپ سے اترا۔ پہلی بات جو اس نے کہی وہ یہ تھی کہ اس کے بعد سے میری حفاظت کا ذمہ دار وہ خود ہو گا۔ ان حالات میں کوئی بھی میرے خلاف کسی بھی بات کے کرنے کی جرات نہ رکھتا تھا۔ کسی گرمجوشی کے بغیر ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ لیکن بتدریج اس شخص نے مجھے جیت لیا۔

باہر موسم بہت خراب تھا۔ میں نے اسے انڈین کے کیبن میں آنے کے لئے کہا، جہاں ہماری بات چیت کا سلسلہ جاری رہا اس کے کہنے پر شیمپین اور وہسکی کی بوتلیں اور کچھ برف آ گئی وہسکی کے چوتھے گلاس کے بعد، ہم باآواز بلند بحث کر رہے تھے وہ اپنے اعتقادات میں بالکل سخت تھا۔ اسے ہر بات کا علم تھا بہت سی دلچسپ باتیں اس نے کیں لیکن اس کی آواز میں تکبر کی جھلک پر مجھے سخت غصہ آیا۔

ہم دونوں نے اپنی ہتھیلیوں کو کیبن میں انڈین کی میز پر زور سے مارا لیکن بوتل کو ہم نے مناسب وقت میں ختم کیا۔ ہماری دوستی اچھی دوستی تھی۔ اس کے بارے میں سب سے اچھی بات اس کا غیر مشروط بے باک پن تھا۔ ایک ایسے شخص کا بے باک پن جس کے محض اشارے پر کام ہوتے تھے۔ لیکن اس نے میری شاعری کو بھی ایک انتہائی غیر معمولی انداز میں پڑھا، اتنی دانائی اور ایسی توانا آواز کے ساتھ کہ میری نظموں نے ایک بار پھر سے جنم لے لیا۔ روڈری گاز اپنے کاروبار کے سلسلے میں دارالحکومت واپس چلا گیا جانے سے پہلے اس نے اپنے تمام کام کرنے والوں کو

میرے گرد اکٹھا کیا اور میری خاطر ایک الوداعی، اشارہ کرتے ہوئے اپنے مخصوص تحکمانہ انداز میں ان سے مخاطب ہوا۔

''اگر آئندہ ہفتے محترم لیگارٹیا (Legarreta) کو ارجنٹینا جاتے ہوئے اسمگلروں کے رویئے میں کسی قسم کی رکاوٹ پیش آئے تو تم لوگ فوراً دوسری سڑک کھول لو گے، لکڑی کاٹنے کا سارا کام روک کر سڑک کو کھول دینا۔ یہ میرے احکامات ہیں'' اس زمانے میں میرا نام لیگارٹیا تھا۔

روڈری گاز ایک برسر آوردہ جاگیردار دو سال بعد پائی پائی کو محتاج ہو کر مر گیا تھا۔ اس پر سمگلنگ کا الزام لگا کر جیل میں ڈال دیا گیا تھا، جہاں وہ مہینوں پڑا رہا۔ اس مدبر شخص کے لئے یہ تمام وقت انتہائی تکلیف دہ رہا ہو گا اس پر جو الزام لگایا گیا تھا، وہ صحیح تھا یا غلط اس کا مجھے علم نہیں لیکن مجھے یہ پتہ چلا کہ ہماری ملکی انتظامیہ نے جس کی چند برس پہلے تک مہمان نواز روڈری گاز کی طرف سے ایک دعوت نامے کی امید پر راتوں کی نیند اڑ جاتی تھی، اسے یہ دیکھتے ہی کہ وہ بے یارو مددگار ہے تنہا چھوڑ دیا تھا جہاں تک میرا تعلق ہے میں اب بھی اس کے ساتھ ہوں اور اسے اپنی یاد سے نہیں بھلا سکتا بیچارہ روڈری گاز ایک چھوٹا سا بادشاہ تھا، جس نے ایک شاعر کو آزادی دلانے کی خاطر مدد کرتے ہوئے جنگل میں ساٹھ کلو میٹر لمبی سڑک کے کھولنے کا حکم دیا تھا۔

انیڈیز کے پہاڑ

اینڈیز کے پہاڑوں میں خفیہ درے تھے، جنہیں سمگلر پرانے زمانے میں استعمال کیا کرتے تھے۔ یہ درے اس قدر دشوار گزار اور بے مہر تھے کہ دیہاتی پولیس نے ان میں نگرانی کرنی چھوڑ دی تھی دریا اور گھاٹیاں مسافر کا رستہ روکتیں تھیں۔

اس مہم کی سربراہی میرے ساتھی جارج کے ذمے تھی۔ ہمارے ساتھ پانچ مشاق گھڑ سوار بطور محافظوں کے تھے۔ یہ لوگ سڑک کے اسکاؤٹ بھی تھے۔ ان میں میرے پرانے دوست (Victor Bianchi) وکٹر بیانکی نے بھی شمولیت اختیار کر لی تھی، جو اس علاقے میں کسی پرانی زمین کے قضیے کی وجہ سے سرویئر کی حیثیت میں یہاں آیا ہوا تھا وہ مجھے نہیں پہچان سکا تھا۔ سال بھر چھپنے کے باعث میری داڑھی بہت بڑی ہو چکی تھی۔ جونہی اسے میرے جنگل کو عبور کرنے کا علم ہوا تو اس نے ایک پرانے مہم جو کی حیثیت سے اپنی بے مثال خدمات پیش کر دیں۔ ایک مرتبہ وہ (Acancagua) کو سر کرنے کی المناک مہم میں شامل ہوا تھا، جس میں بچنے والا وہ ہی واحد شخص تھا۔

ہم سیدھی قطار میں طلوع آفتاب کے لمحے تک حفاظت میں سفر کرتے۔ برسوں سے میں

نے گھڑ سواری نہیں کی تھی، شاید بچپن سے اب تک لیکن اب ہم گھوڑوں پر سوار درے کی جانب رواں دواں تھے اینڈیز کے جنوب میں جنگل بہت بڑے بڑے درختوں سے آباد ہیں۔ دیو قامت لارچ رالی نیپا اور صنوبر کے درخت رالی کے درختوں کے تنوں کا حجم حیران کن ہے۔ میں ایک تنے کی پیمائش کے لئے رکا۔ اس درخت کے تنے کا قطر گھوڑے کے برابر تھا سر پر آسمان کو نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ نیچے صدیوں سے پتے گر رہے تھے۔ جن سے تہیں اتنی دبیز ہو گئی تھی کہ اس پر چلتے ہوئے گھوڑوں کے سُم اس میں دھنس رہے تھے ــــ ہم فطرت کے قدیم ترین کلیسا میں سے گزر رہے تھے۔ ہمارا رستہ ہمیں ممنوعہ اور چھپے ہوئے علاقے میں لے گیا اور ہم نے خفیف ترین اشاروں کو بھی جنہیں ہم سمجھ جاتے، قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ نہ کوئی رستہ تھا نہ پگڈنڈی۔ میرے ہم سفر چار گھڑ سوار تھے جو طاقتور درخت، ناقابل عبور دریا، بڑی گھاٹیاں برف کے ویرانوں جیسی بڑی بڑی رکاوٹوں سے گزر رہے تھے اور جنہوں نے اپنی آنکھوں کو آزادی کی شاہراہ کی طرف لگا رکھا تھا۔ میرے ساتھی پر یقین تھے کہ سبز رستہ گھنی جھاڑیوں اور سبزے میں سے ہو کر ملے گا۔ لیکن احتیاطاً وہ بڑے درختوں کی چھال کو ادھر ادھر تلوار سے کاٹتے جاتے تاکہ مجھے قسمت کے حوالے کرنے کے بعد انہیں واپسی کا رستہ پانے میں آسانی ہو۔

ہر شخص اس تنہائی میں گم، جس کی کوئی حدود نہ تھیں۔ گم سم سبز اور سفید خاموشی میں آگے بڑھتا گیا۔ درخت انگور کی لمبی بیلیں صدیوں کے جمع شدہ گلے سڑے پتوں کا ڈھیر نیم افتادہ درخت جو اچانک رستے کی رکاوٹ بن جاتے یہ سب کچھ فطرت کا درخشاں اور مستور کام تھا۔ اس کے ساتھ ہی بڑھتی ہوئی سردی، برف اور تعاقب کا خوف بھی تھا۔ سب باتیں یکجا ہو گئی تھیں ــــ تنہائی، خوف، خاموشی اور میرے مقصد کی اشد ضرورت۔

بعض اوقات ہم مدھم سے راستوں پر چلتے جو شاید سمگلروں یا پھر انصاف سے بھاگے ہوئے قانون دشمن لوگوں کے چھوڑے ہوئے ہوتے۔ ہم حیران تھے کہ اینڈیز میں اچانک ہونے والے برفانی طوفانوں میں، جو مسافروں کو گھیر کر سات منزلہ برف میں دفن کر دیتے تھے جانے کتنے ہی لوگ سرما کے یخ زدہ ہاتھوں سے ختم ہو گئے ہوں گے۔

رستے کے دونوں جانب جنگلی ویرانے میں جو کچھ نظر آیا وہ انسانی ہاتھوں کا کارنامہ تھا ــــ ٹوٹی ہوئی ٹہنیاں اکٹھی کی گئیں تھیں۔ یہ بے شمار سردیاں برداشت کر چکی تھیں۔ سینکڑوں مسافروں کی طرف سے دیئے گئے سبز نذرانے، گرنے والوں کو یاد رکھنے کے لئے لکڑی کے اونچے مقبرے، ہمیں ان لوگوں کو یاد کرانے کے لئے جو آگے نہ جا سکے اور یہاں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے برفوں کے نیچے دفن ہو گئے۔ میرے ساتھیوں نے بلند صنوبر کی ان شاخوں کو جو درختوں سے ہم پر

چھلانگ لگاتیں شاہ بلوط کی شاخوں کو جو ہمارے سروں کو چھوتیں، جن کے آخری پتے آنے والی سردیوں کے طوفان سے پہلے لرز رہے تھے کاٹ ڈالا اور ہر قبر کے ڈھیر پر میں نے بھی ایک یادداشت چھوڑی۔ لکڑی کا ایک کارڈ، جنگل سے ایک شاخ کسی نامعلوم مسافر کے مقبرے کو سجانے کے لئے____ ہمیں ایک دریا کو عبور کرنا ہے____

وہ چھوٹے چشمے جنہوں نے اینڈیز کی چوٹیوں پر جنم لیا، نیچے کی طرف چلتے ہیں اور اپنی کچل دینے والی توانائی کو آبشار میں منتقل کر دیتے ہیں۔ اس قوت اور رفتار سے، جو وہ ان بلندیوں سے نیچے کی طرف آتے ہوئے حاصل کرتے ہیں، زمین اور چٹانوں کو پھاڑ دیتے ہیں۔

لیکن اس بار ہم ایک تالاب تک پہنچے۔ ایک بہت بڑا پانی کا آئینہ۔ گھوڑے اس میں اتر گئے۔ ان کے قدم گم ہو گئے اور وہ دوسرے کنارے تک تیرتے رہے۔ میں بے قابو ہو کر جھومنے لگا میرے بے قابو پیر زور زور سے ادھر ادھر ہلتے رہے جب کہ گھوڑے اپنے سروں کو پانی سے اوپر رکھنے کے لئے جدوجہد کرتے رہے اور اس طرح ہم وہاں سے نکل آئے۔ جیسے ہی ہم دوسرے کنارے پر پہنچے تو میرے ہمسفر رہنماؤں میں سے ایک نے جو کسان تھا مجھ سے پوچھا۔

"کیا تم ڈر گئے تھے؟"

"بے حد۔ میں سمجھا تھا کہ میرا اختتام آ پہنچا" میں نے جواب دیا

"ہم سب تمہارے پیچھے ہاتھوں میں رسے کو لئے ہوئے تھے" انہوں نے کہا۔ ان میں سے ایک بولا۔

"میرا باپ عین اسی جگہ گرا تھا۔ اور پانی کی لہر اسے بہا کر لے گئی تھی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ایسا دوبارہ تمہارے ساتھ ہو۔"

ہم چلتے رہے۔ آخر کار ایک قدرتی سرنگ میں داخل ہو گئے یہ سرنگ جو چٹانوں میں بنی ہوئی تھی شاید کسی بے پناہ طاقتور دریا کے دباؤ کا نتیجہ تھی۔ جو شاید اسی وقت ہی غائب ہو گیا تھا یا پھر زمین کے کسی تشنج کی وجہ سے جس نے ان پہاڑوں میں اسے تخلیق کر دیا تھا____ چٹان سے تراشی ہوئی گرینائٹ کی سرنگ جس میں اب ہم داخل ہو رہے تھے۔ تھوڑا اور آگے چلنے پر پتھر گرتے رہے____ گھوڑے اپنے پیروں کو پتھریلے گڑھوں میں نکالنے کی کوشش کرتے____ ان کی ٹانگیں دوہری ہو جاتیں ان کے سموں سے چنگاریاں نکلتیں۔ کئی بار میں گھوڑے سے نیچے چٹانوں پر گر پڑا میرے گھوڑے کی ناک اور ٹانگوں سے خون بہہ رہا تھا۔ لیکن ہم ڈھیٹ بنے اپنے شاندار طولانی اور مشقت آزما رستے پر چلتے رہے۔

اس وحشی جنگل میں کوئی شے ہمارا انتظار کر رہی تھی اچانک ہم ایک صاف ستھری مختصر سی چراگاہ میں آ گئے تھے۔ ایک ناقابل یقین منظر ــــ پہاڑوں کی گود میں سمٹا ہوا نقرئی پانی، سبز گھاس، جنگلی پھول، چشموں کی گنگناہٹیں اور سروں پر نیلا آسمان۔ پتوں سے نہ ٹوٹتی فیاض روشنی ہم جادوئی حلقے کے اندر کسی مقدس جگہ میں مہمانوں کی طرح رک گئے تھے اور وہ تقریب اس سے بھی کہیں مقدس تھی جس میں، میں نے حصہ لیا۔

چرواہے اپنے اپنے گھوڑوں سے اتر گئے تھے کسی رسم کے طور پر ایک بیل کی کھوپڑی کو گڑھے کے مرکز میں رکھا گیا تھا۔ میرے ساتھیوں میں سے ایک ایک کر کے سب خاموشی سے اس جگہ تک پہنچے اور کھوپڑی کے استخوانی گڑھوں میں کچھ سکے اور کھانے کی اشیا ڈالیں۔ اس پیش کش میں، میں بھی ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو گیا جو اکھڑ مزاج کے انسانوں کی طرف سے تھی وہ جو یولی سس (Ulysses) کی طرح بے راہ ہو گئے تھے ہر نسل کے مفروروں کے لئے جو روٹی اور مدد کو مردہ بیل کی آنکھوں کے گڑھوں میں تلاش کریں گے۔ لیکن یہ ناقابل فراموش تقریب یہیں ختم نہ ہوئی۔ میرے دیہاتی دوستوں نے اپنے ہیٹوں کو اتار پھینکا اور اس کھوپڑی کے گرد ایک پیر پر اچھلتے ان دائروں کے نشانات کو ڈھونڈنے کا عجیب و غریب رقص شروع کر دیا، جو ان سے پہلے ناچنے والے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ وہاں اپنے نامعلوم ساتھیوں کے ساتھ کسی بہت ہی مبہم سے بتائے گئے انداز میں تب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ دو انسانوں کے مابین جو ایک دوسرے سے ناواقف تھے ایک ربط موجود تھا۔ وہاں دنیا کی راہوں سے ہٹ کر ان دور دراز جگہوں میں بھی خواہش تھی دلائل تھے اور ان دلائل کے جوابات تھے۔

اس سے بہت آگے، اس رات جب ہم اس سرحد کو، جو مجھے میرے ملک سے کئی سالوں کے لئے جدا کر دے گی، عبور کرنے والے تھے، آخری پہاڑ کی گھاٹیوں کے نزدیک ہمیں اچانک روشنی نظر آئی۔ انسانی زندگی کی یقینی علامت نزدیک پہنچنے پر وہاں بہت سی جھونپڑیوں کی وضع کے سائبان نظر آئے جو بالکل خالی تھے۔ ان میں سے ایک میں ہم داخل ہو گئے اور دیکھا کہ وہاں وسط میں آتش دان کے قریب بڑے بڑے تنے جل رہے تھے ــــ دیو قامت درختوں کے جسم، جو وہاں دن رات جلتے رہتے تھے اور جن کا دھواں چھت کی درازوں سے ایک نیلے نقاب کی مانند نکلتا رہتا تھا۔ وہیں ایک طرف پنیر کے ڈھیر تھے جو ان لوگوں نے اس بلندی پر جمع کئے تھے۔ بہت سے لوگ بوریوں کی طرح آگ کے نزدیک پڑے ہوئے تھے۔ خاموشی میں ہم نے گٹار کے ساز کو سنا اور ایک گیت کے بول، جو دہکتے ہوئے کوئلوں اور تاریکی سے جنم لے رہا تھا۔ اس سفر میں یہ وہ پہلی انسانی آواز تھی جس سے ہماری ملاقات ہوئی ــــ یہ محبت اور دور دراز کی جگہوں کا گیت تھا ــــ محبت کا نوحہ۔ اور

خوبصورت قصبے کے مرکز میں دیکھ چکے تھے. ہم نے زیادہ مہنگے ہوٹل کا چناؤ کیا۔ جو قصبے کے کنارے پر واقع تھا اور ہوا یوں کہ جس ہوٹل کو ہم نے منتخب کیا وہ اس قدر نفیس تھا کہ ہمیں اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ گھوڑوں پر کئی دنوں کے سفر کے اثرات. کندھوں پر بوریوں اور ہمارے گرد آلود داڑھیوں والے چہروں نے بہت سی نامہربان آنکھوں کو متوجہ کر لیا تھا۔ ہمارے اندر داخل ہونے سے کوئی شخص بھی ڈر سکتا تھا. جب کہ ہوٹل کا منیجر. جس کے گاہکوں میں برطانوی امراء اور اسکاٹ لینڈ کے ایسے سیاح شامل تھے. جو ارجنٹینا میں سالمن مچھلی کے شکار کے لئے آئے ہوئے تھے ___ ادھر ہماری وضع قطع سے کسی بھی قسم کا شاہانہ پن نظر نہ آتا تھا منیجر نے ہمیں تھیٹریکل انداز میں دیکھتے ہوئے عجیب انداز میں بتایا کہ آخری کمرہ صرف دس منٹ پہلے کرائے پر دے دیا گیا تھا۔ تب اس لمحے ایک شاندار شخص جو یقیناً کوئی فوجی افسر تھا دروازے میں نمودار ہوا. اس کے ہمراہ سنہرے بالوں والی ایک حسینہ تھی. جو کسی فلمی ستارے سے مشابہ تھی۔ اس شخص نے گرجدار آواز میں کہا "رک جاؤ ___ چلی کے باشندوں کو کوئی نہیں دھتکارتا! یہ یہیں رہیں گے" اور ہم وہاں مقیم ہو گئے۔

ہمارا نجات دہندہ جنوبی امریکہ کے ملک ارجنٹینا کے مشہور آمر (Peron) سے بہت ملتا جلتا تھا اور اس کے ہمراہ خاتون (Evita) کی مانند تھی۔ ہم نے سوچا کہ یہ وہی لوگ ہیں لیکن بعد میں. جب ہم نہا دھو کر کپڑے بدل چکے تو پتہ چلا کہ وہ شخص مقامی چھاؤنی کا کمانڈر تھا اور عورت بیونس آئرز کی ایک ایکٹرس. جو اس سے ملنے وہاں آئی تھی۔

ہم نے خود کو لکڑی کا تاجر ظاہر کیا جو کسی منافع بخش سودے کی تلاش میں تھے۔ کمانڈر نے مجھے "پہاڑی آدمی" کہا تھا۔

وکٹر بیانکی نے، جس کی دوستی اور مہم جوئی کی محبت اسے میرے ساتھ اتنی دور یہاں لے آئی تھی. گیٹار اٹھایا اور ارجنٹینا کے مردوں اور عورتوں کو چلی کے گانے سنا کر محفوظ کیا۔

تین دن اور تین راتیں گزر گئیں۔ لیکن پیڈریو کا کہیں اتہ پتہ نہ تھا ہمارے پاس کوئی صاف قمیص نہ رہی تھی اور نہ ہی نئی کے لئے پیسے تھے وکٹر نے کہا "ایک اچھے لکڑی کے تاجر کے پاس کم از کم صاف قمیضیں ہونی چاہئیں" کمانڈر نے ہمیں چھاؤنی میں دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ ہم اچھے دوست بن گئے تھے۔ کمانڈر نے ہمارے سامنے اعتراف کیا تھا وہ جسمانی وضع قطع میں (Peron) سے مشابہت کے باوجود اس کا مخالف تھا۔ گھنٹوں ہم نے اس بحث میں صرف کر دیئے کہ کس ملک کا صدر خراب ترین تھا چلی کا یا ارجنٹینا کا۔

ایک صبح پیڈریو اچانک میرے کمرے میں گھس آیا۔ میں اس پر چیخا "حرامی کہاں رہے

اتنی دیر تم؟" ناممکن ممکن ہو چکا تھا۔ پیڈریو قصبے کے مرکز والے دوسرے ہوٹل میں میرا انتظار کرتا رہا تھا۔

دس منٹ بعد ہم میدان میں سے گزر رہے تھے۔ ہم دن رات چلتے رہے کبھی کبھار ارجنٹینا کے لوگ کار روکتے تاکہ ہم چائے کے چند گھونٹ پی سکیں۔ جس کے بعد، دوبارہ ہم اس نہ ختم ہونے والی اکتاہٹ سے بھری زمین پر چل پڑتے۔

پیرس میں پاسپورٹ کے بغیر

فطری طور پر بیونس آئیرز میں میرا سب سے بڑا مسئلہ اپنے لئے ایک نئی شناخت حاصل کرنے کا تھا وہ جعلی کاغذات جنہیں میں نے ارجنٹینا کی سرحد کو عبور کرنے کے لئے استعمال کیا تھا، میرے بحر اوقیانوس کو عبور کرنے کی مہم یا یورپ میں میرے داخلے کے لئے کار آمد نہ ہوں گے کس طرح مجھے نئے کاغذات مل سکیں گے؟ چلی کی حکومت کی طرف سے ارجنٹینا کی چوکنی پولیس ہر طرف میری تلاش میں تھی اس وقت مجھے کچھ یاد آیا، جو میرے حافظے میں چھپا ہوا تھا مرکزی امریکہ کا میرا پرانا ناول نگار دوست (Miguel Angel Asturios) میگوئل اینجل آسٹوریاز اپنے ملک گوئٹے مالا کی طرف سے سفارتی مشن پر بیونس آئیرز میں موجود تھا۔ ہمارے چہروں میں خفیف سی مشابہت تھی۔ مشترک رائے سے ہم نے خود کو ایک انڈین لفظ (Chompipe) سے مربوط کر لیا تھا یہ لفظ پرندے (Turkey) کے لئے گوئٹے مالا اور میکسیکو میں استعمال ہوتا تھا۔ لمبی ناک، چہرے اور جسم پر چھوڑی ہوئی جگہ کی باعث ہم دونوں اس خوش ذائقہ پرندے سے مشابہ تھے۔

میگوئل اینجل مجھ سے ملنے میری کمیں گاہ میں آیا تھا۔ "دوست" میں نے اس سے کہا "مجھے اپنا پاسپورٹ ادھار دے دو اور خوشی کے ساتھ یورپ میں بطور میگوئل اینجل کے پہنچنے دو"

مجھے یہ کہنے دیں کہ میگوئل ہمیشہ سے آزاد خیال رہا لیکن عملی سیاست سے علیحدہ۔ اس کے باوجود اس نے اس کے بارے میں بالکل نہ سوچا کچھ دن بعد اس سینور آسٹوریاز (Senior Asturias) اور اس سینور آسٹوریاز کے مابین میں نے ارجنٹینا اور یوراگوئے کو جدا کرنے والے وسیع دریا کو عبور کر کے میں (Montevideo) پہنچ گیا۔ جہاں ہوائی اڈے اور پولیس کی چوکیوں سے بچتا بچاتا گوئٹے مالا کے مشہور ناول نگار کی حیثیت سے بالاخر پیرس پہنچ گیا۔ لیکن فرانس میں میری شناخت نے ایک بار پھر مصیبت کھڑی کر دی۔ میرا نیا نکور پاسپورٹ کبھی بھی مجھے

سخت چھان بین کرنے والے حکام سے نہ بچنے دے گا۔ مجھے میگوئل آسنور یاز کا بہروپ چھوڑ کر دوبارہ سے پابلونرودا بننا پڑے گا۔ لیکن یہ کیسے ہو گا؟ جب کہ پابلونرودا تو فرانس پہنچا ہی نہیں اور میگوئل اینجل آسنور یاز فرانس میں پہنچ گیا تھا میرے مشیروں نے مجھے "جارج پنجم" ہوٹل میں پہنچنے کو کہا تھا "وہاں بین الاقوامی شہرت یافتہ اہم لوگوں کے درمیان کوئی بھی تم سے کاغذات کے بارے میں نہ پوچھے گا۔" انہوں نے کہا۔

لہٰذا میں کئی روز اپنے پہاڑی کپڑوں پر توجہ دیئے بغیر وہاں ٹھہرا رہا جس نے اس امیر اور پر تکلف دنیا میں ایک نامانوسیت کی دھن کو چھیڑ دیا تھا۔

پھر پکاسو (Picasso) نظر آ گیا، جس کی مہربانی اس کی ذہانت سے لگا کھاتی تھی۔ وہ اپنی زندگی کی پہلی تقریر پر بالکل ایک ننھے بچے کی مانند خوش تھا۔ اس کی تقریر کا موضوع میری شاعری میری سزا اور میری عدم موجودگی تھی۔ جدید مصوری کے امام نے ایک برادرانہ احساس کے ساتھ مجھے میری محکومیت سے باہر نکالا۔ اس بات کا خیال کرتے ہوئے جو جزیات اس میں شامل تھیں، اس نے بہت سے لوگوں کے علاوہ حکام بالا سے بات کی۔ میں نہیں جانتا کہ محض میری وجہ سے وہ کتنی شاندار تصاویر نہ بنا سکا ہو گا۔ اس بات کا مجھے بری طرح سے احساس تھا کہ اس کا بہت قیمتی وقت میری باعث ضائع ہو رہا تھا۔

اس زمانے میں پیرس میں امن کے لئے ایک کانگریس کا انعقاد ہونے والا تھا۔ اپنی نظم پڑھنے کے لئے میں کانگریس میں آخری لمحات میں پہنچا تمام لوگوں نے مجھے گلے لگایا اور میری تعریف کی۔ بہت سے لوگ مجھے مردہ تصور کر چکے تھے۔ انہیں یقین نہ آتا تھا کہ کس طرح میں چلی کی سزا دینے والی بے درد پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک آیا ہوں۔ اگلے دن پیرس کا ایک پرانا صحافی (Alderete) میرے ہوٹل میں آ گیا۔

"جب اخبار نے اطلاع دی کہ آپ پیرس میں ہیں" تو چلی کی حکومت نے فی الفور اس کی تردید کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ نرودا کا کوئی ہم شکل پیرس آ پہنچا ہے جب کہ نرودا چلی میں ہے اور حکومت اس کی تلاش میں سرگرم ہے اور اس کی گرفتاری میں محض چند گھنٹے باقی ہیں۔"

"ہمیں جواب میں کیا کہنا چاہئے؟" اس نے مجھ سے سوال کیا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بحث میں کہ کیا شیکسپیئر نے اپنی تخلیقات خود لکھی ہیں یا نہیں؟ ــــ ایک دقیق بحث ــــ

مارک ٹوئین (Mark Twan) نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا تھا کہ دراصل یہ ولیم شیکسپیئر نہیں تھا جس نے وہ ڈرامے تحریر کئے بلکہ ایک اور انگریز تھا، جو اسی دن اسی گھنٹے، شیکسپیئر کی پیدائش کے وقت پیدا ہوا تھا، اور جو شیکسپیئر ہی کے وفات کے دن اسی لمحے مرا تھا اور اتفاق سے اس کا

نام بھی ولیم شیکسپیئر (William Shakespeare) ہی تھا۔ میں نے صحافی سے کہا "کہو کہ میں پابلونرودا نہیں ہوں لیکن چلی کا ایک اور باشندہ ہوں، جو نظمیں لکھتا ہے آزادی کے لئے لڑتا ہے اور جس کا نام بھی پابلونرودا ہے۔" میرے کاغذات کو درست کرنا آسان نہ تھا۔

(Aragon) آراگون اور (Pauleluard) پال ایلوارڈ میری مدد کر رہے تھے۔ اس دوران مجھے نیم مخفی زندگی گزارنی تھی بہت سی جگہوں میں سے ایک جگہ جہاں میں نے پناہ لی میڈم (Francoise) کا گھر تھا۔ اس بے حد ذہین اور سچی خاتون کو میں کبھی فراموش نہ کروں گا۔ اس کا مکان شاہی محل کے نزدیک (Collette) میں تھا۔ اس خاتون نے ایک ویت نامی بچے کو گود لے رکھا تھا جب کہ فرانسیسی فوج دور دراز ویت نام میں معصوم لوگوں کے قتل کا وہ کام سرانجام دے رہی تھی جسے بعد میں شمالی امریکہ نے سنبھالنا تھا مجھے یاد ہے کہ پکاسو کی خوبصورت تصاویر میں سے ایک تصویر جو میں نے دیکھی وہ اسی گھر میں تھی۔ یہ کیوبسٹ تحریک سے پہلے کی بنائی گئی پکاسو کی بہت بڑی پینٹنگ تھی۔ اس میں سرخ مخمل کے دو پردوں کو دکھایا گیا تھا جو ایک میز پر کھڑکی کے دوپٹوں کی طرح اکٹھے اوپر سے گرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور میز پر فرانسیسی روٹی ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی نظر آتی ہے۔ اس پینٹنگ سے تقدس کا احساس ملتا تھا۔

میز پر پڑی ہوئی بہت بڑی فرانسیسی روٹی ایک قدیم شبیہ میں مرکزی شکل کی مانند تھی یا (El-Greico) کی (St.Maurice in Elescorml) اس پینٹنگ کے لئے خود میں نے ایک عنوان تجویز کیا تھا۔

"مقدس روٹی کا اوپر اٹھنا"

ایک روز پکاسو مجھے ملنے اس کمیں گاہ میں آگیا۔ میں اسے اس تصویر تک لے گیا، جو اس نے برسوں پہلے بنائی تھی اور اسے مکمل طور پر بھلا چکا تھا۔ وہ سنجیدگی سے اس کے نزدیک پہنچا اور غیر معمولی انداز میں بلکہ ایک اداس تاثر لئے ہوئے جو اس کے ہاں نظر نہ آتا تھا تقریباً دس منٹ تصویر کو دیکھنے میں خاموشی سے گزارے۔ جب وہ تصویر کا بغور معائنہ کر چکا تو میں نے کہا۔

"یہ تصویر مجھے بہت پسند ہے۔" اور میں یہ تجویز دینے والا ہوں کہ میرے ملک کا میوزیم اسے خرید لے۔ مادام یہ تصویر ہمارے ہاتھ فروخت کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔"

پکاسو نے ایک بار پھر چبھتی ہوئی نظر تصویر پر ڈالی اور واحد جملہ جو اس نے ادا کیا "یہ ہرگز بری نہیں ہے۔" میں نے کرائے پر ایک گھر تلاش کر لیا تھا، جو اس وقت مجھے فضول خرچی لگی۔ یہ گھر (Pierre-Mille) اسٹریٹ میں واقع تھا۔

مزدوروں اور غریب لوگوں کے ہمسائے میں یہاں پہنچنے کے لئے گھنٹوں آپ کو میٹرو (Metro) سے سفر کرنا پڑتا جو بات اس گھر میں مجھے اچھی لگی وہ اس کا پنجرہ نما ہونا تھا۔ گھر کی تین منزلیں تھیں۔ مختصر راہ داریاں اور کمرے ــــــ یہ ایک بڑے پرندے کا پنجرہ تھا جو کسی بھی تفصیل کی مزاحمت کرتا تھا۔ نچلی منزل کو جو سب سے کشادہ تھی۔ اور جس میں لکڑی جلانے والا اسٹوو بھی تھا، میں نے لائبریری اور مہمان نوازی کا کمرہ بنا لیا، مہمان نوازی میں وقتاً فوقتاً کرتا رہتا تھا۔ کچھ دوست جو تقریباً سب ہی چلی کے تھے۔ گھر کی پہلی منزل میں منتقل ہو گئے ــــــ (Nemesio Antunez) اور (JoseVenturelh) دونوں مصور تھے اور دوسرے جو وہاں مقیم تھے، مجھے یاد نہیں۔

اس زمانے میں میرے ہاں تین ممتاز سویت ادیب ملنے آئے۔ ان میں (Nikolai Tikhonov)ڈرامہ نگار (Alexander Korneichuk) (جو یوکرین میں ایک سرکاری افسر بھی تھا) اور ناول نگار (Constantin Simonov)

اس سے پہلے میں ان سے کبھی نہ ملا تھا۔ انہوں نے مجھے ایک مدت سے بچھڑے ہوئے بھائی کی طرح گلے لگایا اور گلے لگانے کے ساتھ ساتھ ہر ایک نے میرا زوردار بوسہ بھی لیا۔ یہ سلاوک بوسوں میں سے ایک تھا، جو مردوں کے مابین دوستی اور عزت کی علامت تھا اور جس سے مطابقت کرنے میں مجھے خاصا وقت لگا برسوں بعد جب میں ان برادرانہ اور مردانہ بوسوں کے مطلب کو سمجھا تو میرے پاس ایک موقع تھا کہ میں لطیفے کو ان الفاظ میں بیان کر سکوں۔

پہلا مرد جس نے مجھے چوما، وہ چیکوسلاوایکہ کا قونصل تھا۔"

چلی کی حکومت مجھے قطعاً نہ چاہتی تھی۔ نہ گھر پر اور نہ ہی باہر جہاں کہیں بھی میں جاتا تو دوسری حکومتوں سے میرے لئے مشکلات پیدا کرنے کے بارے میں مجھ سے پہلے فون کے پیغامات اور لکھے ہوئے رقعے، ہوتے۔ مجھے علم ہوا کہ (Quaid Orasx) میں میرے بارے میں ایک فائل موجود تھی جس میں کہا گیا تھا۔

"نرودا اور اس کی بیوی (Deliadel Carril) اکثر اسپین آتے جاتے رہتے ہیں اور سویت ہدایات ادھر ادھر کرتے ہیں۔ انہیں یہ ہدایات روسی ادیب (Ilya Ehrenburg) سے ملتی ہیں جس کے ہمراہ نرودا بھی اسپین کے خفیہ دورے کرتا ہے۔ ایہرن برگ سے قریبی ربط رکھنے کے لئے نرودا نے ایک ایسی عمارت میں اپارٹمنٹ کرائے پر لیا ہے۔ جہاں روسی ادیب بھی رہتا ہے" یہ جھوٹ کا پلندہ تھا۔ (Tean Richard Bloch) نے میری خاطر اپنے دوست کے نام جو وزارت خارجہ میں ایک اہم افسر تھا خط دیا میں نے اس افسر کو سمجھایا کہ

یہ لوگ ان بے سروپا باتوں سے مجھے فرانس سے بے دخل کرانے کی کوشش میں ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ایہرن برگ سے ملنے کے لئے بے چین ہوں لیکن بدقسمتی سے ابھی تک اس عزت افزائی سے محروم رہا ہوں اہم افسر نے مجھے رحم کی نظروں سے دیکھتے ہوئے تحقیقات کرنے کا وعدہ کیا، جو کبھی نہ ہوئیں اور یوں یہ بے تکے الزامات جوں کے توں رہے۔ بعد میں میں نے خود کو ایہرن برگ سے متعارف کرانے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ روزانہ (La Coupole) جاتا ہے جہاں ایک روسی وقت کے مطابق غروب آفتاب کے قریب دوپہر کا کھانا کھاتا ہے۔

"میں چلی کا شاعر پابلو نرودا ہوں" میں نے اسے کہا۔

"پولیس کے مطابق ہم دونوں قریبی دوست ہیں۔ ان کے بقول میں اسی عمارت میں رہتا ہوں، جہاں تم رہتے ہو۔ وہ مجھے تمہاری وجہ سے فرانس سے نکالنا چاہتے ہیں۔ میری خواہش تھی کہ میں کم از کم تم سے مل کر مصافحہ تو کر لوں۔"

مجھے یقین نہیں کہ ایہرن برگ نے دنیا میں کبھی کسی دوسرے موقع پر پلک جھپکی ہو گی لیکن اس کے باوجود، میں نے حماقت بھرے ایک تاثر کو دیکھا جو اس کے سر کے ناراض سفید بالوں تلے گھنی بھنوؤں سے ابھر رہا تھا۔

"میں بھی تم سے ملنا چاہتا تھا نرودا" اس نے کہا مجھے تمہاری شاعری اچھی لگتی ہے لیکن بات کے شروع کرنے سے پہلے کچھ کھاؤ تو سہی۔"

اس کے بعد سے ہم دوست بن گئے۔ میرے خیال میں اس نے میری کتاب (Esp ana en el corazon) کا اسی روز سے ترجمہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ فرانسیسی پولیس نے نادانستہ طور پر مجھے انتہائی تسلی بخش دوستی سے نوازا تھا اور اس طرح مجھے ممتاز ترین روسی مترجم سے متعارف کرایا۔ ایک روز (Jules Super Vielle) مجھے ملنے کے لئے آیا۔ اس وقت تک میرے پاس چلی کا اصل پاسپورٹ میرے ذاتی نام کے ساتھ مل چکا تھا یوراگوئے کا بوڑھا ہوتا ہوا شریف شاعر بہت کم کہیں باہر جاتا تھا میں اس کی آمد سے حیران ہی نہیں بلکہ بے حد متاثر ہوا تھا۔

"میں تمہارے لئے ایک ضروری پیغام لایا ہوں۔ میرا داماد (Bertaux) تم سے ملنا چاہتا ہے۔ کس معاملے میں یہ میں نہیں جانتا" (Bertaux) پولیس کا افسر اعلیٰ تھا۔ ہم اس کے دفتر چلے گئے بوڑھا شاعر اور میں افسر اعلیٰ کے سامنے بیٹھ گئے۔ کسی ایک میز پر میں نے اتنے بہت سے ٹیلی فون نہیں دیکھے تھے۔

وہاں کتنے ٹیلی فون موجود تھے؟ میرے خیال میں بیس سے کم نہ ہوں گے اس کے ذہین اور

فطین چہرے نے ٹیلی فون کے جنگل کے اس پار سے مجھے دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ پیرس کی زیر زمیں زندگی وہیں اس بھری ہوئی میز پر تھی۔ مجھے فنتوماس (Fantomas) اور انسپکٹر (Maigret) یاد آ گئے۔

پولیس کے افسر اعلیٰ نے میری کتابوں کو پڑھ رکھا تھا۔ اور وہ حیران کن انداز میں میری شاعری سے واقف تھا۔

"مجھے چلی کے سفیر سے درخواست موصول ہوئی ہے، کہ میں تمہارا پاسپورٹ حاصل کر لوں۔ سفیر کا کہنا ہے کہ تم سفارتی پاسپورٹ استعمال کر رہے ہو جو غیر قانونی ہو گا۔ کیا یہ اطلاع درست ہے؟" "میرے پاس سفارتی پاسپورٹ نہیں ہے" میں نے جواب دیا "یہ محض سرکاری پاسپورٹ ہے۔ میں اپنے ملک میں سینیٹر ہوں۔ اور اس طرح اس دستاویز پر میرا حق ہے اس کے علاوہ یہ آپ کے سامنے ہے اور آپ اسے دیکھ سکتے ہیں لیکن یہ مجھ سے واپس نہ لیں، کیونکہ یہ میری ذاتی ملکیت ہے۔"

"کیا اس کی تاریخ درست ہے؟ کس نے اسے ٹھیک کیا ہے؟" (Bertaux) نے میرا پاسپورٹ مجھ سے لیتے ہوئے پوچھا "یہ بالکل درست ہے" میں نے اسے بتایا "جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ کس نے اس کی تجدید کی، تو یہ میں نہیں بتا سکتا کیونکہ چلی کی حکومت اس افسر کو فوراً ہٹا دے گی۔

پولیس کے افسر اعلیٰ نے میرے کاغذات کو آہستگی سے بغور دیکھا، پھر اس نے اپنے بغیر نمبر کے بہت سے ٹیلی فون میں سے ایک کو اٹھایا اور چلی کے سفیر سے ملانے کے لئے کہا۔ ٹیلی فون کی یہ گفتگو میری موجودگی میں ہوئی۔

"نہیں جناب سفیر" میں یہ نہیں کر سکتا۔۔۔ اس کا پاسپورٹ بالکل درست ہے، یہ میں نہیں جانتا کہ یہ کس نے کیا ہے، میں پھر یہ دہراتا ہوں کہ اس کے پاسپورٹ کو لینا غلط ہو گا، مجھے افسوس ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا جناب سفیر"

سفیر کی بات میں زور کا عنصر واضح تھا جو (Bertaux) کی آواز میں موجود تلخی سے ظاہر ہو رہا تھا۔ آخر کار اس نے ریسور کو واپس رکھا اور مجھ سے کہنے لگا۔

"وہ تمہارا جانی دشمن لگتا ہے۔ لیکن تم جب تک چاہو فرانس میں رہ سکتے ہو۔"

میں بوڑھے شاعر کے ہمراہ باہر نکل آیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ جہاں تک میرا تعلق ہے، فتح کا ایک احساس نفرت کے ساتھ میرے اندر موجزن تھا۔ یہ سفیر، جو مجھے پریشان کر رہا تھا۔ چلی میں میرے صیاد سے ملا ہوا تھا اور یہ وہی (Joaqin Fernandez)

(جوکن فرنانیڈیز تھا، جو مجھ سے اپنی دوستی پر فخر کرتا تھااور مجھ سے کسی ملاقات کاموقع نہ کھوتا جس نے اس صبح گونیئے مالا کے سفیر کے ہاتھوں شفقت کاایک پیغام میرے لئے بھیجا تھا۔

جڑیں

ابھرن برگ نے جو میری نظموں کو پڑھ رہا تھااور ان کے ترجمے میں مصروف تھاایک بار مجھے سخت برا بھلا کہا۔

"بہت سی جڑیں ــــ تمہاری شاعری میں بے تحاشا جڑیں ہیں آخر اتنی بہت سی کیوں ؟"

واقعی یہ بات درست ہے کہ سرحدی علاقوں نے اپنی جڑوں کو میری شاعری میں ڈبو دیا ہے اور یہ جڑیں کبھی بھی خود کو باہر سے نہ نکال پائیں تھیں۔ میری زندگی ایک مقدس طولانی سفر ہے جو ہمیشہ ایک بل کھاجاتا ہے۔ ہمیشہ جنوب کے جنگلات میں واپس جاتے ہوئے ــــ ان جنگلات تک، جو میرے لئے گم ہو گئے۔

وہاں بڑے بڑے طاقتور درخت سات سو سال کے بعد طوفانوں کی باعث جڑوں سے اکھڑ کر گر جاتے، برف کی نذر ہو جاتے یا آگ سے جل کر راکھ ہو جاتے۔ میں نے جنگل میں عظیم رفیقوں کو ٹوٹتے ہوئے سنا ہے۔ شاہ بلوط کے دخت ایک چھپی ہوئی آواز کے ساتھ نیچے گرتے، جیسے ایک دیو قامت ہاتھ زمین کے دروازوں پر دفن ہونے کی خواہش کر رہا ہو۔

لیکن جڑیں فضا میں اپنے دشمنوں کے لئے برہنہ رہ جاتی ہیں۔ درخت کے لئے رطوبت اور وقت کے لئے کہ وہ یکے بعد دیگرے تباہ کر سکے ان کھلے ہوئے زخمی یا جلے ہوئے بڑے بڑے ہاتھوں سے کوئی بھی اور شے زیادہ خوبصورت نہیں۔ جس کا علم ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہمارا آمنا سامناان سے کہیں جنگل میں کسی راستے میں ہو جاتا ہے۔ مدفون درخت کا راز، وہ اسرار جس نے پتوں کی نشوونما کی۔ نباتات کی مملکت کی گہرائی تک پہنچنے والے عضلات ــــ المناک الجھی ہوئی بے ترتیب جڑیں ہمیں ایک نئے حسن کو دکھاتی ہیں۔ یہ زمین کی گہرائیوں سے ڈھل کر بننے والے مجسمے ہیں ــــ فطرت کے خفیہ عظیم فن پارے ایک بار (Rafael Alberti) رافیل البرتی اور میں (Oborno) کے قریب پیدل چل رہے تھے۔ ہمارے اطراف میں آبشاریں، جھاڑیاں اور جنگل تھے۔ رافیل نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ ہر شاخ دوسری سے مختلف ہے۔ پتے لامحدود وضع کے انداز کی خاطر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔ "وہ یوں نظر آتے ہیں، جیسے انہیں کسی بہت بڑے مالی نے کسی بے حد شاندار پارک کے لئے منتخب کیا ہے" اس نے کہا۔ کئی سال بعد

روم میں رافیل کو وہ چہل قدمی اور ہمارے جنگلات کی قدرتی بھرمار یاد آگئی تھی۔ یہ کچھ ایسا ہی تھا۔

بحیثیت بچے کی (Boroa) اور (Carahue) کے درمیان یا Tolten کے ارد گرد ساحل سمندر پر پہاڑیون میں اتنی آوارہ گردیوں کو یاد کر کے میں اداس ہو جاتا ہوں۔ کتنی بے شمار دریافتیں!

بارش کے بعد دار چینی کے درخت کی حسین صورت اور اس کی مہک جنگل کے ان گنت چہروں سے لٹکتی ہوئی (Moss) کی داڑھی میں گرے ہوئے پتوں کو ایک جانب دھکیلتا ہوں کہ اس کوشش میں کسی جڑ کی چمکدار جلد بے نقاب ہو۔ جو سنہری رنگوں میں ملبوس کسی ننھی منی بیلے رقاصہ کی مانند جڑوں کے نزدیک رقص کرتی ہے یا بعد میں جب میں ارجنٹینا کی سمت پہاڑوں پر سفر میں تھا تو درختوں کے سبز گنبدوں کے نیچے ایک رکاوٹ میرے سر پر ابھر آئی تھی۔ ان میں سے ایک کی جڑ ہمارے سواروں سے بلند ہمارا رستہ روکتی تھی۔ کام دشوار تھا لیکن کلہاڑے نے ممکن کر دیا تھا۔ جڑیں الٹے ہوئے کلیساؤں کی مانند تھیں۔ جن کی عظمت ہمیں اس نظارے سے مسحور کرنے کے لئے وہاں برہنہ تھی۔

نواں باب

جلاوطنی کا آغاز اور انجام

سوویت یونین میں

۱۹۴۹ء میں میری جلاوطنی کے ختم ہونے پر، پہلی بار مجھے سوویت یونین میں پشکن کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں مدعو کیا گیا تھا۔ شفق اور میں ایک ہی وقت میں بالٹک کے سرد موتی سے طے شدہ وقت کے مطابق قدیم و جدید شریف اور ہیرو جیسے لینن گراڈ پہنچے تھے۔

پیٹر اعظم اور عظیم لینن کا شہر پیرس کی طرح "فرشتہ" ہے سرمئی رنگ کا فرشتہ، دھات کے رنگ کی سڑکیں، جست کے رنگ کے پتھریلے محلات اور سبزی مائل دھات جیسا سمندر۔

دنیا میں سب سے شاندار میوزیم، زار کے خزانے، ان کی نادر پینٹنگز، وردیاں، چمک دار جواہرات، تقریبات کے ملبوسات، ان کے ہتھیار، ان کی میزوں کے آرائشی ظروف، سب کے سب میری آنکھوں کے روبرو تھے۔ اور نئے لافانی تحائف ـــ (Auroqa) بحری جنگی جہاز، جس کی جنگی توپوں نے لینن کے خیالات کی پشت ہی کی تھی۔ قدامت کی دیواروں کو گرا دیا تھا۔ اور تاریخ کے دروازوں کو کھول دیا تھا۔

میں وہاں طے شدہ پروگرام کے تحت ایک شاعر سے ملنے گیا تھا، جو ایک صدی پہلے مرچکا تھا ـــ الیگزانڈر پشکن، کبھی نہ مٹنے والی اساطیر اور ناولوں کا مصنف، شاعروں کا یہ شہزادہ عظیم سوویت یونین کے دل کا مالک ہے۔ اس کی صد سالہ تقریبات کو منانے کی خاطر روسیوں نے زار کے محلات کی از سر نو تعمیر کی تھی۔ محل کی ہر دیوار کو اسی طرح دوبارہ بنایا گیا تھا جیسے یہ زمانہ قدیم میں ہوگی۔ ایک بار پھر مٹی اور دھول سے یہ محل اٹھ رہا تھا جسے نازی جرمنی کی توپوں نے مٹی کا ڈھیر بنا

دیا تھا۔

محل کے بلیو پرنٹس اور اس وقت کی دستاویزات کو مدنظر رکھ کر روشن کھڑکیاں منقش دیواریں اور پھولوں سے مزین اہم جگہیں دوبارہ بنائی گئی تھیں۔ ایک دوسرے علاقے کے غیر معمولی شاعر کے احترام میں میوزیم کی تعمیر ــــــ

سوویت یونین میں، جس چیز نے مجھے سب سے پہلے متاثر کیا، وہ وسعت کا ایک احساس، اور اس بڑے ملک کی آبادی کا اتحاد تھا ــــ میدانوں میں برچ کے درختوں کی حرکت، معجزانہ طور پر بچے ہوئے اتنے بڑے جنگلات، بڑے بڑے دریا، گندم کے کھیتوں میں سے لہروں کی مانند دوڑتے ہوئے گھوڑے۔

پہلی ہی نظر میں مجھے سوویت سرزمین سے عشق ہو گیا تھا اور یہ احساس ہوا تھا کہ یہ سرزمین نہ صرف دنیا کے ہر حصے کو جہاں انسانی زندگی موجود ہے ایک اخلاقی سبق دیتی ہے بلکہ امکانات کے تقابل کا ایک رستہ۔ بدستور بڑھتی ہوئی ترقی، اکٹھے کام کرنے اور آپس میں حصہ بٹانے کی راہ دکھاتی ہے لیکن مجھے یہ بھی محسوس ہوا، کہ ایک غیر معمولی پرواز اس زمین کی ان چراگاہوں والے علاقے سے ابھرے گی۔ جس میں اس قدر فطری خالص پن شامل ہے۔

تمام نسل انسانی جانتی ہے، کہ ایک عظیم سچ پر یہاں کام کیا گیا تھا اور تمام دنیا یہ دیکھنے کو منتظر ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ کچھ خوف میں انتظار کرتے ہیں، دوسرے محض منتظر ہیں اور کچھ کو یقین ہے کہ وہ دیکھ سکتے ہیں، کیا آ رہا ہے؟۔

میں جنگل کے وسط میں تھا، جہاں ہزاروں کسان روایتی تہواروں کے لباس میں ملبوس پشکن کی نظموں کو سن رہے تھے۔ ہر شے زندگی کا نغمہ گنگنا رہی تھی۔ مرد، بچے، زمین کے وسیع قطعات، جہاں نیا گندم اپنی زندگی کی پہلی علامات دکھا رہا تھا فطرت انسان کے ہمراہ فاتح اتحاد بناتی نظر آتی تھی۔

مسیخا الوسکی کے جنگل میں، پشکن کی ان نظموں میں سے انسان کو جو دوسرے سیاروں تک پرواز کرے گا، ناقابل یقین انداز میں ابھرنا چاہیے۔

جب کسان تقریبات میں مصروف تھے، تو اس وقت زبردست بارش شروع ہو گئی۔ ہمارے نزدیک ہی چمکتی ہوئی بجلی کا کوندا گرجا اور ایک انسان اور درخت کو، جو اسے پناہ میں لئے ہوئے تھا، جلا کر کوئلہ کر گیا ــــ یہ سب کچھ قدرتی منظر کا ایک حصہ لگا۔ اس کے علاوہ وہ شاعری بھی جو میری کتابوں میں تھی اور جس کا تعلق مجھ سے تھا بارش کے ساتھ موجود تھی۔

سوویت دیساتی علاقے میں تیزی سے تبدیلی آ رہی ہے۔ بڑے بڑے شہر اور نہریں زیر

تعمیر ہیں۔ جغرافیہ بذات خود تبدیل ہو رہا ہے، لیکن پہلی مرتبہ آنے کے باوجود، میں نے ان چاہتوں کو جنہوں نے مجھے ان سے متعلق کیا تھا اور ہر اس شے کو جو میری رسائی سے دور تھی یا میری روح سے ماورا پہچان لیا تھا۔

ماسکو میں ادیب ایک مسلسل تبدیلی کی حالت میں رہتے تھے افکار کا ایک مسلسل تبادلہ۔ اس سے پہلے کہ اسکینڈل باز مغرب اس بات کو دریافت کرتا، مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ بورس پاسٹرناک اور مایا کووسکی بہترین سوویت شاعر تھے۔ مایا کووسکی عوامی شاعر تھا، جس کی آواز میں گرج اور تانبے کی سی چمک تھی۔ ایک شاندار دل، جس نے زبان کی انقلابی تبدیلی سے روشناس کرایا اور سیاسی شاعری میں مشکل ترین مسائل کا مقابلہ کیا۔ پاسٹرناک شام کے سایوں کا بڑا شاعر تھا جس کے ہاں مابعدالطبیعاتی داخلیت تھی اور جو سیاسی طور پر ایک دیانت دار رجعت پسند تھا جس نے اپنے ملک کے بدلتے ہوئے حالات میں کلیسا کے ایک چھوٹے افسر سے بڑھ کر کچھ نہیں دیکھا۔ اس کے ٹھہرے ہوئے سیاسی خیالات کے باوجود اس کے اکثر نقاد پاسٹرناک کی نظموں کو میرے سامنے سنایا کرتے تھے۔ سوویت فنون لطیفہ میں قطعیت پسندی کی ایک عرصے سے موجودگی سے انحراف نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن یہ ذکر بھی ہونا چاہئے کہ یہ قطعیت پسندی ہمیشہ ایک خامی سمجھی گئی اور کھلے عام اس سے جنگ جاری رہی۔

(Zhdanov) زہدانوو کے تنقیدی مضامین کے ساتھ، جو خود ایک بے حد ذہین قطعیت پسند تھا، شخصیت پرستی کے رویئے نے سوویت ثقافت کی نشوونما میں ایک سنجیدہ بے لچک رویئے کو جنم دے دیا تھا۔ لیکن ہر طرف سے اس پر لے دے کی جا رہی تھی اور ہم جانتے ہیں کہ زندگی تصورات سے کہیں زیادہ توانا اور ڈھیٹ ہے۔ انقلاب زندگی ہے۔ تصورات اپنی قبریں خود بناتے ہیں۔

ایہرن برگ کافی ضعیف ہو گیا ہے، لیکن اب بھی سوویت ثقافت کے سچے اور حقیقی اشتعال انگیزوں میں سے ایک ہے۔

میں اکثر اپنے دوست سے ملنے گورکی اسٹریٹ میں واقع اس کی رہائش گاہ پر جاتا، جہاں پکاسو کی تصاویر اور لیتھو گرافس دیوار پر لگے نظر آتے۔ ایہرن برگ کو پودوں سے بہت لگاؤ ہے اور وہ ہمیشہ اپنے چمن میں پودوں کے گرد اگی خود رو گھاس اور احتنامی نقطوں کو اکھاڑتا رہتا بعد میں شاعر (Kirsanov) کرسانوو جس نے روسی زبان میں میری نظموں کا ترجمہ کیا تھا، میرا بہت اچھا دوست بن گیا۔

تمام سوویت شاعروں کی طرح کرسانوو بھی ایک پکا محب الوطن ہے۔ اس کی شاعری میں خوبصورت روسی زبان کی درخشاں چنگاریاں اور عمدہ موسیقی موجود ہے، جسے اس کا قلم ہوا میں

آبشار کی صورت میں بکھیرتا رہتا ہے۔

ایک اور شاعر، جس سے ماسکو میں اکثر میری ملاقات رہی، ترک شاعر ناظم حکمت تھا۔ ایک اساطیری شاعر، جسے اس کے ملک کی بے تکی حکومتوں نے اٹھارہ برس تک جیل میں قید رکھا۔

ناظم حکمت کو ترک بحریہ میں انقلاب لانے کے الزام میں جہنم کی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس پر مقدمہ ایک بحری جہاز میں چلایا گیا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ جہاز کے پل پر اسے اس وقت چلایا جاتا تھا جب وہ چلنے کے قابل نہ رہتا۔ پھر اسے بیت الخلا کے ایک حصے میں رکھا گیا، جہاں فضلے کے ڈھیر زمین سے نصف میٹر تک بلند ہو گئے تھے۔ میرے شاعر بھائی کے اعصاب جواب دیئے جا رہے تھے۔ تعفن سے اس کا سر چکراتا۔ تب اسے خیال آیا کہ اسے عذاب میں مبتلا کرنے والے اسے دیکھ رہے ہیں وہ مجھے کمزور دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں ڈھیر ہو جاؤں اور ہتھیار ڈال دوں۔ ایک احساس فخر کے ساتھ اس کی توانائی واپس لوٹ آئی اور اس نے گانا شروع کر دیا پہلے آہستہ آواز میں، پھر باآواز بلند اور بالآخر اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ اس نے تمام گیت گائے۔ محبت کی تمام نظمیں، جو اسے یاد تھیں، اس نے گائیں اپنی نظمیں، کسانوں کے عوامی گیت، لوگوں کے جنگی نغمے، حتیٰ کہ ہر اس چیز کو جو اسے یاد تھی وہ گایا۔ اور یوں ناظم حکمت نے اذیتوں اور غلاظت پر فتح حاصل کر لی۔ جب اس نے مجھے یہ سب بتایا تو میں نے اس سے کہا "میرے بھائی، تم نے ہم سب کے لئے گایا ہے" اب ہمارے پاس مزید شکوک نہیں ہونے چاہئیں۔ نہ ہی ہمیں حیران ہونا چاہئے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ اب ہم جانتے ہیں کہ ہمیں گانا شروع کر دینا چاہئے۔"

اس نے مجھے اپنے عوام کے مصائب کے بارے میں بھی بتایا۔ ترکی میں جاگیرداروں نے کسانوں پر ظلم و بربریت کو روا رکھا ہوا تھا ناظم حکمت انہیں جیل میں آتے دیکھتا۔ وہ لوگ روٹی اور تمباکو کے لئے گڑگڑاتے، جو انہیں روزانہ کے راشن کے طور ملتا تھا۔ بتدریج وہ بے توجہی سے گھاس کی طرف دیکھنے لگتے اور بعد میں یوں لگتا جیسے گھاس میں کچھ ڈھونڈ رہے ہوں۔ بالآخر ایک دن وہ گھاس کی کچھ پتیوں کو منہ میں بھر لیتے۔ اور گھوڑوں کی مانند چاروں ہاتھوں پیروں پر گھاس کھایا کرتے۔

جذباتی طور پر قطعیت کے خلاف ناظم حکمت جلاوطنی کے بہت سے برس سوویت یونین میں رہا۔ اس ملک سے اس کی محبت جو اسے یہاں لے آئی تھی الفاظ میں کچھ یوں جھلکتی ہے۔

"میں شاعری کے مستقبل میں یقین رکھتا ہوں، مجھے یقین ہے کیونکہ میں اس ملک میں رہ رہا ہوں، جہاں روح کسی بھی اور شے کے بجائے شاعری کی خواہش کرتی

ہے''

بہت سے راز جنہیں لوگوں کو خود ڈھونڈنا پڑا ان الفاظ میں لرزتے ہیں۔ سوویت شخص، جس پر تمام لائبریریوں، کلاسوں، تھیٹروں کے دوازے وا ہیں، لکھنے والوں کے خیالات کے مرکز میں ہے۔ یہ وہ بات ہے، جسے ادبی عمل کے معروضات کی بحث میں نہیں بھولنا چاہئے۔

ایک طرف نئی ہستیوں اور وجود رکھنے والی ہر شے کو نیا کرنے کے عمل کو ادبی سانچوں کو توڑنا چاہئے۔ دوسری طرف کسی طرح کوئی بھی شخص اتنے مربوط اور دور رس انقلاب کی پیروی کرنے میں اجتناب کر سکتا ہے، کیسے کوئی، اتنے بڑے وسیع و عریض ملک میں جو مکمل سماجی اقتصادی اور سیاسی تبدیلی سے گزر رہا ہو، اپنے مرکزی موضوعات سے فتوحات، اختلافات، انسانی مسائل، افراط، ترقی اور نشوونما کو خارج کر سکتا ہے؟ کیسے کوئی ان لوگوں کے ساتھ، جو خوفناک حملہ آوروں اور نو آبادیاتی نظام کے علاوہ، ہر وضع اور ہر رنگ کے مداخلت کاروں میں پھنسے ہوئے تھے ایک مشترک مقصد کی تشکیل نہ کرتا؟ کیا ادب یا فنون لطیفہ اس قسم کے بے حد اہم نوعیت کے واقعات کے سامنے لطیف تر آزادی کی فضا کو برقرار رکھ سکتا ہے؟

آسمان سفید ہے۔ سہ پہر کو چار بجے کے قریب یہ سیاہ ہے اس لمحے کے بعد رات شہر پر کمبل تان لیتی ہے۔

ماسکو، سردیوں کا شہر ہے۔ یہ سرما کا خوبصورت شہر ہے برف چھتوں پر لامحدود انداز میں جم چکی ہے۔ پیدل چلنے کے راستے بالکل صاف چمکتے ہیں۔ ہوا معتدٔ شیشے کی مانند سخت ہے نرم لوہے کے رنگ جیسے برف کے ننھے منے پر اڑتے پھرتے ہیں۔ ہزارہا آنے جانے والے چلتے پھرتے رہتے ہیں، جیسے انہیں سردی محسوس نہیں ہوتی۔ اس سب سے ایک خوابناک کیفیت کا اظہار ہوتا ہے، جس میں ماسکو، اپنی غیر معمولی سجاوٹوں کے ساتھ، جو کبھی زندہ لگتی ہیں کبھی بھوتوں کی مانند، ایک بہت بڑا سرمائی محل بن جاتا ہے۔ اس وقت ماسکو میں، جو زمین کی چھاتی میں ایک جلتے ہوئے دل کی مانند ہے اور جو آگ اور برف کے ستارے کی طرح قائم ہے، درجہ حرارت صفر سے تیس درجے نیچے ہے۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں۔ سڑکوں پر سلامی دینے والے دستے ہیں کیا ہو رہا ہے؟ حتیٰ کہ برف بھی جہاں جہاں پڑی ہے بے حس و حرکت ہے یہ عظیم (Vishinsky) وشنسکی کی تدفین کی رسومات ہیں گلیاں جنازے کے جلوس کے گزرنے کے لئے خالی ہو جاتی ہیں — ایک گہری خاموشی ہر طرف طاری ہے۔ پر سکون خاموشی اس عظیم سپاہی کے لئے سرما کے دل میں بیٹھ جاتی ہے۔

وشنسکی کی آگ سوویت مادر وطن کی جڑوں کی خاطر واپس آتی ہے۔ سپاہی، جنہوں نے

چلتے ہوئے سلامی کے لئے اپنے ہتھیار پیش کئے ایک تنظیم میں رہتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ان میں سے ایک سپاہی خفیف سی حرکت کرتا ہے، اپنے دستانوں میں چھپے ہوئے ہاتھوں کو اٹھاتے ہوئے ایک سیکنڈ کے لئے لمبے جوتوں کو حرکت دیتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ بے حس و حرکت لگتے ہیں۔

ایک ھسپانوی دوست نے مجھے بتایا تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران ایک بار بمباری کے فوراً بعد بے حد سرد موسم میں ماسکو کے شہری گلیوں میں آئس کریم کھاتے دیکھے جا سکتے تھے۔

"جب میں نے انہیں اتنے پرسکون انداز میں خوفناک جنگ کے دوران نقطہ انجماد سے نیچے گرے ہوئے درجہ حرارت پر آئس کریم کھاتے دیکھا۔" "تب میں جانتا تھا کہ یہ جنگ جیت لیں گے" میرے دوست نے کہا۔

پارک میں برف سے سفید درخت، دھند میں ڈوب گئے ہیں۔ ماسکو کی سردی میں پارک میں ان نقرئی پتیوں کا کوئی شے مقابلہ نہیں کر سکتی۔ سورج ان سے سفید شعلے نکالتا ہوا انہیں غیر مصفّٰے بنا دیتا ہے، لیکن ان کے پھولوں کے نمونوں سے ایک قطرہ بھی نہیں پگھلتا۔

یہ ایک شجر صفت دنیا ہے، جو ہمیں اپنی برفانی بہار کے باغ میں سے نظارہ کراتی ہے۔ کریملن (Kremlin) کے قدیم مینار، ہزاروں سال پرانے پیچ دار کلس، سینٹ باسل کے سنہری گنبد ماسکو کے مضافات کو چھوڑتے ہوئے ایک اور شہر کی جانب. میں فراخ سفید شاہراہیں دیکھتا ہوں۔ یہ منجمد دریا ہیں۔ ان ساکت دریاؤں کے پاٹ میں کبھی کبھار کھانے کی میز پر کسی مکھی کی طرح، کہیں ایک مچھیرے کا ہیولا ابھرتا ہے۔ مچھیرا اس طویل منجمد چادر پر رکتا ہے، ایک نقطے کو منتخب کر کے برف میں سوراخ کرتا ہے حتیٰ کہ اس کے سامنے سوراخ میں سے مدفون لہر کو دیکھا جا سکتا ہے۔ فی الوقت وہ کچھ نہیں پکڑ سکتا، کیونکہ مچھلیاں اس لوہے سے، جس نے سوراخ بنایا ہے، ڈر کر بھاگ گئی ہیں، پھر مچھیرا تھوڑی سی خوراک بھاگی ہوئی مچھلیوں کے لئے سوراخ میں ڈالتا ہے اور اپنا کانٹا ڈال کر منتظر رہتا ہے۔

وہ اس یخ بستہ ٹھنڈ میں گھنٹوں انتظار کرتا رہتا ہے میرے خیال میں ادیبوں کا کام آرکٹک کے مچھیرے سے کس قدر مشابہ ہے۔ ادیب کو دریا ڈھونڈنا پڑتا ہے اور اگر اسے یہ یخ بستہ ملتا ہے تو اسے بھی برف میں ڈرل سے ایک سوراخ کرنا پڑتا ہے۔ اسے بہت صبر کرنا پڑتا ہے، چاہے موسم سرد ہو یا تنقید سخت، اسے چاہئے کہ وہ مذاق کو برداشت کرے، گہرے پانی کو تلاش کرے، صحیح کانٹے کا استعمال کرے اور اس عام کام کے بعد کہیں وہ ایک چھوٹی سی ننھی مچھلی کو باہر نکالتا ہے۔

لہٰذا اسے پھر مچھلی کا شکار کرنا چاہیئے۔ سردی، پانی، نقاد کا مقابلہ کرتے ہوئے اور بتدریج ایک بڑی مچھلی کو قابو کرنا چاہیئے اور پھر ایک اور، اور ایک اور۔

مجھے ادیبوں کی کانگریس میں مدعو کیا گیا تھا۔ وہاں کرسیوں میں بڑے مچھیرے تھے۔ سوویت یونین کے عظیم ادیب (Fadeyev) اپنے سفید بالوں اور مسکراہٹ کے ساتھ (Fed in)کسی انگریز مچھیرے کی طرح دبلا پتلا اور فطین ایہرن برگ اپنے پریشان بالوں کے ساتھ اس سوٹ میں ملبوس جو پہلی بار پہننے پر بھی ایسا ہی ملا ہوا دکھائی دیا ہو گا، جیسے وہ اس کو پہنے ہوئے سو گیا ہو۔ ڈائس پر سوویت کی دور افتادہ جمہوریہ منگولیا کے نمائندے بھی موجود تھے ــــ یہ وہ لوگ تھے، جن کے ناموں کے بارے میں پہلے میں نے کبھی نہ سنا تھا ــــ خانہ بدوش ممالک، جن کے حروف ابجد نہ تھے۔

دوسری بار ہندستان کا سفر

۱۹۵۰ء میں مجھے اچانک ہندوستان جانا پڑا تھا پیرس میں (Joliot Curie) نے ایک مشن کے لئے ہندوستان جانے کو کہا تھا۔ مجھے نئی دہلی کا سفر کرنا تھا جہاں مختلف سیاسی نظریات رکھنے والے لوگوں سے ملاقات مطلوب تھی۔ اور وہیں یہ بھی طے کرنا تھا کہ ہندوستان میں امن تحریک کو تقویت دینے کے کیا مواقع ہیں (Joliot Curie) امن کے سپاہیوں کی دنیا کا صدر تھا ہماری تفصیلی بات چیت ہوئی۔ وہ متفکر تھا، کیونکہ ہندوستان میں امن پسند رائے کا، باوجویکہ ہندوستان ہمیشہ سے ایک امن پسند ملک کی ہمہ گیر شہرت رکھتا تھا، کوئی وزن نہ تھا۔

خود وزیراعظم ہندوستان، نہرو اسی ملک میں وقت کے ہاتھوں تسلیم شدہ اور باعث توقیر وجہ کے امن کے ایک ممتاز وکیل کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔

(Joliot Curie) نے مجھے دو خطوط دیئے تھے۔ ایک بمبئی میں کسی سائنس دان کے نام تھا اور دوسرا، جسے ذاتی طور پر مجھے وزیراعظم ہندوستان کو پہنچانا تھا۔ یہ عجیب سی بات لگتی تھی کہ مجھے اس طویل سفر اور بظاہر اتنی معمولی سی بات کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ شاید اس ملک کے لئے، جہاں میں نے اپنی جوانی کے کچھ سال گزارے تھے، میری نہ ختم ہونے والی محبت تھی، یا پھر شاید اسی سال چونکہ مجھے امن کا انعام مل چکا تھا ــــ ایک اعزاز جو پابلو پکاسو اور ناظم حکمت کو بھی ملا تھا۔ بمبئی کے لئے ہوائی جہاز میں سوار ہو کر میں تیس برس کے بعد ہندوستان واپس جا رہا تھا۔ ہندوستان اب اپنی آزادی کے لئے لڑنے والا وہ نو آبادیاتی ملک نہ تھا، بلکہ ایک آزاد جمہوریت تھی گاندھی کا خواب، جس کی پہلی کانگرس میں، میں ۱۹۲۸ء میں شریک ہوا تھا۔ ان دنوں کے میرے دوستوں

میں سے کوئی بھی حیات نہ تھا۔ وہ انقلابی دوست، جنھوں نے اپنی جدوجہد کی کہانیوں کو بھائیوں کی طرح مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے سنایا تھا۔

جہاز سے اتر کر میں سیدھا کسٹم میں پہنچا، جہاں سے مجھے کسی ہوٹل میں جانا تھا اور ماہر طبعیات رامن کو خط پہنچانا تھا اور پھر نئی دہلی جانا تھا۔ میں نے اپنے میزبانوں سے رابطہ نہ رکھا تھا بہت سے لوگ جو میرے خیال میں کسٹم انسپکٹر تھے، میرے سامان کی تلاشی لے رہے تھے۔ اس سے پہلے بھی کئی بار میں نے تلاشی ہوتے دیکھی تھی لیکن اس وضع کی تلاشی کبھی نہیں دیکھی۔ میرا سامان کچھ زیادہ نہ تھا، بس ایک درمیانہ سا سوٹ کیس، جس میں میرے کپڑے تھے اور ایک چھوٹا سا چمڑے کا تھیلا، جس میں میرے ٹائلٹ کا سامان تھا۔

لیکن میری پتلونوں، جوتوں کو اٹھایا گیا جنہیں پانچ چہرے بغور دیکھ رہے تھے۔ پتلونوں کی جیبوں، حتیٰ کہ سلائی، تک کو بھی دیکھا گیا روم میں، میں نے اپنے جوتوں کو ایک اخبار میں، جسے میں نے ہوٹل سے حاصل کیا تھا، لپیٹ لیا تھا تاکہ کپڑے خراب نہ ہوں۔ اس اخبار کا نام شاید (Osservatore Romano) تھا۔

کسٹم والوں نے اس اخبار کو میز پر روشنی تلے پھیلا دیا تھا اور اسے اس احتیاط کے ساتھ تہہ کیا تھا جیسے وہ کوئی خفیہ دستاویز ہو۔ بالآخر اس اخبار کو میرے دوسرے کاغذات کے ساتھ رکھ دیا میرے جوتوں کا بھی اندر باہر سے بغور معائنہ کیا گیا، جیسے وہ بھی کسی نادر اور بیش قیمت کھود کر نکالی گئی شے کا کوئی نمونہ ہوں یہ ناقابل یقین تلاشی دو گھنٹے تک جاری رہی پھر انہوں نے میرے کاغذات کا ایک بنڈل بنایا جس میں میرا پاسپورٹ، پتوں کی نوٹ بک، وہ خط جو میں نے وزیراعظم کو دینا تھا اور رومن اخبار کا وہ حصہ شامل تھے۔ اس بنڈل کو میری آنکھوں کے سامنے موم سے بند کر دیا گیا اور مجھے بتایا گیا کہ میں ہوٹل جا سکتا ہوں۔

اپنی تمام تر قوت ارادی کو استعمال کرتے ہوئے، کہ کہیں میں چلی کا مثالی صبر نہ کھو بیٹھوں، میں نے ان سے کہا کہ کوئی بھی ہوٹل، مجھے بغیر میرے شناختی کاغذات کے رجسٹر میں اندراج نہ کرنے دے گا۔ اور ہندوستان آنے کا میرا مقصد وزیراعظم کو خط پہنچانا ہے، جو میں اب نہیں پہنچا سکتا، کیونکہ وہ انہوں نے ضبط کر لیا ہے "ہم ہوٹل سے بات کریں گے، اور وہ تمہیں جگہ دے دیں گے، تمہاری چیزیں تمہیں وقت پر مل جائیں گی" مجھے جواباً کہا گیا۔

یہ وہ ملک تھا، جس کی آزادی کی جدوجہد بحیثیت ایک نوجوان کے میرے تجربے کا حصہ رہی تھی، میں نے سوچا اور اپنے سوٹ کیس اور منہ کو ایک ساتھ بند کیا، بس ایک خالی لفظ جو میرے ذہن میں گونجا ـــــ "لعنت" تھا۔

ہوٹل میں میری ملاقات پروفیسر (Baera) سے ہوئی جسے میں نے اس حادثے کے بارے میں بتایا۔ وہ ایک خوش مزاج ہندو تھا۔ اس نے ان واقعات کو سرسری طور پر سنا اپنے ملک کے بارے میں، جو اس کی دانست میں ابھی تکمیل کے مراحل میں تھا، اس کا رویہ برداشت کرنے کا تھا۔ میں نے اس کے برعکس اس انتشار میں خاصی بیہودگی کو دیکھا تھا کسی خوش آئند بات سے کہیں دور جس کی میں نے ایک نو آزاد وطن سے توقع کی تھی۔

(Joliot Curie) کا دوست، جس کے لئے میں اس کا خط لے کر آیا تھا، ہندوستان میں نیوکلیر فزکس کے شعبے کا ڈائریکٹر تھا۔ اس نے مجھے اپنی تنصیبات دکھانے کے لئے مدعو کیا تھا، اور یہ بھی بتایا تھا کہ اسی روز ہمیں وزیراعظم ہندوستان کی بہن کے ہاں دوپہر کے کھانے پر بھی جانا ہے۔

میری قسمت ایسی ہی رہی تھی اور ایسی ہی آئندہ عمر بھی رہی اگر ایک ہاتھ ڈنڈے سے میری پسلیوں کو کچوکے دیتا تو دوسرا ہاتھ اس کی تلافی کے طور پر مجھے پھولوں کا گلدستہ پیش کرتا۔ نیوکلیر ریسرچ کا ادارہ ان صاف شفاف چمکدار جگہوں میں سے ایک تھا، جہاں مرد، عورتیں، سفید لباس میں ملبوس بہتے ہوئے پانی کی طرح راہ داریوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ سیاہ تختوں اور بڑے آلات کے ارد گرد اپنا رستہ بناتے ہوئے میں سائنسی تفصیلات کا محض خفیف سا حصہ ہی سمجھ سکا لیکن یہاں کا آنا ایک تطہیر کرنے والا غسل تھا، جس نے پولیس کے ہاتھوں میری تذلیل کے زخموں کو دھو دیا تھا۔

اپنی دھندلی یادداشت کے مطابق میں ایک پیالے کو دیکھتا ہوں، جس میں پارہ موجود ہے، اس دھات سے زیادہ کوئی شے حیران کن نہیں، جو اپنی توانائی کو کسی حیوانی زندگی کی شکل میں ظاہر کرتی ہے۔ اس کی حرکت، اس کی مائع میں ڈھلنے کی صلاحیت، دائروں اور طلسماتی تبدیلیوں نے ہمیشہ میرے تخیل کو متوجہ کیا ہے۔

میں نہرو کی بہن کا نام بھول گیا ہوں، جس کے ہاں اس روز ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ اس کی موجودگی میں میری بدمزاجی منتشر ہو گئی تھی۔

وہ بے حد حسین عورت تھی، جو کسی بھڑکیلی ایکٹریس کی طرح بنی سنوری تھی۔ اس کی ساری کے چمکدار رنگ، سونے اور موتیوں کے زیورات نے اس کے احساس تفاخر کو بڑھا دیا تھا میں اس سے متاثر ہوا تھا، لیکن ایسی مہذب خاتون کا ہاتھوں سے کھانا ــــ اس کی ہیروں کی انگوٹھیوں والی لمبی انگلیوں کو چاول اور سالن میں ڈوبے ہوئے دیکھنا ایک عجیب تضاد تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نئی دہلی کی جانب عازم سفر ہوں تاکہ اس کے بھائی اور وہاں دوسرے امن دوستوں سے مل

سکوں۔ جواب میں اس خاتون نے کہا تھا کہ اس کے خیال میں ہندوستان کے تمام لوگوں کو اس تحریک کا ساتھ دینا چاہئے۔

اسی سہ پہر کو ہوٹل میں مجھے اپنے کاغذات کا بنڈل موصول ہوا دہری شخصیت والی پولیس نے اس موم کی مہر کو جسے انہوں نے خود بنڈل پر بند کیا تھا کھول ڈالا تھا۔ یقیناً انہوں نے میرے تمام کاغذات کی تصاویر بنا لی ہوں گی، جس میں میری لانڈری کی رسیدیں بھی شامل تھیں۔ بعد میں مجھے علم ہوا کہ وہ تمام لوگ، جن کے پتے میرے پاس نوٹ بک میں درج تھے، پولیس ان سب سے جا کر ملتی رہی تھی۔ ان لوگوں میں (Ricardo) کی بیوہ بھی شامل تھی، جو اس وقت میری سالی تھی۔ یہ عورت ایک صوفی تھی جس کا واحد خواب ایشیائی فلسفے تھے۔ وہ ہندوستان کے ایک دور افتادہ گاؤں میں رہائش پذیر تھی۔ میری پتوں والی نوٹ بک میں اس کے نام کی موجودگی اس کے لئے بھی خاصی پریشانی کا موجب رہی تھی۔

ہندوستان کے دارالحکومت نئی دہلی پہنچتے ہی، اسی روز میں چھ سات ممتاز شخصیات سے ملا، جو خود کو آسمانی آگ سے بچانے کے لئے سائبان تلے بیٹھے تھے۔ ان میں ادیب، فلسفی ہندو اور بدھ مذہب کے راہب تھے۔ یہ ہندوستان کے وہ لوگ تھے، جو تعریف کی حد تک سادہ اور کسی قسم کے تصنع سے بالاتر تھے۔ ہر شخص نے اتفاق کیا کہ تحریک امن کے حامی لگن کے ساتھ اپنے ملک میں ایک نہ ٹوٹنے والی روایت اور افہام و تفہیم کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ انہوں نے دانشمندی سے بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی قسم کی مذہبی یا قومی اجارہ داری کے جھکاؤ کو درست کر لینا چاہئے۔ کسی بھی اشتراکی، بدھ مت کے پیرو یا کسی متوسط طبقے کو تحریک پر حق نہیں جتانا چاہئے۔ اہم بات یا مسئلے کا نقطہ منتہی یہ تھا کہ تمام گروہوں کو حصہ لینا چاہئے۔ میں ان سے متفق تھا۔

چلی کا سفیر (Drjoan Marin) ڈاکٹر جان مارن ایک ادیب اور ڈاکٹر میرا ایک پرانا دوست تھا۔ وہ مجھ سے رات کے کھانے کے وقت ملنے آیا اور بہت سی ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ اس کی پولیس کے سربراہ سے گفتگو رہی تھی۔

ایک مخصوص پرسکون انداز میں، جو بااختیار لوگ سفارت کاروں سے بات چیت میں برتتے ہیں، ہندوستانی پولیس کے سربراہ نے اسے بتایا تھا کہ میری حرکات کے بارے میں ہندوستانی حکومت پریشان ہے اور اسے امید ہے کہ میں جلد ہی ملک سے چلا جاؤں گا میں نے سفیر کو بتایا کہ میری تمام مصروفیت ہوٹل کے باغ میں چھ سات ممتاز لوگوں سے گفتگو تھی۔ جن کے خیالات میری دانست میں ایک مشترک آگہی تھی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں (Joliot Curie) کا پیغام وزیراعظم تک پہنچاتے ہی، اس ملک کے لئے اپنی تمام تر ہمدردیوں کے باوجود، ایک منٹ بھی یہاں

کسی بغیر وجہ کے نہ ٹھہروں گا۔

میرے ملک کے سفیر نے جو چلی میں سوشلسٹ پارٹی کے بانیوں میں سے تھا لیکن شاید بڑھتی ہوئی عمر اور سفارتی مراعات کے باعث نرم پڑ چکا تھا. ہندوستانی حکومت کے احمقانہ رویئے پر کسی غصے کا اظہار نہ کیا اور میں نے اس سے کسی مدد کی درخواست نہ کی۔ ہم خوشگوار انداز میں جدا ہوئے۔ وہ ایک بڑے فرض سے سبکدوش ہوتے ہوئے, جو میرے ہندوستان جانے سے اس پر پڑ گیا تھا۔ اور میں اس کے بارے میں اس کی ذہانت اور دوستی کے تمام تاثرات کو ہمیشہ کے لئے کھو چکا تھا۔

نہرو نے مجھ سے ملاقات کے لئے اگلے دن صبح کو اپنے دفتر میں وقت دیا تھا۔ وہ کھڑا ہوا اور چہرے پر کسی رسمی استقبالیہ مسکراہٹ کے شائبہ کے بغیر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اس کے چہرے کی اتنی تصاویر اتر چکی ہیں کہ بیان کرنے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ سیاہ سرد آنکھوں نے کسی احساس کے بغیر مجھے دیکھا۔ تیس برس پہلے وہ اور اس کا باپ آزادی کے لئے ایک بڑی ریلی میں مجھ سے متعارف ہوئے تھے۔ جس کا میں نے اس سے ذکر کیا لیکن اس سے اس کے چہرے کے تاثر میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اس نے سرد آنکھوں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے ہربات کا جواب ہاں یا ناں میں دیا۔ میں نے اس کے دوست (Joliot Curie) کا خط اس کے حوالے کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس فرانسیسی سائنس دان کی بے حد عزت کرتا ہے۔ اور پھر خط پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس خط میں (Curie) نے نہرو سے میرا ذکر کیا تھا اور اسے میری مدد کرنے کے لئے کہا تھا۔ خط ختم کر کے اس نے اسے واپس لفافے میں ڈالا اور بغیر ایک حرف بولے مجھے دیکھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میری موجودگی نے ایک غیر ارادی ناپسندیدگی کو اس کے ہاں تحریک دے دی ہے۔ یہ بات بھی میرے ذہن میں آئی کہ یہ سفراوی رنگت کا شخص آج کل یقیناً خراب جسمانی, سیاسی اور جذباتی تجربے سے دو چار ہو گا کوئی بات ارفع اور توانا تھی اس کے بارے میں, جیسے وہ محض احکامات دینے کا عادی تھا لیکن رہنما ہونے کی طاقت نہ رکھتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اس کا باپ پنڈت موتی لعل پرانے جاگیرداروں کی قبیل میں سے تھا۔ اور جو گاندھی کا خزانچی اعلیٰ رہ چکا تھا, جس نے کانگریس کی تحریک کو صرف اپنی سیاسی ذہانت ہی سے نہیں بلکہ اپنی دولت سے بھی نوازا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید میرے سامنے موجود خاموش آدمی کسی لطیف طریقے سے دوبارہ زمیندار بن گیا ہے اور مجھے اسی لاتعلقی سے دیکھ رہا ہے, جس سے وہ اپنے کسی برہنہ پا کسان کو دیکھے گا۔

”میں پیرس واپس پہنچنے پر پروفیسر (Joliot curie) کو کیا بتاؤں گا؟“ میں اس کے خط

کا جواب دے دوں گا" اس نے خشک لہجے میں کہا چند منٹ میں خاموش رہا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک صدی بیت گئی ہو۔ نہرو نے کچھ کہنے کے بارے میں کسی تاثر کا اظہار نہ کیا۔ نہ ہی کسی قسم کی بے چینی کے تاثرات اس کے چہرے پر ابھرے جیسے. بس میرا وہاں موجود ہونا ٹھیک نہ تھا. مجھے یہ احساس شدت کے ساتھ ہونے لگا کہ میں کتنے اہم شخص کا وقت ضائع کر رہا ہوں۔ مجھے خیال آیا کہ اپنے اس مقصد کے بارے میں مجھے کچھ کہنا ہو گا۔

سرد جنگ اب کسی بھی لمحے بھڑک سکتی تھی۔ ایک اور خوفناک تبدیلی انسانیت کو ہڑپ کر سکتی ہے۔ میں نے ایٹمی اسلحے کے خوفناک خطرے کا بھی ذکر کیا اور ان کے لئے، جو جنگ سے بچاؤ کی خاطر مل کر رہنا چاہتے تھے، یہ کس قدر اہم تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں مستغرق رہا جیسے کہ اس نے کچھ نہ سنا ہو، چند لمحوں کے بعد وہ بولا۔

"اصولی طور پر دونوں سمت سے ایک دوسرے پر امن کے لئے دلائل کی بوچھاڑ جاری ہے۔"

"ذاتی طور پر" میں نے کہا "میرے خیال میں، وہ تمام لوگ، جو امن کی بات کرتے ہیں یا اس کے لئے کچھ دینا چاہتے ہیں، ایک ہی فریق اور ایک ہی تحریک سے تعلق رکھتے ہیں، ہم کسی کو بھی اس سے خارج نہیں کرنا چاہتے، علاوہ ان کے جو انتقام اور جنگ کی تبلیغ کرتے ہیں۔"

اب وہاں گہری خاموشی تھی، مجھے احساس ہوا کہ گفتگو ہو چکی میں کھڑا ہوا اور اپنا ہاتھ اجازت کے لئے اٹھایا۔ اس نے خاموشی سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ اور جب میں دروازے کی طرف بڑھا تو اس نے کسی قدر دوستانے انداز میں کہا۔

"کیا میں تمہارے لئے کچھ کر سکتا ہوں، تم کسی چیز کی خواہش کرو گے۔ میں اپنے ردعمل میں خاصا ست واقع ہوا ہوں اور اپنے لئے بدقسمتی سے، میں دل کا برا نہیں ہوں، پھر بھی زندگی میں پہلی بار میں نے جارحانہ انداز اختیار کیا۔

"اوہ ہاں! میں تو بھول ہی گیا، میں ایک بار ہندوستان میں رہ چکا ہوں، لیکن تاج محل دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا جو نئی دہلی سے اس قدر نزدیک ہے، یہ اچھا موقع تھا کہ میں اس شاندار یادگار کو دیکھ لیتا، اگر پولیس نے مجھے شہر چھوڑنے اور فوراً یورپ جانے کے بارے میں نہ کہا ہوتا، لیکن اب میں کل واپس جا رہا ہوں۔"

اپنے اس مزاحمتی رویئے سے خوش ہوتے ہوئے، میں نے جلدی سے خدا حافظ کہا اور اس کے دفتر سے نکل آیا۔

ہوٹل منیجر استقبالئے پر میرا منتظر تھا۔

"آپ کے لئے میرے پاس ایک پیغام ہے، انہوں نے مجھے حکومتی دفتر کی طرف سے بتایا ہے کہ آپ چاہیں تو تاج محل دیکھنے جاسکتے ہیں" "مجھے میرا بل دو" میں نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں وہاں نہ جاسکوں گا، میں پہلی پرواز سے پیرس کے لئے جارہا ہوں" پانچ سال بعد ماسکو میں مجھے، سالانہ لینن امن کمیٹی کے بین القوامی اجتماع میں بیٹھنے کا موقع ملا، جس کا میں رکن تھا جب سال رواں کے امیدواروں کی نامزدگی کا موقع آیا تو ہندوستان کے مندوب نے وزیر اعظم نہرو کا نام تجویز کیا۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ کا سایہ دوڑ گیا، لیکن جیوری کے دوسرے ممبران میں سے کوئی نہ سمجھ سکا اور میں نے اپنا ووٹ اس کے حق میں دے دیا اس طرح بین الاقوامی لینن امن انعام نے نہرو کو دنیا کے امن کے سورماؤں میں سے ایک بنا دیا۔

چین کا پہلا دورہ

انقلاب چین کے بعد، میں دوبارہ وہاں گیا۔ پہلی بار ۱۹۵۱ء میں جب مجھے (Sun Yat-sen) سن یات سن کی بیوہ مادام سونگ چنگ لنگ (Soong Ching Ling) کے لئے لینن امن انعام دینے کے لئے منتخب کیا گیا تھا مادام کو سونے کا تمغہ ملنا تھا، جس کے لئے اس کا نام چین کے نائب وزیر اعظم (Kuo-Mo-Jo) کوموجو نے تجویز کیا تھا کوموجو (Aragon) آراگون کے ہمراہ انعام کمیٹی کا نائب چیئرمین بھی تھا۔

(Ana Seghers) فلم پروڈیوسر (Aleyondrov) اور ان کے علاوہ کچھ اور دوسرے جن کا نام یاد نہیں۔ ایہرن برگ بھی جیوری میں میرے ہمراہ تھا۔ جس کی وجہ سے ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ آئندہ سال انعام حاصل کرنے والوں کے ناموں میں پکاسو بریخت اور رافیل البرتی شامل ہوں گے۔ بیشک یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ چین جانے کے لئے ہم نے ٹرانس سائبیرین ریل کا سفر اختیار کیا۔ اس گاڑی میں سفر کرنا، بحری جہاز میں سفر کے مترادف تھا، جو زمین پر پراسرار دوریوں میں، حد نظر تک چلتی تھی۔ کھڑکی سے باہر دور دور تک زرد رنگ تھا۔ یہ خزاں کے موسم کا وسط تھا اور سفیدے کے درختوں کے پیلے پتے ہر طرف نظر آتے تھے۔ اور اس سے بھی دور، جہاں تک آنکھ دیکھ سکتی تھی، ٹنڈرہ تیگا کی چراگاہیں تھیں۔ وقتاً فوقتاً نئے شہروں کے اسٹیشن۔ ایہرن برگ اور میں ٹانگیں سیدھی کرنے کے بہانے باہر نکل آئے۔ اسٹیشنوں پر کسانوں کے ہجوم اپنی پوٹلیوں، صندوقوں کے ساتھ انتظار گاہوں میں ٹرین کے منتظر ہوتے۔ ہمارے پاس ان جگہوں میں چلنے پھرنے کے لئے بمشکل وقت ہوتا۔ یہ سارے اسٹیشن ایک جیسے تھے۔ ہر اسٹیشن پر اسٹالن کا سیمنٹ کا بنا مجسمہ ہوتا کبھی یہ نقرئی رنگ اور کبھی سبز رنگ میں

رنگا نظر آتا۔ تقریباً ایک درجن مجسمے جو ہم نے دیکھے بالکل ایک جیسے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان میں کون ساخراب اور کون ساستھرا یا نقرئی تھا۔ سفر کے دوران ایہرن برگ نے مجھے ایک ہفتہ تک اپنی بذلہ سنجی اور شکی مزاجی کیفیت کی بنا پر لطف اندوز کئے رکھا۔ وہ ایک محب الوطن روسی تھا، لیکن اس نے اس خاص حصے میں زندگی کے کئی پہلوؤں پر مسکراتے ہوئے طنزیہ انداز میں بحث کی۔ برلن میں وہ سرخ فوج کے ہمراہ آیا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک بہترین جنگی نامہ نگار تھا۔ سرخ سپاہی اس شرمیلے جنونی شخص سے بے پناہ پیار کرتے تھے۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا، جب اس نے ماسکو میں مجھے ان سپاہیوں کی طرف سے اس کے لئے بھیجے گئے تحائف دکھائے تھے۔ جنہیں جرمنی کے کھنڈرات سے دریافت کیا گیا تھا۔ ان تحائف میں ایک بندوق تھی، جسے بلجیم کے بندوق سازوں نے نپولین بوناپارٹ کے لئے بنایا تھا اور (Ronsord) کی تخلیقات کی دو جلدیں، جو فرانس میں ۱۶۵۰ء میں چھپی تھیں ان جلدوں پر موجود دستخط بارش یا خون سے داغ دار تھے۔ ایہرن برگ نے نپولین والی بندوق تو فرانس کے میوزیم کو دے دی تھی "میں بھلا اس کا کیا کروں گا؟" بندوق کی نالی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا تھا لیکن (Ronsard) کی ننھی منی کتابوں کو اس نے پیار سے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

ایہرن برگ فرانسیسی ثقافت کا ایک پرجوش مداح تھا۔ گاڑی میں اس نے اپنی خفیہ نظموں میں سے ایک نظم مجھے سنائی تھی۔ یہ ایک مختصر سا محبت کا گیت تھا، جس میں فرانس کو محبوب دکھایا گیا تھا، جس سے شاعر پیار کرتا تھا۔ میں اس نظم کو خفیہ اس لئے کہتا ہوں، کیونکہ یہ وہ دور تھا جب روس میں بین القوامیت کے الزامات کی بھرمار تھی اخبارات اکثر ابہام کے الزامات تراشتے، جدید آرٹ انہیں بین الاقوامی نظر آتا اچانک فلاں فلاں ادیب یا مصور توقیر کھو بیٹھتا اور کسی بھی الزام کے تحت اس کا نام حدف بہ تنقید ہو جاتا۔ لہٰذا ایک چھپے ہوئے پھول کی مانند ایہرن برگ کی نظم کو اپنی ملائمیت کو اپنے تک محدود رکھنا تھا جو کچھ ایہرن برگ نے مجھے دکھایا تھا، اسے جلد ہی اسٹالن کی تاریک رات میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو جانا تھا غائب ہو جانے کو میں ان کے متضاد کردار اور اختلافات کو مورد الزام ٹھہراؤں گا۔

اپنے بے ترتیب بالوں، گہری شکنوں، نکوٹین سے داغ دار دانتوں اور سرد سلیٹی آنکھوں اور ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ ایہرن برگ ایک بوڑھا شکی مزاج اور خاصی حد تک مایوس انسان تھا۔ حال ہی میں جب میں نے اپنی آنکھیں اس عظیم انقلاب کی جانب کھولیں تو میں گناہ کی تفصیلوں سے اندھا ہو گیا تھا مجھے وقت کی عام غریبانہ روش میں لڑائی کے لئے یا ان مجسموں میں، جو سنہرے یا نقرئی رنگ میں رنگے تھے، کچھ کم ہی ملاوقت بتائے گا کہ میں صحیح نہ تھا، لیکن میں نہیں سوچتا

کہ ایہرن برگ کو اس المیے کی وسعت کے بارے میں احساس ہو گیا تھا۔ اس کی بڑائی کا انکشاف ہم پر بیسویں کانگریس میں ہو گا۔ ریل گاڑی اس پھیلے ہوئے زرد حصے میں سنیل (Snail) کی رفتار پر چلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی دن بہ دن سفیدے کے درخت پہ درخت ہم (Ural) کے پہاڑی سلسلے سے گزر چکے تھے اور اب سائبیریا سے گزر رہے تھے۔

ایک دن ہم ڈائنگ کار میں دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ جب ایک سپاہی سے گھری ہوئی میز نے مجھے متوجہ کیا۔ وہ نشے میں مدہوش ایک مسکراتا ہوا نوجوان تھا، جس کے رخسار اچھی صحت کی چغلی کھا رہے تھے۔ وہ بیرے سے مسلسل کچے انڈے منگواتا رہا اور انڈے کو بخوشی اپنی پلیٹ میں توڑ دیتا اور فوراً ہی وہ دو تین انڈوں کی پھر فرمائش کر دیتا۔ اس کی بچوں جیسی نیلی آنکھوں اور چہرے پر مستی کے عالم سے اس کی سرخوشی کا اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ اس سارے کام میں خاصی دیر سے مشغول ہو گا۔ کیونکہ اب انڈے کی سفیدی اور زردی اس کی پلیٹ سے اچھل کر خطرناک انداز میں میز کی ایک سمت سے فرش پر گر رہی تھی۔ سپاہی نے بیرے کو پرجوش انداز میں آواز دے کر مزید انڈے لانے کو کہا، جیسے وہ اپنے خزانے میں اضافہ کر رہا ہو۔ میری نظریں اس سرنگین منظر پر لگی ہوئی تھیں، جو اس غیر متوقع سائبیرین خالی پن اور سمندر جیسے ماحول میں بے حد معصوم لگ رہا تھا۔ گھبرائے ہوئے بیرے نے بالآخر ایک ملٹری پولیس کے سپاہی کو بلایا، محافظ نے جو پوری طرح مسلح تھا، سپاہی کو سختی سے گھورا، لیکن سپاہی نے کسی بات کی پرواہ کئے بغیر انڈے توڑنے کے کھیل کو جاری رکھا۔ مجھے توقع تھی کہ اب ملٹری پولیس کا سپاہی اس نوجوان سپاہی کو ایک ہلے میں اس کے خواب سے بیدار کر دے گا۔ لیکن مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ لمبا تڑنگا قد آور سپاہی اس لڑکے کے پاس بیٹھ گیا اور مسکراتے ہوئے اسے سمجھانے لگا۔ پھر اچانک اس نے نوجوان سپاہی کو بازو سے پکڑتے ہوئے بڑے بھائی کی طرح اٹھایا اور ڈائنگ کار کے درواز سے باہر اسٹیشن پر اور پھر قصبے کی گلیوں کی طرف لے گیا۔ میں نے تلخی سے سوچا، کہ کیا ہوا ہوتا، اگر یہی حرکت کسی غریب نشئی انڈین سے بین الاستوائی ریل گاڑی، میں سرزد ہو جاتی۔

ٹرانس سائبیرین دنوں کے دوران ایہرن برگ کو پوری توانائی کے ساتھ صبح اور سہ پہر کو پنے ٹائپ رائیٹر کے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے سنا جا سکتا تھا۔ وہیں اس نے (The Thorn) سے ۔لا اپنا آخری ناول (The Ninth Wave) ختم کیا تھا، جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے اکادکا (Captains Verse) کی کچھ نظموں کو سنا اور کچھ نظمیں (Matilde) کے لئے، محبت کی نظمیں تحریر کیں۔ جو بعد میں (Naples) نیپلز میں بغیر کسی نام کے شائع ہوئی تھیں۔

ریل گاڑی کو ہم نے (Irkotsk) میں چھوڑ دیا، منگولیا کے لئے ہوائی جہاز پر سوار ہونے

سے پہلے ہم سائبیریا کی سرحد پر واقع مشہور جھیل بیکال تک ٹہلتے ہوئے گئے۔ یہ سرحدی علاقہ زار کے زمانے میں آزادی کا دروازہ سمجھا جاتا تھا۔ قیدیوں اور جلاوطنوں کے بارے میں خواب اور خیالات، جو اس جھیل تک آوارہ پھرتے رہے فرار کا بس ایک یہی واحد راستہ تھا__

بیکال! بیکال مدھم روسی آوازیں اب بھی پرانے گیت گاتے ہوئے دہراتی ہیں۔ جھیلوں کے مطالعے کے ادارے نے دوپہر کے کھانے پر ہمیں مدعو کر لیا سائنس دان اپنے رازوں سے ہمیں آگاہ کر رہے تھے۔ آج تک کوئی بھی شخص اس جھیل کی اصل گہرائی کا اندازہ نہیں لگا سکا۔ ارل پہاڑوں کے بیٹے اور آنکھ میں سے کوئی بھی نہیں بعض غیر معمولی مچھلیاں اس کی دو ہزار فٹ کی گہرائی سے حاصل کی جاتی ہیں۔ اندھی مچھلی، جسے اس کی اندھیری رات کی گہرائیوں سے نکالا جاتا ہے۔ اس وضع کی مچھلی کے لئے میری اشتہا بھڑک اٹھی تھی اور میں نے سائنس دانوں سے چند مچھلیاں کھانے کی فرمائش کر ڈالی۔ میں دنیا میں چند لوگوں میں سے ایک ہوں، جس نے ان تاریکیوں سے حاصل کردہ مچھلیوں کو عمدہ سائبیرین ووڈکا کے ساتھ تناول کیا۔

یہاں سے ہم نے منگولیا تک پرواز کی۔ میرے ذہن میں اس شہابی منظر کی، جہاں کے رہنے والے اب بھی خانہ بدوشوں کی طرح خیموں میں زندگی گزارتے ہیں، ایک دھندلی سی یاد موجود ہے۔ جب کہ اب وہاں پہلی بار چھاپے خانے اور یونیورسٹیاں بن گئی تھیں (Ulanbot ar) کے اطراف میں لامحدود بنجر زمین ایک دائرے کی شکل میں بالکل میرے ملک کے صحرا (Ata cama) کی طرح کھلتی ہے جس میں کہیں کہیں اونٹ نظر آ جاتے ہیں، جو تنہائی کو ایک نئی جہت دیتے ہیں۔

اتفاقاً میں نے منگولیا کی وہسکی کو بے حد قیمتی چاندی کے پیالوں میں نوش کیا۔ یہاں کے لوگ ہر چیز سے شراب کشید کر لیتے ہیں۔

یہ وہسکی اونٹ کے خمیر شدہ دودھ سے تیار کی گئی تھی۔ اب بھی میں جب اس کے ذائقے کو یاد کرتا ہوں، تو میری ریڑھ کی ہڈی میں پھریریاں سی آتی ہیں لیکن (Ulan Bator) میں رہنا کس قدر پر لطف تھا مجھ جیسے کسی شخص کے لئے، جو تمام خوبصورت ناموں میں رہتا ہے میں ان میں ایسے رہتا ہوں، جیسے خواب کے محلات ہیں، جو صرف میرے لئے بنائے گئے ہوں۔ اور اسی طرح میں ہر حرف سے محظوظ ہوتے ہوئے سنگاپور میں سمرقند کے نام میں رہا۔

جب میں مروں گا، تو میں کسی نام میں دفن ہونا چاہوں گا، کوئی بہت ہی خصوصی چنا ہوا، ایسا نام جو سننے میں بھی خوبصورت لگے تاکہ اس کے حرف سمندر کے قریب میری ہڈیوں پر گاتے رہیں۔

چینی لوگ دنیا میں سب سے زیادہ مسکراتے ہیں۔ وہ نو آبادیاتی نظام، انقلابات، قحط اور خونی مار دھاڑ میں بھی اس طرح مسکراتے ہیں کہ کوئی اور نہیں مسکرا سکتا۔ چینی بچوں کی مسکراہٹ خوبصورت ترین چاولوں کی وہ فصل ہے جو اس کثیر تعداد عوام نے کبھی حاصل کی ہے۔ لیکن چینی مسکراہٹ کی دو اقسام ہیں ایک قسم فطری ہے، جو گندمی چہروں کو روشن کرتی ہے۔ یہ مسکراہٹ کسانوں اور عوام کی کثیر تعداد کی ہے۔ دوسری ہٹائی جانے والی جھوٹی مسکراہٹ ہے، جسے ناک سے نیچے چپکایا اور ہٹایا جا سکتا ہے۔ یہ افسرانہ مسکراہٹ ہے۔ جب میں اور ابھرن برگ پہلی بار پیکنگ کے ہوائی اڈے پر اترے، تو ہمارے لئے ان دو مسکراہٹوں میں امتیاز کرنا مشکل تھا۔ حقیقی اور اچھی مسکراہٹیں کئی دنوں تک ہمارے ساتھ رہیں۔ یہ مسکراہٹیں ہمارے چینی ساتھی ادیبوں، ناول نگاروں اور شاعروں کی تھیں جنھوں نے اپنی شریفانہ مہمان نوازی سے ہمیں خوش آمدید کہا تھا یوں ہم (Ting Ling) ناول نگار ادیبوں کی یونین کے صدر اور اسٹالن انعام یافتہ (Maotung) اور دلکش (Aiching) پرانے کیمونسٹ اور شاعروں کے شہزادے سے ملے یہ سب کے سب فرانسیسی یا انگریزی زبان بولتے تھے۔ کئی سال بعد یہ تمام لوگ ثقافتی طوفان (Cultural Rev olotion) میں بہہ گئے تھے لیکن ہمارے وہاں پہنچنے پر یہ لوگ چینی ادب کے پھول تھے۔

اگلے روز لینن انعام کی تقریب انعامات کے بعد، جسے اس وقت تک اسٹالن انعام کہا جاتا تھا، ہم نے سوویت سفارت خانے میں کھانا کھایا۔ اس خاتون کے علاوہ، جسے یہ عزت بخشی گئی تھی، وہاں (Chouenlai) چو این لائی، بزرگ مارشل چوتھے (Marshal Chuteh) اور بہت سے دوسرے موجود تھے۔ سفیر اسٹالن گراڈ کا ایک ہیرو تھا۔ ایک مخصوص سوویت سپاہی، جو ایک کے بعد دوسرا جام لنڈھائے جا رہا تھا۔ میں (Soong Ching Ling) سونگ چنگ لنگ کے بالکل نزدیک بیٹھا ہوا تھا، جو اب بھی بے حد خوبصورت اور پرکشش تھی۔ اس دن سب سے زیادہ محترم شخصیت وہ تھی۔

ہم سب کے پاس دوڈکا کا بھرا ہوا نقرئی جار موجود تھا اکثر و بیشتر (Kanpai) کے لئے آواز آتی۔ یہ چینی جام لنڈھانے کا ایک انداز تھا، جس میں پورا گلاس ایک قطرہ چھوڑے بغیر ایک ہی گھونٹ میں خالی کرنا پڑتا تھا۔ میرے سامنے بوڑھا مارشل چوتھے اپنا گلاس بھرنے سے کبھی نہ چوکا۔ اپنے مخصوص دہقانی مسکراہٹ کے ساتھ وہ چند منٹوں میں مجھ پر سبقت لے جاتا۔ کھانے کے اختتام پر میں نے ایک ایسا لمحہ منتخب کیا، جب اس کی توجہ کسی اور جانب تھی اور میں نے اس کی بوتل سے ووڈکا پینے کی کوشش کی میرے شبہات کی تصدیق ہو گئی۔ میں نے دریافت کیا کہ مارشل کھانے کے ہمراہ محض پانی پی رہا تھا، جب کہ میں بڑی مقدار میں سیال آگ کو اپنے اندر اتار رہا

تھا۔

کافی پیتے وقت میز پر میرے برابر میں موجود سن یات سن کی بیوہ سونگ چنگ لنگ، (یہ وہ عظیم عورت تھی جسے عزت بخشنے کے لئے ہم یہاں آئے تھے) نے اپنے سگرٹ کیس سے سگرٹ کو نکالا، پھر مسکراتے ہوئے اس نے سگرٹ کیس کو میری طرف بڑھا دیا۔

"نہیں میں سگرٹ نہیں پیتا۔ شکریہ" میں نے اس سے کہا میں نے اس کے سگرٹ کیس کی تعریف کی، جس کے جواب میں اس نے

"مجھے یہ اپنی زندگی میں بہت اہم یادگار کی حیثیت سے عزیز ہے۔"

وہ واقعی چونکا دینے والی شے تھی۔ خالص سونے کا بنا ہوا، جس میں لعل اور ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ میں نے اسے بغور احتیاط سے دیکھ کر ایک بار مزید اس کی تعریف کرتے ہوئے اس کی مالکہ کو واپس کر دیا۔ بہت جلد ہی وہ بھول گئی تھی کہ میں اس کا سگریٹ کیس اسے لوٹا چکا ہوں کیونکہ جب ہم کھڑے ہوئے، تو اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔

"ازراہ کرم میرا سگریٹ کیس؟"

مجھے یقین تھا کہ میں سگرٹ کیس لوٹا چکا ہوں۔ لیکن پر بھی میں نے اسے کسی کامیابی کے بغیر میز کے نیچے تلاش کیا۔

سن یات سن کی بیوہ کے چہرہ سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی اور دو سیاہ آنکھیں مجھ میں سنگدل روشنی کی کرنوں کی طرح اتری جا رہی تھیں۔ مقدش شے کا کہیں بھی پتہ نہ تھا۔ اور میں بے تکے پن سے اس کے گم ہونے پر خود کو ذمے دار تصور کر رہا تھا۔ ادھر وہ دو سیاہ کرنیں مجھے یہ قائل کرنے کے قریب تھیں کہ میں ہیروں کا چور ہوں۔

خوش قسمتی سے جب معاملہ میری برداشت سے باہر ہو رہا تھا تو میں نے وہ سگریٹ کیس دوبارہ اس کے ہاتھوں میں نمودار ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اسے اپنے بیگ میں تلاش کر لیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ واپس لوٹ آئی تھی۔ لیکن میں اس کے بعد مدتوں نہ مسکرا سکا۔

اب مجھے خیال آتا ہے کہ ثقافتی انقلاب نے شاید مادام سونگ چنگ لنگ کو اس کے خوبصورت طلائی سگرٹ کیس سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا ہو گا۔ سال کے اس وقت چینی مرد او عورتیں ایک ہی وضع کا میکینکوں جیسا نیلا اوور آل پہنتے تھے جس سے ان کے ہاں ایک جیس آسمانی رنگت نمایاں ہو جاتی کسی ملبوس کا کوئی چیتھڑا نہیں، لیکن موٹریں بھی نظر نہ آتی تھیں۔ بڑے بڑے ہجوم ہر جگہ کو بھرے رکھتے۔ جو ہر جگہ بہتے چلے آتے۔

یہ انقلاب کے بعد دوسرا سال تھا۔ یقیناً بہت سی جگہوں پر دشواریاں تھیں اور

چیزوں میں کمی بھی ہو گئی۔ لیکن پیکنگ کے دورے میں کہیں بھی ہمیں ایسا نظر نہ آیا۔ مجھے اور ایہرن برگ کو جس بات نے پریشان کیا، وہ چھوٹی چھوٹی جزیات تھیں۔ نظام میں چھوٹی چھوٹی گرہیں جب ہم جرابوں کا ایک جوڑا یا رومال خریدنا چاہتے تھے تو اس سے ملک کے لئے مسئلہ پیدا ہو گیا۔ ہمارے چینی ساتھیوں نے آپس میں اس پر بحث کی۔ خاصے اعصابی تناؤ کے بعد ہم نے ایک کارواں میں ہوٹل کو چھوڑا۔ ہماری کار سب سے آگے تھی محافظوں، پولیس اور ترجمانوں کی کاریں عقب میں تھیں گاڑیوں کا ایک جتھا، جو ہمیشہ زیادہ ہوتا، ہجوم میں سے رستہ بناتا ہوا بڑھا۔ ہم کسی برفانی طوفان کی طرح لوگوں کے درمیان میں بنائے گئے تنگ رستے میں سے گزر رہے تھے۔
جب ہم اسٹور پہنچے تو ہمارے چینی ساتھی چھلانگ لگا کر نیچے اترے اور سارے خریداروں کو اسٹور سے نکال دیا گیا۔ سارا ٹریفک رک گیا تھا اور انہوں نے اپنے جسموں سے ایک رکاوٹ کھڑی کر رکھی تھی۔ انسانی رستہ، جس میں ایہرن برگ اور میں سر جھکائے ہوئے چلے اور پندرہ منٹ بعد بدستور سر جھکائے ہوئے اپنے ہاتھوں میں پیکٹ تھامے یہ تہیہ کئے واپس لوٹے کہ چین میں آئندہ کبھی دوبارہ جرابوں کا جوڑا نہ خریدیں گے۔ ان باتوں پر ایہرن برگ کو بہت غصہ آتا تھا۔ مثال کے طور پر ایک ریستوران کا قصہ جو میں اب سنانے جا رہا ہوں۔ ہوٹل میں وہ ہمیں بے کار انگریزی کھانا کھلاتے، جو چین کو اپنے نو آبادیاتی آقاؤں سے ورثے میں ملا تھا، میں چینی کھانوں کا بڑا مداح ہوں، میں نے اپنے جوان ترجمان کو بتایا کہ میں پیکنگ کے مشہور کھانوں کے لئے ترس رہا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ وہ اس بارے میں دیکھے گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے کیا کیا، لیکن ہمیں ہوٹل کے بیہودہ بھنے ہوئے گائے کے گوشت کو مسلسل کھانا پڑا، ایک بار پھر میں نے ترجمان کی یاد دہانی کرائی۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا "ہمارے کامریڈ کئی بار اس صورتحال پر اکٹھے ہو کر بات چیت کر چکے ہیں یہ مسئلہ عنقریب حل ہو جائے گا۔"
اگلے دن استقبالیہ کمیٹی کا ایک اہم رکن ہم سے ملنے آیا۔ اپنی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے اس نے پوچھا کیا واقعی ہم چینی خوراک کھانا چاہتے ہیں ایہرن برگ نے اثبات میں سر ہلایا اور میں نے بھی اس میں اضافہ کرتے ہوئے بچپن سے مشہور چینی کھانوں کی خواہش کا اظہار کر دیا۔
"لیکن یہ ایک بڑا مسئلہ ہے" چینی کامریڈ نے پریشان انداز میں کہا اس نے سر کو ہلایا اور پھر کہنے لگا "تقریباً ناممکن"
ایہرن برگ نے اپنی شکی مسکراہٹ سے ایک بار پھر تصدیق کی دوسری طرف میں اس قدر پریشان ہو چکا تھا کہ میں نے کہا کامریڈ مہربانی کر کے پیرس جانے کے لئے میرے کاغذات تیار کر دیں اگر میں چینی خوراک چین میں نہیں کھا سکتا تو میں اسے لاطینی علاقے میں کھاؤں گا۔ جہاں یہ

کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

میرے شدید ردعمل کا جواب مل گیا۔ چار گھنٹے بعد اپنی بہت سے کمیٹیوں کے ہمراہ ہم ایک مشہور ریستوران تک پہنچے، جہاں پانچ صدیوں سے بطخ کی ڈش تیار کی جاتی تھی۔ یہ واقعی نہ بھلانے والی یادگار خوراک تھی دن رات کھلا رہنے والا یہ ریستوران ہمارے ہوٹل سے، جہاں ہم مقیم تھے محض تین سو میٹر کے فاصلے پر تھا۔

کپتان کی نظمیں

ایک جلاوطن کی حیثیت سے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک دشت نوردی کے دوران میں ایک ایسے ملک میں پہنچا، جسے میں نے پہلے نہ دیکھا تھا اور میں نے اس ملک اٹلی سے پیار کرنا سیکھ لیا۔

اس ملک میں ہر چیز مجھے اچھی لگی بطور خاص اطالوی سادگی، زیتون کا تیل، روٹی اور فوری طور پر تیار شدہ شراب، یہاں تک کہ پولیس بھی وہ پولیس جس نے کبھی مجھے نہ ستایا، لیکن جو ہمہ وقت سائے کی طرح میرے پیچھے لگی رہی۔ یہ پولیس کی طاقت تھی، جسے میں نے ہر جگہ دیکھا، اپنی نیند، حتیٰ کہ اپنے سوپ میں بھی۔

ادیبوں نے مجھے نظمیں سنانے کے لئے مدعو کیا تھا، میں نے پورے اعتماد کے ساتھ دانش گاہوں، تھیٹروں، (Gonoa) کے مزدوروں فلورنس (Florence) یورن (Turin) اور وینس (Venice) میں ہر جگہ نظمیں پڑھیں میں بھرے مجموں کے سامنے بے پناہ خوشی کے ساتھ نظمیں سناتا تھا کوئی میرے قریب ہی ہر نظم کو، مدھم اطالوی زبان میں دہراتا اور میں اپنی نظم کو اس عظیم زبان میں ایک خوشگوار اضافے سے سنتا۔ البتہ پولیس کو یہ بات کچھ پسند نہ تھی۔

(Castilian) میں تو ٹھیک تھا، لیکن اطالوی ترجمہ کوتاہیوں سے بھرپور تھا۔ امن کی تعریف میں سطور۔ ایک لفظ جو پہلے ہی مغربی دنیا میں متروک کر دیا گیا تھا اور بطور خاص میری شاعری کا عوامی جدوجہد کے حق میں رجحان خاصا خطرناک تھا میونسپل الیکشن میں ٹاؤن کونسل کی نشستیں عوامی پارٹیوں نے جیتی تھیں اور شاندار ٹاؤن ہال میں مجھے مہمان خصوصی کی حیثیت سے بلایا گیا کئی شہروں میں مجھے اعزازی شہریت دی گئی تھی۔

ایسا میلان، فلورنس اور جینوا میں ہوا تھا، کونسلر حضرات اپنے اعزازات سے مجھے میری نظموں کے سننے سے پہلے یا بعد میں نوازتے۔ اہم معززین شہر اور پادری ہال میں جمع ہوتے ہم شیمپین کا ایک گلاس پیتے، جسے میں اپنے دور افتادہ ملک کے لئے قبول کر لیتا۔ بغل گیر ہونے اور

ہاتھوں کے بوسے لینے کے مابین میں بالاخر شہر کے ہال کے سامنے کی سیڑھیوں تک پہنچ جاتا۔ پولیس، جس نے مجھے ایک لمحے کا بھی آرام نہ دیا تھا، ہر گلی میں میری منتظر ہوتی۔

وینس میں جو ہوا وہ ایک مذاق تھا۔

میں نے لیکچر ہال میں نظمیں پڑھیں ایک بار پھر مجھے اعزازی شہری بنایا گیا۔ لیکن پولیس مجھے اس شہر سے جہاں (Desdemona) نے جنم لیا تھا، اور دکھ اٹھائے تھے۔ باہر چاہتی تھی۔ وہ دن رات میرے ہوٹل کے دروازوں پر موجود رہتے میرا پرانا دوست (Vitoria Videli) وٹوریا ویڈیلی اور کلاونڈانٹ کارلوس (Trieste) سے میری نظمیں سننے آئے تھے اس نے میرے ہمراہ نہروں میں گنڈولا میں سوار ہونے اور وہاں سے کہنہ سلیٹی رنگ کے محلات کو دیکھنے کا لطف اٹھایا تھا جہاں تک پولیس کا تعلق ہے، وہ پہلے سے کہیں زیادہ مجھ پر دباؤ ڈال رہی ہے۔ ہمیشہ میرے تعقب میں۔ بس چند قدم پیچھے میں نے وینس سے جہاں مجھے نرغے میں لیا جارہا تھا۔ Casa) (Nova کیسانووا کی مانند بھاگنا چاہا۔ اس فرار میں وٹوریا ویڈیلی اور (Costarica) کوسٹاریکا کا ادیب (Joaqin) میرے ہمراہ شامل تھے۔ وینس کے دو سپاہی ہمارے پیچھے لپکے ہم نے فوراً ہی وہاں موجود واحد گنڈولا، جو کیمونسٹ میئر کی ملکیت تھی اور جس میں موٹر بھی لگی ہوئی تھی، چھلانگ لگا دی میئر کی گنڈولا نے تیزی سے نہر کے پانیوں کو کاٹنا شروع کر دیا جب کہ دوسری پارٹی کے نمائندے کشتی کی تلاش میں پاگل ہو رہے تھے۔ انہوں نے تعاقب کے لئے ایک جہاز کو حاصل کیا۔ یہ سیاہ رنگ کا تھا اور اس پر سنہری رنگ سے سجاوٹ کی گئی تھی۔ یہ جہاز وینس میں عشاق کے استعمال میں آتا تھا۔ اس بحری جہاز نے بہت دور تک ہمارا پیچھا کیا۔ بالکل جیسے کوئی بطخ کسی سمندری ڈولفن کا پیچھا کرے۔

آخر کار (Napels) نیپلز میں یہ معاملہ اپنے اختتام تک پہنچا۔ پولیس میرے ہوٹل آئی۔ نیپلز میں صبح سویرے کوئی بھی جلدی اپنے کام پر نہیں جاتا۔ یہاں تک کہ پولیس بھی۔

میرے پاسپورٹ میں ایک بلاوجہ کی غلطی کو بہانہ بناتے ہوئے انہوں نے مجھے اپنے افسر تک چلنے کے لئے کہا، وہاں انہوں نے مجھے کافی پیش کی اور بتایا کہ اس روز مجھے اطالوی سرزمین کو چھوڑنا ہو گا۔ اٹلی کے لئے میری محبت کسی کام نہ آئی۔

"مجھے یقین ہے کہ کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے" میں نے کہا۔

"قطعاً نہیں، آپ کے بارے میں ہماری رائے بہت اچھی ہے، لیکن آپ کو اٹلی چھوڑنا پڑے گا، تب انہوں نے ہر پھر کر مجھے بتایا کہ دراصل چلی کا سفارت خانہ اٹلی سے میرے نکالے جانے میں دلچسپی رکھتا ہے۔

گاڑی اس سہ پہر کو روانہ ہو رہی تھی۔ میرے تمام دوست پہلے ہی سے وہاں الوداع کہنے کے لئے موجود تھے۔

پھول، بوسے اور نعرے۔۔۔

روم تک گاڑی کے سفر میں پولیس کے محافظوں نے میری خدمت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ انہوں نے گاڑی میں میرا سوٹ کیس رکھا اور اتارا۔ وہ میرے لئے (La,unita) اور (Peesesera) اخبارات خرید کر لائے۔ ان میں کوئی بھی دائیں بازو کا اخبار نہ تھا۔ اپنے اور اپنے عزیزوں کے لئے انہوں نے مجھ سے میرے دستخط حاصل کئے۔ اس قدر مہذب پولیس کے سپاہی میں نے نہ دیکھے تھے۔

"جناب عالی! ہمیں بہت افسوس ہے، ہم غریب ہیں ہمارے خاندان ہیں، جن کی کفالت ہمارے ذمے ہے، اس لئے ہمیں احکامات کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔ ہمیں نفرت ہے......" روم کے اسٹیشن پر جہاں مجھے سرحد تک جانے کے لئے گاڑیاں بدلنی تھیں۔ میں ایک بہت بڑے ہجوم کو کھڑکی سے دیکھ سکتا تھا۔ میں نے لوگوں کو نعرے لگاتے سنا۔

ایک بڑا اجتماع اور اضطراب میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ سروں کے دریا سے اوپر پھولوں سے بھرے بازو، ریل گاڑی کی طرف پابلو، پابلو کہتے ہوئے بڑھے۔

جب میں باعزت و حفاظت ڈبے کی سیڑھیوں تک پہنچا تو میں چکراتے ہوئے بھنور کا مرکز بن چکا تھا۔ چند لمحوں میں مرد، عورتیں، ادیب، صحافی ہزار کے قریب لوگوں نے مجھے پولیس کے ہاتھوں سے چھین لیا تھا۔ پولیس جواباً آگے بڑھی اور مجھے میرے دوستوں کے ہاتھوں سے نکال لائی۔

ان ڈرامائی لمحات میں کچھ چہروں کو پہچاننے میں، میں کامیاب ہوا (Alberto Moravia) البرٹو موراویا اور اس کی بیوی (Elsa Morante) ایلسا مورانتے موراویا کی طرح ایک ناول نگار مشہور مصور (Rento Guttuso) رینانو گٹاسو اور کچھ دوسرے شاعر تھے (Christ Stopped at eboli) کا مشہور زمانہ مصنف (Carlo levi) کارلو لیوی، پھولوں کا ایک گلدستہ لئے موجود تھا۔ ان سب کے درمیان جب پھول زمین پر گر رہے تھے، ہیٹ اور چھتریاں ہوا میں تھیں، مکوں کی آوازیں دھماکوں کی طرح سنائی دیں۔ پولیس والوں کی مصیبت آئی ہوئی تھی اور ایک بار پھر مجھے میرے دوستوں نے دریافت کر لیا تھا اس جھگڑے کے دوران میری نظر ایلسا مورانتے پر پڑی، جو اپنی ریشمی چھتری کو ایک سپاہی کے سر پر مار رہی تھی، اچانک میں نے سامان کی ٹرالی لے جاتے ہوئے ایک موٹے آدمی کو دیکھا جس نے اپنا ڈنڈا سپاہی کی

کمر پر دے مارا تھا۔ یہ وہ رومن لوگ تھے جو میری پشت پناہی پر آمادہ تھے۔
حالات اس قدر گھمبیر ہوتے نظر آئے کہ پولیس نے مجھے ایک طرف گھسیٹ کر درخواست کی۔

"اپنے دوستوں سے کہو کہ وہ پرسکون ہو جائیں" مجمع چلا رہا تھا "نرودا، روم میں رہے گا، نرودا اٹلی نہیں چھوڑے گا۔ شاعر کو رہنے دو، چلی کے باشندے کو رہنے دو آسٹرین کو باہر پھینکو (آسٹرین سے مراد اٹلی کے وزیر اعظم (De Gasperi) سے تھی جو آسٹیرین نژاد تھا)۔

تقریباً آدھ گھنٹے کے جھگڑے کے بعد اوپر سے ایک حکم آیا جس میں مجھے اٹلی میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی، میرے دوست مجھے گلے لگا رہے تھے، مجھے چوم رہے تھے، میں اسٹیشن سے باہر نکل آیا اور آزردہ خاطر ان پھولوں پر چلنے لگا، جو لڑائی کے دوران ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔

اگلے روز، میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو سنیٹیر کے گھر میں پایا جہاں مجھے میرا مصور دوست (Renato Gutiuse) لے گیا تھا۔ جسے اب بھی حکومتی ارباب اقتدار کی بات پر بھروسہ نہ تھا، مجھے (Capri) کیپری کے جزیرے سے ایک برقیہ ملا۔ یہ ایک ممتاز تاریخ دان (Edwin cerio) کی طرف سے تھا۔ جس کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا۔ اس نے اطالوی رسم و رواج اور ثقافت کے اس انداز میں توہین آمز رویئے پر مذمت کا اظہار کرتے ہوئے مجھے کیپری کے ایک خوبصورت گھر میں رہنے کے لئے مدعو کیا تھا۔ یہ سب ایک خواب لگتا تھا۔ اور جب میں متیلڈی (Matilde) کے ہمراہ کیپری پہنچا تو خواب دیکھنے کا غیر حقیقی احساس بڑھ گیا تھا ہم سردیوں کی ایک رات کو اس خوبصورت جزیرے پر آئے تھے ساحل کے سایوں کے درمیان سفر بلند، نامانوس اور خاموش نظر آتا تھا۔ جانے کیا ہو گا؟ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ ایک چھوٹی گھوڑا گاڑی ہماری منتظر تھی۔

رات کی ویران گلیوں میں گھوڑا گاڑی اوپر اور اوپر کی طرف چلتی چلی گئی سفید سفید گم مکان، تنگ عمودی گلیاں ــــ بالاخر گاڑی رکی اور کوچوان ہمارے اسباب لے کر گھر میں چلا گیا۔ گھر کا رنگ سفید تھا اور بظاہر یہ خالی لگتا تھا۔

ہم اندر داخل ہوئے تو آتش دان میں روشن آگ کو دیکھا، وہاں شمعوں کی روشنی میں ایک دراز قامت آدمی کھڑا ہوا تھا، جس کے سر کے بال داڑھی سب سفید تھی اور اس کا سوٹ بھی سفید تھا۔ وہ مشہور تاریخ دان اور ماہر فطرت (Edwin Cerio) تھا جو نصف کیپری کا مالک تھا وہ وہاں سایوں میں بچوں کی کہانیوں کے (Taita) دیوتا کی مانند ایستادہ تھا۔ اس کی عمر

تقریباً نوے برس تھی اور اس جزیرے پر وہ سب سے ممتاز انسان تھا۔

"آپ یہاں آرام سے رہیں۔ یہاں کوئی آپ کو تنگ نہ کرے گا" وہ ہمیں ہمارے خیالات میں چھوڑ کر چلا گیا تھا اور خود ہمیں مختصر پیغامات، جن میں خبریں اور نصیحتیں شامل ہوتیں کسی پتے یا پھولوں کے ہمراہ بھیجتا رہتا۔ جو اس کے ذاتی باغ سے ہو۔تے تھے۔ یوں وہ خود کو مطمئن سمجھتا۔ ہمارے لئے؛ یڈون میسریو اٹلی کے فیاض اور فراخ معطر قلب کی نمائندگی کرتا تھا۔

بعد میں مجھے اس کی کتابیں اور کام کو دیکھنے کا موقع ملا، کتابیں جو (Axel Munth e) سے زیادہ مشہور تو نہیں لیکن سچی تھیں شریف بوڑھا سیریو اکثر اپنے پرمزاح انداز میں کہا کرتا "کیپری قصبے کا چوراہا، خدا کا شاہکار ہے۔" میٹلڈی (Matilde) اور میں اپنی محبت میں پناہ ڈھونڈتے ہم (Anacapri) میں لمبی سیر کے لئے نکل جاتے، چھوٹا سا جزیرہ ہزاروں ننھے ننھے باغات میں بٹا ہوا تھا، جس میں فطری حسن ہے جس کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن جو واقعی سچ ہے۔

چٹانوں کے درمیان جہاں کہیں بھی سورج اور ہوا کی پہنچ ہوتی، صحرائی زمین میں بے شمار پودے اور پھول ان گنت نمونوں میں کھل اٹھتے۔ یہ خفیہ کیپری جس میں آپ ایک طولانی سفر کے بعد اس وقت پہنچتے ہیں جب آپ کے لباس پر سے سیاحت کے نشان کو ہٹا دیا جاتا ہے، تو چٹانوں اور انگوروں کے باغات، نیک لوگوں محنت کش اور فطری انسانوں کا یہ مقبول کیپری خود میں ایک جاذبیت لئے نظر آتا ہے۔ اس وقت تک آپ چیزوں اور لوگوں کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ کوچوان اور مچھلیوں سے واقف ہو جاتے ہیں۔ آپ کیپری کے خفیہ حصے کا ایک جزو بن چکے ہوتے ہیں—— غریبوں کا کیپری، اور آپ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اچھی شراب اور عمدہ زیتون کو، جسے یہاں کے مقامی باشندے استعمال کرتے ہیں۔ کہاں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

وہ تمام گھٹیا چیزیں، جن کے بارے میں، ہم ناولوں میں پڑھتے ہیں محلات کی بلند و بالا دیواروں کے پس پشت رونما ہوتی ہیں، لیکن میں نے ایک خوشگوار زندگی کو تنہائی میں، دنیا کے سادہ ترین انسانوں کے مابین حاصل کیا—— ناقابل فراموش وقت!

میں صبح کو سارا وقت اپنی نظموں پر کام کرتا اور میٹلڈی سہ پہر کے وقت انہیں ٹائپ کرتی۔ یہ پہلی بار تھا کہ ہم اکٹھے اس گھر میں رہ رہے تھے۔ یہاں کی خوبصورتی نشہ آور تھی اور اس جگہ ہماری محبت آہستہ آہستہ بڑھتی رہی اور اس کے بعد ہم کبھی جدا نہ رہ سکے۔ میں نے (Captia ins Verse) کو مکمل کیا۔ یہ محبت کی ایک کتاب ہے۔ جذبے سے سرشار، لیکن دردناک بھی، جو بعد میں نیپلز میں گمنامی میں شائع ہوئی)۔

اب میں اس کتاب کی کہانی بیان کرنے جا رہا ہوں۔ میری تخلیقات میں سب سے زیادہ زیر بحث آنے والی کتاب، ایک عرصے تک یہ ایک راز کی حیثیت سے رہی، جیسے کہ میں اس کو اپنا نہ رہا ہوں یہ کتاب جانتی نہ ہو کہ اس کا باپ کون تھا۔ کچھ بچے فطری ہوتے ہیں، جو فطری محبت کے نتیجے میں جنم لیتے ہیں۔ اسی طرح (Captains Verse) ایک فطری کتاب تھی۔ اس کتاب کی نظمیں مختلف جگہوں پر لکھی گئیں۔ ان میں بہت سی یورپ میں، میری جلاوطنی کے ایام میں، جن میں سے کچھ نیپلز میں ۱۹۵۲ء میں کسی نام کے بغیر شائع ہوئیں مٹیلڈی کے لئے میری محبت، چلی (وطن) کی یاد، سماجی شعور کے لئے جذبات اس کتاب کے صفحات کو بھرتے ہیں، جس کے کئی ایڈیشن مصنف کے نام کے بغیر ہی منظر عام پر آئے۔ اس کی پہلی اشاعت کے لئے مصور Paolo) Ricci) نے کہیں سے بہت عمدہ کاغذ، (Bodoni) کے چھاپنے کا نایاب انداز اور Pompeii کی نقش کرنے کی نقول حاصل کیں۔ اس مصور نے برادرانہ چاہت کے ساتھ کتاب حاصل کرنے والوں کی ایک فہرست بھی تیار کی خوبصورت کتاب صرف پچاس نسخوں کے ایڈیشن میں جلد ہی چھپ گئی۔ اس کے لئے ہم نے ایک طویل جشن منایا، جس میں ایک میز پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔ کیپری کے انگوروں کی ایک بے مثال پیداوار، پانی کی مانند مقطر شراب، اور ہمارے ان دوستوں کی تالیاں، جنہیں ہماری محبت سے عشق تھا۔ چند مشکوک نقادوں نے دستخط کے بغیر اس کتاب کے منظر عام پر آنے کیوجہ سیاسی مفادات بتائے۔ "پارٹی اس کے خلاف ہے، پارٹی اس کی اجازت نہیں دیتی۔"

انہوں نے کہا ___ لیکن یہ سچ نہ تھا، خوش قسمتی سے میری پارٹی حسن کے بیان کے خلاف نہیں ہے۔ اصل سچائی یہ ہے کہ میں ان نظموں سے (Delia) کو زخمی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

(Delia Del Carril) بیویوں میں سے محبوب ترین، میرے ان زمانوں کی ساتھی تھی، جب میری شاعری سب سے زیادہ گنگناتی، فولاد اور شہد کے دھاگے کی طرح بندھی ہوئی، اٹھارہ برس تک میری سب سے محبوب بیوی ڈیلیا۔ یہ کتاب، جو اچانک اور جلتی ہوئی محبت سے بھری ہے۔ اس تک ایک چٹان کی مانند پہنچ کر اس کی شرافت کو نقصان پہنچاتی۔ یہی وہ واحد بھرپور، ذاتی اور قابل توقیر وجہ تھی جس نے اس کتاب کو مصنف کا نام نہ دیا۔

بعد میں بغیر کسی پہلے اور آخری نام کے یہ کتاب لڑکپن تک پہنچ گئی ایک فطری اور بہادرانہ لڑکپن، اس کتاب نے خود اپنا رستہ زندگی میں سے بنایا اور مجھے اس کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

اب (Captain,s Verse) اصل کپتان کے دستخطوں کے ساتھ سڑکوں پر آوارہ

خرامی کرتی ہے، یعنی کتابوں کی دکانوں اور لائبریریوں میں۔

جلاوطنی کا انجام

میری جلاوطنی اپنے انجام کو پہنچ رہی تھی یہ ۱۹۵۲ء کا سال تھا ہم نے سوئٹزرلینڈ (Switzerland) کو کنیز (Cannes) کے راستے عبور کیا، تاکہ اطالوی بحری جہاز کو پکڑ سکیں، جو ہمیں (Montevideo) تک لے جائے۔

اس مرتبہ ہم فرانس میں کسی سے نہ ملنا چاہتے تھے (Alice Ciascar) میرا وفادار مترجم اور ایک پرانا دوست، وہ واحد شخص تھا، جسے میں نے فرانس سے گزرنے کی اطلاع دی تھی لیکن کنیز میں ایک غیر متوقع بات ہماری منتظر تھی۔ بندرگاہ کے قریب سڑک پر مجھے (Paul Elurad) پال ایلوراڈ اور اس کی بیوی (Dominique) مل گئے۔ انہیں ہمارے آنے کے بارے میں علم ہو گیا تھا۔ اور وہ ہمیں دوپہر کے کھانے پر مدعو کرنے کے منتظر تھے۔ پکاسو بھی وہاں ہو گا۔ وہیں ہمیں چلی کے مصور (Nemesio Antunez) اور اس کی بیوی بھی مل گئے۔ یہ بھی دوپہر کے کھانے پر ہوں گے۔ یہ آخری موقع ہو گا کہ میں پال ایلوراڈ سے مل سکوں گا کنیز کی دھوپ میں، میں اسے نیلے رنگ کے پاجامہ سوٹ میں ملبوس دیکھتا ہوں، اس کا دھوپ سے سنولایا سخت چہرہ اور اس کی گہری نیلی آنکھوں، افریقہ کی روشنی میں چمکتی ہوئی گلیوں میں اس کی بچگانہ لامحدود مسکراہٹ کو کبھی نہ بھول پاؤں گا۔

پال ایلوراڈ مجھے سینٹ ٹروپیز (Saint-Tropez) سے الوداع کہنے آیا تھا۔ وہ پکاسو کو بھی اپنے ہمراہ لایا تھا اور کھانے کا انتظام بھی کیا تھا۔ پارٹی بہت اچھی تھی۔

ایک احمقانہ غیر متوقع واقع نے میرا دن خراب کر دیا تھا منیلڈی کے پاس یوراگوئے (Yuruguay) کا ویزا نہ تھا جلد ہی ہمیں اس ملک کے قونصل خانے تک جانا تھا۔ لہٰذا ہم نے ٹیکسی لی۔ اور میں دروازے پر منتظر رہا۔ قونصل کو باہر دیکھ کر جو منیلڈی سے ملنے باہر آ گیا تھا، منیلڈی پرامید انداز میں مسکرائی۔ وہ بھی ایک اچھے لڑکے کی مانند لگ رہا تھا اور (Madam Butterfly) کی دھن گنگا رہا تھا وہ ایک قونصل کی طرح ملبوس ہونے کی بجائے بنیان اور نیکر پہنے ہوئے تھا۔ منیلڈی کو محسوس تک نہ ہوا کہ وہ شخص گفتگو کے دوران ایک عام سا جبراً استحصال کرنے والا بن جائے گا۔ وہ فالتو وقت کے لئے معاوضہ کا طالب تھا جس کے لئے اس نے ہر قسم کی رکاوٹیں حائل کر دی تھیں۔ یوں منیلڈی کو ویزا کے حصول میں کئی گھنٹے لگ گئے جیسا کہ قونصل ہر سیکنڈ پر نئی مصیبت کھڑی کر دیتا تھا منیلڈی کو اپنی تصویر بنوانی تھی۔ ڈالرز کو فرینک میں

تبدیل کرانا تھا (Bordeux) تک ایک لمبی ٹیلی فون کال کے پیسے دینے تھے۔ ٹرانزٹ وغیرہ کی فیس (جو مفت ہونا چاہئے تھا) ۱۲۰ ڈالر بنی تھی اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کہیں اس کی کشتی نہ چھوٹ جائے ایک عرصے تک میں نے اس دن کو اپنی زندگی کے تلخ ترین دن کے طور یاد رکھا۔

بے تکی بحریات

میں سمندر کا شوقین ہوں۔ برسوں میں معلومات اکٹھی کرتا رہا ہوں، جو کسی کام کی نہیں، کیونکہ عام طور سے، میں زمین پر چلتا ہوں اب میں چلی واپس جا رہا ہوں، اپنے، سمندری ملک کو، میرا بحری جہاز افریقہ کے ساحلوں کے نزدیک پہنچ رہا ہے۔ ابھی یہ ہرکیولیز کے قدیم ستونوں کے پاس سے گزرا تھا، جو آج مسلح انداز میں بادشاہی نظام کی آخری فصیلوں میں سے ہیں۔

میں سمندر کا مطالعہ کرنے والے کی طرح، خود کو مکمل طور پر الگ رکھتے ہوئے سمندر کو غور سے دیکھتا ہوں۔ ادبی سرمستی کے بغیر۔ لیکن ایک نقاد کے ذائقے اور فیل ماہی کے تالو کے ساتھ، بھلا کون سمندر کی سطح اور اس کی گہرائی سے واقف ہو سکتا ہے۔

میں نے ہمیشہ سمندر کی کہانیوں کو پسند کیا ہے، اور میری لائبریری میں مچھلیاں پکڑنے کا جال موجود ہے، وہ کتابیں، جنہیں میں بار بار پڑھتا ہوں وہ (William Beebe) کی ہیں یا انٹارکٹک کے جھینگے نما کیڑے ے بارے میں کوئی اچھا رسالہ

سمندری گھاس مجھے اچھی لگتی ہے۔ غذائیت سے پر سالماتی پانی سے تر اور برق شدہ، جو سمندر کو کاسنی روشنی کے دھبے میں تبدیل کر دیتا ہے، تب مجھے یہ پتہ چلا کہ وھیل مچھلیاں، صرف اسی قسم کی سمندری مخلوق کو کھاتی ہیں۔ بے حد ننھے پودے اور غیر حقیقی سیال ہمارے لرزاں بر اعظم پر سے گزرتے ہیں۔ وھیل مچھلیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ کو جاتے ہوئے اپنی زبانیں تالو سے لگائے ہوئے اپنے بے پناہ بڑے منہ کھولتی ہیں، تاکہ یہ جاندار اور غذائیت سے بھرپور پانی ان میں بھر جائیں اور ان کی پرورش کر سکیں یہ گلاکس وھیل (Rhachianectes Glauc us) کے کھانے کا طریقہ کار ہے، جو میرے ازلا نیگرا کی کھڑکیوں کے پاس سے ہو کر اپنے راستے پر جنوبی بحرالکاہل اور ٹراپیکل جزیروں کی طرف جاتی ہے ہجرت کا یہی رستہ سپرم وھیل اور دانتوں والی وہیل کا بھی ہے یہ وہ مچھلیاں ہیں، جو سب سے زیادہ چلی میں شکار ہوئی ہیں چلی کے ملاحوں نے سمندری دنیا کی حکایات کو مصور کرنے کی خاطر انہیں استعمال کیا تھا۔ ان کے دانتوں پر ملاحوں نے چاقو سے دل اور تیر کھودے ہوئے تھے۔ ان میں محبت کی یادیں ننھی منی یادگاریں، بچگانہ بحری

جہاز کی تصاویر یا اپنی محبوباؤں کی تصویریں ہوتیں۔ لیکن ہمارے وہیل کے شکاری سپرم وہیل کے دانتوں کو نگلنے بلکہ (Blabber) کے خزانے کو حاصل کرنے کے لئے جوان پہاڑ جیسی مچھلیوں کے پیٹ میں ہوتے ہیں کیپ ہارن (Cape Horn) اور آبنائے میگ لان (Strait of Magellan) انٹارکٹک اور اس کے غیض و غضب کے پاس سے نہیں گزرے میں کہیں اور سے آ رہا ہوں۔ بحیرہ روم کی آخری نیلگوں حدوں کو میں نے اپنے عقب میں چھوڑ دیا ہے۔ کیپری جزیرے کے خدوخال جہاں دل موہ لینے والی عورتیں اپنے نیلگوں بالوں کو درست کرنے کی خاطر چٹانوں پر چڑھتی ہیں، کیونکہ سمندر کے تموج نے ان کی وحشی زلفوں کے رنگ کو بدل ڈالا ہے۔

نیپلز کے ماہی خانے میں زمانہ قدیم کے حشرات کے سالے دیکھنے کے قابل تھے اور ایک جیلی فش، جو بھاپ اور چاندی کی بنی ہوئی تھی، اسے اٹھتے اور گرتے ہوئے اپنے نیلے رقص میں بل کھاتے دیکھنا۔ اپنے زیریں حصے میں ایک برقی کمر بند سے بندھی، جو شاید ہی گہرائی میں کسی خاتون نے کبھی باندھا ہو گا۔

بہت سال پہلے مدراس میں اپنی جوانی کے اداس ہندوستان میں مجھے ایک بہت اعلیٰ ماہی خانے میں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ جس میں چمک دار مچھلی کو دیکھ سکتا ہوں، زہریلی (Morays) مچھلیوں کا غول، آتشی اور قوس قزح کے رنگوں میں اور اس سے بھی زیادہ سنجیدہ آکٹوپس اپنی بے شمار آنکھوں، مقناطیسی لکیروں، ٹانگوں، سکرز (Succers) اور مجتمع اطلات کے ہمراہ

وکٹر ہیوگو کے ناول (The Toilers of the Sea) میں پہلی مرتبہ ہم دیو قامت آکٹوپس سے متعارف ہوتے ہیں (وکٹر ہیوگو بھی شاعری کا ایک بڑا آکٹوپس ہے) اور اس قسم کے آکٹوپس کے محض بازو ہی کے ایک ٹکڑے کو مجھے، کوپن ہیگن کے میوزیم میں دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ واقعی روایتی (Kraka) قدیم سمندروں کا ایک خوف تھا، جو کسی بحری جہاز کو اپنی گرفت میں لے کر کھینچتے ہوئے نیچے لے جاتا تھا۔ جو حصہ میں نے الکوحل میں محفوظ دیکھا، اس سے پتہ چلا کہ اصل عفریت تیس میٹر سے بھی لمبا تھا، لیکن جس میں مجھے دلچسپی تھی وہ شاید (Narwal) کا جسم تھا، چونکہ میرے دوستوں کی معلومات شمالی سمندروں کے بحری (Unicorn) کے بارے میں نہ جاننے کے برابر تھی، مجھے احساس ہوا کہ میں (Narwal) کا واحد ترجمان ہوں یا شاید میں خود ہی ایک (Narwal) تھا کیا (Narwal) کا کوئی وجود ہے؟

کیا اس وضع کی غیر معمولی سمندری مخلوق، جس کے ماتھے پر ہاتھی دانت کا چار یا پانچ میٹر لمبا نیزہ لگا ہو، اور جو آگے جا کر سوئی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کیا وہ اس کی روایت، اس کا خوبصورت

نام، لکھو کھا انسانوں کے مشاہدے میں آئے بغیر جا سکتا ہے؟ اس کے نام کے بارے میں، میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ سمندر کی تہہ کے ناموں میں سے یہ سب سے خوبصورت نام ہے۔ سمندری جام کا نام جو گاتا ہے سمندر کی نقرئی نوک کا نام۔ پھر کیوں آخر کس کو اس کا نام نہیں معلوم؟ آخر کیوں کسی کے نام کا آخری حصہ (Narwal) نہیں ہے۔

سمندری یونی کارن (Unicorn) اپنی لہروں اور آبی سایوں میں اپنی طویل ہاتھی دانت کی تلوار کے ساتھ، غیر دریافت شدہ سمندر، میں غرق ایک اسرار میں مستور ہے۔

قرون وسطے میں شکار کرنے والا یونی کارن ایک پراسرار جمالیاتی کھیل تھا، وہ زمین جس پر یونی کارن رہتا ہے دیوار گیریوں میں ہے۔ ایک چمکدار مخلوق، سفید چکنی خواتین سے گھری ہوئی بشمول مشاطاؤں کے جن کے چاروں طرف حسین پرندے اپنی درخشاں چمک لئے پھرتے ہیں۔ جہاں تک نروال کا تعلق ہے، قرون وسطیٰ کے بادشاہ اسے ایک عمدہ تحفہ تصور کرتے تھے اور آپس میں اس کے بہترین حصے تقسیم کیا کرتے۔ روایت تھی کہ اس سے حاصل کیا ہوا۔ سفوف اگر شراب میں حل کیا جائے تو انسان کے دائمی خواب، صحت، جوانی اور توانائی کی بخشش ہوتی ہے۔

ڈنمارک میں ایک دن آوارہ گردی کے دوران، میں ایک پرانی دکان میں داخل ہو گیا، جہاں قدرتی تاریخ کی اشیاء برائے فروخت موجود تھیں۔ ایک ایسا کاروبار جس کا ہمارے امریکہ میں علم نہیں مگر میرے لئے ایک کشش رکھتا ہے۔۔۔۔ وہاں کونے میں تین یا چار نروال کے سینگ ہیں۔ طویل ترین پانچ میٹر لمبا ہے۔ میں ان کے ارد گرد پھرتے ہوئے ان پر ہاتھ پھیرتا ہوں۔ دکان کے بوڑھے مالک نے میرے ہاتھ میں ہاتھی دانت کے نیزے کو سمندر کی تخیلاتی پن چکیوں پر جھکتے ہوئے دیکھا۔ جسے میں نے کونے میں رکھ دیا، جو میں خرید سکا وہ بہت ننھا سا تھا شاید نروال کے کسی بچے کا، ان میں سے کسی کا جو آرکٹک کے سرد پانیوں کی دریافت میں اپنے معصوم نیزے کے ساتھ نکل جاتے ہیں اسے میں نے اپنے صندوق میں رکھ لیا تھا، لیکن سوئٹزرلینڈ کی جھیل لیمان کے قریب ایک مختصر سے گھر میں، چونکہ مجھے سمندری یونی کارن کے جادوئی خزانے کو چھونے کا اشتیاق تھا۔ بس میں نے اسے صندوق سے نکالا۔ اب میں اسے تلاش نہیں کر سکتا۔

کیا میں اسے Vesenaz کے گھر میں کہیں چھوڑ آیا ہوں؟ یا وہ بستر کے نیچے آخری لمحوں میں کہیں گم ہو گیا ہے۔ یا پھر کسی ناقابل گرفت انداز میں کسی رات کو قطبی حلقے میں واپس چلا گیا ہے۔ میں بحر اقیانوس میں طلوع ہوتے ہوئے نئے دن کو ننھی لہروں پر دیکھتا ہوں۔

بحری جہاز کے اطراف میں سفید نیلا اور گندھک جیسے پانی کا جھاگ اور بلوئی ہوئی

سمندر کے کنارے لرز رہے ہیں۔
ان پر اڑنے والی نقرئی اور غیر شفاف مچھلی اڑ رہی ہے۔
میں اپنی جلاوطنی سے واپسی کے سفر میں ہوں۔
بہت دیر تک میں پانیوں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ اب میں دوسرے پانیوں کی جانب رواں دواں ہوں۔۔۔ میرے وطن کی ستائی ہوئی لہریں۔
طویل دن کا آسمان، سمندر پر چھاتا ہے۔
رات ایک بار پھر راز کے وسیع محل کو چھپانے کے لئے آئے گی۔

دسواں باب

سفر اور گھر واپسی

ایک میمنا میرے گھر میں

میرا ایک رشتے دار سینیٹر، کسی حالیہ الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد (Islanegra) میں میرے گھر کچھ روز گزارنے کے لئے آیا تھا اور یوں میمنے کی کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔

سینیٹر کے پرجوش حامی اس کے اعزاز میں ایک ضیافت کے انتظام کے لئے آئے۔ ضیافت کی پہلی سہ پہر ایک میمنے کو چلی کے دیہاتی انداز میں پکایا گیا گھر سے باہر بہت بڑی آگ میں ایک جانور کے جسم کو لکڑی میں پرو دیا گیا تھا۔ اسے "لکڑی پر بھوننا" کہتے ہیں۔ اور اس سے بے تحاشا شراب اور گٹار کی موسیقی میں لطف اندوز ہوا جاتا ہے۔ ایک اور میمنا آئندہ دن کے کھانے کے لئے رکھ چھوڑا تھا اسے میرے کمرے کی کھڑکی کے باہر باندھ دیا گیا تھا، جب کہ اس کی قسمت ڈانواں ڈول تھی۔ تمام رات وہ میمنا اپنی تنہائی کی شکایت میں چیختا چلاتا رہا۔ اس کی آہ و بکا دل کو لرزانے والی بلکہ اس قدر تکلیف دہ تھی کہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح ہوتے ہی اس میمنے کو اغواء کر لوں گا۔ اگلے دن میں نے اسے کار میں رکھ کر اپنے گھر سے تقریباً ایک سو پچاس کلومیٹر دور سانتیاگو لے گیا۔ جہاں چاقو اس تک نہ پہنچ سکیں گے۔ جونہی وہ وہاں پہنچا تو اس نے میرے باغ ، اپنی پسند کی چیزوں کو للچاتے ہوئے چرنا شروع کر دیا اسے ٹیولپ کے پھول پسند تھے، جن میں سے ایک پھول بھی اس نے نہ چھوڑا گلاب کی جھاڑیوں سے اس نے قطعاً بے تکلفی نہ کی۔ شاید کانٹوں کی وجہ سے لیکن کنول کے کھلے ہوئے پھولوں کو اس نے لطف کے ساتھ نوالہ بنایا اب میرے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں ایک بار پھر اسے باندھ دوں اور میرے باندھتے ہی اس

نے پھر چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ یقیناً دوبارہ میرے دل کو موم کرنے کی خاطر، جیسا کہ وہ پہلے کر چکا تھا۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔

اب (Juanito) کی کہانی اور میمنے کی کہانی یکجا ہو جائیں گی اسی زمانے میں جنوب میں فارم کے مزدوروں کی ہڑتال ہو گئی تھی۔ اس علاقے کے زمینداروں نے، جو اپنے مزارعوں کو روزانہ بیس سینٹس کے حساب سے معاوضہ دیتے تھے، ہڑتال کو لاٹھیوں اور جیل کی قید سے ختم کر دیا تھا۔ ایک دیہاتی بچہ اس قدر خوفزدہ تھا کہ اس نے چلتی ہوئی ریل گاڑی سے چھلانگ لگا دی تھی۔ اس بچے کا نام (Juanito) تھا، وہ ایک راسخ العقیدہ کیتھولک تھا اور دنیاوی باتوں سے بالکل بے خبر تھا۔ جب کنڈکٹر ٹکٹوں کی پڑتال کے لئے آیا تو لڑکے نے اسے بتایا کہ اس کے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔

وہ سانتیاگو جا رہا تھا اور اس کے خیال میں ریل گاڑیاں لوگوں کے لئے تھیں کہ وہ ان میں جہاں چاہیں آئیں جائیں۔ یقیناً وہ بلا ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں پکڑا جاتا، لیکن تیسرے درجے کے مسافروں اور دیہاتی لوگوں نے ہمیشہ کی طرح وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا کرایہ چندہ اکٹھا کر کے ادا کر دیا۔

(Juanito) اپنے کپڑوں کی گٹھڑی بغل میں دبائے دارالحکومت کی سڑکیں اور چوراہے ناپتا رہا۔ وہ وہاں کسی کو بھی نہ جانتا تھا۔ لہٰذا اس نے کسی سے بات نہ کی۔ دیہات میں یہ کہا جاتا تھا کہ سانتیاگو میں چوروں کی تعداد دوسرے لوگوں سے زیادہ ہے، اور بچے کو ڈر تھا کہ لوگ اس سے اس کا اسباب جو اس نے اخبار میں لپیٹ کر گٹھڑی کی شکل میں بغل میں دبایا ہوا تھا، چھین لے گے۔

دن کے وقت وہ مصروف ترین سڑکوں پر گھومتا، جہاں لوگ ہمیشہ جلدی میں ہوتے، اور اپنے راستے میں کسی دوسرے سیارے سے آئی ہوئی اس مخلوق کو ہٹا دیتے۔ رات کے وقت بھی وہ سب سے پر ہجوم ہمسائیگی کی تلاش میں رہتا۔ لیکن یہ وہ راستے تھے، جہاں رقص گاہیں اور رات کی زندگی بھرپور تھی اور وہاں وہ خود کو اور بھی کھویا ہوا محسوس کرتا ــــ گناہ گاروں کے مابین ایک زرد رو چرواہا۔ پیسوں کے بغیر وہ کچھ بھی نہ کھا سکتا تھا اور بالآخر ایک دن وہ زمین پر نیم مردہ حالت میں غش کھا کر گر پڑا۔ متجسس لوگوں کا ایک ہجوم سڑک پر پڑے ہوئے لڑکے کے گرد جمع ہو گیا، ایک چھوٹے سے ریستوران کے سامنے گرا تھا۔ اسے اندر لے جایا گیا اور فرش پر لٹا دیا۔ ریستوران کے مالک نے آ کر ایک نظر اسے دیکھا اور کہا۔ "یہ ایک خالی معدہ ہے" اور یوں جونہی مردہ جسم کے منہ میں کھانے کے چند لقمے پہنچے، اس میں جان پڑ گئی۔

ریستوران کے مالک نے اسے پلیٹیں دھونے کے کام پر لگا دیا اور اسے پسند کرنے لگا اور ہمیشہ اسے دیکھ کر مسکراتا رہتا۔ دیہات کے مقابلے میں اسے کھانے کو بہت کچھ مل جاتا تھا۔

شہر نے اس چرواہے کے گرد اپنا سحر کچھ ایسے حیران کن انداز میں بنا کہ ایک روز وہ اور بھیڑ کا گوشت مجھے ملنے میرے گھر چلے آئے۔ چرواہے نے شہر کو دیکھنا چاہا تھا، لیکن بھینوں کے پہاڑ کے عقب میں مہم جوئی کی نظر ہو گیا وہ ایک گلی میں تجسس کے ساتھ گیا، چوراہے کو عبور کیا اور ہر چیز کو دلکش پایا۔ اس نے ان مہمان نواز علاقوں کا پتہ نوٹ نہیں کیا، جہاں اس کی پذیرائی ہوئی تھی، کیونکہ اسے لکھنا ہی نہیں آتا تھا اور اس نے ان کی ناکام تلاش کی تھی، جنہیں وہ کبھی بھی تلاش نہ کر سکا۔

اس کی خراب صورت حال پر ترس کھاتے ہوئے، کسی نے اسے مجھ سے (پابلونرودا سے) ملنے کو کہا۔ میں نہیں جانتا کہ اسے یہ مشورہ کیوں دیا گیا شاید اس لئے کہ چلی میں لوگوں کے دماغ میں جو بھی نئی بات سما جائے وہ اسے میری طرف روانہ کرنے کی عادت میں ہیں۔ اور پھر اس کے بعد جو کچھ بھی ہو جائے۔ اس کے لئے وہ مجھے مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ یہ عجیب بے تکی قومی روایات ہیں۔

بہرحال وہ لڑکا میرے گھر آیا اور قیدی جانور سے اس نے ملاقات کی اسے میمنے کو اپنے قابو میں کرنے کے بعد، جس کی مجھے ضرورت نہ تھی مجھے یہ سہل لگا کہ میں نیا قدم اٹھاؤں، یعنی اس چرواہے کو اپنے ہاں رکھ لوں۔ اس کے ذمے میں نے یہ کام لگایا کہ وہ دیکھے کہ یہ میمنا میرے پھولوں پر ہاتھ صاف نہ کرے لیکن بھوک مٹانے کے لئے وہ باغ کی گھاس کو کھا سکتا ہے۔ جلد ہی وہ دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے۔ پہلے روز تو رسا میمنے کے گلے میں رسی کو ربن کی طرح باندھا گیا اور وہ لڑکا اسے ادھر ادھر لئے پھرا۔ میمنے نے جی بھر کر گھاس چری اور چرواہے نے بھی خوب کھایا پیا اور دونوں میرے گھر میں پھرتے رہے۔ یہاں تک کہ میرے کمروں میں بھی۔

وہ دونوں انسان کے فطری قانون کے مطابق دھرتی ماں کی آنول کے ساتھ ایک دوسرے سے بندھے تھے۔ یہ مکمل طور پر ایک رشتہ تھا۔ کئی ہفتے گزر گئے چرواہا اور میمنا کھا کھا کر خاصے فربہ ہو گئے تھے۔ بطور خاص میمنا جو اس قدر بھاری ہو گیا تھا کہ بمشکل اپنے مالک کے پیچھے چلتا بسا اوقات وہ ایک شان بے اعتنائی کے ساتھ میرے کمرے میں چلا آتا اور فرش پر مینگنوں کا چھوٹا سا ہار بنا کر نکل جاتا۔ یہ سب اس وقت ختم ہو گیا، جب چرواہے نے مجھے اپنی دور دراز دنیا میں واپس جانے کے بارے میں بتایا۔ یہ آخری وقت کا فیصلہ تھا اور جسے اس کو برقرار رکھنا تھا کہ وہ اپنے آبائی

شہر کی (Virgiw) سے عہد کر کے آیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ میمنے کو نہ لے جا سکا۔ یہ ایک دل گداز جدائی تھی۔ چراوہا ریل گاڑی پر سوار ہو گیا۔ لیکن اس مرتبہ اس کے ہاتھ میں ٹکٹ تھا۔۔۔ یہ سب خاصا سوگوار تھا میرے باغ میں رہ جانے والے میمنے کی بجائے اب ایک خاصا سنجیدہ اور فربہ شے موجود تھی۔ مجھے اس کے ساتھ کیا کرنا ہو گا؟

اب کون اس کا خیال رکھے گا؟ میری سیاسی مصروفیات خاصی تھیں میرا گھر میری شدت انگیز شاعری کے بعد سے، جس کی وجہ سے مجھے خاصی سزائیں دی گئی تھیں تباہ حال تھا۔ میمنے نے ایک بار پھر سے درد بھری دھن کو الاپنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے دوسری جانب دیکھا اور اپنی بہن سے اسے اپنے ہمراہ لے جانے کو کہا۔ اس بار مجھے یقین تھا کہ وہ بھوننے والی چھڑی سے نہ بچ سکے گا۔

اگست ۱۹۵۲ سے اپریل ۱۹۵۷ تک

اگست ۱۹۵۲ سے اپریل ۱۹۵۷ تک کی تفصیلات کا ذکر میری یادوں میں نہ ہو گا، کیونکہ یہ تمام وقت میں نے چلی میں گزارا اور اس سارے عرصے میں کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ رونما نہ ہوا، جو میرے پڑھنے والوں کے لئے دلچسپی کا باعث بن سکے۔ یہاں کچھ ایسی باتوں کا ذکر میں ضرور کروں گا، جوان برسوں کے دوران پیش آئیں۔ میں نے اپنی کتاب (Las Uvas yel vien to) جو پہلے لکھی گئی تھی شائع کی۔ دوسری کتابوں (Odas Elementales) ، (Nuevas odas elementales) اور (Tercerlibro Delas odes) پر بہت محنت سے کام کیا ایک بین الاقوامی ثقافتی کانگریس کا انتظام کیا، جو سانتیاگو میں منعقد ہوئی اور جس میں براعظم امریکہ سے مقتدر شخصیات نے حصہ لیا۔

میں نے سانتیاگو ہی میں اپنی پچاسویں سالگرہ منائی اور دنیا بھر سے اس میں ممتاز ادیبوں نے شرکت کی۔ چین سے (Aiching) اور (Ṣiaöëmi) سوویت یونین سے (Ilya Ehren berg) نے چیکوسلواکیہ سے (Drda) اور (Kurvalek) آئے۔ لاطینی امریکہ سے آنے والوں میں (Miguel Angel Asturias) (Norah Lange) (Oliverio Gron do) (Ra,ul larra)(Maria rost) (Elvio Romere) اور بہت سے دوسرے شامل تھے۔ میں نے اپنی لائبریری اور بہت سی دوسری ذاتی ملکیت کی چیزیں چلی کی یونیورسٹی کو دیں سوویت یونین کا لینن امن انعام کے منصف کی حیثیت سے دورہ کیا۔ جب کہ میں خود یہی انعام اس دوران حاصل کر چکا تھا تب اس انعام کا نام اسٹالن انعام تھا (Delia del Carril)

اور میں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے میں نے اپنا گھر (La Chascona) تعمیر کیا اور منیلڈی کے ساتھ اس میں منتقل ہو گیا۔ میں نے چلی سے ایک رسالہ (Gacetadelhig e) کے نام سے شروع کیا، اور اس کے کئی شماروں کی ادارت کی۔ میں نے چلی کی کمیونسٹ پارٹی کی انتخابی مہمات اور دوسری مصروفیات میں حصہ لیا۔ بیونس آئرز میں (Losada) پبلشنگ پریس نے میری کل تخلیقات کو بائبل کے کاغذ پر شائع کیا۔

بیونس آئرز میں قید

اس دورے کے اختتام پر، مجھے امن کی کانگریس میں مدعو کیا گیا تھا جسے سیلون کے جزیرے پر کولمبو میں منعقد ہونا تھا، جہاں میں نے کئی سال گزارے تھے۔ یہ ۱۹۵۷ء کے اپریل کا مہینہ تھا۔ خفیہ پولیس سے ٹکراؤ خطرناک نہیں لگتا، لیکن اگر یہ ارجنٹائنا کی خفیہ پولیس ہو، تو پھر یہ مذاق کے علاوہ غیر متوقع واقعات کے ساتھ کچھ اور بات ہو گی۔

اس خاص رات کو چلی سے دور دراز زمینوں کے سفر کے بعد میں تھک کر بستر میں لیٹ گیا۔ اور سونے ہی والا تھا کہ بہت سے پولیس کے سپاہی گھر میں گھس آئے۔ انہوں نے سارے گھر کو الٹ پلٹ دیا، کتابوں اور رسالوں کو بکھیرا اور الماریوں میں گھس کر انڈرویئرز تک کو نہ چھوڑا۔ ارجنٹینا کے اس دوست کو، جس کے گھر میں، میں ٹھہرا ہوا تھا، وہ پہلے ہی لے جا چکے تھے۔ جب انہوں نے مجھے گھر کے پچھواڑے، میرے کمرے میں تلاش کر لیا تو پوچھا۔ "یہ کون شخص ہے؟"

"میرا نام پابلو نرودا ہے" میں نے کہا۔

"کیا یہ بیمار ہے؟" انہوں نے میری بیوی سے استفسار کیا "ہاں یہ بیمار ہے اور سفر کے باعث تھکا ہوا بھی، ہم آج ہی یہاں پہنچے ہیں، اور کل یورپ کے لئے ہماری پرواز ہے۔"

"اچھا اچھا" انہوں نے کہا اور وہ کمرے سے نکل گئے ایک گھنٹے کے بعد، وہ ایک ایمبولینس کے ساتھ واپس آ گئے منیلڈی نے احتجاج کیا، جس کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ان کے پاس احکامات تھے اور وہ مجھے لینے آئے تھے۔ تھکا ہوا ہشاش بشاش صحت مند یا بیمار، مردہ یا زندہ

اس رات بارش ہو رہی تھی۔ بیونس آئرز کے آسمان سے موٹی موٹی بوندیں برس رہی تھیں۔

جمہوریت کے نام پر (Gen.Arambor) نے حکومت کے ناجائز اقتدار کو اتار پھینکا

تھا۔

میں نیم مردہ، تھکاماندہ اور بیمار جیل کی راہ پر تھا۔ وہ اسٹریچر جس پر چار پولیس کے سپاہی مجھے اٹھا کر لے جارہے تھے سیڑھیوں سے اترتے وقت راہ داریوں سے ہوتے ہوئے لفٹ میں جاتے وقت ایک مصیبت بن گیا تھا۔ اسٹریچر اٹھانے والوں کو خاصی دقت کا سامنا تھا۔ ان کے عذاب میں مزید اضافہ کرنے کے لئے منیلڈی نے انہیں اپنی شریں آواز میں بتایا کہ میرا وزن ۱۱۰ کلو گرام ہے اور میں ایسا ہی لگتا بھی تھا، سوئیٹر اوور کوٹ اور ان تمام کمبلوں میں، جو میرے وجود کو ڈھکے ہوئے تھے اسٹریچر پر ایک بڑے ڈھیر کی مانند ابھرا ہوا، بالکل اوسورنو کے آتش فشاں پہاڑ کی طرح میں نے تصور کیا جس کی تشکیل میں ارجنٹینا کی جمہوریت کا عمل دخل تھا۔ اور اس نے میری (Phlebitis) کی علامات کو قدرے بتر کر دیا تھا۔ لیکن غریب شیطان میرے وزن سے ہانپتے کانپتے ہوئے میرا اسٹریچر اٹھائے چل رہے تھے۔ ہم جیل کے معمولات کے مطابق رہ رہے تھے۔ میری تمام ذاتی اشیا مجھ سے چھین لی گئی تھیں۔ حتیٰ کہ وہ جاسوسی نامول بھی لے لیا گیا تھا جسے میں نے اپنی اکتاہٹ مٹانے کی خاطر پاس رکھا ہوا تھا، لیکن حقیقتاً میرے پاس بور ہونے کا وقت بھی نہ تھا۔

آہنی رکاوٹیں شور کرتی ہوئیں کھلیں اور بند ہو گئیں۔ اسٹریچر آہنی دروازوں اور صحنوں میں سے گزرتا رہا۔ اچانک میں نے خود کو ایک ہجوم میں پایا۔ یہ سب رات کے قیدی تھے، جن کی تعداد دو ہزار سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ مجھے ایسا رکھا گیا تھا کہ کوئی میرے نزدیک نہ آسکے، یا میں کسی سے رابطہ نہ کر پاؤں۔ اس سب کے باوجود کمبلوں میں سے رینگتے ہوئے ہاتھ مجھ سے مصافحہ کرتے رہے اور ایک سپاہی نے تو اپنی بندوق ایک طرف رکھ کر ایک کاغذ کو میرے سامنے کر دیا، کہ وہ اس پر میرے دستخط حاصل کر سکے۔ بالاخر انہوں نے مجھے اوپر والی منزل پر آخری کمرے میں منتقل کر دیا۔ اس کمرے میں بہت بلندی پر ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ میں آرام کرنا چاہتا تھا کہ شاید نیند آسکے۔ لیکن نیند کو میں نہ پا سکا۔

دن طلوع ہو چکا تھا اور ارجنٹینا کے قیدیوں نے کانوں کو پھاڑ کر بہرہ کر دینے والا شور مچا رکھا تھا بالکل جیسے وہ (River) اور (Boca) کے درمیان کھیلے جانے والا فٹ بال کا میچ دیکھ رہے ہوں۔

چند گھنٹوں کے گزر جانے کے بعد ارجنٹینا، چلی اور بہت سے دوسرے ملکوں میں ادیبوں اور دوستوں کا ایک حلقہ سرگرم عمل ہو چکا تھا انہوں نے مجھے میرے کمرے سے نکالا اور ہسپتال لے گئے، جہاں میری تمام چیزیں واپس کر کے مجھے آزاد کر دیا۔ میں جیل کو چھوڑنے والا تھا کہ

وردی میں ملبوس ایک محافظ میرے پاس آیا اور میرے ہاتھوں میں ایک کاغذ تھما دیا۔

اس کاغذ پر ایک نظم تحریر تھی، جو اس نے میرے لئے لکھی تھی نظم خاصی حد تک خامیوں سے پر اور خراب تھی لیکن تمام مقبول فنون کی طرح معصوم ــــ میں سوچتا ہوں کہ بہت سے شاعروں کو منظوم خراج عقیدت ان لوگوں کی طرف سے وصول ہوا، جو ان کی حفاظت پر معمور کئے گئے تھے۔

شاعری اور پولیس

ایک دن ازلا نیگرا میں ہماری جوان نوکرانی نے ہمیں بتایا "مادام ڈان پابلو، میں حاملہ ہوں"

اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ ہمیں علم نہ تھا کہ اس بچے کا باپ کون تھا۔ بچے کی ماں کو اس کی پرواہ نہ تھی، جس بات کی اسے فکر تھی، وہ یہ کہ متیلڈی اور میں اس کے بچے کے روحانی ماں باپ بن جائیں۔ لیکن ایسا نہ ہو سکتا تھا اور ہم یہ نہ کر سکے نزدیک ترین کلیسا (Eltabo) میں ہے۔ یہ ایک خوش باش چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جہاں سے اکثر ہم اپنی گاڑی میں پٹرول بھرواتے تھے۔ اس کلیسا کا پادری چھوٹے سے خار دار سیہہ کی مانند تھا

"ایک اشتراکی روحانی باپ؟ کبھی نہیں۔ نرودا، اگر تمہارا بچہ اٹھائے ہوئے بھی آئے تو اس دروازے سے اندر داخل نہ ہو گا" وہ خادمہ آرزدہ خاطر اپنے گھر واپس چلی گئی۔ اسے کچھ سمجھ نہ آیا تھا۔

ایک مرتبہ اور میں نے (Dont Astero) کو خراب ہوتے دیکھا۔ وہ ایک عمر رسیدہ، پرانا گھڑی ساز ہے، جو والپاریزو میں گھڑیوں کی مرمت کے ساتھ بحریہ کے آلات کو بھی ٹھیک کرتا ہے۔ اس کی جیون ساتھی اس کی بیوی مر رہی تھی۔ پچاس سالہ ازدواجی زندگی تمام ہو رہی تھی ــــ میں نے سوچا کہ مجھے اس کے بارے میں کچھ لکھنا چاہئے، کوئی ایسی بات، جو ان تلخ حالات میں اس کی کسی طرح مدد کر سکے، کوئی چیز، جو وہ اپنی مرتی ہوئی بیوی کے لئے پڑھ سکے۔ ایسا میں نے سوچا، میں نہیں جانتا کہ میں ایسا سوچنے میں حق بجانب تھا۔ میں نے ایک نظم لکھی جس میں ڈان آسٹرو کی کاریگری اور اس کی صنعت کے بارے میں توصیفی تاثرات کا اظہار کیا تھا اس زندگی کے لئے گھڑیوں اور پرانے کلاک کی ٹک ٹک کے درمیان ــــ (Sariata Vial) نے وہ نظم اخبار کو دے دی (La Union) اخبار کو ایک پادری (Sehor Pascal) چلاتا تھا جو اس نظم کو چھاپنے پر رضامند نہ تھا ــــ وہ اس نظم کو شائع نہ کرے گا ــــ اس نظم کا شاعر نرودا کلیسا سے نکلا

ہوا ایک اشتراکی ہے، اور وہ ایسا ہرگز نہ کرے گا۔ ڈان آسٹرو کی بیوی مر گئی۔ لیکن پادری نے وہ نظم شائع نہ کی۔

میں ایک ایسی دنیا میں رہنا چاہتا ہوں، جہاں کوئی بھی کلیسا سے نہ نکالا گیا ہو — میں کسی کو خارج نہ کروں گا۔ کل میں اس پادری کو یہ نہ بتاؤں گا، "کہ تم فلاں فلاں شخص کو روحانی طور پر پاک نہ کر سکو گے، کیونکہ تم اشتراکیوں کے خلاف ہو" میں کسی اور پادری کو یہ نہ بتاؤں گا۔ "میں تمہاری نظم کو، تمہاری تخلیق کو محض اس لئے شائع نہ کروں گا کہ تم اشتراکیوں کے خلاف ہو۔"

میں ایسی دنیا میں رہنا چاہوں گا، جہاں افراد محض انسان ہوں جو اپنے ذہنوں کو کسی اقتدار، کسی نام یا کسی چھاپ سے آزاد رکھیں میں چاہوں گا کہ لوگ تمام کلیساؤں اور تمام چھاپہ خانوں میں بلا خوف جائیں۔ میں کبھی نہ چاہوں گا کہ کوئی شخص دوبارہ میئر کے دفتر کے در پر منتظر رہے۔ یا کسی کو قید کر کے جلاوطن کر دیا جائے۔ میں ہر شخص کو شہر کے ہال میں سے مسکراتے ہوئے آتے جاتے دیکھنا چاہوں گا۔ میں نہیں چاہوں گا کہ کوئی شخص گنڈولا میں بیٹھ کر فرار ہو یا کسی کا تعاقب موٹر سائیکل پر کیا جائے۔ میں چاہوں گا کہ لوگوں کی کثیر تعداد، واحد کثرت، ہر شخص، بولنے پڑھنے، سننے اور زندہ رہنے کے قابل ہو — میں کبھی بھی جدوجہد کو نہیں سمجھ سکا علاوہ، اس شے کے جو ساری جدوجہد ہی کو ختم کر دے۔ میں کبھی سخت انتظامات کو نہ سمجھ سکا، علاوہ اس چیز کے جو ان کو ختم کر دے — میں نے سڑک کا انتخاب کر لیا ہے، میرا یقین ہے کہ سڑک ہمیں ہمیشہ قائم رہنے والی برادری تک لے جاتی ہے ہیں ہر جانب پھیلی ہوئی اس دائمی، نہ ختم ہونے والی نیکی کے لئے لڑا ہوں۔ میری شاعری اور پولیس کے درمیان ساری بھاگ دوڑ کے بعد اور ایسے ہی دوسرے واقعات کے بعد میں مزید کچھ نہ کہوں گا۔ کیونکہ یہ محض تکرار ہو گی۔ ان تمام باتوں کے باوجود، جو میرے ہاں تو ظہور پذیر نہ ہوئیں۔ لیکن دوسروں کی زندگیوں میں نظر آئیں، گو وہ ان ... نہ کر سکے اب بھی انسان کے مقدر کے بارے میں میرا ایمان ہے ایک واضح اور بالکل صاف و شفاف اعتقاد کہ ہم ایک مشترک اور عظیم محبت کی طرف بڑھ رہے ہیں یہ جانتے ہوئے کہ ایٹم بم کا خطرہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے میں یہ لکھ رہا ہوں کہ ایٹمی سانحہ اس روئے زمین پر کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑے گا، لیکن یہ میری امید کو نہیں بدل سکتا۔ اس اہم وقت پر، غصے کی حالت میں، ہم جانتے ہیں کہ حقیقی زندگی ان آنکھوں میں اترے گی، جو چوکس ہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کو جان لیں گے۔ باہم ہم آگے بڑھیں گے اور اس امید کو کچلا نہیں جا سکتا۔

سیلون سے نیا سامنا

ایک کائناتی مقصد___ ایٹمی موت کے خلاف۔ جنگ مجھے دوبارہ کولمبو لئے جا رہی تھی___ ہندوستان جاتے ہوئے ہم نے ایک شاندار جیٹ طیارے T-U 104 میں سوویت یونین کو عبور کیا، جو ہمارے وفد کو لے جانے کے لئے پرواز میں تھا۔ واحد اسٹاپ جو ہمارے رستے میں آیا، تاشقند تھا۔ یہ سمرقند کے قریب ہے۔ دو روز کے بعد طیارہ ہمیں ہندوستان کے دل میں اتار دے گا۔

ہم دس ہزار میٹر کی بلندی پر اڑ رہے تھے، ہمالیہ کو عبور کرنے کے لئے دیو قامت پرندہ، مزید اوپر کی طرف تقریباً پندرہ ہزار میٹر کی بلندی پر اڑا۔ اس بلندی سے ایک بے حس و حرکت منظر کو نیچے دیکھا جا سکتا تھا۔ پہلی رکاوٹیں، جو سامنے آئیں، ہمالیہ کی سفید اور نیلگوں چوٹیاں تھیں___ کہیں نیچے قابل نفرت برفانی انسان، اپنی خوفناک تنہائی میں چلتا پھرتا ہے، اور بائیں ہاتھ پر ماؤنٹ ایورسٹ برف کے تاج میں ایک اور بے قاعدگی کے ساتھ ابھرتا ہے، سورج اس پھیلے ہوئے سارے منظر کو زیر نگیں کرتا ہے اس کی روشنی برفانی سکوت کے وقار اور چٹانوں کو نمایاں کرتی ہوئی نئے تاثر کو ابھارتی ہے___ امریکہ کے اینڈیز، جنہیں میں کئی بار عبور کر چکا ہوں، مجھے یاد آتے ہیں۔ بے ترتیبی، جناتی خوف اور ہمارے پہاڑوں کے غضبناک صحرا یہاں موجود نہیں۔ ایشیائی پہاڑ مجھے کہیں زیادہ باترتیب اور کلاسیکی لگتے ہیں، ان کے گنبد، پھیلی ہوئی لامحدود وسعت میں پگوڈا اور راہبوں کے معبدوں کی طرح نظر آتے ہیں تنہائی دور تک چلی جاتی ہے___ سائے پتھروں کی دیوار کی مانند ابھرنے کے بجائے عظیم معبدوں کے پراسرار نیلگوں باغات کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔

میں خود کو یاد دلاتا ہوں کہ میں دنیا کی بے حد مصفیٰ ہوا میں سانس لے رہا ہوں اور آسمان سے زمین پر موجود بلند ترین چوٹیوں کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ ایک بے مثال احساس ہے، جس میں وضاحت، فخر، رفتار اور برف سب گھل مل گئے ہیں۔ ہم سیلون کی طرف اڑ رہے ہیں۔ اب ہندوستان کے گرم علاقوں پر بلندی کم ہو رہی ہے۔ ہم نے سوویت جہاز کو نئی دہلی میں ہندوستانی جہاز سے بدل لیا تھا۔ اس کے بازو شدید طوفانی بادلوں میں لرزتے ہوئے آواز پیدا کرتے ہیں۔ اس اوپر نیچے کی حرکت میں میرے خیالات پھولوں کے جزیرے تک چلے جاتے ہیں، بائیس برس کی عمر میں میں سیلون میں تنہا رہا تھا، جہاں اردگرد پھیلی ہوئی فطرت کی خوبصورت جنت میں، میں نے اپنی تلخ ترین نظمیں لکھی تھیں امن کی خاطر، جس کے لئے مجھے حکومت نے منتخب کیا ہے، میں ایک طویل مدت کے بعد تجدید ملاقات کے لئے دوبارہ واپس آ رہا ہوں ایک بڑی تعداد میں، شاید سینکڑوں بدھ راہب زعفرانی رنگ کے لباس میں ملبوس گروہوں میں نروان کی حالت میں نظر آتے

ہیں، جو انہیں بدھا کے شاگردوں کی حیثیت سے نمایاں کرتی ہے جنگ، تباہی اور موت کے خلاف لڑتے ہوئے یہ مبلغ امن اور تنظیم کے ان قدیم جذبات کو مستحکم کرتے ہیں، جن کی شہزادے سدھارتھ گوتمانے (جو بدھا کے نام سے مشہور ہوا) تبلیغ کی تھی میرے خیال میں ہمارے امریکی ملکوں کے کلیسا اس سب سے کس قدر مختلف ہیں۔ جیسے ہسپانوی سرکاری کلیسا، کتنا پرسکون اور بہتر ہوتا اگر سچے عیسائی یہ دیکھتے کہ کیتھولک مبلغین اپنے منبر سے ایٹمی موت کے خلاف (جو لاکھوں معصوم انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے اور اپنی تباہ کاریوں کے اثرات نسل انسانی میں آنے والے وقتوں کے لئے چھوڑ جاتی ہے) جنگ کرتے۔

میں تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا اس گھر کو دیکھنے کے لئے نکل کھڑا ہوا، جہاں میں ویلاواٹے کے علاقے میں کبھی رہ چکا تھا اس گھر کو ڈھونڈنے میں مجھے خاصی دقت ہوئی۔ درخت بڑے ہو گئے تھے، گلی کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔

پرانی جگہ، جہاں میں نے بہت سی دردناک نظمیں لکھی تھیں عنقریب گرا دی جانے والی تھی۔ اس گھر کے دروازوں کو دیمک لگ چکی تھی ٹراپیکل رطوبت نے دیواروں کو تباہ کر دیا تھا، لیکن وہ گھر جدائی کے اس آخری لمحے کا منتظر تھا۔ مجھے اپنے پرانے دوستوں میں سے کوئی بھی نہ ملا، لیکن پھر بھی جزیرے نے میرے دل کے دروازے پر اپنی چمکتی ہوئی روشنی اور شور کے ساتھ دستک دی سمندر اب بھی پام کے درختوں تلے ساحل پر چٹانوں سے ٹکرا کر وہی پرانی دھن گنگنا رہا تھا۔ میں ایک بار پھر جنگلوں کے راستوں پر چل پڑا۔ ایک مرتبہ پھر تیز خوشبوؤں نے جیسے مجھے مخمور کر دیا اور مجھے اگتی ہوئی سبز نباتات کی آہٹ اور جنگل کی زندگی کی آواز سنائی دی میں (Sigiriya) کی چٹان تک پہنچا جہاں ایک پاگل بادشاہ نے اپنا قلعہ بنوایا تھا۔ پرانے دنوں کی طرح میں نے بدھا کے دیو قامت مجسموں کی زیارت کی، جن کے نیچے انسان حشرات الارض کی مانند رینگتے ہیں۔ میں بھی ایک بار وہاں چلا گیا یہ جانتے ہوئے کہ دوبارہ میں یہاں کبھی نہ آؤں گا۔

چین کا دوسرا سفر

اس امن کانگریس کے بعد (Jorge Amado) اور اس کی بیوی (Zelia) کے ہمراہ میں نے کولمبو سے ہندوستان کو ہوائی سفر میں عبور کیا ہندوستانی جہازوں میں ہمیشہ پگڑیاں باندھے، رنگوں میں ڈوبے ہوئے ٹوکریوں کے ساتھ مسافر بھرے ہوتے۔ اتنے بہت سے لوگوں کو جہاز میں ٹھونسنا ناممکن نظر آتا۔ ایک ہجوم پہلے ہوائی اڈے پر اتر گیا جس کی جگہ دوسرے ہجوم نے لے لی۔

ہمیں مدراس سے آگے کلکتہ تک جانا تھا۔ جہاز استوائی طوفانوں میں کانپ کانپ گیا۔ اور ایک دن نے، جو اصل رات سے بھی کہیں زیادہ اندھیرا تھا، اچانک ہمیں چھپالیا۔ جلد ہی پھر روشن آسمان نمودار ہو گیا۔ جہاز نے دوبارہ جھٹکے کھانے شروع کیے۔ بجلی کڑکی اور چاروں جانب پھر تاریکی تھی، میں نے (Jorge) کے چہرے کو سفید سے زرد اور زرد سے سبز ہوتے دیکھااور اسے بھی رنگ کے تبدیل ہونے کا یہ عمل جس نے خوف کی باعث ہماری آواز کو جیسے جکڑ لیا تھا، میرے چہرے میں نظر آیا ہو گا۔ جہاز کے اندر بارش شروع ہو گئی تھی۔ پانی بڑے بڑے قطروں کی صورت میں اندر آ رہا تھا۔ جس نے ٹی میو کو میں سردیوں کے موسم میں اپنے گھر کی یاد دلا دی تھی۔ لیکن زمین سے دس ہزار میٹر کی بلندی پر پانی کے ٹپکنے کے اس عمل سے میں محفوظ نہ ہوا البتہ دلچسپ چیز ایک راہب تھا، جو ہمارے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، اس نے چھتری کو کھولا اور مشرقی سنجیدگی کے ساتھ قدیم دانائی کی کتاب کو پڑھتا رہا۔ کسی حادثے کے بغیر ہم رنگون تک پہنچ گئے۔

زمین پر اپنے قیام کی تیسویں سالگرہ تقریباً وہیں آئی۔

برما میں میرا گھر، جہاں ایک بالکل انجان شخص کی حیثیت سے میں نے اپنی نظمیں لکھی تھیں۔ ۱۹۲۷ء میں تیئیس سال کی عمر میں، میں اسی رنگون میں اترا تھا۔ تب یہ رنگوں سے چکرا دینے والی ایک حیران کن جگہ تھی اور اس کی زبانیں ناقابل فہم تھیں۔ کالونی، انگریز حاکموں کے استحصال اور جبر کا شکار تھی۔ لیکن شہر صاف شفاف تھا اور روشن تھا اس کی گلیاں زندگی کی گہما گہمی سے پر تھیں، دکانوں کے شیشے نو آبادیاتی خواہشات کا مظہر تھے۔ اب یہ نصف خالی شہر تھا، جس کی دکانوں کے شیشے برہنہ تھے۔ اور گلیوں میں کوڑے کے ڈھیرے لگے تھے۔ آزادی کی عوامی جدوجہد کوئی آسان راستہ نہیں۔ لوگوں کی بیداری اور آزادی کے جھنڈوں کے بعد ہمیں اپنی راہ کو طوفانوں اور سختیوں میں سے گزارنا ہوتا ہے، آج کے دن میں آزاد برما کی کہانی سے ناواقف ہوں" جو تند و تیز دریائے آراوادی کے کنارے پر واقع ہے، جہاں سنہری پگوڈا ہیں لیکن کوڑے کے ان ڈھیروں پر اور ان سے پرے اس کی گلیوں میں نظر آتی اداسی کو دیکھتے ہوئے، میں نئی جمہوریاؤں کو ہلا دینے والے ان تاریک ڈراموں کے بارے میں تصور کر سکتا تھا، یوں لگتا تھا، جیسے ماضی کا جبر اب بھی ان پر مسلط ہے، میری چاہنے والی محبوبہ (Josie Bliss) اور میرے (Tango delviu do) کی ہیروئین کا کچھ پتہ نہ چلا کوئی بھی مجھے اس کی زندگی یا موت کے بارے میں معلومات فراہم نہ کر سکا۔ اور وہ علاقہ، جہاں ہم اکٹھے رہے تھے، اس کا نام و نشان تک نہ تھا اب ہم برما سے پرے اڑ رہے ہیں، ان پہاڑی چوٹیوں کو عبور کرتے ہوئے، جو برما کو چین سے علیحدہ کرتی ہیں——

ایک بے مثال اور پر سکون منظر کی شدت (Mandalay) سے جہاز، چاول کے کھیتوں،

پگوڈا اور لاکھوں کی تعداد میں پام کے درختوں پر سے ہوتا ہوا. برما کی جنگی حالت پر سے گزر کے. چین کے خاموش اور پر سکون منظر پر سے گزرا سرحد کی دوسری طرف چین کے پہلے شہر (Kun ming)میں ہمارا پرانا شاعر دوست (Aiching) ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے گہرے نقوش شرارت اور شفقت سے بھری اس کی آنکھیں، اس کی ذہانت، اس طویل سفر کے بعد ایک بار پھر مسرت کا وعدہ تھا۔

ہوچی من کی طرح آئی چنگ بھی مشرق میں آباد کاروں کے استبداد اور پیرس میں سخت کوشی کے عادی، پرانے مشرقی شاعروں کے قبیل میں سے تھا۔ اپنے آبائی وطن میں جیل سے نکلے ہوئے یہ شاعر جن کی آواز فطری تھی، بیرونی ممالک کے ریستورانوں میں خدمت گار یا ضرورت مند طلباء بن جاتے۔ انھوں نے کبھی بھی انقلاب میں اعتماد کو نہ کھویا تھا. وہ اپنی شاعری میں بے حد نرم و لطیف جذبے کے حاصل تھے لیکن سیاست میں آہنی جبڑے رکھتے تھے۔ وہ وقت پر اپنی قسمتوں کا فیصلہ کرنے آئے تھے۔

(Kunming) کے پارک میں درخت پلاسٹک سرجری کے عمل سے گزر گئے تھے۔ ان کی ہیئت غیر فطری ہو چکی تھی اور کبھی کبھار، کوئی کٹا ہوا حصہ کیچڑ میں لتھڑا یا پیڑوں میں بندھی ہوئی کوئی شاخ کسی زخمی بازو کی طرح دیکھی جا سکتی تھی۔ ہمیں ایک باغبان کو دیکھنے کے لئے لے جایا گیا تھا ایک فطین شیطان جو ایسے غیر معمولی باغ پر حکمرانی کرتا تھا۔ صنوبر کے چھوٹے درخت تیس سینٹی میٹر سے بڑے نہ تھے، حتیٰ کہ ہمیں پست قامت مالٹے کے ایسے درخت بھی دیکھنے کو ملے جن میں چاول کے دانوں کے برابر سنہری مالٹے لٹک رہے تھے۔

ہمیں ایک عجیب و غریب پتھریلے جنگل میں بھی لے جایا گیا، جہاں پر چٹان ایک سوئی کی مانند لمبی تھی یا سمندر میں کسی لہر کی مانند باریک اور سخت

ہمیں بتایا گیا کہ چٹانوں کا یہ دلچسپ شوق بھی صدیوں پرانا تھا بہت سی بڑی بڑی چٹانیں، بے تکی حیران کن شکلوں کے ساتھ چین کے قدیم شہروں کے چوراہوں پر سجی ہوئی تھیں۔ پرانے وقتوں میں جب گورنر بادشاہ کو کوئی تحفہ دینا چاہتا، تو وہ ان بڑے پتھروں کا انتخاب کرتے اور ان تحائف کو (Peking) پیکنگ پہنچنے کے لئے برسوں گزر جاتے کیونکہ درجنوں غلام، ہزارہا کلو میٹر کے فاصلوں پر ان پتھروں کو دھکیلا کرتے۔ چین مجھے پر اسرار لگا اس کے برعکس اپنے انقلابی برسوں کے وسط میں، میں اسے ایک ایسے ملک کی حیثیت سے دیکھے بغیر نہ رہ سکا، جس نے ہزار ہا سال میں اپنی تعمیر کی تھی اور جو مسلسل خود کو مستحکم کر رہا تھا۔

ایک عظیم پگوڈا، انسان اور اساطیر، جنگ جو سپاہی، کسان اور دیوتا اس کے قدیم طرز تعمیر میں

آتے جاتے ہیں۔ یہاں کچھ بھی اچانک نہ تھا. حتیٰ کہ مسکراہٹ تک ــــ مقبول عام فنون کو جو اپنے پس منظر میں خامیوں کو لئے ہوئے ہوتے. دیکھنے کے لئے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔

چینی گڑیاں، مٹی کے ظروف، سڑی ہوئی لکڑی اور پتھر، دوبارہ وہ نمونے بناتے ہیں، جو ہزار ہا سال پرانے ہیں۔ ہر شے پر کامیاب فنکاری کی مہر ثبت ہے اور پھر اسے دہرا دیا گیا ہے۔ ایک دیہاتی بازار میں، میرے لئے سب سے عمدہ قسم کے بانسوں سے بنے ہوئے پنجروں کو دیکھنا حیرت کی بات تھی۔ یہ بہت اعلیٰ قسم کے صناعی کے نمونے تھے۔ جن میں ایک کمرے کے اوپر ایک اور کمرہ بنا ہوا تھا. جن میں سے ہر ایک میں قیدی (Cicada) الگ موجود تھا اور ان کے لئے تین فٹ بلند قلعہ بنا ہوا تھا. جب میں نے ان گرہوں کو بغور دیکھا. جن سے بانس کی کھپچیاں اور نرم تنوں کا سبز رنگ بندھا ہوا تھا. تو مجھے ان لوگوں کے ہاتھوں سے اور ان کی معصومیت سے، جو معجزے رونما کر سکتی ہے، زندگی واپس آتی دکھائی دی۔ میری تعریفی نظروں کو دیکھتے ہوئے ان دیہاتی کسانوں نے وہ پنجرے فروخت کرنے کی بجائے. بغیر کوئی معاوضہ لئے مجھے دے دیئے اور اس طرح (Cicada کے گیت ہفتوں چینی علاقے میں میرے ساتھ رہے۔ صرف اپنے بچپن میں اس وضع کے سیدھے سادے تحائف کا حصول مجھے یاد ہے۔

ہم نے ایک بحری جہاز پر، جس میں (Yangtze) سے آئے ہوئے ہزاروں کسان، مسافر، مزدور اور مچھیرے سوار تھے، اپنا سفر شروع کیا۔ یہ جہاز (Nanking) کی طرف رواں دواں تھا. کئی دن تک ہم وسیع دریا میں، جہاں ہمارا آمنا سامنا بڑی کشتیوں، کام کرنے والوں سے اور ان سے متعلق ہزاروں زندگیوں اور روزمرہ کے معاملات اور خوابوں سے ہوتا، چلتے رہے ــــ یہ دریا چین کی مرکزی سڑک ہے بے حد فراخ اور بہت پر سکون۔ بعض مقامات پر یہ دریا تنگ ہو جاتا ہے، جہاں تنگ گھاٹی میں سے گزرتے ہوئے بحری جہاز کو مشکل پیش آتی۔ دونوں طرف اونچی دیواریں آسمان کو چھوتی نظر آتیں جہاں وقتاً فوقتاً کوئی ننھا بادل کا ٹکڑا یا چٹانوں میں کوئی چھوٹا سا مکان نظر آ جاتا۔ اور یوں لگتا جیسے مشرقی مصور کے مشاق موئے قلم نے کوئی تصویر بنا دی ہو۔

اس روئے زمین پر چند مناظر ہی اس قدر حسین ہوں گے ــــ شاید کوہ قاف کے عظیم الشان پہاڑی درے یا (Mageha) کی ممنوعہ اور تنہا آبناؤں کا ہی مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرے چین کے پہلے دورے کے بعد سے قابل توجہ تبدیلی آ چکی ہے۔ اور جوں جوں میں چین کے اندرونی حصوں میں جاتا ہوں، مجھے صورت حال اور واضح نظر آتی ہے۔

یہ تاثر پہلے پہل مبہم لگتا ہے ــــ

میں کیا دیکھتا ہوں۔ گلیوں میں اور عوام میں کیا تبدیلی آئی ہے؟ آہ مجھے نیلا رنگ نظر نہیں آتا۔

پانچ سال پہلے اسی وقت میں چین کی گلیوں میں، گھوما تھا جو ہمیشہ انسانی زندگی سے دھڑکتی تھیں، لیکن تب ہر شخص نیلے رنگ کے موٹے اونی کپڑے کے پرولتاری لباس میں نظر آتا تھا مرد، عورتیں اور بچے سب اسی لباس میں نظر آتے مجھے یہ سادہ لباس نیلے رنگ کے مختلف شیڈ میں اچھا لگتا۔ گلیوں اور سڑکوں پر نیلے رنگ کے بے شمار نقطوں کو ادھر ادھر ہوتے دیکھنا بھلا لگتا تھا۔

سب بدل چکا ہے۔ آخر یہ کیا ہوا ہے؟

کپڑے کی صنعت ان پانچ برسوں میں بہت پھیل گئی ہے۔ کہ وہ لاکھوں چینی عورتوں کو ہر قسم کے رنگوں، پھولوں، لائینوں اور پولکاڈوٹس کی مختلف اقسام، ریشم کی بے تحاشا قسمیں اور چینی مردوں کے پہننے کے لئے بھی بہت سے رنگوں میں مختلف کپڑے تیار کرتی ہے اب چین کی ہر گلی میں چینی معیار کے مطابق رنگوں کی قوس قزح بکھری ہوئی تھی۔ چینی نسل کسی بھی شے کو بدوضع بنانا نہیں جانتی۔ یہ ملک جہاں قدیم ترین صندل سرکنڈے کا پھول معلوم ہوتا ہے دریائے ینگ سی میں سفر کرتے ہوئے، مجھے خیال آیا کہ قدیم چینی مصوری کس قدر وفادار ہے۔ اوپر پہاڑی کے قریب ایک پگوڈا کی مانند ٹیڑھا میڑھا دیودار کا درخت. ذہن میں پرانی خیالی تصویروں کو لاتا ہے بہت کم جگہیں، ان پہاڑی دروں کے مقابلے میں، جو دریا کے اوپر ناقابل یقین بلندیوں تک ابھرے نظر آتے ہیں، غیر حقیقی اور حیرن کن حد تک دلچسپ ہوں گے یہ گھاٹیاں اور چٹانیں ان شاندار لوگوں کے قدیم وقت کے نشانات کی مظہر ہیں پانچ یا چھ میٹر نئی اگائی ہوئی سبزیاں یا عبادت کے لئے ایک چھوٹا سا پتوں والی چھت کا معبد—— دور اوپر ننگی چٹانوں پر ہمیں قدیم دیو مالا کے بخاراتی گچھوں کی مانند نظر آتے ہیں۔

یہ محض بادل یا کبھی کبھار اڑتے ہوئے پرندوں کے غول ہیں۔ فطرت کی اس شاندار دنیا میں ایک بھرپور نظم تخلیق ہوتی ہے ایک نظم —— کسی پرواز جتنی مختصر—— یا بہتے ہوئے پانی کی نقرئی چمک کی مانند

لیکن جو بات واقعی غیر معمولی ہے. وہ اس منظر میں کسی چٹان پر موجود ایک مستطیل مزرعہ اراضی میں انسانوں کو کام کرتے ہوئے دیکھنا ہے۔ ہر بلندی پر، عمودی دیواروں کی نوک پر جہاں کہیں بھی قابل زراعت مختصر سی زمین ہے، وہاں ایک چینی کسان کھیتی باڑی کر رہا ہے۔

چینی دھرتی ماں، وسیع اور سخت ہے، اس نے انسان کو منظم کر کے ایسا بنا ڈالا ہے، کہ وہ کام کا ایک نہ تھکنے والا اوزار بن کر رہ گیا ہے۔ وسیع و عریض زمین، غیر معمولی انسانی محنت اور ناانصافی

کے بتدریج خاتمے کے ملاپ نے اس خوبصورت دور افتادہ جگہ کے لوگوں اور سارے چین کو زندہ رہنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ دریائے ینگ سی کے سفر کے دوران جارج خاصا اداس رہا. بحری جہاز پر زندگی کی جہتوں نے اسے اور اس کی بیوی زیلیا کو بے چین رکھا حالانکہ زیلیا بے حد پر سکون مزاج کی مالک تھی، جو اسے آگ میں سے بھی بغیر جلے گزار سکتا تھا۔ چڑا دینے والی باتوں میں سے ایک حقیقت یہ تھی کہ ہماری خواہشات کے برعکس اس دورے کے دوران ہم لوگوں سے مراعات یافتہ لوگوں کا سا سلوک برتا جا رہا تھا۔ اپنے خصوصی کمروں اور نجی کھانے کے کمروں کی وجہ سے ہم جہاز پر سوار کثیر تعداد چینی لوگوں کے ہجوم میں مضطرب رہتے تھے۔

برازیل کے ناول نگار نے اپنی طنزیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور ایک کاٹ دار طنزیہ جملہ کہہ ڈالا۔

درحقیقت اسٹالن دور کے سامنے آنے والے حقائق نے جارج کی ذات کی گہرائی میں کسی بل کو کھول دیا تھا۔ ہم پرانے دوست ہیں۔ ہم نے اکٹھے جلاوطنی کی زندگی گزاری ہے ہم مشترک یقین اور امید سے باہم جڑے رہے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں جارج کے مقابلے میں اپنے مزاج کے اعتبار سے، میں کہیں کم علاقایت کا قائل تھا اور چلی کے ہونے کے ناطے سے میری افتاد طبع مجھے دوسروں کو سمجھنے پر مجبور کرتی تھی، جب کہ دوسری طرف جارج میں بالکل لچک نہ تھی۔ اس کے گرو (Luis Carlos Prestes) نے اپنی زندگی کے پندرہ سال جیل میں گزارے تھے۔ یہ وہ باتیں ہیں جنہیں بھلایا نہیں جا سکتا۔ یہ روح میں ایک سختی سی پیدا کرتی ہیں۔ میں نے جارج کی علاقایت کو اس میں حصہ لئے بغیر اپنی ذات کے مقابلے میں صحیح جانا۔ بیسویں کانگریس کی رپورٹ ایک لہر کی مانند تھی، جس نے ہم سب انقلابیوں کو نئے اقدامات اور نئے نتائج کے سامنے ثابت قدم رہنے پر آمادہ کر دیا تھا ہم میں سے بہت سوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ دردناک حقائق کے بے نقاب ہونے سے ہم میں پیدا ہونے والے غم و غصے نے جیسے از سر نو ہمیں ایک زندگی دی تھی خوف اور تاریکی سے دھل کر ہم جیسے ایک نیا جنم لے چکے تھے اور سچائی پر مضبوط گرفت کے ساتھ ہم پھر سے سفر جاری رکھنے کے لئے آمادہ تھے۔

دوسری طرف جارج دریائے ینگ سی اور مہیب چٹانوں کے درمیان اس بحری جہاز میں اپنی زندگی میں ایک نئی جہت کا آغاز کرتا نظر آتا تھا اور اس کے بعد سے وہ اپنے اعتراضات اور رویئے میں متعدل اور خاموش ہو گیا تھا میں نہیں سمجھتا کہ انقلاب میں اس کا ایمان متزلزل ہو گیا تھا، لیکن ہاں وہ اپنے کام میں لگ گیا تھا. جس نے اسے اس کے راست سیاسی کردار سے، جس سے وہ اب تک منسلک تھا۔ علیحدہ کر دیا، جیسے اچانک مرض کا علاج اس کے ہاں شروع ہو چکا ہو۔ اس

نے خود کو اپنی بہترین تصانیف لکھنے کے لئے وقف کر دیا۔

(Cabriela) سے شروع کرتے ہوئے (Cioue and cinamon) تک ایک شاندار شاہکار، جو شہرت اور مسرت سے لبریز تھا۔

شاعر آئی چنگ، جس نے ہماری رہنمائی کی، وفد کا سربراہ تھا۔ ہر رات کو جارج آماڈو زیلیا اور منیلڈی اور میں اپنے ذاتی کمرے میں کھانا کھاتے۔ کھانے کی میز سنہری اور سبز سبزیوں سے ڈھکی ہوتی کھٹی میٹھی مچھلی اور نئے طریقے سے پکا ہوا مرغ اور بطخ ہمیشہ ہی مزے دار ہوتے۔ کچھ روز کے بعد یہ مدہوش کن میلہ ہماری پسند کے باوجود، ہمارے لئے وبال جان بن گیا۔ آخر کار ہمیں ایسے لذیذ کھانوں سے الگ رہنے کا موقع مل گیا، لیکن ہمارا راستہ ناہموار تھا، جو موڑ کاٹتے ہی بالکل کسی ٹیڑھے میڑھے درخت کی شاخ کی مانند بتدریج پر پیچ ہوتا گیا۔

میری سالگرہ اس سفر کے دوران آ پڑی تھی۔

منیلڈی اور زیلیا نے اس خوراک سے پیچھا چھڑانے کی خاطر اس موقع پر اپنی خوراک تیار کرنے کا پروگرام بنایا۔ یہ خاصا سادہ سا کھانا تھا۔ مرغ جسے ہم اپنے انداز میں بھونتے اور اس میں ٹماٹر اور پیاز کا سلاد چلی کے مخصوص انداز میں اس کے ہمراہ چلتا، خواتین نے اس بڑے راز کو خاصا حیران کن بنا دیا۔ وہ چوری چھپے ہمارے اچھے دوست آئی چنگ تک گئیں۔ شاعر نے کوئی جواب دینے سے پہلے کمیٹی سے اس بارے میں بات کرنے کو ترجیح دی ان کے فیصلے نے ہمیں حیران کر دیا۔

سارا ملک شدت کی لہر میں آیا ہوا تھا۔ ماؤزے تنگ نے اپنی سالگرہ کو منسوخ کر دیا تھا اس قسم کے حالات میں بھلا میری سالگرہ کیسے منائی جا سکتی تھی؟

زیلیا اور منیلڈی نے جواب دیا کہ جو ان کے ذہن میں ہے، وہ بالکل مختلف ہے۔ بجائے اس کے کہ کھانے کی میز کو عمدہ قسم کے کھانوں مرغ، بطخ، مچھلیوں وغیرہ سے سجایا جائے، جنہیں عموماً نہیں کھایا جاتا، ہم بس ایک کھانا یعنی مرغ رکھیں گے۔ یہ سادہ مرغ جو تنور میں ہمارے اپنے طریقے سے بنا ہوا ہو گا۔

ایک اور میٹنگ جو شاعر آئی چنگ اور نظر نہ آنے والی کمیٹی کے ارکان کے مابین ہوئی، اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جس جہاز پر ہم سفر کر رہے تھے اس میں کوئی تنور نہ تھا۔ زیلیا اور منیلڈی نے جو پہلے ہی باورچی سے بات کر چکی تھیں آئی چنگ کو بتایا کہ ایک غلطی ہو گئی ہے۔ ایک بہت ہی اچھا تنور (Oven) ہمارے مرغ کے لئے بالکل تیار ہے آئی چنگ بھینگا بن گیا اور اس نے دریائے ینگ سی کے پانیوں کو گھورنا شروع کر دیا۔

۱۲ر جولائی کو میری سالگرہ کا دن تھا، ہمارا بھنا ہوا مرغ میز پر موجود تھا، جو اس ساری بحث کا محور رہا تھا، اس مختصری ڈش کو ٹماٹر کے چند ٹکڑے اور پیاز کی کرینس منور کر رہی تھیں۔ اس سے پرے بڑی میز پر ہر روز کی طرح چینی کھانے سجے ہوئے تھے۔

۱۹۲۸ میں، میں ہانگ کانگ اور شنگھائی سے گزرا تھا تب چین استبداد کے آہنی ہاتھوں میں ایک نو آبادی تھی جواریوں، افیمیوں، قبحہ خانوں، چور اچکوں، سمندری اور بری قزاقوں کی ایک جنت تھی ـــــ ان بڑے شہروں میں موجودہ عظیم بینکاری کے اداروں کے برعکس آٹھ یا اس سے زیادہ جنگی بحری جہازوں کی موجودگی، عدم تحفظ، خوف نو آبادیاتی استحصال کا منظر تھی ـــــ ایک ایسی دنیا کی موت جو لاش کی طرح سڑ رہی ہو۔

قابل اہانت قونصلروں کی اجازت سے بہت سے ممالک کے جھنڈے چینی منافع خوروں اور ملایا کے مجرموں کے گھروں پر لگے ہوئے تھے۔ بین الاقوامی کمپنیاں ان کی معاشی سرپرستی کرتی تھیں۔ اپنی یادداشتوں میں، ایک واقع کا ذکر میں کر چکا ہوں، جب چین کی ایک گلی میں ایک مرتبہ مجھے میرے پیسوں اور کپڑوں سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ چین میں انقلاب کے موقع پر دوسری بار آتے ہی یہ تمام یادیں پلٹ آئی تھیں۔ یہ ایک نیا ملک تھا۔ میں یہاں کی اخلاقی صفائی سے متاثر ہوا تھا۔ خرابیاں، چھوٹے چھوٹے جھگڑے اور غلط فہمیاں، جن کے بارے میں، میں تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں، معمولی جزئیات ہیں۔ دنیا کی قدیم ترین تہذیب میں ایک فاتحانہ تبدیلی کا پایا جانا میرا سب سے اہم تاثر تھا۔ ہر جگہ بے شمار تجربات زیر غور تھے جاگیرداری کی زراعت ایک تبدیلی کے عمل سے دو چار تھی۔ اخلاقی فضا ایک بڑے طوفان کے گزر جانے کے بعد بالکل شفاف تھی، جس خبر نے مجھے حیران کر دیا، وہ چینی انقلاب کے عمل میں ماؤزے تنگ کے بجائے ماؤزے تنگ ازم تھا۔ میرا مطلب ماؤ اسٹالن ازم سے ہے سوشلسٹ دیوتا کے لئے کسی رسم کا دہرایا جانا، عوام کی آزادی کے عظیم رہنما اور ایک بڑے منتظم ماؤ کی سیاسی شخصیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کیسے میں اس کے رزمیہ ہیولے سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہوں، جو اس قدر شاعرانہ، اتنا اداس کر دینے والا اور اتنا قدیم ہے!

اس کے باوجود اپنے سفر کے دوران، میں نے سینکڑوں غریب کسانوں کو اپنے کام سے واپسی پر ایک سادہ سے گوریلا جنگ جو کی تصویر کے سامنے سربسجود دیکھا، جو اب ایک دیوتا میں ڈھل چکا تھا۔ سینکڑوں لوگوں کو میں نے چھوٹی لال کتاب ہلاتے ہوئے دیکھا ایک کائناتی علاج کے طور پر، پنگ پانگ کے میچ کے جیتنے پر اپنڈی سائٹس کے ٹھیک ہونے پر یا کسی سیاسی مسائل کے حل ہونے پر خوشامد کے اس انداز کا اظہار، ہر منہ سے روزانہ ادا ہوتا ہے جسے ہر روزنامے ہر رسالے،

ہر کاپی کسی بھی قسم کی کتاب، (Almanac) تھیٹر، مجسمے یا پینٹنگ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اسٹالن کے معاملے میں، شخصیت پرستی کی رسم کے بارے میں اپنا اظہار خیال پہلے ہی کر چکا ہوں، لیکن ان دنوں اسٹالن ہمیں وہ فاتح معلوم دیتا تھا، جس نے ہٹلر کی فوجوں کو مغلوب کر دیا تھا۔

اس کا روبہ زوال کردار ایک پراسرار عمل تھا، جو ہم میں سے بہت سے لوگوں کے لئے اب تک ایک راز ہے۔

اور اب یہاں نئے چین کے وسیع و عریض پیش منظر میں ایک بار پھر انسان، میری آنکھوں کے سامنے دیو مالائی کردار میں ڈھل رہا ہے — ایک اساطیر انقلابی ضمیر پر قادر ہونے کی ضرورت رکھتا ہے۔ ایک انسان کی گرفت میں لانے کے لئے دنیا کی تخلیق، جو ہم سب کے لئے ہے، میں اس تلخ گھونٹ کو دوسری بار نہ نگل سکا (Chungking) میں میرے چینی دوست مجھے۔ شہر کے سب سے مشہور پل پر لے گئے۔ تمام عمر مجھے پلوں سے عشق رہا ہے۔ میرا باپ ریلوے کا ملازم تھا۔ جس نے میرے دل میں پلوں کے لئے عزت کا جذبہ پیدا کیا وہ انہیں پل نہیں کہتا تھا۔ اس کی دانست میں یہ بے ادبی تھی وہ پلوں کو فن کا شاہکار کہتا۔ ایک ایسا منفرد شاہکار، جس کو وہ فن مصوری، مجسمہ سازی اور شاعری ۔سے کم نہ سمجھتا تھا۔ میرا باپ کئی بار مجھے چلی کے جنوبی علاقے میں بنے ہوئے شاندار پل (Mallecs) کو دکھانے لے گیا، جو سر سبز جنوبی پہاڑوں کے درمیان بلندی پر بنا ہوا آہنی وائلین کی مانند نازک اور خالص تھا جس کے تنے ہوئے تار اس بات کے لئے آمادہ تھے کہ (Colliuppi) کی ہوا انہیں چھیڑ کر کوئی راگ الاپے۔ اس وقت تک میری دانست میں یہ دنیا کے حسین ترین پلوں میں سے ایک تھا۔ لیکن دریائے ینگ سی پر بنا ہوا یادگار پل ایک مختلف چیز ہے۔ یہ چین کے فن تعمیر کا شاہکار ہے جس کے بننے میں روسی انجینئروں نے مدد کی ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک قدیم عہد کی جدوجہد کے خاتمے کی علامت بھی ہے۔ صدیوں سے (Chngking) کے شہر کو دریا نے تقسیم کیا ہوا تھا، جس نے اس شہر کو وقت سے الگ تھلگ، تنہا اور ست رکھا میرے چینی دوستوں کا پل دکھانے کا جذبہ میری کمزور ٹانگوں کے لئے ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ مجھے بلند میناروں پر چڑھا کر نیچے گہرائیوں میں لے جاتے ہیں اس پانی کو دکھانے کے لئے، جو ہزارہا سال سے اپنے راستے پر بہہ رہا ہے لیکن آج کئی کلومیٹر طویل آہنی جال اس کے راستے میں موجود ہے۔ ان ریل کی لائینوں پر ریل گاڑیاں دوڑیں گی یہ بائیسکل چلانے والوں کے رستے ہیں اور یہ وسیع و عریض سڑک پیدل چلنے والوں کے لئے ہے۔ اس عظمت نے مجھے مسحور کر دیا ہے۔

شام کے وقت (آئی چنگ) ہمیں ایک پرانے ریستوران میں کھانے پر لے جاتا ہے۔ یہ ریستوران روائتی قسم کے کھانوں کا گھر ہے چیری کے پھولوں کی بارش، بانس کے سلاد کی قوس قزح، سو سال پرانے انڈے، جوان مادہ شارک مچھلی کے ہونٹ، الفاظ چینی کھانے پکانے کی ساری پیچیدگی، اس کی شاندار انواع و اقسام، بے مثال جدت ناقابل یقین روایت کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے۔

آئی چنگ ہمیں کچھ ہدایات دیتا ہے۔

ایک اچھے کھانے کی تین ممتاز خصوصیات ہیں، سب سے پہلے ذائقہ دوسرا خوشبو اور تیسرا رنگ۔ خوراک کے یہ تینوں عناصر ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں۔ ذائقہ بہت عمدہ ہونا چاہئے۔ خوشبو لذیذ اور رنگ کا اشتہا انگیز ہونا ضروری ہے۔ آئی چنگ نے بتایا کہ جس ریستوران میں ہم کھانے کے لئے جا رہے ہیں، یہاں ایک اور اہم عنصر آواز کا ہے۔ چینی کی بڑی قاب کے ارد گرد آخری لمحے میں ایک اور چیز کا اضافہ کیا جاتا ہے (Shrimptails) کی آبشار جو گرم سرخ آہنی ڈونگے میں گرتی ہے۔ اور بانسری سے مشابہ دھن کی آواز آتی ہے۔ موسیقی کا ایک جملہ، جو ہمیشہ ایسے ہی دہرایا جاتا ہے۔ پیکنگ میں ہمارا استقبال (Tingling) نے کیا، جو ادیبوں کی امن کمیٹی کا سربراہ تھا۔ جس نے جارج آماڈو کو اور مجھے منتخب کیا تھا۔ ہمارا پرانا شاعر دوست Siao) (Eni اپنی جرمن فوٹو گرافر بیوی کے ہمراہ وہاں موجود تھا۔ سب کچھ خوشگوار اور خوش کن تھا۔ ہم نے کنول سے بھری ہوئی مصنوعی جھیل کی سیر کے لئے ایک کشتی لی یہ جھیل آخری بادشاہوں کی تفریح کے لئے بنائی گئی تھی۔

ہم نے فیکٹریاں، چھاپہ خانے، میوزیم اور پگوڈا دیکھے۔ دنیا کے انتہائی منفرد ریستوران میں کھانا کھایا۔ (اس قدر منفرد کہ وہاں صرف ایک میز موجود تھی) اور یہاں میزبانی کے فرائض امپریل ہاؤس کے باقیات میں سے کر رہے تھے۔

ہم دو جنوبی امریکی جوڑے چینی ادیب کے گھر میں کھانے، پینے سگرٹ کے کش لگانے اور خوش وقت ہونے کے لئے جمع تھے بالکل جیسے ہم اپنے ملک میں اکٹھے ہو کر لطف اندوز ہوتے۔ میں اخبار اپنے جوان ترجمان کے حوالے کر کے اسے ناقابل فہم چینی الفاظ کے کالم کی طرف اشارہ کر کے کہتا میرے لئے اس کا ترجمہ کرو۔ وہ اپنی بالکل نئی سیکھی ہوئی ہسپانوی زبان میں شروع ہو جاتا۔ اس نے میرے لئے زراعت پر لکھے ہوئے اداریئے، ماؤزے تنگ کے تیراکی کے پروگرام، معذرت نامے، فوجی خبریں تک سنا ڈالیں۔ جو اس کے شروع ہوتے ہی مجھے اکتاہٹ میں مبتلا کر دیتیں حتیٰ کہ میں کہہ اٹھتا "رک جاؤ، اسے چھوڑ کر یہاں سے شروع کرو" اور اس طرح ایک

مرتبہ مجھے زندگی کے حیران کن رخ سے سابقہ پڑا۔

جب میں نے اپنی انگلی ایک خبر پر رکھی، تو یہ ایک سیاسی مقدمے سے متعلق خبر تھی، جس میں ملزمان وہی لوگ تھے۔ جن سے ہم روزانہ مل جل رہے تھے۔ یہ لوگ ابھی تک ہماری استقبالیہ کمیٹی کے رکن تھے مقدمہ کچھ وقت کے لئے شاید روک دیا گیا تھا. لیکن ان لوگوں نے کبھی بھی تفتیش کے بارے میں ایک لفظ نہ کہا، نہ ہی انہوں نے یہ بتایا کہ ان کے مستقبل محض ایک دھاگے سے بندھے ہیں۔

وقت بدل گئے تھے، تمام پھول مرجھا رہے تھے۔ جب یہ پھول ماؤزے تنگ کے احکامات پر کھلے تو لاتعداد کاغذی ٹکڑے فیکٹریوں، ورکشاپوں، یونیورسٹیوں، دفتروں، فارموں میں ناانصافی. جبری طور پر حاصل کئے گئے فیصلوں، رہنماؤں اور اعلیٰ افسروں کے خلاف نمودار ہو جاتے اور جونہی مکھیوں اور چڑیوں کے خلاف جنگ ایک اعلان سے ختم ہو جاتی جب یہ انکشاف ہوتا کہ ان کی تباہی سے غیر متوقع نتائج سامنے آئیں گے تو وہ عہد، جو غنچوں کے کھلنے سے شروع ہوا تھا۔ اچانک ختم ہو جاتا اوپر سے ایک نیا حکم آتا___ دائیں بازوں کے لوگوں کی تلاش کی جائے اور فوراً ہی ہر ادارے میں ہر ملازمت پر، ہر گھر میں، چینوؤں نے اپنے ہمسائیوں سے اقرار نامے حاصل کرنے شروع کر دیئے۔ یا وہ خود اپنے دائیں بازو کے ہونے کا اقرار کرتے۔

میری دوست ناول نگار (Ting Ling) پر الزام لگایا گیا کہ چیانگ کائی شک کے سپاہیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ اس کا معاشقہ چل رہا ہے یہ صحیح تھا، لیکن یہ عظیم انقلابی تحریک سے پہلے کی بات تھی اس خاتون نے انقلاب کی خاطر اس محبت کو تج دیا تھا اور (Yenan) سے اپنے نومولود بچے کو گود میں لئے ہوئے ان جانبازوں کے سائے تلے لانگ مارچ میں شرکت کی تھی۔ لیکن اس سب نے اس کی کوئی مدد نہ کی۔ اس کو اس کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا وہ ایک خدمت گار کی حیثیت سے فخر اور عزت کے ساتھ ایک ہوٹل میں کام کرتی رہی اور پھر اسے کسی دور افتادہ دیہاتی کمیون کے باورچی خانے میں بھیج دیا گیا۔ یہ اس عظیم اشتراکی ادیب کی آخری خبر ہے جو مجھے ملی یہ خاتون چینی دانش وروں میں ایک ممتاز حیثیت کی حامل تھی مجھے نہیں علم کہ (SIAOEMI) کا کیا بنا؟ جہاں تک آئی چنگ کا تعلق ہے۔ یہ شاعر جو ہر جگہ ہمارے ساتھ رہا، اس کا مستقبل اداس تھا۔ اسے صحرائے گوبی میں بھیج دیا گیا، بعد میں اسے لکھنے کی اجازت دے دی گئی تاوقتیکہ وہ اپنی کسی بھی تحریر پر اپنا نام نہ لکھے۔ ایک ایسا نام، جو اس وقت چین اور چین سے باہر کی دنیا میں معروف تھا۔ اس طرح آئی چنگ کو ادبی خودکشی پر مجبور کر دیا گیا جارج آماڈو برازیل جا چکا تھا۔ مجھے کچھ عرصے کے بعد تلخ ذائقے کے ساتھ چھٹی لینی تھی۔ یہ تلخ ذائقہ اب بھی

میرے منہ میں موجود ہے۔

سوکھومی کے بندر

میں سوویت یونین واپس آگیا ہوں۔ یہاں مجھے جنوب کے دورے کی دعوت دی گئی ہے۔ وسیع و عریض زمینوں کو عبور کرنے کے بعد جب میں جہاز سے نیچے اترا تو میں بڑی بڑی چراگاہوں، فیکٹریوں، شاہراہوں، بڑے سوویت شہروں اور چھوٹے قصبوں کو اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ میں اطراف میں چھائے ہوئے کوہ قاف کے سلسلے تک آ پہنچا ہوں، جس پر صنوبر کے جنگلات اور جنگلی جانور ہیں۔ میرے قدموں تلے (Black Sea) اپنے نیلے رنگ میں ملبوس میرا استقبال کرتا ہے۔

مالٹے کے درختوں سے پھولوں کی مدہوش کرنے والی خوشبو ہر سمت سے آتی ہے۔ ہم (Abkhazia) کے دارالحکومت (Sukhumi) سوکھومی میں ہیں۔ یہ ایک چھوٹی سی سوویت جمہوریہ ہے یہ اطلسی اونی کھال (GOLDEN FLEELE) کا علاقہ ہے، جہاں چھ صدی قبل از مسیح جیسن (Jason) اس کو چرانے کی خاطر یونان کے دیہاتی علاقے (DIOSCUR (Iسے وہاں آیا تھا۔ کہیں بعد میں میوزیم میں مجھے یونانی سنگ مرمر کا ایک ریلیف دیکھنے کو ملا، جسے حال ہی میں بحیرہ اسود (Black sek) کے پانیوں سے نکالا گیا تھا۔ ان ساحلوں پر (Helenic (Godsھیلن کے زمانے کے دیوتا اپنی پراسراریت کا جشن مناتے تھے۔ آج وہ اسرار محنت کش، سادہ لوح عوام سے تبدیل ہو چکا ہے، یہ وہ لوگ نہیں، جنہیں آپ لینن گراڈ میں دیکھتے ہیں۔

سورج، گندم اور وسیع انگوروں کے باغات کی اس سرزمین میں بحیرہ روم کے خطے، کا لہجہ ملتا ہے۔ یہاں کے لوگ مختلف انداز میں کام کرتے ہیں۔ ان کی عورتوں کی آنکھیں اور ہاتھ اطالوی یا یونانی عورتوں جیسی ہیں۔

گزشتہ چند دنوں سے میں ناول نگار (Simonov) کے گھر میں رہ رہا ہوں۔ ہم بحیرہ اسود کے گرم پانیوں میں تیراکی کے لئے جاتے ہیں (Simonov) اپنے باغ میں خوبصورت درخت دکھاتا ہے میں پہچانتا ہوں اور ہر بار، جو نام وہ دہراتا ہے، میں ایک محب الوطن کسان کی طرح کہتا ہوں "یہ ہمارے چلی میں ہے اس وضع کے درخت ہمارے ملک چلی میں ہیں— اور وہ بھی" (Siminov) مجھے دیکھ کر مسکراتا ہے۔

میں اسے بتاتا ہوں "مجھے افسوس ہے، کہ تم کبھی جنگلی انگور کی بیل کو میرے گھر سانتیاگو میں نہ دیکھو گے، یا سفیدے کے وہ درخت جو چلی کی خزاں میں روپہلے ہو جاتے ہیں۔ اس جیسا سونا

اور کوئی نہیں اگر تم موسم بہار میں چیری کے پھولوں کو دیکھ سکو اور چلی کے بولڈو درخت کی مہک کو سونگھ سکو۔ کاش تم دیکھ سکتے کہ کس طرح کسان شاہراہ میل پلا کے کنارے چھتوں پر غلے کے سنہری خوشوں کو رکھتے ہیں۔ کاش تم اپنے پاؤں ازلاینگرا کے سرد پانیوں میں ڈبو سکتے۔ لیکن میرے عزیز یسی نوو ملک راستوں میں حدیں بناتے ہیں، وہ دشمن بننے میں محظوظ ہوتے ہیں سرد جنگوں میں وہ ایک دوسرے سے آگ اور بارود کا تبادلہ کرتے ہیں ـــــ ہم حیران کر دینے والے راکٹوں میں آسمان پر پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن برادرانہ محبت میں ہم اپنے ہاتھوں تک نہیں پہنچ سکتے "

"شاید چیزیں بدلیں گی " یسی نوو کہتا ہے اور وہ ایک سفید پتھر کو بحرہ اسود میں غرق شدہ دیوتاؤں کی طرف اچھال دیتا ہے توکھومی کا سرمایہ اس کے بندروں کا بہترین مجموعہ ہے اس علاقے کی (Subtropical) آب و ہوا کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تجرباتی طب کے ادارے نے، یہاں دنیا بھر کے بندروں کو جمع کر رکھا ہے۔ آیئے اندر چلتے ہیں۔

بڑے پنجروں میں، ہم بے چین، جذبات سے عاری دیو قامت اور ننھے منے بغیر بالوں کے اور بالوں سے بھرے ہوئے بندر دیکھیں گے بعض کے چہرے خیال انگیز نظر آئیں گے اور بعض کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے شرارے ہوں گے۔ اداس اور باغی قسم کے بندر بھی یہاں موجود ہیں۔ مٹیالے اور سفید بندر، کئی رنگوں کے بندر موٹے، سنجیدہ اور وہ جو تعدد ازدواج کے قائل ہیں، اپنی بندریوں کو اجازت کے بغیر کھانے نہیں دیں گے، جس کا اظہار وہ اپنی خوراک کھانے کے بعد کرتے ہیں اس ادارے میں علم حیاتیات کی انتہائی جدید تحقیق ہوتی ہے بندروں کو علم نسلیات، نظام اعصاب اور زندگی کے بہت سے اسرار اور اس کی طوالت کی تحقیق کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

ایک بندریا اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ ہماری طرف دیکھتی ہے ایک بچہ اس کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے، دوسرے کو وہ پیار کے ساتھ گود میں لئے ہوئے ہے۔ ادارے کا ناظم ہمیں بتاتا ہے کہ جو بچہ بندریا کی گود میں ہے، وہ اس کا اپنا نہیں بلکہ اس نے گود لیا ہوا ہے۔ اس نے ابھی بچے دیئے ہیں، لیکن ایک اور بندریا جو بچے کے پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی۔ اس ماں نے فوراً ہی اس کے یتیم بچے کو اپنا لیا ہے۔ اور اس وقت سے اس نے اپنی ماںتا کی ساری محبت اپنے بچے کے بجائے اپنے گود لئے ہوئے بچے کو دے دی ہے۔ سائنس دانوں کے خیال میں ماں کی اتنی شدید ماںتا اس بندریا کو اور دوسرے بچوں کو بھی گود لینے پر مجبور کر سکتی ہے۔ لیکن بندریا نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

اس کے رویئے نے سادگی سے زندگی کے اصول ہی کی اطاعت نہیں کی بلکہ ماؤں کی تنظیم کی آگہی کو بھی تسلیم کیا ہے۔

آرمینیا (Armenia)

اب ہم ایک روایتی محنت کش ملک کی جانب پرواز کر رہے ہیں۔ ہم آرمینیا میں ہیں۔ دور جنوب میں کوہ ارارات کی برف پوش چوٹیاں آرمینیا کی تاریخ پر سایہ فگن ہیں بائبل کے مطابق یہ وہ مقام ہے، جہاں حضرت نوحؑ کی کشتی از سرنو زمین کو آباد کرنے کے لئے رکی تھی۔

ایک ٹھوس حقیقت، کیونکہ آرمینیا کی زمین سنگلاخ اور آتش فشانی ہے۔ آرمینیا کے لوگوں نے اس زمین کو ناقابل بیان قربانیوں سے قابل کاشت بنایا اور قدیم دنیا میں اپنی قومی ثقافت کو بلند درجہ عطا کیا۔ ان کے سوشلسٹ سماج نے اس شریف قوم کو غیر معمولی ترقی اور کامیابی سے ہمکنار کیا ہے۔ صدیوں ترک حملہ آور آرمینیاؤں کا قتل عام کرتے رہے یا انہیں اپنا غلام بناتے رہے، سطح مرتفع کی ہر چٹان اور معبدوں کی ہر اینٹ پر آرمنی خون کے قطرے موجود ہیں۔ اس ملک کے سوشلسٹ احیا نے معجزہ کر دکھایا ہے اور وہ جو سوویت بادشاہی نظام کے حق میں بولتے ہیں، انہیں جھوٹا ثابت کر دکھایا ہے۔

آرمینیا میں، میں نے دھاگہ بنانے کے کارخانے دیکھے، جہاں پانچ ہزار مزدور کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بہت سے صنعتی کارخانے بھی دیکھنے کو ملے۔ میں نے شہروں سے دیہات تک کا علاقہ دیکھ ڈالا مگر ہر جگہ صرف آرمنی مرد اور عورتوں ہی کو کام کرتے پایا۔ اس سیاہ آنکھوں اور سفید رنگت والے لوگوں کی سرزمین میں مجھے نیلی آنکھوں والا صرف ایک روسی انجینئر دیکھنے کو ملا یہی روسی، جھیل (Sevan) پر ہائیڈرولک پلانٹ کو چلا رہا تھا اس جھیل کا رقبہ جس کا سارا پانی صرف ایک رستے سے نکلتا تھا بے حد وسیع ہے۔ یہ قیمتی پانی بخارات میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پانی کو ترستا ہوا آرمینیا اس پانی کے فائدے کو بروئے کار لانے کے قابل نہیں۔ تبخیر کے عمل کو روکنے کے لئے دریا کو چوڑا کیا گیا ہے۔ اس طرح جھیل کی سطح گر جائے گی اور اس وقت دریا میں اضافی پانی کے ساتھ آٹھ ہائیڈروالیکٹرک اسٹیشن، نئی صنعتیں، دیو قامت، ایلومینیم کے پلانٹ چلیں گے اور سارے ملک کی زراعت کی تخلیق ہوگی۔ جھیل کے اوپر واقع اس ہائیڈروالیکٹرک پلانٹ پر جانا میں کبھی نہ بھولوں گا، اس جھیل کے شفاف پانیوں میں آرمینیا کا نہ بھلائے جانے والا نیلا آسمان منعکس ہوتا ہے۔

جب صحافیوں نے مجھ سے آرمینیا کے قدیم کلیساؤں اور معبدوں کے بارے میں میرے

تاثرات پوچھے تو میں نے بات کو ذرا پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔

"سب سے بڑا کلیسا، جسے میں پسند کرتا ہوں، وہ جھیل کے نزدیک واقع معبد، ہائیڈرو الیکٹرک پلانٹ ہے"

میں نے آرمینیا میں بہت سی چیزیں دیکھیں۔ میرے خیال میں سب سے خوبصورت شہر جو میں نے دیکھا وہ (Erivan) ہے۔ یہ سارا شہر آتش فشانی مادے سے تعمیر ہوا ہے۔ اس میں پیازی رنگ کے گلاب کا سا حسن ہے۔

میں (Binakan) میں موجود فلکیات کی رسد گاہ کا دورہ بھی کبھی نہ بھول سکوں گا۔ جہاں پہلی بار مجھے ستاروں کی تحریر کو دیکھنے کا اتفاق ہوا خلا میں موجود ستاروں کی لرزش کو پکڑ لیا گیا تھا۔ ستاروں کی دھڑکن کو بے حد حساس نظام کی مدد سے آسمان کے الیکٹرو کارڈیو گرام کی مانند ریکارڈ کیا جا رہا تھا۔ اس ریکارڈنگ میں مجھے ہر ستارے کی ایک مخصوص کانپتی ہوئی تحریر نظر آئی، جو بے حد دلچسپ بھی تھی اور ایک زمینی شاعر کے لئے ناقابل فہم بھی۔

(Erivan) کے چڑیا گھر میں، میں سیدھا (Condori) کے پنجرے تک جا پہنچا، لیکن میرے ملک کے باسی نے مجھے نہ پہچانا۔ وہ اپنے پنجرے کے ایک کونے میں کھڑا اداس، اپنی آنکھوں میں (Cordilleras) کے لئے خواب بن رہا تھا۔ میں نے اسے اداسی سے دیکھا کیونکہ میں اپنے وطن واپس جا رہا تھا، اور وہ ہمیشہ کے لئے یہاں سلاخوں کے پیچھے رہے گا۔ اسی چڑیا گھر میں (Tapir) کے ساتھ میرا تجربہ مختلف رہا۔

(Erivan) کا چڑیا گھر بہت سے چڑیا گھروں سے مختلف ہے جہاں (Amazon) سے (Tapir) کو لا کر رکھا گیا ہے۔ یہ خاص جانور اپنے جسم میں بیل سے مشابہت رکھتا ہے، لیکن اس کے چہرے پر ناک بہت لمبی ہے۔ اور اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہیں مجھے اقرار کرنا چاہئے کہ وہ (Tapir) مجھ سے مشابہ تھا یہ کوئی راز نہیں ہے۔

(Erivan) کا (Tapir) اپنے پنجرے میں تالاب کے نزدیک اونگھ رہا تھا، جب اس نے مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں کی چمک پیدا ہو گئی، شاید ہم دونوں ایک بار برازیل میں مل چکے تھے چڑیا گھر کے وارڈن نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اس جانور کو تیرتا ہوا دیکھنا چاہوں گا اور میں نے اسے بتایا کہ میں واقعی اسے تیرتا ہوا دیکھ کر خوش ہوں گا۔ اس جانور کے لئے ایک چھوٹا سا دروازہ کھولا گیا۔ اور (Tapir) نے مجھے خوشی سے دیکھتے ہوئے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ کسی دریائے گھوڑے کی مانند بالوں سے بھرے ہوئے اپنے جسم کو پانی سے نکالتے ہوئے، وہ پانی میں غوطہ لگا گیا، دوبارہ وہ خوشی سے سرشار پانی کی سطح پر ابھرا اور پھر اس نے برق رفتاری سے اپنے کرتب دکھانے

شروع کر دیئے۔

چڑیا گھر کے وارڈن نے کہا "ہم نے کبھی اسے اتنا خوش نہیں دیکھا دوپہر کے وقت ادیبوں کی تنظیم کی طرف سے دیئے گئے عصرانے میں، اپنی تقریر کے دوران، تشکر کا اظہار کرتے ہوئے میں نے برازیل کے (Tapir) کا ذکر کیا اور جانوروں سے اپنی محبت اور چڑیا گھر کے بارے میں بتایا آرمینیائی ادیبوں کے صدر نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا "نرودا کو ہمارے چڑیا گھر جانے کی کیا ضرورت تھی؟ ادیبوں کی تنظیم میں اس کا یہاں آنا ہی جانوروں کی تمام قسموں کو دیکھنے کے لئے کافی تھا۔ یہاں ہمارے پاس ببر شیر اور شیر، لومڑیاں، سیل عقاب، سانپ، اونٹ اور (Macaws) بھی موجود ہیں۔"

شراب اور جنگ

واپس جاتے ہوئے، میں ماسکو میں رکا۔

میرے لئے یہ شہر بہت سے تکمیل شدہ خوابوں کا مسکن، اور میرے بہت عزیز دوستوں کا گھر بھی ہے۔

میرے لئے ماسکو ایک دعوت طعام ہے، جونہی، میں وہاں پہنچتا ہوں، میں فوراً ہی گلیوں میں ہشاش بشاش سیٹی پر (Cuecas) کی دھن بجاتا ہوا نکل جاتا ہوں۔

میں روسی مردوں کے چہروں، آنکھوں، روسی عورتوں کی چٹیوں گلیوں میں بکنے والی آئس کریم، مقبول عام کاغذ کے پھولوں، دکانوں کی کھڑکیوں میں نئی چیزوں کی جستجو کو دیکھتا ہوں۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں، جو زندگی کو اہم بناتی ہیں۔

ایک بار پھر میں ایہرن برگ سے ملنے کے لئے گیا اور میرے دوست نے سب سے پہلی چیز، جو مجھے دکھائی، وہ نارویجین شراب کی بوتل تھی ـــــ طاقت ور پانی ـــــ اس کے لیبل پر ایک بحری جہاز کی تصویر تھی اور اس جہاز کے سفر کے آغاز اور واپسی کی تاریخیں بھی درج تھیں، جو اس بوتل کو آسٹریلیا اور وہاں سے سیکنڈے نیویا لے آیا تھا۔

ہم نے شراب کے بارے میں بات چیت شروع کر دی تھی مجھے اپنی نوجوانی کے دن یاد آ گئے، جب ہمارے ملک کی بہترین شراب، جس کی بہت مانگ تھی، بیرونی دنیا کے لئے جایا کرتی تھی لیکن یہ شراب، ان لوگوں کے لئے، جو ریلوے کی وردی پہنتے اور ایک فقیرانہ طرز کی زندگی گزارتے، بہت مہنگی تھی۔ میں ہر ملک میں شراب کے بننے کی تاریخ کا دلچسپی سے مطالعہ کرتا اس وقت سے لے کر جب وہ لوگوں کے پیروں تلے کچلی جاتی اور جب وہ سبز شیشے یا کٹ گلاس کی بوتل

میں بند ہو جاتی (Calicia) اور اسپین میں، مجھے (Ribeiro) کی شراب سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا، جسے پیالی میں پینے کے بعد، پیالی کے کنارے پر خون کے سرخ دھبے سے نظر آتے ہیں مجھے ہنگری کی وہ شراب بھی یاد ہے، جسے عرف عام میں بیل کا خون کہا جاتا ہے اور جسے پینے سے خانہ بدوشوں کے وائیلن دھڑک اٹھتے تھے۔

میرے اجداد انگوروں کے باغات کے مالک تھے، (Paral) کے قصبے میں، اپنے باپ اور چچاؤں سے میں نے نئی اور معطر شراب میں فرق محسوس کرنا سیکھا تھا، ان دنوں میرے لئے یہ دشوار تھا کہ میں ان کی طرح غیر مصفٰے شراب کو جو ڈرم سے بہتی ہے، پسند کر سکوں۔ میرے لئے ذائقے میں ایک لطیف خمیر کو پالینے کے بعد، پرانی حالت میں جانا ممکن نہ تھا یہی کچھ فن میں بھی ہوتا ہے۔ ایک صبح کو آپ (Praxiteles) کی افروڈائٹ کے ساتھ بیدار ہوتے ہیں اور (Oceani a) کی وحشی مجسمہ سازی کے ساتھ عمر بتا دیتے ہیں۔

پیرس میں شرفا کے ہاں، مجھے عمدہ قسم کی شراب پینے کو ملی تھی اس شراب کا نام (Mout on-Rothschild) تھا، جس کی خوشبو اور ملائمت کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یہ شراب (Arag on) اور (Elsa) کے ہاں پینے کو ملی تھی۔

(Aragon) نے کہا تھا یہ بوتلیں مجھے ابھی موصول ہوئی ہیں اور میں بطور خاص انہیں تمہارے لئے کھول رہا ہوں۔ اور پھر اس نے مجھے کہانی سنائی۔

جرمن فوجیں فرانسیسی حدود میں داخل ہو رہی تھیں، فرانس کا بے حد عقلمند، سپاہی شاعر اور افسر (Louis Aragon) ایک اگلی چوکی پر پہنچا، اس کی نگرانی میں مرد نرسوں کا ایک دستہ تھا اسے حکم ملا تھا کہ وہ اس چوکی سے ایک بلڈنگ تک جائیں، جو وہاں سے تین سو میٹر آگے تھی، لیکن وہاں موجود انچارج کپتان نے اسے روک دیا، یہ کپتان (Count Alphonse de Roth schild) تھا جو خود آراگون سے عمر میں کم تھا اور اسی کی مانند پرجوش بھی۔

"جرمن بمباری نزدیک ہی ہو رہی ہے،" "تم اس جگہ سے آگے نہیں جاسکتے" وہ بولا

آراگون نے جواب دیا "مجھے حکم ملا ہے کہ میں اس عمارت تک جاؤں۔

کپتان نے جواب دیا "مجھے جو احکامات ملے ہیں، اس کے تحت ہمیں بس یہیں رہنا ہو گا۔" چونکہ میں آراگون کی طبیعت سے واقف ہوں، مجھے یقین ہے کہ ان کی گفتگو کے دوران لفظوں کے شعلے، دستی بموں کی طرح اڑ رہے ہوں گے اور جوابات تلواروں کے حملوں کی طرح، لیکن یہ سب کچھ دس منٹ سے زیادہ نہ ہوا۔ اچانک دونوں کی حیران آنکھوں کے سامنے جرمن توپ سے نکلا ہوا ایک گولہ اس عمارت پر پھٹا اور فوراً ہی وہ عمارت دھوئیں اینٹوں اور راکھ

کے ڈھیر میں ڈھل گئی اور یوں فرانس کا پہلا شاعر روتھ شیلڈ کی ڈھٹائی کے باعث مرنے سے بچ گیا۔

اس کے بعد سے اب تک اس واقع کی سالگرہ پر آراگون کو اس کاؤنٹ کے انگوروں کے باغات سے تیار کی گئی اس شراب کی بوتلیں ملتی ہیں۔ یہ کاؤنٹ گزشتہ جنگ عظیم میں اس کا کپتان تھا۔

اب میں ماسکو میں ایلیا ایہرن برگ کے گھر میں مہمان تھا ادب کا یہ عظیم گوریلا، جو جرمن نازی ازم کے لئے اتنا ہی خطرناک تھا، جتنا کہ چالیس ہزار فوجوں کا ایک ڈویژن، ایک انتہائی نفیس، خوش خوراک بھی تھا۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ (Stendhal) کے بارے میں زیادہ باخبر تھا یا (Foie Gras) کے بارے میں۔ ہاں وہ (Jorge Manrique) کی نظموں کو بالکل ایسے ہی پسند کرتا جیسے (Pommery ct Lrenz کو چکھتے ہوئے اس کا حال ہو جاتا۔ وہ فرانس کی ہر شے سے، جسمانی اور روحانی طور پر محبت کرتا تھا۔

بہرحال جنگ کے خاتمے کے بعد ماسکو میں یہ خبر پھیل گئی کہ فرانسیسی شراب کی کچھ پراسرار بوتلیں بکاؤ ہیں۔ سرخ فوج نے برلن کی طرف اپنی پیش قدمی کے دوران ایک غار نما قلعہ پر قبضہ کیا تھا، جہاں سے (Goebbbels) کے پاگل پروپیگنڈے کے ساتھ ساتھ فرانسیسی شراب کی بوتلوں کا ڈھیر بھی ہاتھ لگ گیا تھا۔ کاغذات اور بوتلوں کو فاتح فوج کے ہیڈ کوارٹر کی طرف بحری جہاز سے بھیج دیا گیا، جہاں کاغذات کو مطالعے کے لئے رکھ لیا گیا، لیکن یہ سمجھ نہ آیا کہ بوتلوں کے ساتھ کیا کیا جائے۔

یہ بے حد خوبصورت شیشے کی بوتلیں تھیں۔ جن کے لیبلوں پر ان کی پیدائش کی تاریخ درج تھی۔ تمام بوتلیں ممتاز اور شہرہ آفاق کمپنیوں کی تھیں۔ جن میں (Romanee) (Beave) وغیرہ کے نام تھے۔ سارا ذخیرہ اپنے ترتیب کے اشاروں کے ساتھ نمایاں تھا۔

سوشلزم کے رویئے کے باعث فرانس کی بنی ہوئی شاندار شراب کی بوتلیں روسی شراب خانوں میں تقسیم کر دی گئی اور روسی شراب ہی کی قیمت پر فروخت ہوئیں۔ لیکن یہ احتیاط برتی گئی کہ ہر خریدار مخصوص تعداد سے زیادہ نہ خریدے سوشلزم کے ارادے بالکل صحیح تھے، لیکن ہم شاعر لوگ ہر جگہ ایک جیسے ہیں۔ میرے تمام ادیب ساتھیوں نے اپنے رشتے داروں، ہمسائیوں اور دوستوں کو کم قیمت پر بوتلیں خریدنے کے بھیج دیا جب کہ یہ خاصی قیمتی شراب تھی۔ اس طرح شراب کی تمام بوتلیں ایک ہی دن میں ختم ہو گئیں۔ ایک مخصوص بڑی تعداد، جس کا میں ذکر نہیں کروں گا۔ ایہرن برگ [illegible] پہنچ گئی تھی۔

ایہرن برگ جو نازی ازم کا غیر مشروط دشمن تھا اور یہی وجہ ہے کہ آج کل میں خود کو اس کی صحبت میں شاعری اور فتح کا جشن مناتے اور (Coebbels) کے تہہ خانے سے بر آمد شدہ شراب پیتے ہوئے پاتا ہوں۔

محلات جو واپس لے لئے گئے

بڑے مقناطیسوں نے مجھے کبھی بھی اپنے بڑے محلات میں مدعو نہیں کیا اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں بھی ان کے بارے میں کبھی متجسس نہیں رہا۔ چلی میں خرید و فروخت ایک قومی شغل ہے لوگ ہفتہ وار نیلاموں میں جاتے ہیں، جو میرے ملک کا ایک خاصا ہے۔ ان بڑے گھروں میں، ہر شخص تباہ ہو چکا ہے جب خریدنے کا وقت آتا ہے تو سب سے زیادہ قیمت لگانے والا مجھے موقع نہیں دیتا، میں یا عوام، جن میں سے، میں ایک ہوں۔

آرام کرسیاں، عیسیٰ کے مجسمے، پرانی وضع کی تصاویر، قالین، چمچے اور چادریں جن میں بہت سی بے کار زندگیوں کی تخلیق ہوئی۔ سب چیزیں یہاں ایک سے دوسرے ہاتھ میں چلی جاتی ہیں۔

لوگ چل کر اندر آتے، چیزوں کو دیکھتے اور انہیں چھوتے، آخر میں، ان میں سے کچھ لوگ خرید لیتے ہیں۔ پھر عمارت گرا دی جاتی ہے اور گھر کے ٹکڑے بھی فروخت کے لئے رکھ دیئے جاتے ہیں۔

گاہک آنکھیں (گھر کی کھڑکیاں) آنتیں (سیڑھیاں)، فرش (جو پاؤں ہیں) تک لے جاتے ہیں، حتیٰ کہ گملوں میں لگے ہوئے پودے بھی سب میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔

یورپ میں اس کے برعکس عظیم الشان گھروں کو قائم رکھا جاتا ہے۔ کبھی کبھار مصوری کے شوقین لوگوں کو شہزادیوں اور شہزادوں کی تصاویر دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے، جنہیں محض خوش نصیب مصوروں نے ہی دیکھا تھا۔

ہم بہت سے رازوں، دلچسپ جرائم، ان حیرت انگیز فائیلوں مصنوعی بالوں کی وگوں، منقش دیواروں میں دفن بہت سی باتوں تک جو ان کا مقدر ہیں مستقبل کی برقی تفریح کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔

مجھے رومانیہ بلایا گیا تھا اور میں پروگرام کے مطابق وہاں پہنچا، ادیب مجھے (Transylva nia) کے خوبصورت جنگلوں کے وسط میں واقع ایک دیہاتی گھر میں آرام کرنے کے لئے لے گئے تھے۔

رومانیہ کے ادیبوں کا گھر کبھی وہاں کے خبطی بادشاہ (Carol) کا محل تھا اور اس بادشاہ کے غیر شہنشاہی عشق دنیا بھر میں مشہور رہے تھے۔

اپنے جدید فرنیچر اور سنگ مرمر کی میزوں کے ساتھ یہ محل اب رومانیہ کی فکر اور شاعری کی خدمات کے لئے وقف تھا۔ اس رات میں ملکہ کے بستر میں ایک اچھی نیند سویا اور اگلے دن ان تمام محلات کی سیر کی، جنہیں میوزیم اور ریسٹ ہاؤس میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

میرے ہمراہ شاعر (Jebeleano) (Benive) اور (Radu Boureano) تھے۔ سرسبز صبح کو قدیم شاہی باغات کے صنوبر کے جنگلات میں ہم نے پوری قوت سے سیٹیاں بجائیں، گانے گائے اور ہر زبان میں اپنی نظمیں پڑھیں رومانیہ کے شعرا استبدادی حکمرانوں کے جور و ستم کے زیر نگیں دکھوں کی ایک طولانی تاریخ رکھنے کے ساتھ ساتھ دنیا میں سب سے بہادر اور خوش مزاج شاعر ہیں۔ اپنی زمین کے درختوں میں پرندوں کی مانند ان بہادروں کے گروہ نے، جو اپنی حب الوطنی میں مستحکم اور اپنے انقلاب میں نصیحتیں رکھنے والے ہیں اور ناقابل بیان حد تک زندگی سے محبت کرنے والے ہیں، میری آنکھوں کو کھول دیا تھا۔

میں نے رومانیہ کے ادیبوں کو پچھلی مرتبہ ایک اور مقدس جگہ جانے کے بارے میں بتایا۔ جس پر وہ بے حد خوش ہوئے۔ جنگ کے زمانے میں یہ میندرڈ (Madria) کا (Liria) کا محل تھا۔ جب (Franco) اپنے اطالویوں، موروں اور سواستیکا کو لئے ہوئے ہسپانویوں کو تہہ تیغ کرنے کے مقدس فریضے کے لئے پیش قدمی کر رہا تھا۔ تو ملیشیا کے سپاہیوں نے اس محل پر قبضہ کر لیا، جسے میں نے کئی مرتبہ دیکھا تھا۔ ہر بار، جب میں ۳۴-۱۹۳۵ء میں (Arguelles) اسٹریٹ میں گیا، میں اسے عزت سے ایک نظر دیکھتا۔ ڈیوک یا (Alba) کے ڈچز کی خدمت کے طور پر نہیں، جن کا مجھ پر کوئی استحقاق نہ تھا بلکہ ایک مایوس امریکی اور نیم وحشی شاعر کی مانند محض اس عظمت اور خاموشی سے متاثر ہو کر جو اس سفید محل میں تھی جب جنگ شروع ہوئی تو ڈیوک انگلستان میں رہ گیا۔ اس کا آخری نام حقیقت میں (Bernik) ہے۔ وہ وہاں اپنی نادر تصاویر اور قیمتی نوادرات کے ساتھ مقیم رہا ذھن میں ڈیوک کے خیال کے آتے ہی، میں نے انہیں بتایا کہ چین کی آزادی کے بعد کنیفوشس کا آخری وارث، جس نے معبد اور مردہ فلسفی کی ہڈیوں سے اپنی قسمت بنائی تھی، نادر تصاویر، کھانے کے برتنوں اور میز کے سرپوشوں کے ہمراہ فارموسا بھاگ گیا تھا۔ یقیناً وہ وہاں آرام دہ زندگی گزارتا ہو گا اپنے ملنے والوں سے ان چیزوں کی قیمت وصول کرتا ہو گا۔ اسپین سے ان دنوں ایک سنسنی خیز خبر تمام دنیا تک پھیل گئی "البا کے ڈیوک کا تاریخی محل سرخوں نے لوٹ لیا۔ تباہی کے عریاں مناظر، آئیں اس تاریخی ہیرے کو

بچائیں " میں اس محل کو دیکھنے کے لئے گیا۔ کیونکہ اب مجھے اس میں جانے کی اجازت تھی۔ بندوقیں تانے ہوئے نیلے اوور آل میں ملبوس لٹیرے دروازوں پر موجود تھے۔ میڈرڈ پر پہلے بم جرمن طیاروں نے برسائے تھے۔ میں نے ملیشیا کے سپاہیوں سے اندر جانے کی اجازت چاہی انہوں نے میرے کاغذات کا بغور معائنہ کیا اور اس سے پہلے کہ میں ہال میں داخل ہو جاتا، انہوں نے مجھے روک لیا۔ میں ڈر گیا تھا کیونکہ داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنے جوتوں کو چٹائی پر صاف نہیں کیا تھا فرش حقیقتاً شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ میں نے اپنے جوتوں کو اچھی طرح سے رگڑا اور اندر داخل ہو گیا۔ دیواروں پر خالی چوکھٹے بتا رہے تھے کہ تصاویر یہاں سے جا چکی ہیں۔ ملیشیا کے سپاہی سب کچھ جانتے تھے، انہوں نے مجھے بتایا کہ پرسوں ڈیوک نے ان تصاویر کو لندن کے ایک بینک کی تجوری میں پہنچا دیا ہے۔ بڑے ہال کمروں میں اب اہم چیزیں صرف دیواروں پر ٹنگے جانوروں کے سر اور شکار کی ٹرافیاں تھیں۔ سب سے بڑی ٹرافی ایک عظیم الجثہ سفید ریچھ کی تھی، جو کمرے کے وسط میں اپنی دونوں ٹانگوں پر بازو پھیلائے ہوئے بھس بھرے سر کے ساتھ ہنستا ہوا کھڑا تھا اور ملیشیا کے سپاہیوں کی وہ پسندیدہ شے تھی، جسے ہر روز وہ برش سے صاف کرتے۔

میں ان خوابگاہوں میں دلچسپی رکھتا تھا۔ جہاں اتنے سارے (Alba) اپنے برے خوابوں کو لئے ہوئے، جن میں (Flemish) بھوت آکر رات کو ان کے تلوے سہلاتے تھے، سو چکے تھے۔ وہ پاؤں اب وہاں نہ تھے لیکن جوتوں کا سب سے بڑا ذخیرہ جو کبھی میں نے دیکھا تھا، نمایاں طور پر وہاں موجود تھا آخری ڈیوک نے آرٹ کے ذخیرے میں کوئی اضافہ نہیں کیا تھا لیکن اس کے جوتوں کا ذخیرہ ناقابل بیان حد تک بہت بڑا اور ان گنت تھا۔ شیشے کے بنے ہوئے شیلف، جو بلندی میں چھت تک پہنچتے تھے۔ ہزارہا جوتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان تک پہنچنے کے لئے خصوصی سیڑھیاں تھیں، جیسے لائبریریوں میں ہوتی ہیں۔ تاکہ احتیاط سے ایڑی سے جوتے پکڑ کر اتارا جا سکے۔ میں نے بغور دیکھا تو وہاں گھڑ سواری کے لئے سینکڑوں جوڑی جوتے تھے۔ زرد رنگ کے، سیاہ رنگ کے۔ کچھ لمبے جوتے بھی تھے، جن میں اندرونی استر پلش کا تھا اور جن کے بٹن موتیوں کے تھے۔ ان کے علاوہ سینکڑوں پمپ اور شوز ان میں لگے ہوئے (Gaiters) جن سے یوں احساس ہوتا کہ جیسے ٹھوس ٹانگیں اور پیر ان میں موجود ہیں۔ اگر شیشے کی الماری کو کھول دیا جاتا تو وہ سارے جوتے ڈیوک کی تلاش میں لندن کی جانب دوڑ پڑتے۔ آنکھوں کے سامنے ایک اچھا وقت لیکن ملیشیا کے سپاہی کبھی تک کو ان جوتوں کو نہ چھونے دیں گے "ثقافت" وہ بولے "تاریخ" انہوں نے کہا۔ اور مجھے ان غریب لڑکوں کا خیال آگیا، جو فاشزم کے علم کو روکنے کی خاطر (Somosierra) کی بلندیوں پر برف اور کیچڑ میں دفن ہو گئے۔

ڈیوک کے بستر کے نزدیک سنہری فریم میں گوتھک طرز میں لکھی ہوئی ایک تحریر نے مجھے متوجہ کیا (Caramba) میں نے سوچا کہ یہ (Alba) کا خاندانی شجرہ ہے، لیکن میں غلط تھا یہ تو (Rudyard Kipling) کی نہ متاثر کرنے والی مقدس شاعری تھی (Readers Digest) کی شروعات کی ابتدا جس کی دانشورانہ سطح میری دانست میں ڈیوک آف البا کے جوتوں سے زیادہ نہ تھی ــــ (سلطنت برطانیہ مجھے معاف کرے) ڈچز کا غسل خانہ، میں نے سوچا، خاصا تحریک انگیز ہو گا اس نے بہت سی باتوں کو مہمیز دے دی، سب سے بڑھ کر (Prado) کے میوزیم میں لیٹی ہوئی میڈونا، جس کے دونوں نپل (Goya) نے ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر بنائے تھے کہ سوچنا پڑتا تھا کہ کس طرح اس انقلابی مصور نے اس فاصلے کو چوم چوم کر بنایا ہو گا، کہ نہ نظر آنے والا گلو بند ایک چھاتی سے دوسری چھاتی تک پہنچا ہو گا۔ لیکن میں ایک بار پھر غلط تھا۔

ایک مزاحیہ طربیہ اور آخر کار میں کسی دیوی کے غسل خانے کی بجائے ایک دائرہ نما کمرے میں تھا۔ نقلی پیمائی ایک قدم گہرا نہانے کا ٹب ایلابیسٹر کے بنے ہوئے فحش ہنس راج مختصراً ایک ایسا غسل خانہ، جو کسی ہالی ووڈ کی فلم میں نظر آتا ہے۔ یہ سوچتا ہوا کہ مجھے دھوکا دیا گیا ہے میں باہر نکل آیا جب کہ مجھے اطلاع مل گئی تھا۔ ملیشیا کے سپاہیوں نے مجھے دوپہر کے کھانے پر مدعو کر لیا۔ ان کے ساتھ میں باورچی خانے تک گیا ڈیوک کے چالیس یا پچاس گھریلو ملازم، نوکر، باورچی، مالی خود اپنے اور ملیشیا کے سپاہیوں کے لئے جو محل کی حفاظت پر معمور تھے کھانا پکاتے تھے۔

انہوں نے مجھے کوئی اہم مہمان سمجھا تھا۔ بہت سی سرگوشیوں ادھر ادھر کے چکروں اور کئی رسیدوں پر دستخطوں کے بعد وہ ایک گرد آلود بوتل لے آئے یہ سو سال پرانی شراب (Lachr yma christi) تھی۔ جس میں سے مجھے چند گھونٹ پینے کی اجازت ملی۔ یہ پگھلی ہوئی شراب شہد اور آگ سے تیار کی گئی تھی ۔ جو ایک ہی وقت میں بے حد تند اور نہ محسوس کی جانے والی تھی۔ ڈیوک آف البا کے وہ آنسو میں بآسانی نہ بھلا سکوں گا۔ ایک ہفتہ بعد جرمن بمبار طیاروں نے (Liria) کے محل پر چار بم گرائے تھے۔ اپنے گھر کے ٹیرس سے میں نے شگون کے دو پرندے اڑتے ہوئے دیکھے اور ایک سرخ روشنی نے مجھے فوراً بتا دیا کہ میں اس محل کے آخری لمحات کو دیکھ رہا ہوں۔ میں رومانیہ کے ادیبوں کو یہ بتاتے ہوئے اپنی کہانی کو ختم کرتا ہوں کہ اسی شام کو میں سلگتے ہوئے کھنڈرات کے پاس سے گزرا " وہاں میں نے روح کو چھونے والے ایک منظر کو دیکھا۔ آسمان سے برستی ہوئی آگ میں دھماکے جو زمین کو دہلا رہے تھے اور ہر جانب آگ روشن تھی۔ ملیشیا کے سپاہیوں نے کسی طرح سفید ریچھ کو بچا لیا تھا۔ وہ اس کوشش میں

تقریباً ہلاک ہو گئے تھے۔ چھتیں گر رہی تھیں، ہر شے آگ کی لپیٹ میں تھی اور اس عظیم الجثہ بھس بھرے جانور نے کھڑکی سے باہر جانے سے انکار کر دیا تھا۔

آخری بار میں نے محل کے سبز باغ میں، اسے سفید بازوؤں کو پھیلائے ہنستے ہوئے مرتے دیکھا تھا۔

خلانوردوں کا عہد

ایک بار پھر ماسکو

۷ر نومبر کی صبح کو، میں نے لوگوں کی پریڈ دیکھی۔ اس میں موجود کھلاڑی، دمکتے ہوئے سوویت جوان، سب نپے تلے قدموں کے ساتھ ریڈ اسکوائر میں چل رہے تھے۔ ان سب کو تیز نگاہوں والا ایک شخص، جو عرصہ ہوا مرچکا، دیکھ رہا تھا۔ اس حفاظت مسرت اور توانائی کا بانی (Vladimir ilyich ulyanov) لافانی لینن

اس مرتبہ پریڈ میں کچھ ہتھیار بھی تھے۔ لیکن پہلی بار تین بین البراعظمی میزائیل بھی باہر نکالے گئے تھے۔ میں ان دیو قامت سگاروں کو اپنے ہاتھوں سے چھو سکتا تھا۔ اس قدر معصوم صورت اس کے باوجود کرہ ارض کے کسی بھی مقام پر ایٹمی (تابکاری) بربادی پہنچانے کے قابل اس روز دو روسی خلاباز، جو آسمانوں سے واپس لوٹے تھے، انہیں انعامات سے نوازا جانا تھا۔ مجھے یوں لگا، جیسے یہ میرے ہی دو پر ہیں شاعر کا کام وسیع پیمانے پر پرندے کا سا ہوتا ہے۔ صحیح طور پر ماسکو کی گلیوں میں، بحیرہ اسود کے ساحلوں پر سوویت کوہ قاف کے پہاڑی سلسلوں میں، میں نے چلی کے پرندوں پر کتاب لکھنے کی خواہش کی تھی نی میوکو کے شاعر کا پرندوں کے بارے میں تحقیقات کرنے اپنے دور افتادہ وطن کے پرندوں کے بارے میں لکھنے کا، (جن میں چڑیاں، Chercam as, Condors, Finches, Mokingbirds, وغیرہ شامل ہیں) مصمم ارادہ تھا۔ جب کہ دو سوویت انسانی پرندے خلا میں پہنچ کر ساری دنیا کو انگشت بدنداں کر چکے تھے۔ انہیں اپنے سر پر محسوس کرتے ہوئے، اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے دو انسانوں کی کائناتی پرواز سے ہم سب کے سانس رک گئے تھے۔

اس دن انہیں تمغوں سے سجایا گیا تھا۔ ان کے پاس ان کے عزیز و اقارب تھے۔ ان کے خاندان کی اپنی جڑیں، عوام کی جڑیں تھیں وہاں موجود بوڑھے دیہاتی جن کی گھنی مونچھیں ہیں اور بوڑھی عورتوں کے سر بڑی شالوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ جو کہ گاؤں اور دیہاتی علاقوں کی خصوصیت ہے۔ خلاباز ہم جیسے تھے۔ دیہات فیکٹری دفتر کے لوگ موجود تھے۔ ریڈ اسکوائر میں

خروشیف نے سوویت یونین کے نام پر ان کا استقبال کیا تھا۔ بعد میں ہم نے انہیں (St.Georg e) کے ہال میں دیکھا۔ (Ghermanthove) چمکتی آنکھوں والے نوجوان خلاباز کا مجھ سے تعارف کرایا گیا۔

"خلاباز، مجھے بتاؤ، جب تم خلا میں محو پرواز تھے اور ہمارے اس کرہ ارض کو تم نے دیکھا تو کیا تم چلی کو دیکھ سکتے تھے؟"

یہ کہنا بالکل ایسے ہی تھا کہ اپنے اس دورے میں تم نے سب سے اہم چیز جو اوپر سے دیکھی تھی وہ چلی کا ملک تھا۔

وہ قطعاً نہ مسکرایا، جیسا کہ میں توقع کر رہا تھا، بلکہ دو سیکنڈ تک سوچنے کے بعد مجھ سے بولا

"زرد پہاڑوں کا ایک سلسلہ جنوبی امریکہ میں یاد آتا ہے، جو بہت بلند تھے، شاید وہ چلی تھا۔"

بالکل صحیح کامریڈ —— وہ چلی ہی تھا۔

سوشلسٹ انقلاب کی چالیسویں سالگرہ پر، میں نے ماسکو کو فن لینڈ کے لئے ریل گاڑی سے خیرباد کہا تھا۔ اسٹیشن جانے کے لئے جب میں شہر سے گزرا تو آتش بازی کے گولے آسمان تک جانے والے چمکتے ہوئے ستارے، نیلے، سرخ، کاسنی، سبز زرد، مالٹی تالیوں کی گونج کی مانند بہت بلندی پر پھٹ رہے تھے بالکل باہمی سمجھوتے اور دوستی کے اشاروں کی مانند، جو فتح کی اس رات کو دنیا بھر کے ممالک کی جانب جا رہے تھے۔ فن لینڈ (Finland) میں، میں نے (Narwhal) کا دانت خریدا اور اپنے سفر کو جاری رکھا (Gothenburg) سے ہم بحری جہاز میں سوار ہو گئے، ہمیں امریکہ لے جانا تھا امریکہ اور میرا ملک بھی وقت اور زندگی کے ساتھ قدم ملاتا ہے خیر جب ہم (Venezvela) وینزویلا سے والپاریزو کے لئے گزرے تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے وزارت داخلہ کے پالتو چمچے سموزا (Somoza) اور ٹروجی لو (Trujillo) کی ناجائز اولاد، ظالم (Perez) نے مجھے اور میری بیوی کو بحری جہاز سے اترنے اور روکنے کے لئے کسی جنگ کی ضرورت سے بھی زیادہ سپاہی بھیجے ہوئے تھے۔ لیکن جب تک میں والپاریزو پہنچا تو آزادی پہلے ہی سے وینزویلا کے ظالم حکمران کو باہر نکال چکی تھی۔ اور خوبصورت پٹے سے بندھا کسی خرگوش کی مانند جو عالم خوابیدگی میں دوڑ رہا ہو۔ وہ (Miami) پہنچ چکا تھا۔

دنیا سپتنک کی پہلی اڑان کے بعد سے تیزی سے گھوم رہی ہے۔ کسے یقین آئے گا کہ پہلا شخص جس نے والپاریزو میں ہمارا استقبال کرتے ہوئے میرے کیبن پر دستک دی وہ کمی کمی نوو

(Simonov) ہوگا۔ وہ ناول نگار جسے میں بحیرہ اسود میں تیرتا ہوا چھوڑ آیا تھا۔

گیارھواں باب

شاعری ایک شغل ہے

شاعری کی قوت

یہ ہمارے عہد کی سہولت تھی کہ اس کی جنگوں، انقلابوں اور بے پناہ سماجی اتھل پتھل نے شاعری کے لئے زمین کو ناقابل تصور حد سے بھی کہیں زیادہ زرخیز بنا دیا ہے۔ عام انسان کو حملہ کرتے ہوئے یا حملے کی زد میں آتے ہوئے تنہائی میں یا عوامی ریلی کے دوران بے پناہ انسانوں کے ہجوم میں اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب میں نے اپنی پہلی کتابیں لکھیں تو یہ بات کبھی میرے ذہن میں نہ آئی تھی کہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ میں خود کو چوراہوں، گلیوں، فیکٹریوں، لیکچر ہالوں، تھیٹروں اور باغوں میں اپنی نظمیں پڑھتا ہوا پاؤں گا۔

عملی طور پر، میں چلی کے ہر کونے میں اپنی شاعری کو بیجوں کی مانند اپنے ملک کے عوام میں بکھیرنے گیا ہوں۔

میں ایک بار پھر یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ چلی میں سانتیاگو کے ایک بازار میں (Ve gacentre) میں میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ صبح کے وقت گاہکوں، گھوڑا گاڑیوں، ریل گاڑیوں اور سڑکوں کی ایک نہ ختم ہونے والی قطار، مختلف صوبائی شہروں سے غذائی مواد، پھل اور سبزیاں لاتی ــــ بازار کے لوگ ــــ ایک بڑی یونین کے کارکنان عموماً قلیل تنخواہوں پر کام کرنے والے جو ننگے پاؤں، چائے خانوں، دکانوں اور (Vegacentre) کے قرب و جوار میں کھانے پینے کی سستی جگہوں پر مکھیوں کی طرح منڈلاتے ہیں۔

ایک دن کوئی شخص مجھے اپنے ہمراہ کار میں لے جانے کے لئے آیا اور میں بغیر جانے پوچھے

کہ میں کہاں، جا رہا تھا اس میں سوار ہو گیا۔ میری جیب میں میری کتاب (Espana enel corazon) کی ایک، کاپی تھی۔ راستے میں مجھے بتایا گیا کہ میں (Vegacentre) کے یونین ہال میں سامان اٹھانے والے مزدوروں کو لیکچر دینے جا رہا ہوں۔

جب میں اس کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں داخل ہوا تو (JosgSilva) کی نظم (Noc turno) جیسی ٹھنڈک میرے وجود میں دوڑ گئی اس لئے نہیں کہ یہ سردیوں کا موسم تھا بلکہ اس لئے کہ وہاں کے ماحول نے مجھے بالکل مبہوت کر دیا تھا۔

پچاس کے قریب مرد لکڑی کے خالی کھوکوں اور عارضی طور پر بنائی گئی لکڑی کی بنچوں پر میرے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ نے اپنی کمر کے گرد ایپرن کی طرح خالی بوریوں کو باندھا ہوا تھا۔ دوسرے پرانی دغدار بنیانوں میں موجود تھے۔ اور بہت سے اور چلی کے سرد جولائی کے مہینے (چلی (Chilli) کے جنوبی حصہ میں سردیاں ہمارے ہاں کے گرمیوں کے موسم میں آتی ہیں۔) میں کمر سے اوپر ننگے تھے۔ میں ایک چھوٹی سی میز کے دوسری طرف جو مجھے اسی غیر متوقع سامعین سے الگ کر رہی تھی بیٹھ گیا۔ ان سب نے مجھ پر میرے ملک کے عوام کی طرح اپنی سیاہ کوئلہ جیسی آنکھیں گاڑ دیں۔

مجھے بوڑھا (Laperrete) یاد آگیا، جس نے مجھے اتنے متاثر کرنے والے سامعین مہیا کئے تھے، جو اپنے چہرے کے عضلات کو ہلائے بغیر آپ پر اپنی آنکھیں جمائے رکھتے ہیں۔ ایک بار نائیٹریٹ پمپا پر اس نے مجھ سے کہا تھا۔

" دیکھو، وہاں ہال میں پشت پر اس ستون کے ساتھ جھکے ہوئے دو مسلمان ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ صحرا کے بے خوف ماننے والوں کی طرح انہیں جو چاہئے وہ بس سر اور کندھوں کو ڈھانپنے والا رومالی چغہ ہے۔

اس مجمع کو، میں کس طرح سے سنبھالوں؟
میں ان کے سامنے کیا پڑھ سکتا ہوں؟

میری زندگی میں وہ کون سی باتیں ہیں، جو ان کی دلچسپی کو قائم رکھیں گی؟ میں طے نہ کر سکا، لیکن وہاں سے بھاگنے کی اپنی خواہش پر پردہ ڈالے ہوئے میں نے اس کتاب کو جو میرے پاس تھی نکالا اور ان سے مخاطب ہوا "کچھ عرصہ پہلے میں اسپین میں تھا، وہاں جنگ وجدل کا بازار گرم تھا اس کے بارے میں، جو کچھ میں نے لکھا ہے اسے سنیں۔"

مجھے یہ وضاحت کرنی چاہئے کہ میری کتاب (Espana enel corzaon) مجھے سمجھنے کے لئے اس قدر سہل کبھی نہ لگی تھی۔ یہ آسان معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت یہ المناک واقعات

کے سیل میں ڈوبی ہوئی ہے۔ خیر میں نے سوچا تھا کہ بس میں چند نظموں کو پڑھ کے، کچھ لفظ بول کر خدا حافظ کہہ دوں گا، لیکن ایسا ہوا نہیں۔

نظم کے بعد نظم پڑھتے ہوئے، میرے لفظ جیسے سکوت کے ایک گہرے کنویں میں گر رہے تھے۔ ان سیاہ آنکھوں اور ابروؤں کی جنبش کو دیکھتے ہوئے جو میری نظموں کے تعاقب میں تھیں، مجھے احساس ہوا کہ میری کتاب اپنے نقطہ عروج کو چھو رہی تھی۔

خود اپنی ہی ذات سے متاثر ہوتے ہوئے اور اس مقناطیسی قوت سے لرزتے ہوئے، جس نے ان پیش افتادہ روحوں کو میری نظموں سے مربوط کر رکھا تھا، میں بس پڑھتا چلا گیا۔ پڑھنے کا یہ عمل کوئی ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ جب میں چلنے والا تھا تو ان میں سے ایک شخص کھڑا ہوا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے اپنی کمر پر ایک بوری باندھی ہوئی تھی۔ میں سب کی جانب سے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں" وہ بولا "میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آج تک کسی چیز نے ہمیں اس قدر متاثر نہیں کیا"

جب وہ بول چکا تو اس کے منہ سے ایک سسکی نکل گئی وہاں موجود لوگوں میں بہت سے دوسرے بھی رو رہے تھے۔

میں بھیگی ہوئی آنکھوں اور کھردرے ہاتھوں کے مصافحوں کے مابین گلی میں باہر نکل آیا۔

کیا کوئی بھی شاعر آگ اور برف کے ان مقدمات کے بعد، پہلے کی طرح رہ سکتا ہے؟

جب میں (Tina Modotti) ٹینا موڈوٹی کو یاد کرنے لگا تو مجھے اس قدر محنت کرنی پڑتی جیسے کہ میں مٹھی بھر نظر نہ آنے والی دھند کو اکٹھا کر رہا ہوں۔

کیا وہ اسے جانتا تھا، یا نہیں؟

وہ تب بھی بہت ہی پیاری تھی۔ ایک زرد کتابی چہرہ سیاہ بالوں کے پردوں میں ملفوف اور دو مخملیں آنکھیں، جو بس برسوں دیکھتی رہتی ہیں (Diego Rivera) نے اس کے چہرے کو اپنے میورل (Mural) میں سے ایک میں پودوں کے تاج اور غلے کے نیزوں میں سجا رکھا تھا۔

یہ اطالوی انقلابی ایک غیر معمولی فنکارہ اپنے کیمرے کے ساتھ سوویت یونین کے عوام اور وہاں کی یادگاروں کی تصاویر بنانے کے لئے گئی تھی لیکن سوشلزم کی ناقابل گرفت بھرپور موج میں پھنس کر رہ گئی اور کیمونسٹ پارٹی کے انتہائی گھٹیا مقصد کی خاطر اپنا کیمرہ دریائے ماسکو میں غرق کر بیٹھی۔ میں اسے میکسیکو میں اس وقت ملا تھا، جب اس کا جھگڑا چل رہا تھا۔ اچانک ایک رات میں

اس کی موت کی خبر سے ہل کر رہ گیا۔

یہ واقعہ ۱۹۴۱ء میں ظہور پذیر ہوا کمانڈانٹ (Vittoria Vidali) اس کا شوہر تھا۔ ٹینا موڈوٹی اپنے گھر جاتے ہوئے ایک ٹیکسی میں دل کے دورے کے ہاتھوں مر گئی تھی۔ وہ اپنے عارضہ قلب کے بارے میں جانتی تھی لیکن اس کا اس نے محض اس لئے کبھی ذکر نہ کیا تھا کہ کہیں اس کے انقلابی کام کو کم نہ کر دیا جائے وہ عورت، وہ سب کچھ کر لینے کو قبول کر لیتی تھی، جو کوئی بھی دوسرا نہ کرتا۔ دفاتر میں جھاڑو دینا، طویل فاصلوں کی مسافت پیدل طے کرنا، ساری ساری رات بیٹھ کر خطوط لکھنا اور مضامین کا ترجمہ کرنا۔ اسپین کی جنگ میں اس نے زخمی ہونے والے ری پبلیکن کی تیمار داری کی تھی۔ کیوبا کے ممتاز نوجوان جلاوطن (Julio Antinio Mela) کے ساتھ رہتے ہوئے وہ ایک دردناک تجربے سے گزری تھی۔ ظالم (Cierardo Machado) نے بہت سے بندوق برداروں کو اس انقلابی رہنما کے قتل کے لئے بھیجا ہوا تھا ایک شام وہ دونوں پکچر دیکھ کر لوٹ رہے تھے۔ ٹینا موڈوٹی جولیو میلا کے بازو پر جھکی ہوئی تھی۔ جب وہ مشین گن کے برسٹ سے اچانک زمیں بوس ہو گیا۔ وہ دونوں زمین پر گر پڑے تھے اس کا اپنا جسم اپنے مردہ ساتھی کے خون میں لت پت تھا جب کہ قاتل پولیس کی حفاظت میں بھاگ گئے تھے۔

اس سب پر مستزاد ارباب اقتدار، جنہوں نے قاتلوں کی حفاظت کی تھی اب ٹینا کو قتل میں پھنسانا چاہتے تھے بارہ سال بعد ٹینا کی طاقت جواب دے گئی۔ میکسیکو کے رجعت پسندوں نے ایک بار پھر اس کی قوت کا اسکینڈل کھڑا کر دیا تھا بالکل جس طرح پہلے انہوں نے اسے جولیو میلا کے قتل میں پھنسانا چاہا تھا۔ میں اور کارلوس (ٹینا کا شوہر) اس ننھی سی لاش پر کھڑے تھے۔ کارلوس جیسے باہمت اور سخت مزاج انسان کو اذیت میں دیکھنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ رجعت پسند ٹینا کو بدنام کرتے ہوئے اس کے زخموں پر نمک پاشی کا کام کر رہے تھے "ٹینا مر گئی" کمانڈانٹ کارلوس سرخ آنکھوں سے روتے روتے چیخا وہ اپنے مختصر سے تابوت میں موم کی بنی ہوئی لگتی تھی۔ میں اس سارے دکھ کے منظر کے سامنے خاموش کھڑا تھا۔

اخبارات کے صفحات سنسنی خیز گند سے بھرے پڑے تھے۔ انہوں نے ٹینا کو "ماسکو کی پراسرا عورت" بتایا تھا۔ کچھ نے کہا کہ وہ اس لئے مر گئی کہ بہت کچھ جانتی تھی۔ کارلوس کے دکھ کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ کچھ کرنا چاہئے۔ اور میں نے ان لوگوں کو چیلنج کرتے ہوئے اپنی مری ہوئی دوست کے لئے ایک نظم لکھی یہ جانتے ہوئے کہ یہ نہیں چھپے گی۔ میں نے اس نظم کو تمام اخبارات میں بھیج دیا لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ اگلے دن چنچنی خبروں کے بجائے تمام اخبارات کے پہلے صفحوں پر میری احتجاجی نظم چھپی ہوئی تھی۔ نظم کا عنوان (Tina Modotti

(na muretto تھا یعنی (ٹینا موڈوئی مرگئی) ۔ اس صبح وہ نظم میں نے قبرستان میں پڑھی، جہاں ہم نے اس کے جسد خاکی کو ہمیشہ کے لئے گرینائٹ کے پتھر تلے دفن کر دیا۔ قبر کے کتبے پر میری نظم کی سطور کھدی ہوئی ہیں۔ میکسیکو کے اخبارات نے اس کے بعد ایک سطر بھی ٹینا کے خلاف نہ چھاپی۔

لوٹا (Lota) میں بہت سالوں کے بعد دس ہزار کان کن ایک اجلاس کے لئے اکٹھے ہوئے تھے۔ کوئلے کے کان کنوں کی ڈسٹرکٹ اپنی غربت کے خلاف ایک مسلسل احتجاجی حالت میں تھی اور احتجاج کرنے والے مزدور لوٹا قصبے کے مرکز میں جمع ہو گئے تھے۔ سیاسی مقررین مسلسل تقریریں کرتے رہے۔ دوپہر کی ہوا میں کوئلے اور سمندر کے نمکین پانی کی بو تیرتی تھی سمندر اس جگہ سے نزدیک ہی دس کلو میٹر کے فاصلے پر پھیلا ہوا تھا وسط دوپہر میں وہ سب ہمہ تن گوش تھے۔ مقرر کا پلیٹ فارم خاصا بلند تھا۔ جہاں سے میں کان کنوں کے آہنی خود اور سیاہ ہنیوں کا ایک سمندر اپنے سامنے دیکھ سکتا تھا۔ بولنے والوں میں میرا آخری نمبر تھا۔

جب میرا نام اور میری نظم کا عنوان "سٹالن گراڈ کے لئے نئی محبت، پکارا گیا تو ایک غیر معمولی بات ظہور پذیر ہوئی۔ ایک ایسی تقریب میں، جسے میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ جونہی انہوں نے میرا نام اور نظم کے بارے میں اعلان سنا تو ایک عظیم الشان انسانوں کے اجتماع نے اپنے سروں سے ٹوپیاں ہیٹ اور آہنی خود اتار لئے سیاسی تقاریر کو سننے کے بعد انہوں نے اپنے سروں کو میری شاعری کے لئے ننگا کر دیا تھا، کہ میری شاعری بذات خود اب بولنے والی تھی۔ اس بلند پلیٹ فام سے، میں لاتعداد آہنی خودوں اور ہنیوں کی حرکت کو دیکھ سکتا تھا۔ دس ہزار ہاتھ ایک ہی وقت میں زمین کی طرف جھک گئے۔ یہ احترام میں ایک عظیم بے آواز سیاہ لہر تھی۔

پھر میری نظم شروع ہوئی۔ اور اس کا آغاز کچھ ایسے تھا کہ پہلے کبھی ایسے نہ ہوا تھا ــــ آزادی اور مسابقے کا ملا جلا سریہ دوسرا واقع جب ظہور پذیر ہوا تو میں ابھی جوان تھا، اس وقت میں ایک طالب علم شاعر تھا۔ ایک دبلا پتلا غذائی قلت کا شکار شاعر جو ہر وقت گہرے رنگ کے لبادے میں ملبوس رہتا جیسا کہ ان دنوں کوئی بھی شاعر ہو سکتا تھا۔ اس زمانے میں میری بس ایک کتاب (Crepusculario) شائع ہوئی تھی اور تب میرا وزن کسی سیاہ پر سے بھی کم تھا۔

کچھ دوستوں کے ہمراہ میں ایک رقص گاہ میں چلا گیا تھا۔ یہ رقص و سرود اور بدمعاشوں کی غنڈہ گردی کے دن تھے۔ اچانک رقص یوں تھما جیسے کسی گلاس کو دیوار سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے دو نامی گرامی بدمعاش ایک دوسرے پر آوازے کستے ہوئے رقص گاہ کے فرش پر عین وسط میں موجود تھے۔ جب بھی ان میں سے ایک دوسرے کو مکہ مارنے کے لئے آگے

بڑھتا، تو دوسرا پیچھے کی طرف ہٹ جاتا۔ ان کے ہمراہ موسیقی کے مداح جو اپنی اپنی میزوں پر براجمان تھے۔ اپنی مدافعت میں پیچھے کو ہٹتے۔ یہ دونوں بدمعاش قدیم زمانے کے جانور نظر آتے تھے، جو ماقبل تاریخ کے کسی جنگل کے کھلے حصے میں رقص کر رہے تھے۔

بغیر کچھ سوچے سمجھے میں آگے بڑھا اور ان پر برس پڑا۔

''کم بخت لفنگو، غبی بن مانسو، قابل نفرت غلاظت، لوگوں کو جو یہاں رقص دیکھنے کے لئے آئے ہیں، نہ کہ تمہیں، تنگ مت کرو''

انہوں نے آپس میں حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا، جیسے انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ آرہا ہو، پستہ قد شخص نے جو ٹھگ بننے سے پہلے باکسر (مکہ باز) رہ چکا تھا، مجھے قتل کرنے کے ارادے سے میری جانب بڑھنا شروع کیا اور وہ گوریلا یقیناً مجھے مار ڈالتا اگر اس کے شانے پر لگا ہوا مکہ اسے زمین بوس نہ کرتا۔ یہ موقع میری وجہ سے اس کے مخالف کو مل گیا تھا۔ جب گرے ہوئے کھلاڑی کو ایک بوری کی مانند گھسیٹ کر وہاں سے باہر لے جایا جارہا تھا اور لوگ اپنی اپنی میزوں پر بوتلیں ہماری جانب اٹھائے ہوئے تھے اور ناچنے والی لڑکیاں ہماری طرف شوق سے تک رہی تھیں لڑائی میں جیتنے والے دیوانے، فاتح کی حیثیت سے ہماری خوشی میں شریک ہونا چاہا۔

''تم بھی یہاں سے دفعان ہو جاؤ، کیونکہ تم اس سے کچھ زیادہ اچھے نہیں'' تھوڑی ہی دیر میں میری فتح کا لمحہ ختم ہو چکا تھا۔

میں اور میرے دوست ایک تنگ برآمدے میں سے گزر رہے تھے، جب ہمارا سامنا ایک پہاڑ جیسے انسان سے ہو گیا جس کی کمر چیتے کی سی تھی اور جو ہمارا راستہ روکے کھڑا تھا۔ یہ زیر زمین دنیا کا ایک بدمعاش تھا، وہی شخص جس نے لڑائی میں فتح حاصل کی تھی۔

''میں تمہارا انتظار کر رہا تھا'' اس نے مجھ سے کہتے ہوئے ایک خفیف سے دھکے کے ساتھ مجھے ایک دروازے کی طرف دھکیل دیا، جب کہ میرے دوست سہمے ہوئے خرگوشوں کی طرح وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے، اب اس کے سامنے میں وہاں بے یارو مددگار رہ گیا تھا۔ اپنے دفاع کے لئے میں نے ادھر ادھر کچھ ڈھونڈنا چاہا، لیکن کچھ ہاتھ نہ لگا، وہاں کچھ تھا ہی نہیں ماسوائے میزوں کے وزنی سنگ مرمر کے اوپر والے حصے اور زنگ خوردہ آہنی کرسیاں، جنہیں میں اٹھا نہ سکتا تھا۔ نہ ہی وہاں کوئی گملا تھا اور نہ کوئی بوتل، حتیٰ کہ نہ ہی کوئی چھڑی، جسے کوئی شخص غلطی سے بھول گیا ہو

اس شخص نے کہا ''ہمیں کچھ بات کرنی چاہئے'' مجھے احساس ہوا کہ کسی بات کی کوشش بھی

کس قدرے بے کار ہوگی اور مجھے خیال آیا کہ یہ کسی شیر کی طرح اپنے شکار کو کھانے سے پہلے مجھے پکڑے گا۔ مجھے احساس ہوا کہ میرا دفاع اس بات میں ہے کہ میں اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دوں کہ میں کس قدر ڈرا ہوا ہوں۔

ایسا ہی ایک دھکا، جیسا اس نے مجھے دیا تھا، میں نے بھی اسے دینے کی کوشش کی لیکن میں اسے ایک انچ بھی نہ ہلا سکا۔ وہ اینٹوں کی ایک دیوار تھی۔

اچانک اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف کیا اور اس کی نظروں سے وحشی جانور کا سا انداز ختم ہو گیا

"کیا تم شاعر پابلو نرودا ہو؟" اس نے کہا

"ہاں میں وہی ہوں"

اس نے اپنا سر لٹکا دیا۔ "میں کتنا نابکار شخص ہوں، یہاں میں اس شاعر کے سامنے ہوں، جسے میں حقیقتاً چاہتا ہوں" اور اس نے مجھے بتانا چاہا کہ میں کس قدر عظیم انسان ہوں اور وہ اپنے سر کو اپنے ہاتھوں میں لئے ہلاتا رہا "میں تو محض لباس کا وہ حصہ ہوں، جو سر پر ڈالتے ہیں، دوسرا شخص جس سے میں لڑا تھا، کوکین بیچتا ہے، ہم اس زمین کا گند ہیں، لیکن ایک چیز میری زندگی میں بالکل شفاف ہے۔ یہ میری دوست ہے، میری محبوبہ، پابلو اس کی تصویر دیکھو، میں کبھی اس کو بتاؤں گا کہ تم نے درحقیقت اس کی تصویر کو اپنے ہاتھوں میں لیا تھا، اور یہ بات اسے بے حد خوش کرے گی"

اس نے مسکراتے ہوئے مجھے ایک ہنستی ہوئی لڑکی کی تصویر دی۔

"ڈان پابلو۔ یہ لڑکی تمہاری وجہ سے، مجھ سے محبت کرتی ہے، تمہاری نظموں کی وجہ سے، جو ہم دونوں نے اکٹھے زبانی یاد کی تھیں" اور تبھی اس نے نظم پڑھنی شروع کر دی۔

"تمہاری ذات میں مجھ جیسا ایک اداس لڑکا اپنی نظریں ہم پر ڈالتے ہوئے جھکتا ہے۔"

اسی وقت زور سے دروازہ کھلا۔ یہ میرے دوست تھے، جو اسلحے کے ساتھ واپس پلٹے تھے۔ میں ان کے حیرت زدہ چہروں کو دروازے میں دیکھ سکتا تھا۔

میں آہستگی سے چلا۔ وہ شخص ایک انچ ہلے بغیر ہمارے پیچھے رہ گیا تھا۔

"اس لڑکی کی رگوں میں جلتی ہوئی زندگی کے لئے، انہیں میرے ہاتھوں کو مارنا ہوگا" ____ شاعری کے ہاتھوں شکست کھایا ہوا۔

بڑی طاقتوں کا ہوائی جہاز، جو سوویت یونین پر جاسوسی کے مقصد کے لئے اڑ رہا تھا، ایک

ناقابل یقین بلندی سے نیچے گرا دیا گیا تھا ـــــ دو زبردست میزائلوں نے اسے نشانہ بنا کر بادلوں سے زمین بوس کر دیا تھا۔ اخباری نامہ نگار اس ویران پہاڑی علاقے کی طرف پہنچے، جہاں سے راکٹوں کو چھوڑا گیا تھا۔ نشانہ باز دو تنہا لڑکے تھے، جو صنوبر کے درختوں، دریاؤں اور برف کی دنیا میں سیب کھاتے شطرنج کھیلتے، ایکارڈین بجاتے، کتابیں پڑھتے اور پہرہ دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی مادر وطن سوویت یونین کے وسیع آسمان کی حفاظت کرتے ہوئے اوپر نشانہ لیا تھا ان پر سوالات کی بوچھار کر دی گئی۔

"تم کس قسم کی خوراک کھاتے ہو؟"

"تمہارے والدین کون ہیں؟"

"کیا تمہیں رقص پسند ہے؟"

"تم کون سی کتابیں پڑھتے ہو؟"

اس آخری سوال کا جواب دیتے ہوئے دونوں نوجوانوں نے ایک ساتھ ہی جواب میں کہا کہ وہ نظمیں پڑھتے ہیں اور ان کے پسندیدہ شاعروں میں کلاسیکی روسی شاعر پشکن اور چلی کا نرودا شامل ہیں۔ جب مجھے اس بات کا علم ہوا تو میں بے حد خوش ہوا۔ وہ میزائل، جو اتنی بلندی پر گیا تھا اور جس نے غرور کو اتنا نیچے گرا دیا تھا، اس نے کسی بھی طور میری جذباتی شاعری کے ایک ایٹم (سالمے) کو بھی اپنے ہمراہ شامل کر لیا تھا۔

شاعری

مصوری کے کتنے فن پارے..... دنیا میں ان کے لئے اب اتنا بڑا کوئی کمرہ نہیں..... انہیں اب کمرے سے باہر آویزاں ہونا پڑے گا۔ کتنی کتابیں..... کس قدر چھوٹی کتابیں..... کون ان سب کو پڑھ سکتا ہے.........؟ اگر یہ خوراک ہوتیں اگر عظیم بھوک کے دنوں میں ہم سلاد کے ہمراہ انہیں کاٹ کر ان پر کچھ لگا کر کھا لیتے، تو ہم سب کھا چکتے......... ہم اکتا گئے ہیں۔ دنیا کتابوں کے سیلاب میں ڈوب رہی ہے (Reverdy) نے مجھ سے کہا تھا "میں نے ڈاک خانے سے کہہ دیا ہے کہ مجھے کتابیں نہ پہنچائی جائیں۔ میں انہیں کھول نہیں سکتا۔ میرے پاس مزید جگہ نہیں ہے۔ وہ دیواروں پر چڑھ رہی ہیں۔ میں سانحے سے گھبراتا ہوں، وہ میرے سر میں جگہ بنانا چاہتی تھیں" ہر شخص (Eliot) ایلیٹ سے واقف ہے۔ ایک مصور، ڈرامہ نگار، اور شاندار نقاد..... لکھنے والا۔ تنقید لکھنے سے پہلے، وہ میری نظمیں پڑھا کرتا تھا..... میں خوش تھا..... کوئی بھی انہیں اتنا نہ سمجھتا تھا......... تب ایک روز اس نے اپنی نظمیں پڑھنا شروع کیں اور میں خود غرضانہ

انداز میں احتجاج کرتا ہوا جاگ اٹھا...... میرے لئے انہیں مت پڑھو، مت پڑھو...... میں نے خود کو اپنے غسل خانے میں ، بند کر لیا تھا لیکن ایلیٹ دروازے کے بند ہونے کے باوجود انہیں پڑھتا رہا...... میں اداس ہو گیا۔ اسکاٹ شاعر (Fraser) وہاں موجود تھا، وہ مجھ پر برس پڑا، تم ایلیٹ سے ایسا سلوک کیوں کرتے ہو؟

میں نے جواب دیا، میں اپنے قاری کو کھونا نہیں چاہتا، میں نے بہت احتیاط سے اسے تخلیق کیا ہے...... وہ میری شاعری میں موجود سلوٹوں تک سے مانوس ہو گیا ہے...... ایلیٹ میں اس قدر صلاحیت ہے...... وہ تصویر بنا سکتا ہے...... وہ مضامین لکھتا ہے...... لیکن میں اس پڑھنے والے کو محفوظ کرنا چاہتا ہوں اور اسے ایک خوشبو دار پودا سمجھتے ہوئے اس کی آبیاری کرتا ہوں۔

(Fraser) تم مجھے سمجھتے ہو...... کیونکہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو شاعر دوسرے شاعروں کے لئے چھپیں گے...... ہر ایک ...... اپنی ایک ننھی سی کتاب کو نکالے گا اور دوسرے کی جیب میں ڈال دے گا...... اس کی نظم...... اور وہ اسے دوسرے کی پلیٹ میں رکھ دے گا___ ایک روز (Quevedo) نے اپنی نظم بادشاہ کے نیپکن پر چھوڑ دی تھی۔ وہ حقیقتاً اسی قابل تھی...... جیسے بھری دوپہر میں قصبے کے مرکز میں شاعری یا کتابوں کو خستہ ہونے دیا جائے اور وہ انسانوں کی انگلیوں کے درمیان سے چیتھڑوں کی طرح گر جائیں...... لیکن یہ بات کہ ایک شاعر دوسرے شاعروں کے لئے شائع ہوتا ہے، مجھے متاثر نہیں کرتی، مجھے متوجہ نہیں کرتی بلکہ، خود مجھے فطرت کے جنگلات میں ایک چٹان یا کسی لہر کے سامنے، چھپے ہوئے کاغذ اور چھاپہ خانوں سے کہیں دور دفن کراتی ہے۔

شاعری نے اپنے قاری سے، جو اس کے قابو سے باہر ہے، اپنا رشتہ توڑ لیا ہے۔ اسے اس کو واپس لانا ہو گا...... اسے تاریکی میں چل کر انسانی قلب سے، عورت کی آنکھوں، گلیوں، میں اجنبی لوگوں سے جو شفق کے وقت یا تاروں بھری رات میں بس شاعری کی ایک سطر کے خواہاں ہوتے ہیں، ان سے سامنا کرنا ہو گا۔ اس غیر متوقع تک کا سفر، اس عام طویل مسافت، تمام علم اور تجربے کا جو حاصل ہے...... ہمیں ان کے مابین، جنہیں ہم نہیں جانتے غائب ہو جانا ہے لہٰذا وہ اچانک ہماری کوئی شے گلی سے، ریت سے، ان پتوں سے، جو ہزاروں سال سے اسی جنگل میں گرے ہیں اٹھا لیں گے...... اور آہستگی سے وہ شے، جسے ہم نے تخلیق کیا ہے لے لیں گے...... محض تب ہم حقیقتاً شاعر ہوں گے۔ اور اس صورت میں شاعری زندہ رہے گی......

زبان کے ساتھ جینا

میں ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں میری نظموں سے ایک نظم ایک رسالے میں شائع ہوئی ۱۹۲۳ء میں میری پہلی کتاب (Crepuscülario) چھپی تھی اور یہ "یادیں" میں ۱۹۷۳ء میں لکھ رہا ہوں۔

اس تحریک دینے والے، بے چین کرنے والے لمحے، کو جب شاعر چھپے ہوئے نومولود کو زندہ ہاتھ پاؤں مارتے پہلی بار چیختے، بالکل کسی نوزائدہ بچے کی طرح، جو اپنی طرف توجہ کو مبذول کراتا ہے، پچاس سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔

آپ تمام عمر زبان کے ساتھ، اسے لمبائی کے لئے پھیلاتے ہوئے اس کو دریافت کرتے ہوئے اس کے بالوں میں انگلیاں پھرتے ہوئے اس کے پیٹ کو گدگداتے ہوئے اس انتہائی قربت کو اپنی فطرت ثانیہ بنائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے ہسپانوی زبان کے جاننے میں یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا بولے جانے والی زبان کی مختلف جہتیں ہیں۔ لکھی جانے والی زبان غیر معمولی لچک اختیار کرتی ہے۔ زبان کو کپڑوں کی طرح یا اپنے جسم پر جلد کی مانند، اس کی آستینوں، اس کے ٹکڑوں اس کی دم براری اور اس کے خون اور پسینے کے دھبوں کی طرح استعمال کرنا، ایک مصنف کے کمال کو دکھاتا ہے۔ یہی اسلوب ہے۔ میں نے دیکھا کہ میرا عہد فرانسیسی ثقافت کے انقلابی رجحانات کے ضمیر میں ہے انھوں نے ہمیشہ مجھے اپنی طرف متوجہ کیا، لیکن نجانے کیوں یہ میرے جسم کے لئے مناسب وضع کے لباس نہ تھے۔ چلی کے ایک شاعر (Huidobru) ھوڈی برو نے اپنی طرز زندگی اور پیراۂ اظہار کو فرانسیسی تبدیلیوں کے مطابق ڈھالا تھا کبھی مجھے ایسا لگتا کہ اس نے اپنے معیارات سے تجاوز کیا ہے۔ اس وضع کی بات بڑے پیمانے پر ظہور پذیر ہوئی۔ جب ڈاریو (Dar io) ہسپانوی شاعری کے منظر پر گرجا تھا لیکن ڈاریو ایک بڑا ہاتھی تھا، ایک موسیقار جس نے اپنے عہد کی ہسپانوی زبان کی شیشے کی ساری کھڑکیوں کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا تاکہ دنیا کی ہوا اندر آسکے۔ اور ایسا ہوا۔

ہماری زبان کبھی کبھار ہم لاطینی امریکیوں کو ہسپانویوں سے جدا کر دیتی ہے۔ بہرحال کسی بھی چیز سے بڑھ کر یہ زبان کا نظریہ ہے، جو اختلاف پیدا کرتا ہے۔

(Gongora) گونگورا کا منجمد حسن، ہماری بلندیوں کے لئے تخلیق نہیں ہوا لیکن اسپین سے کوئی بھی شاعری، حتیٰ کہ تازہ ترین شاعری تک ایسی نہیں جس میں گونگورا کا ذائقہ موجود نہ ہو ہماری امریکی زمین، خاک آلود چٹانوں، ٹوٹے ہوئے لاوے مٹی اور خون سے مل کر بنی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ نقرئی گلاس میں کس طرح سے کام کیا جاتا ہے۔ ہمارے بڑے شاعر جو سننے میں خالی لگتے ہیں جو دالان میں کسی دوسرے کے باغ کے پھولوں سے سجے ہوئے گلدانوں کی طرح استادہ

ہیں، انہیں صحیح مقام عطا کرنے کے لئے محض (Martin Fierrow) کی شراب یا Gabr) (ila Misteral کے گاڑھے سے شہد کا ایک قطرہ ہی کافی ہے۔

(Cervantes) سروانتے کے بعد ہسپانوی زبان سونے کی بن گئی۔ اس نے درباری شان و شوکت اختیار کر لی اور وہ وحشیانہ قوت جو اسے (Gonzalo de Berceo) اور ھنیلا کے آرچ بشپ سے حاصل ہوئی تھی۔ گم کر دی اس نے وہ تناسلی آگ بھی جو Quevde) (o کے ہاں روشن ہے ضائع کر دی۔ یہی کچھ انگلستان، فرانس اور اٹلی میں ہوا (Chaucer) چاسر اور (Rabelais) کی غیر معمولی مہمات کے ساتھ بھی یہی ہوا اور انہیں خصی کر دیا گیا۔

نادر انداز نے جو (Petrarch) سے ورثے میں ملا تھا، زمردوں اور ہیروں کو چمکایا لیکن عظمت کے ماخذ نے از خود جلنا شروع کر دیا۔ اس پہلے چشمے نے کل انسان کے ساتھ اس کی آزادی اس کی فطری زیادتی کے ساتھ سب کچھ کرنا تھا۔

کم از کم میرا مسئلہ یہ تھا۔ حالانکہ میں نے اسے ان حالات میں نہیں رکھا تھا، حتیٰ کہ خود اپنی ذات کے ساتھ بھی نہیں۔

اگر میری شاعری کا کوئی بھی مطلب تھا تو یہ کہ وہ کمرے میں بند رہنے پر ناخوش ہوئے بغیر کسی مزاحمت کی فضا میں پھیلے۔ مجھے اپنی محدود دنیا کو، کسی دور دراز ثقافت کے محدود حصار میں تلاش کئے بغیر اسے خود ہی توڑنا تھا

اس سرزمین سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے، جہاں میں نے جنم لیا تھا، مجھے خود اپنی شخصیت کو بنانا تھا۔

اس نصف کرے کے ایک اور شاعر نے اس راہ پر گامزن ہونے میں میری مدد کی تھی اور یہ شاعر (Manhattan) سے میرا ساتھی والٹ وھٹمین(Walt Whitman) تھا۔

نقادوں کو بھگتنا چاہئے

(Maldoror) کے گیت، بنیادی طور پر ایک سلسلہ وار کہانی کا حصہ بنتے ہیں۔ یہ مت بھولیں کہ (Isidore Ducasse) نے اپنا قلمی نام ۱۸۳۷ میں (Eugenesu) کے ناول (LATREUMONT) سے لیا تھا، جو(Chatenay) میں شائع ہوا تھا۔ لیکن La) (treaumont جسے ہم جانتے ہیں وہ (Latreaumont) کے مقابلے میں کہیں زیادہ گر گیا۔ وہ شیطان بننا چاہتا تھا، اور اس سے بھی سوا ایک اعلیٰ رتبے کا گرا ہوا فرشتہ۔

(Maldoror) اپنی نا آسودگی کی انتہا پر جنت اور جہنم کی شادی مناتا ہے۔ غصہ، کرب ناقبل تکرار کی ناقابل مزاحمت لہر پیدا کرتا ہے۔ اور ہر طرف اس کے نام کی گونج سنائی دیتی ہے۔

(Latreaumont) نے ایک نئے وقفے کا تعین کیا۔ یہ اس نے اپنی آرزدہ سمت سے انکار کیا۔ اور اس رجائی شاعری کی ابتدا کی، جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہ لکھی تھی۔

یوراگوئے کا جوان شاعر پیرس میں مر گیا، لیکن اس کی شاعری میں وعدہ کی گئی تبدیلی، نیکی اور صحت کی طرف جھکاؤ نے جس کو وہ پورا نہ کر سکا، اس تنقید کو خاصی حد تک تحریک دی۔ اسے اس کے دکھ کے باعث تحسین ملی اور خوشی کی طرف حرکت پر اسے برا بھلا کہا گیا۔ شاعر کو عذاب جھیلنا چاہئے۔ اسے ناکامی میں زندگی گزارنی چاہئے اور اپنی ناکامی کے گیت لکھتے رہنا چاہئے سماجی سطح پر یہ ایک رائے تھی اور یہ رائے ایک خاص طبقے کی تھی اس سیدھے ساتھے حسابی فارمولے کی بہت سوں نے تقلید کی، جو نہ لکھنے کی رکاوٹ کے باعث دکھ اٹھاتے رہے ان نہ نظر آنے والے قوانین نے شاعروں کو کس مپرسی، پھٹے ہوئے جوتوں، ہسپتالوں اور مردہ خانوں میں پہنچایا۔ اس سب نے لوگوں کو بہت خوش کیا۔ ہر شخص خوش تھا۔ آنسو برائے نام بہائے گئے۔ چیزیں بدل گئیں، کیونکہ دنیا بدل گئی تھی اور ہم شاعروں نے اچانک بغاوت کا رخ خوشی کی طرف موڑ دیا۔

ناخوش و مصلوب ادیب سرمایہ داری کی شفق میں، خوشی کی رسم و رواج کا ایک حصہ ہے۔ ذائقے کو بے حد احتیاط کے ساتھ دکھ کی جانب موڑا گیا، تاکہ عظیم تخلیق میں عمل انگیز ثابت ہو زندہ اور دکھ جھیلنے والے روبہ زوال لوگوں کو شاعری کرنے کا نسخہ دیا گیا۔

(Holderlin) پاگل ہولڈرلن ناراض رمبارڈ (Rimbaud) سدا کا آوارہ گرد (Gerard de narual) جیراڈ ڈی نارووال، جس نے ایک چھوٹی سی گلی میں خود کو لیمپ پوسٹ سے لٹکا کر خودکشی کر لی تھی رواں صدی کے آخری برسوں کو ان لوگوں نے نہ صرف خوبصورتی کے جھٹکے عطا کئے بلکہ مصائب کا راستہ بھی فراہم کیا۔ اصول نے اس کانٹوں بھری راہ کو شاعر کے لئے روح کی تخلیق کی خاطر بنیادی ضرورت قرار دے دیا۔ جنہوں نے شہادت کی راہ اپنائی ان میں (Dy!an Thomas) ڈیلان تھامس آخری تھا۔ بدقسمتی سے پرانے لوگوں کے یہ خیالات، جو حقیقتاً بورژوائی ہیں اب بھی کچھ ذہنوں میں سوچے سمجھے جاتے ہیں۔

ازھان جو دنیا کی نبض کو اس کی ناک سے محسوس نہیں کرتے، حالانکہ یہی وہ جگہ ہے، جہاں اسے دیکھنا چاہئے، کیونکہ دنیا کی ناک مستقبل میں سونگھتی ہے۔

کچھ نقاد، خربوزے یا کھیروں کی رینگنے والی بیلوں کی کی مانند ہوتے ہیں، جن کی بڑھتی ہوئی ننھی ننھی شاخیں خوف سے سہمی ہوئی کہ وہ کسی شے کو بھول جائیں گی فیشن ایبل انداز میں جدید ترین

آہ کو حاصل کرتی ہیں جب کہ ان کی جڑیں ماضی ہی میں دفن رہتی ہیں۔ ہم شاعروں کا حق ہے کہ ہم اپنے ملک کے عوام کے ساتھ ان کی خوشی کی جنگ میں شریک رہیں۔

خوش رہیں ایلیا ایہرن برگ اپنی کسی تحریر میں کہیں کہتا ہے۔

" پابلو ان چند خوش باش لوگوں میں سے ہے، جنہیں میں جانتا ہوں " میں وہی پابلو ہوں، ایہرن برگ واقعی غلط نہیں کہتا۔

اسی لئے، میں حیران ہوں کہ رسالوں کے تبصرہ نگار، جنہیں زیادہ جاننا چاہئے، میری مادی بہتری کے بارے میں زیادہ پریشان ہیں حالانکہ میرے ذاتی معاملات تنقید نگاروں کا مسئلہ نہیں ہونا چاہئے مجھے احساس ہے کہ اتفاقاً اگر میں خوش ہوں تو یہ بات بہت سوں کو ناراض کرتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اندرونی طور پر خوش ہوں۔ میرا ضمیر صاف اور میری ذہانت بے چین ہے وہ نقاد، جو شاعروں کی بہتر طرز زندگی سے خائف ہیں۔ انہیں میں مشورہ دیتا ہوں۔ اس بات پر انہیں فخر کرنا چاہئے کہ شاعری کی کتابیں چھپتی ہیں، بکتی ہیں اور یوں اپنا مقصد پورا کرتی ہیں تاکہ نقادوں کی سوچ بچار کے لئے کچھ میسر آسکے انہیں خوش ہونا چاہئے کہ ادیبوں کو معاوضہ ملتا ہے اور کچھ اس قابل ہیں کہ وہ اپنی سچی محنت سے گزارہ کر سکتے ہیں نقادوں کو صورت حال کو خراب کرنے کے بجائے اس سے فخر حاصل کرنا چاہئے۔ اسی لئے کچھ عرصہ پہلے، جب میں نے اپنے بارے میں ایک جوان نقاد کی تحریر کو پڑھا تو مجھے احساس ہوا کہ باوجود ذہین ہونے کے اس کی ذہانت اسے فاش غلطیاں کرنے سے نہ روک سکی اس کے بقول میری شاعری مسرت کے باعث کمزور ہو گئی تھی۔

اس نقاد نے مجھے دکھوں کا نسخہ دیا تھا۔ اس کے نظریئے کے مطاق اپنڈکس (Appendix) کے درد کو خوبصورت نثر پیدا کرنا چاہئے اور شاید پیری ٹونائیٹس (Paritonitis) اچھی نظمیں تخلیق کر سکے اس مواد سے جو میرے پاس موجود ہے میں کام کو جاری رکھتا ہوں احساسات، وجود، کتابوں، واقعات اور جنگوں کی وجہ سے میں ہر قسم کی خوراک کھاتا ہوں۔ میں سارے کرہ ارض کو نگل جانا چاہوں گا۔ میں تمام سمندر پی جانا چاہوں گا۔

طویل اور مختصر سطریں

ایک فعال شاعر کی حیثیت سے میں نے خود اپنی ذات میں مستغرق رہنے کے خلاف لڑائی کی اور اس طرح میں اپنی ذات کی گہرائی میں موجود داخلی اور حقیقی دنیا کے درمیان ہونے والی بحث کو استحکام بخشتا ہوں میں کوئی نصیحت نہیں کرنا چاہ رہا، لیکن ممکن ہے میرا تجربہ دوسروں کی مدد کر

سکے۔ آئیں نتائج پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

میری شاعری کو سنجیدہ تنقید اور ہتک آمیز جملوں کا سامنا کرنا پڑا جو ایک فطری سی بات ہے۔ یہ کھیل کا جزو ہے۔ اس حصے میں میری کوئی آواز نہیں۔ لیکن میری ایک رائے ضرور ہے. اس نقاد کے لئے جو اہم باتوں پر زور دیتا ہے۔

میری رائے میری کتابوں میں ہے، میری تمام شاعری میں ہے۔ غیر دوستانہ گپ کے لئے بھی میری رائے ہے۔ اور اس میں میری نہ ٹوٹنے والی تخلیقی کاوش موجود ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں۔ اگر وہ ناکام ہے، تو تم درست ہو۔ میرا غرور اس صناع کی مانند ہے. جس نے برسوں اپنی صنعت میں ایک لگن اور محنت کے ساتھ. جس میں کبھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، کام کیا ہو۔ اور اگر میں کسی بات کے بارے میں مطمئن ہوں. تو وہ اس طرح یا اس طرح کم از کم میرے ملک میں ہے میں نے لوگوں کو شاعری اور شاعر کو بطور پیشے کے عزت کرنا سکھایا ہے. جب میں نے لکھنا شروع کیا تو شاعروں کی دو قسمیں تھیں۔ ان میں کچھ تو وہ تھے. جو اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے تھے. اور پیسے کے بل بوتے پر اپنی عزت کرواتے تھے. جو ان کے جائز و ناجائز معیار تک پہنچنے میں معاون بنتی تھی۔ شاعروں کا دوسرا خاندان ان لوگوں پر مشتمل تھا. جو شاعری کے متشدد آوارہ گرد، شراب خانوں کے اسیر، دلچسپ پاگل لوگ اور مصیبت زدہ نیند میں چلنے والے تھے۔ ہاں ان لوگوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ وہ ادیب، جو غلاموں کی مانند حکومتی دفاتر میں چھوٹے سے اسٹول پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے خواب ہمیشہ دفتری مرزدہ کاغذوں کے پہاڑ تلے دبے ہوتے. یا اپنے افسران کے دہشت ناک خوف اور مذاق اڑانے کی ذلت کے زیر اثر رہتے۔

میں نے زندگی کو آدم سے زیادہ برہنہ حالت میں شروع کیا تھا مگر اپنے ذہن کو شاعری کی انفرادی حیثیت کو برقرار رکھنے کے انداز میں یہ رویہ نہ صرف بذات خود بیش قیمت تھا بلکہ اس کی وجہ سے بے وقوفوں نے مجھ پر ہنسنا چھوڑ دیا تھا. اور اس کے بعد سے ان بے وقوفوں نے جن کا دل اور ضمیر باقی تھا اچھے لوگوں کی مانند ان سنجیدہ حقائق کو جنہیں شاعری نے تحریک دی، قبول کرنا شروع کر دیا تھا اور اس طرح وہ لوگ جو مجھ سے ناراض تھے بتدریج میرے دوست بن گئے۔ یوں شاعری نے عزت و مرتبہ حاصل کیا۔ نہ صرف شاعری بلکہ شاعروں کو عزت ملی

ساری شاعری اور تمام شاعر!

میں اچھی طرح سے لوگوں کے لئے اس خدمت سے واقف ہوں اور کبھی بھی میں کسی شخص کو اپنے آپ سے یہ معیار نہیں چھیننے دوں گا، کیونکہ میں اس اعزاز کو تمغے کی طرح پہننا چاہتا ہوں۔

وہ ہر شے کے بارے میں سوال کر سکتے ہیں۔ لیکن جواب میں بتارہاہوں یہ ایک ٹھوس تاریخ ہے۔

شاعری کے جانی دشمن بہت سی تاویلیں سامنے لے آئیں گے، جن کی اب کوئی حیثیت نہیں ہے۔ انہوں نے جوانی میں مجھے ایک بھوکا شخص کہا تھا۔ اب وہ مجھ پر یوں حملہ کرتے ہیں، کہ لوگ میرے بارے میں یہ رائے رکھیں کہ میں بہت دولت مند ہوں، جو کہ فی الحال میں نہیں ہوں لیکن کسی دن ضرور ہونا چاہوں گا، تاکہ ان لوگوں کو مزید تکلیف ہو کچھ دوسرے میری سطروں کی پیمائش میں لگے رہتے ہیں، تاکہ یہ ثابت کر سکیں کہ میں انہیں کاٹتا ہوں یا لمبا کر دیتا ہوں۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ کون طوالت یا اختصار کے لئے، تنگی یا کشادگی کے لئے، زرد تر یا سرخ تر کے لئے قوانین بناتا ہے، شاعر، جو انہیں تحریر کرتا ہے، وہی یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کیا کیا ہے؟ وہ اس بات کا فیصلہ اپنے سانس اور خون، اپنی دانائی اور اپنی لاعلمیت کے ساتھ کرتا ہے۔ کیونکہ یہ سب کچھ شاعری کی خوراک میں شامل ہوتا ہے۔ شاعر، جو حقیقت نگار نہیں، وہ مردہ ہے اور وہ شاعر، جو محض حقیقت نگار ہے، وہ بھی مردہ ہے۔ وہ شاعر جو صرف غیر منطقی ہے۔ محض خود ہی اپنی شاعری کو سمجھے گا یا اس کی محبوبہ اسے سمجھ سکے گی اور یہ بات افسوس ناک ہے شاعر جو کلی طور پر منطقی ہے۔ اسے ہر زید عمر بکر سمجھے گا اور یہ بات بھی افسوس ناک ہے۔ خزانے یا شیطان نے کوئی مخصوص قوانین یا اجزائے ترکیبی تجویز نہیں کئے۔ لیکن یہ دو اہم شریف آدمی شاعری کے میدان کارزار میں ایک جنگ کو جاری رکھتے ہیں اور اس جنگ میں ایک ہارتا ہے دوسرا جیتتا ہے۔ ایک بار ایک جیتتا ہے اور پھر دوسرے کو فتح ہوتی ہے۔ لیکن شاعری بذات خود شکست نہیں کھاتی یہ امر واقع ہے کہ شاعر کے شغل کو خاصا خراب کیا گیا ہے، لہٰذا بہت سے نئے مرد اور خواتین سامنے آجاتے ہیں۔ اور ہم سب شاعر نظر آئیں گے یوں پڑھنے والے غائب ہو جائیں گے۔ ہمیں ان پڑھنے والوں کی تلاش میں مہمات کرنی ہوں گی، جن میں صحرا کو اونٹوں پر عبور کرنا یا آسمان کی وسعتوں کو دیکھنے کے لئے خلائی جہازوں پر جانا شامل ہے۔

شاعری انسان کی اندرونی آواز ہے۔ اس آواز سے پرستش کا رواج مناجات اور مذاہب کا مواد فراہم ہوا ہے۔ شاعر نے ابتدائی زمانوں میں فطرت کے مظاہر سے سامنا کیا ہے۔ اور خود کو اپنے پیشے کی خاطر راہب کہلوایا ہے۔ اسی طرح اپنی شاعری کے دفاع کے لئے جدید عہد کا شاعر گلیوں میں اور عوام میں حاصل کئے ہوئے استحکام کو قبول کرتا ہے آج کا سماجی شاعر ابھی تک زمانہ قدیم کے ادیبوں کے گروہ سے متعلق ہے پرانے زمانے میں اس نے تاریکی سے عہد کیا تھا، آج اسے روشنی کی وضاحت کرنی چاہئے۔

اصلیت

میں اصلیت میں یقین نہیں رکھتا۔ یہ ہمارے عہد کی ایک اور بکواسیات ہے، جو تیز رفتاری سے ختم ہو رہی ہے۔

شخصیت کی تکمیل کے لئے میں زبان، ہیت یا کسی بھی تخلیقی اظہار کے ذریعے میں، جسے فن کار استعمال کرتے ہیں، یقین رکھتا ہوں لیکن وسیع تناظر میں اصلیت ایک جدید اختراع اور بڑے پیمانے کا دھوکہ ہے۔ کچھ لوگ اپنے ملک میں اپنی زبان یا دنیا میں ملک الشعرا بننا چاہتے ہیں لہٰذا وہ منتخب کرنے والوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں اور وہ ان لوگوں کی تضحیک کرتے ہیں، جو ارباب اقتدار سے مقابلہ کرتے ہیں اور شاعری ایک مضحکہ خیز صورت اختیار کر لیتی ہے۔

اس کے باوجود یہ ضروری ہے کہ اندرونی کیفیات کو ان اضافی مواد کے علاوہ قابو میں رکھا جائے، جو فطرت، ثقافت اور سماجیات سے متعلق کسی شاعر کی زندگی میں بہتری لانے پر منتج ہوتی ہے۔

ماضی میں سب سے زیادہ شریف شاعر مثلاً (Quevedo) کیوویڈو نے اپنے انتہاہی اشاروں والی نظمیں(Immitation of horace) (Immitation of, Ovid) اور (Immitation of lucertius) تحریر کیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اپنی کیفیت کو برقرار رکھتا ہوں جسے خود اپنی فطرت سے تمام زندہ اشیا کی مانند، جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ توانائی ملتی رہی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میری شروع کی کتابوں میں محسوسات کا زیادہ عمل دخل ہے، کسی بھی شاعر کے لئے اس سے زیادہ خراب بات کیا ہوگی کہ وہ گیت کے لئے دل کی نازک اور پرجوش ہدایات پر کان نہ دھرے۔ اس کے باوجود چالیس سالہ تجربے کے بعد میرا یقین ہے کہ شاعر اپنی تخلیقات میں اپنے جذبات پر زیادہ گرفت پا سکتا ہے۔ میں اطلسی فوریت پر یقین رکھتا ہوں، اس کے لئے شاعر کے پاس، اپنی جیب میں رونما ہونے والی صورت کے لئے کچھ موجود ہونا چاہئے۔ مثلاً متحکم شاعر ہستیوں کے لفظوں، آوازوں اور تصورات کے ذہنی خاکے جو ہمارے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتے ہیں ان کو فوری طور پر پکڑ کر جیب میں رکھ لینا چاہئے۔ اس معاملے میں بذات خود میں ست واقع ہوا ہوں، لیکن یہ جانتا ہوں کہ میں ایک اچھی نصیحت کر رہا ہوں۔ مایا کو واسکی کے پاس ایک چھوٹی سی نوٹ بک ہے، جس میں وہ تحریر کرتا رہتا ہے۔ احساسات کا بھی ایک خزانہ ہے، انہیں کس طرح سے محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ ان کے بارے میں شعوری طور پر واقف ہونے سے کہ جب ان کی آمد ہو، تب اس وقت ہم کاغذ کو دیکھتے ہیں تو یہ

شعوری جذبے بہتر طور پر واپس آتے ہیں۔ اضافی طور پر اپنے کام کے لئے، میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاعر کسی بھی دیئے گئے موضوع پر، جسے معاشرہ بحیثیت مجموعی چاہتا ہو، لکھ سکتا ہے۔ تقریباً تمام ہی عظیم فن پارے زمانہ ازل سے فرمائش پر وجود میں آئے ہیں (Geo rgics) روم کی دیہاتی زندگی کا محض پروپیگنڈہ ہے۔ ایک شاعر یونیورسٹی کے لئے یا مزدوروں کی یونین کے لئے، دستکاروں کے لئے یا پیشہ وروں کے لئے لکھ سکتا ہے۔ آزادی کو صرف اس لئے نہیں کھویا گیا تھا۔ ساحرانہ تاثرات اور شاعر کا خدا سے ربط، وہ ایجادات ہیں، جو ذاتی مفادات کے تحت سامنے آتی ہیں۔

عظیم تخلیقاتی قوت کے لمحوں میں پیش کش جزوی طور پر کسی اور کی بھی ہو سکتی ہے، جس پر خارجی مواد اور مطالعے کا اثر بھی ہو سکتا ہے۔ اچانک میں ان مشاہدات کو روکتا ہوں، جو کہ کسی حد تک نظریاتی سمت میں ہیں اور مجھے سانتیاگو کی ادبی زندگی یاد آنے لگتی ہے۔

مصور اور ادیب ایک تخلیقی لگن میں عوام کے رد عمل کی پرواہ کئے بغیر کام کرتے تھے۔ مصوری اور شاعری پر ایک خزاں زدہ گیت کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ ہر فن کار، دوسرے کے مقابلے میں زیادہ باغی، کہیں زیادہ بے ترتیب اور حوصلہ شکن ہوتا ہے۔ چلی کے طبقات میں گہری اور تکلیف دہ حد تک تلون پایا جاتا تھا۔

(Alessandri) الیے سانڈری تخریبی تقاریر کرتا تھا۔ نائیٹریٹ کی کانوں میں کام کرنے والے مزدور، جو براعظم میں اہم عوامی تحریک کے بانی تھے، اکٹھے ہو رہے تھے۔ وہ جدوجہد کے مقدس دن تھے کارلوس وکونا (Carlosvicuna) جان گنڈلفو (Jubnganduilfu) اور میں نے جلد ہی طلباء کی تنظیم میں شمولیت اختیار کر لی میری پسندیدہ کتاب (Sacha yegul en) تھی۔ دوسرے (Artsybashev) کے فحش ناول پڑھا کرتے اور ان سے ایک نظریاتی اعتماد قائم کرتے، بالکل جس طرح آج کل لوگ وجودی فحش نگاری سے نظریاتی ربط رکھتے ہیں دانشور خود کو شراب خانے میں بالکل اپنے گھر میں سمجھتے۔ پرانی عمدہ شراب، غربت کو شہری چمک فراہم کرتی تھی۔ جو اگلی صبح ہونے تک قائم رہتی۔

(Juan Egana) ایک غیر معمولی شاعر منتشر ہو کر اپنی قبر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک کہانی گردش میں تھی کہ اسے بے پناہ دولت ورثے میں ملی ہے۔ اور اس نے ساری دولت ایک خالی گھر میں میز پر قرضوں کے چکانے میں ختم کر دی ہے۔ اس کے شراب پینے والے ساتھی، جو دن بھر سوتے، رات کو شراب لانے کے لئے نکل کھڑے ہوتے لیکن جان ایگانا کی شاعری، چاند کی وہ روشنی ہے، جس نے کبھی بھی ہمارے گیتوں کے جنگل میں ہلکی سی چمک پیدا نہ کی یہ اس جدید

مجموعے کا رومانوی موضوع ہے، جس کو (Molina Nonez) اور (O.Segura castro) نے انتہائی فیاضی اور عظمت کے ساتھ ایک مکمل کتاب کی صورت میں پیش کیا تھا یہ ایک انتشار کے عہد کی انمول شاعری تھی۔ جس میں بڑے بڑے واضح خلا اور خالص شاندار قسم کی نظمیں نمایاں تھیں۔

جس شخصیت نے مجھ پر سب سے زیادہ اثر چھوڑا، وہ (Auro oyarzon) تھا۔ یہ جدید ادب کا آمر تھا۔ اب کوئی بھی اسے یاد نہیں کرتا۔ بادلیئر (Baudelair) کا چاہنے والا ایک نحیف ونزار شخص تھا ایک نمایاں وضع کا زوال پذیر چلی کا (Barba Jacobs) مصیبت زدہ حسین پاگل لاش کی مانند، اپنی طویل قد و قامت کے ساتھ وہ ناک میں بولا کرتا۔ اور جمالیاتی مسائل کے بارے میں بیان دینے کا اس نے ایک مخصوص انداز اختیار کر رکھا تھا۔ اس کی آواز سلگتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اس کی پیشانی ذہانت کے معبد کا زرد گنبد تھی۔ مثال کے طور پر وہ کہتا "دائرے کی دائریت" "مبہم کا ابہام" اس سب کے باوجود وہ بیوقوف ہرگز نہ تھا۔ اس میں جنت دوزخ دونوں کی ثقافت کی ملاوٹ موجود تھی۔ وہ بین القوامیت کا حامل تھا۔ جس نے بتدریج اپنی فطرت کو اپنے نظریوں سے مار دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس نے محض شرط جیتنے کی خاطر نظم لکھی، اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ نظم چلی کے تمام شعری مجموعوں میں شامل کیوں نہیں ہے؟

بوتلیں اور بت نما

کرسمس آ رہا ہے۔

ہر آنے والا کرسمس کا تہوار ہمیں سال ۲۰۰۰ کے قریب لے جاتا ہے۔ ہم آج کے شاعر، مستقبل کی خوشی کی خاطر کل کے امن کے واسطے، بین الاقوامی انسان کے لئے سن ۲۰۰۰ کی گھنٹیوں کو سننے کی جدوجہد کر رہے ہیں اور گیت گا رہے ہیں۔

بتیسویں دہائی میں شریف النفس انسان (Socrates Aguirre) نے جو بیونس آئرز کے قونصل خانے میں میرا افسر اعلیٰ تھا مجھ سے ۲۴ر دسمبر کو اپنے گھر پر سانتا کلاس یا قدیم سینٹ نک بننے کے لئے کہا تھا۔ میں نے زندگی میں بہت سی چیزوں کو خراب کیا ہے لیکن کوئی بھی اتنی بے کار ثابت نہ ہوئی جتنا قدیم سینٹ نک

روئی کے ٹکڑے میری داڑھی سے گرتے رہے، اور جب میں بچوں میں کھلونے تقسیم کر رہا تھا تو سب کچھ خلط ملط ہو گیا اور پھر میں آواز کو بھلا کیسے بدل سکتا تھا۔ جسے جنوبی چلی کے موسم نے غلطی سے میرے اوائل عمر کے برسوں میں پہلے ہی بدل ڈالا تھا۔ اور میں ناک میں بولتا تھا۔ مجھے

ایک حرکت کرنی تھی۔ میں بچوں سے انگریزی زبان میں بولا۔ لیکن سیاہ اور نیلی آنکھوں والے بچوں نے اپنے شک کا اظہار کرتے ہوئے مجھے چھوا اور بڑے لڑکوں لڑکیوں کی طرح سے سلوک کیا۔ کہ معلوم تھا کہ ان بچوں میں سے ایک بچی کو قسمت میرا عزیز ترین دوست بنا دے گی۔ ایک اہم ادیبہ، میرے متعلق لکھی گئی سوانح میں سے سب سے عمدہ کی مصنف۔ میں (Margarita Aguirre) کی بات کر رہا ہوں۔

اپنے گھر میں، میں نے چھوٹے بڑے لاتعداد کھلونے جمع کئے ہوئے ہیں۔ جن کے بغیر میں جی نہیں سکتا۔ وہ بچہ جو نہ کھیلے۔ بچہ نہیں ہے لیکن وہ انسان جو نہیں کھیلتا اس بچے کو کھو چکا ہے، جو کبھی اس میں رہتا تھا۔ اور وہ یقیناً اسے یاد کرے گا۔ میں نے بھی اپنا گھر ایک کھلونے گھر کی طرح سے بنایا ہے اور میں اس میں صبح سے رات تک کھیلتا ہوں۔

یہ میرے ذاتی کھلونے ہیں۔ تمام عمر میں نے انہیں جمع کیا ہے سائنسی نقطہ نظر سے، خود اپنی ذات کو خوش رکھنے کے لئے میں انہیں چھوٹے بچوں اور تمام عمر کے دوسرے لوگوں کے لئے بیان کروں گا میرے پاس ایک بوتل کے اندر بادبانی کشتی ہے۔

درحقیقت میرے پاس ایسی کئی اور بوتلیں بھی ہیں۔ بلکہ ایک پورا بیڑہ جن میں کشتیوں کے نام، بادبان مستول اور لنگر ہیں۔

کچھ بہت دور سے آئی ہیں۔ دوسرے چھوٹے سمندروں سے۔ ان میں سے ایک بے حد خوبصورت مجھے اسپین سے بھیجی گئی تھی۔ یہ میری نظموں کی ایک کتاب کے حقوق کے عوض معاوضہ تھا۔ مرکزی مستول کے اوپر ہمارا جھنڈا ایک ننھے ستارے کے ساتھ لگا ہوا تھا دوسری تمام کارلوس ہولنڈر کی بنائی ہوئی ہیں۔

کارلوس ایک بوڑھا ملاح ہے، جس نے میرے لئے بہت مشہور اور عظیم الشان جہازوں کے نمونے تیار کئے ہیں۔ یہ جہاز ہیمبرگ، سیلم اور بریٹون سے نائٹریٹ ڈھونے یا جنوبی سمندروں میں وھیل مچھلی کے شکار کے لئے آتے تھے۔

جب میں چلی کی طویل شاہراہ پر بوڑھے ملاح کی تلاش میں کوئلے اور بارش کی بو والے جنوبی شہر (Coronel) تک جاتا ہوں، تو درحقیقت میں دنیا کے مختصر ترین شپ یارڈ میں پہنچ جاتا ہوں۔ چھوٹے سے دالان میں کھانے کا کمرہ، باورچی خانہ، باغ سب کچھ ہے۔ وہ بھی ایک ترتیب کے ساتھ۔ وہ حصے جنہیں صاف و شفاف بوتلوں میں داخل کیا جائے ڈان کارلوس کی سینی ایک جادوئی ڈنڈا ہے۔ جو بادبانوں، مستولوں کو چھوتی ہے، حتیٰ کہ قلیل ترین دھویں کا مرغولہ بھی جو بندرگاہ سے اس کے ہاتھوں میں گزرتا ہے۔ اور اسے ازسرنو بوتل کے جہاز کے لئے، جو چمکتا ہے

اور کسی انجانے سفر کے واسطے تخلیق کیا جاتا ہے۔

میرے ذخیرے میں شامل جہاز، جو نیوی گینز کے عام سے ہاتھوں سے ہو کر آتے ہیں، وہ مارسیلز یا اینٹورپ (Antwerp) وغیرہ سے لائے گئے جہازوں میں ممتاز ہیں، صرف اس لئے نہیں کہ اس نے انہیں زندگی دی بلکہ اس لئے بھی کہ اس نے ہر جہاز پر ایک لیبل لگا کر اس پر اس جہاز کا نام، نمبر جہاز کے سفر اور دوران سفر جو کچھ اس نے ہواؤں اور لہروں میں دیکھا اور وہ سامان جو اس نے بحر اقیانوس میں اپنے بادبانی سفر کے دوران تقسیم کیا درج ہوتا۔

بوتلوں میں میرے پاس (Potosi) اور (Prussia) جیسے عظیم اور بے حد طاقتور جہاز شامل ہیں، جو ہیمبرگ سے لائے گئے اور رودبار انگلستان میں تباہ ہوئے۔ کپتان ہولینڈر نے مشہور زمانہ بحری جہاز (Maria Celeste) ماریا سیلیسٹی کے بھی دو نمونے بنا کر مجھے دیئے۔ یہ وہ جہاز ہے جو ۱۸۸۲ء میں رازوں کے اسرار میں تبدیل ہو کر ایک ستارہ بن گیا تھا میں سفر کی اس روداد کو بیان نہیں کروں گا، جو جہاز کی اپنی دھندلاہٹ میں رہتی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کس طرح یہ ننھے جہاز بوتلوں کے اندر گئے۔ ایک پیشہ ور دھوکے باز کی حیثیت سے بات کو اسرار کا رنگ دیتے ہوئے، میں نے ایک نظم میں پراسرار جہازوں کے بنائے جانے کی ساری تفصیل بیان کی ہے۔ اور اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح سے وہ بننے کے بعد بوتلوں کے اندر داخل ہوتے تھے۔ لیکن یہ راز اب بھی راز ہے۔ بت نما (Figureheads) میرے بڑے کھلونے ہیں۔ میری دوسری بہت سی چیزوں کی مانند ان بت نما، کھلونوں کی بھی اخبارات اور رسائل کے لئے تصاویر لی گئی تھیں اور ان پر دوستانہ انداز میں دشمنی کے طریقے سے بحث کی جاتی ہے۔

ان میں جو بہتر ہیں وہ سمجھتے ہوئے ہنستے ہیں اور کہتے ہیں "کیسا پاگل شخص ہے، دیکھو اس نے کسی وضع کی چیزیں جمع کرنے کا فیصلہ کیا ہے" کمینے قسم کے لوگ اسے دوسری طرح سے دیکھتے ہیں۔ وہ میرے جمع جتھہ سے جلتے ہوئے اس نیلے جھنڈے کو دیکھ کر جس پر مچھلی بنی ہے اور جس کو میں اپنے گھر (Islanegra) پر لہراتا ہوں، کہتے ہیں۔

"میں اپنا ذاتی جھنڈا نہیں لہراتا۔ میرے پاس تصویریں نہیں ہیں" غریب آدمی، اپنے چھوٹے سے بچے کی مانند، جو ان دوسرے بچوں سے جلتا ہے، جن کے پاس لٹو ہوں جھلا رہا ہے۔ اس تمام مصیبت میں سمندری "بت نما" مسکرا دیں اور اس رشک سے جو ان کی باعث پیدا ہوا اکڑیں انہیں صحیح معنوں میں جہاز کی پیشانی پر سجنا ہو گا۔ سمندری مجسمے گم شدہ سمندروں سے بر آمد شدہ پتلے، چھاتیوں والے بت نما انسان نے اپنے جہاز بنائے تو وہ اس جہاز کی پیشانی کو ارفع معنی دینا چاہتا تھا۔ قدیم زمانوں میں اس نے بحری جہاز کی پیشانی پر پرندوں کے مجسمے لگائے۔ لکڑی

میں تراشے ہوئے اساطیری پرندے (Toten birds) ۔ پھر انیسویں صدی میں وہیل کا شکار کرنے والے بحری جہازوں پر علامتی بت نما لگائے گئے۔ نیم برہنہ دیویاں یا ری پبلکن نرسیں جو ایک مخصوص وضع کی ٹوپی پہنے ہوتیں۔ میرے پاس مردانہ اور زنانہ دونوں قسم کے بت نما ہیں مختصر ترین اور دلکش ترین، جسے (Salvador Allende) سالویڈار آلینڈے نے اکثر مجھ سے حاصل کرنا چاہا، ماریا سیلسٹی کا بت نما تھا۔ جو چھوٹے فرانسیسی بیڑے سے متعلق تھی اور جس کے بارے میں امکان ہے کہ یہ صرف دریائے سین ہی میں سفر کرتی ہوگی۔

یہ گہرے رنگ کی آبنوسی لکڑی سے تراشی گئی تھی۔ بہت سے برسوں اور سفروں نے اسے تمام زمانوں کے لئے شفق کا رنگ دے دیا ہے۔

یہ ایک چھوٹی سی عورت ہے جو لگتا ہے کہ محو پرواز ہو، ہوا کی علامت کے ساتھ جو اس کے لباس میں نمایاں ہے۔ اس کی چینی کی آنکھیں اس کے رخساروں پر پڑنے والے گڑھوں پر لگی ہیں۔ اور یہ بات عجیب لگے گی کہ یہ آنکھیں ہر سردی کے موسم میں آنسو بہاتی ہیں۔ جس کی وضاحت کوئی نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ بھوری لکڑی میں مسام رطوبت کو جذب کر لیتے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ فرانسیسی آنکھیں سردیوں میں روتی ہیں۔ اور میں ماریا سیلسٹی کو ہر سال اپنے ننھے چہرے پر قیمتی آنسو بہاتے دیکھتا ہوں۔

تصورات مسیحی ہوں یا بیگن، انسانوں میں مذہبی جذبات کو ابھارتے ہیں۔ میرے ایک بت نما نے کئی سال افقی انداز میں سمندر کا سامنا کیا، جیسے وہ جہاز پر سفر میں ہو ایک سہ پہر کو منیلڈی اور میں نے یہ دریافت کیا کہ ازلانگرا کی کچھ پرستار خواتین اخباری نمائندوں کی طرح گھر کی باڑھ پر چڑھی ہوئی ہیں چمنی میں موجود بت نما کے سامنے موم بتیوں کی روشنی میں جو انہوں نے وہاں جلا رکھی تھیں جھکی ہیں۔۔۔۔ ممکن ہے ایک نئے مذہب نے جنم لے لیا ہو۔۔۔۔

کسی بھی طور اس سنجیدہ بت نما کو، جو گیبریلا میسترل کی ہم شکل تھی ان پرستش کرنے والے معصوموں سے دور کرنا ضروری تھا۔ اس وقت میں نے اسے چمن سے نکال کر اپنے کمرے میں آتش دان کے قریب رکھ لیا تھا۔

کتابیں اور سمندری سیپیاں

چھوٹے پیمانے پر کتابوں کے عاشق کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے کتابیں اس کے ہاتھوں سے گرنے کی بجائے اس کے برابر سے ہو کر بڑھتی ہوئی قیمتوں کی طرح بلند پرندوں کی مانند گزر جاتی ہیں۔ اور پھر بھی بہت سی کوششوں کے بعد گوہر مراد حاصل ہوتا ہے۔

مجھے یاد ہے جب ۱۹۳۴ء میں، میڈرڈ کے ایک کتب فروش گارسیا رلیکو سے، میں نے ایک سو پیستا(Peseta) کی قیمت کے برابر (Gongora) کی کتابوں کا ایک پرانا سیٹ، بیس پیستا ماہانہ کی اقساط پر خریدنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ ایک معمولی رقم تھی، جو اس وقت میرے پاس نہ تھی مگر پانچ مہینوں میں باقاعدگی سے میں نے یہ رقم قسطوں میں واپس کر دی تھی یہ (Foppens) کا ایڈیشن تھا، جسے سترھویں صدی کے (Flemish) پبلشر نے مخصوص ٹائپ میں چھاپا تھا۔ اس وضع کی چھپائی اسپین کے سنہرے دور کے ماہرین کا خاصا تھا۔ میں صرف کویڈو کے ایڈیشن پڑھنے میں لطف حاصل کرتا ہوں، جس میں جنگ کے لئے لکھی گئی نظمیں، لڑنے والے جنگی جہازوں جیسی لگتی ہیں۔ بعد میں، میں فرانس اور انگلستان میں ارزاں قیمت پر بکنے والی کتابوں کی ادھر ادھر بکھری دکانوں میں کھو گیا۔ میرے ہاتھ مٹی میں اٹ جاتے لیکن وقتاً فوقتاً کوئی خزانہ میرے ہاتھ لگ جاتا یا کم از کم میں اس خیال ہی سے محظوظ ہو لیتا۔

ادبی انعامات سے حاصل کردہ رقوم کبھی کبھار مجھے گراں قیمتوں پر بھی کتابوں کی خرید میں مدد کر دیا کرتیں۔ میری لائبریری خاصی بڑی ہو گئی تھی۔ شاعری کی نادر کتابیں اسے منور کرتیں اور فطری تاریخ سے میری محبت نے اسے نباتات پر بے شمار رنگین تصاویر کی بے شمار کتابوں سے، جن میں پرندوں، حشرات اور مچھلیوں پر کتابیں تھیں بھر دیا تھا۔ دنیا کے مختلف حصوں سے مجھے بہت سی (Ibara) کی چھپی ہوئی ناقابل یقین ڈان کو ہوتے (Bodoni) (Donquixotes) کی مخصوص ٹائپ میں دانتے (Dante) حتیٰ کہ محدود تعداد میں چھپنے والی (Moliere) بھی، اور (Adusin Delphi) جسے بطور خاص فرانس کے شہزادے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ لیکن درحقیقت حسین ترین چیزیں، جو میں نے جمع کیں، وہ سمندری سیپیاں تھیں۔ جو مجھے اپنی غیر معمولی ہیئتوں کے باعث بے پناہ خوشی فراہم کرتیں۔ ایک پراسرار سیپی، جس میں چاندی کا خالص پن، لاتعداد سراسراہٹوں اور گوتھک ہیئیوں کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ جن دن کیوبا Cub (a کے ڈان کارلوس ڈھلاتورے نے جو ایک ممتاز (Malacologist) تھا۔ مجھے سیپیوں کے کچھ عمدہ نمونے دیئے تو مجھ پر سمندر کی گہرائیوں کے ہزارہا ننھے دروازے کھل گئے۔ تاکہ میں ان میں غوطہ لگا سکوں اس وقت سے میں سات سمندروں کو عبور کر چکا ہوں، جہاں جہاں میرا سفر مجھے لے گیا، میں سیپیاں جمع کرتا رہا، لیکن مجھے اعتراف کرنا ہوگا کہ یہ پیرس کا سمندر تھا، جس نے ہر لہر میں میرے لئے سمندری سیپیوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ پیرس نے سمندروں کی سیپیوں سے دنیا بھر کے فطرت پسندوں کی دکانوں میں سیپیوں کے خزانے جمع کر رکھے تھے۔

میرے لئے شہر کے (Sargasso) میں ٹوٹے ہوئے لیمپوں اور پرانے جوتوں کے

درمیان (Olivia Textilina) کی تلاش آسان تھی۔ بہ نسبت اس کے کہ میں (Veracr uz) یا (Baja Calfornia) کی چٹانوں میں اپنے ہاتھوں کو سرگرم رکھوں یا پھر (Quertz) کے نیزے کو تھاموں، جو سمندری نظم کی طرح سے (Rostellaria Fusus) میں ختم ہوتی ہے۔

کوئی بھی اس خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتا، جو مجھے اس وقت محسوس ہوئی، جب میں نے سمندر سے ایک بڑے (Oyster) کو جس پر گھونگوں کے کانٹے جڑے ہوئے تھے نکالا تھا۔ اس کا نام (Spondxlus Rosero) تھا یا پھر اس سے بھی کہیں بعد میں جب میں نے برفانی (Spondylus) کو دریافت کیا تھا۔ ان انعامات میں سے کچھ کا تاریخی پس منظر ہو سکتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ پیکنگ کے میوزیم میں، چین کے سمندر سے حاصل شدہ (Mollusk) مولسک کا مقدس ذبہ کھول کر ایک نمونہ جو بہت نادر تھا، مجھے دیا گیا تھا اور یوں میں فن کے اس بے مثال نمونے کا مالک بن گیا تھا، جس میں سمندر نے چین کو معبد اور پگوڈا کے لئے جو اس کے طول و عرض میں اب بھی موجود ہیں، فن تعمیر کا ایک، نیا انداز فراہم کیا تھا۔ ایک بڑی لائبریری بنانے کے لئے مجھے تیس سال کا عرصہ لگا۔ میری الماریوں میں بے شمار کتابیں تھیں۔ (Quevedo) کووِیڈو (Cervontes) سروانتے، (Gongora) گونگورا اور ان کے علاوہ بہت سی دوسری، جیسے (Rimboud) رمباڈ اور (Lautreamont) لاٹرے مون۔ مجھے محسوس ہوتا تھا، جیسے ان کتابوں کے صفحات اب بھی ان شاعروں کا مس رکھتے تھے، جو مجھے محبوب تھے میرے پاس رمباڈ کے مسودے موجود تھے۔

پیرس میں پال ایلوارڈ نے مجھے سالگرہ کے تحفے کے طور پر (Isabelle Rimbaud) ازابیلا مباڈ کے وہ خطوط دیئے جو اس نے مارسیلز کے ہسپتال میں اپنی ٹانگ کے کٹنے سے پہلے اپنی ماں کو تحریر کئے تھے۔ یہ وہ خزانے تھے۔ جو پیرس اور شکاگو کے کتابیں جمع کرنے والوں کے لئے بے حد اہم تھے۔

میں دنیا کے اتنے حصوں میں گیا تھا کہ میری لائبریری بے حد بڑی ہو گئی ــــ ایک ذاتی لائبریری کی حدود سے کہیں زیادہ۔

ایک دن میں نے اپنی سیپیوں کے شاندار ذخیرے کو، جسے جمع کرتے ہوئے بیس برس لگے تھے اور پانچ ہزار کتابیں، جنہیں میں نے بہت سے ممالک سے بے حد چاہت سے خریدا تھا، اپنے ملک کی یونیورسٹی کو عطیئے کے طور دے دیا۔ اور یہ سب لائبریری کے منتظم نے خوبصورت الفاظ کے ساتھ ایک شاندار تحفے کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ کوئی بھی شخص اس کی خوشی کا اندازہ لگا سکتا

ہے، جس نے میرے اس تحفے کو قبول کیا ہو گا۔ لیکن ایسے کج ذھن لوگ بھی ہیں۔ ایک تقریب میں کسی سرکاری نقاد نے بطور احتجاج غصے سے بھرے ہوئے مضامین تحریر کئے۔

وہ غصے سے چلایا کہ بین الاقوامی کمیونزم کو روکنا کیسے ممکن ہو گا؟ ایک اور شریف آدمی نے پارلیمنٹ میں یونیورسٹی پر حملہ کرتے ہوئے کہا کہ میرے شاندار تحائف آخر کیوں لئے گئے؟

ان قومی اداروں کی سرکاری معاونت کو روک دینے کی دھمکی بھی دی گئی ان مضامین کے مصنف اور پارلیمنٹ کے ممبران نے چلی کی چھوٹی سی دنیا میں ایک برفانی لہر دوڑا دی۔ یونیورسٹی کا منتظم کانگریس میں ایک بیمار شخص کی مانند دائیں بائیں پھرتا رہا۔ اتفاقیہ طور پر بیس برس گزر گئے ہیں اور کسی نے بھی میری کتابوں یا سیپیوں کی کبھی شکل نہیں دیکھی۔ یوں لگتا ہے، جیسے وہ کتابوں کی دکانوں یا سمندروں میں واپس پہنچ گئی ہیں۔

ٹوٹا ہوا شیشہ

ایک طویل عرصہ باہر رہنے کے بعد، تین دن ہوئے۔ میں والپاریزو میں، اپنے گھر واپس لوٹا ہوں۔

دیواروں میں بڑے بڑے شگاف، زخموں کی طرح نمایاں تھے ٹوٹے ہوئے شیشے کے دل توڑنے والے قالین کمروں کے فرش کو ڈھکے ہوئے تھے، زمین بوس محلات متانت کے ساتھ زلزلے کے وقت کا ریکارڈ بن گئے تھے۔ کتنی بہت سی خوبصورت چیزوں کو مٹیلڈی جھاڑو کی مدد سے اب فرش پر سے صاف کر رہی تھی۔ کتنی ہی نادر اشیاء زمین کے جھٹکوں کے باعث اب کوڑے کا ڈھیر بن چکی تھیں۔ ہمیں صفائی کرنی تھی چیزوں کو از سر نو درست کرنا تھا۔ اور سب کچھ پھر سے شروع کرنا تھا اس بے ترتیبی میں کاغذ کا ڈھونڈنا مشکل کام ہے اور خود اپنے خیالات کو مجتمع کرنا کہیں اور بھی دشوار۔

میرا آخری کام رومیو جولیٹ کا ترجمہ تھا۔ اور ایک طویل نظم جسے (Archaic) بحر میں لکھا___ ایک نظم جو کبھی مکمل نہ ہو سکی محبت کی نظم آؤ___! اور ٹوٹے ہوئے شیشے سے اٹھو___ گانے کا وقت آ گیا ہے۔ محبت کی نظم، میری مدد کو آؤ اور درد کے باوجود گاؤ تاکہ چیزوں کو اکٹھا کیا جا سکے۔

یہ سچ ہے کہ دنیا، خود کو اپنی جنگوں سے پاک نہیں کرتی، خون کو نہیں دھوتی، اپنی نفرت پر قابو نہیں پاتی۔ یہ سچ ہے! اس کے باوجود، یہ بھی سچ ہے کہ ہم ایک حقیقت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ متشدد لوگ دنیا کے آئینے میں منعکس ہیں اور ان کے چہرے، دیکھنے میں خوشگوار نہیں ہیں،

حتیٰ کہ خود ان کے اپنے لئے بھی لیکن میں محبت کے امکان میں اب بھی یقین رکھتا ہوں، مجھے اعتماد ہے کہ انسانوں میں خون اور ٹوٹے ہوئے شیشے کے باوجود ایک باہمی تفہیم ضرور ہو گی۔

میری بیوی مٹیلڈی اور وشیا

میری بیوی مٹیلڈی بھی میری طرح جنوب کے صوبائی شہر (Chilan) چیلان سے تعلق رکھتی ہے، یہی شہر اس کی جائے پیدائش ہے۔ چیلان خوش قسمتی سے اپنے دہقانوں کے بنائے ہوئے برتنوں اور بدقسمتی سے لرزہ خیز زلزلوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ اپنی بیوی سے مخاطب ہوتے ہوئے، اس نظم (Cien sonetos de omoy) میں، میں نے اسے بتایا تھا کہ میں محسوس کرتا ہوں شاید یہ نظمیں وضاحت کرتی ہیں، کہ وہ میرے لئے کتنی اہمیت رکھتی ہیں زندگی اور زمین نے ہم دونوں کو اکٹھا کیا ہے۔ یہ کسی دوسرے کے لئے قطعاً دلچسپ نہ ہو گا۔ لیکن ہم خوش ہیں۔

چلی کے تنہا ساحل پر طویل چھٹیوں کے دوران ہم، باہم ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں نہیں۔ جب ساحل سورج سے خشک ہو کر صحرا لگتا ہے۔ بلکہ سردیوں کے موسم میں جب بارشیں اور سردیاں ساحل کو غیر معمولی سبز، نیلے اور زرد رنگ کے پھولوں سے ڈھک دیتیں۔ کبھی کبھار ہم تنہا اور وحشی سمندر سے دور اعصابی شہر سانتیاگو چلے جاتے، جہاں ہم دونوں دوسروں کے پیچیدہ وجودوں سے ملاقات کرتے۔

مٹیلڈی میرے گیت توانا آواز میں گاتی ہے۔

ہر چیز جو میں لکھتا ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے، سب اس کے نام ہے یہ کافی نہیں، مگر یہ بات اسے خوش کرتی ہے۔

اب میں اسے، اپنے ننھے جوتوں کو باغ کی کیچڑ میں ڈبوتے دیکھ رہا ہوں پھر وہ اپنے ننھے ہاتھوں کو بھی زمین میں، جہاں تک پودا جاتا ہے اتار دیتی ہے— زمین سے— اپنے پیروں، ہاتھوں، آنکھوں اور آواز کے ساتھ — وہ میرے لئے تمام جڑیں، سارے پھول اور خوشی کے تمام میٹھے پھل لائی ہے—

ستاروں کا موجد

پیرس کے ہوٹل میں ایک شخص اپنے کمرے میں سو رہا تھا کیونکہ وہ ایک ناقابل علاج، رات کا الو تھا۔ جب میں آپ کو یہ بتاؤں، کہ اس وقت دوپہر کے بارہ بجے ہیں، اور وہ شخص ابھی تک سو

رہا ہے، تو اس بات پر قطعاً حیران نہ ہوں۔

اسے جاگنا ہو گا۔ اس کے بائیں سمت کی دیوار گرا دی گئی ہے پھر اس کے سامنے والی دیوار گر گئی۔ یہ بمباری نہیں تھی۔ سامنے تازہ بنے ہوئے گڑھوں سے مونچھوں والے مزدور کدالیں ہاتھوں میں لئے سامنے آئے اور خوابیدہ شخص پر طنز کرنے لگے۔

"آؤ، ہمارے ساتھ مشروب پیئو"

شیمپین کی بوتل کھولی گئی۔ میرا اپنے سینے پر سہ رنگی سیش (Sash) لگائے ہوئے آ گیا۔ موسیقی کا شور اٹھا۔ مارسیلز کی دھنیں۔ ایسی بے تکی باتوں کے پیچھے کیا مقصد تھا؟ بس پیرس کی زیر زمین ریلوے میٹرو کی زیر تعمیر دولائنیں، خوابیدہ شخص کے ہوٹل کے کمرے کے نیچے آپس میں مل گئی تھیں جس لمحے اس شخص نے مجھے اپنی یہ کہانی سنائی، میں نے اسے اپنا دوست بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ بلکہ یوں کہیں کہ اس کا معتقد یا شاگرد بن گیا۔ چونکہ اس وضع کی غیر معمولی باتیں اکثر اس کے ساتھ ہوتی رہیں، اور میں ان میں سے کسی کو بھی چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ اس لئے، کئی ملکوں میں، میں اس کا پیچھا کرتا رہا۔ اس جنگلی، تخیلاتی منظر سے مسحور ہو کر، فیڈریکو گارسیالور کا Fedr) ico Garcia lorca) نے بھی میری ہی طرح ایک پوزیشن اختیار کر لی میں اور لور کا میڈرڈ کے مشہور فوارے کی دوسری سمت (Gorveos) کوربوس کیفے میں بیٹھے ہوئے تھے، کہ وہ سونے والے پیرس سے وہاں آ دھمکا حالانکہ وہ ایک گلوب کی طرح گول تھا، لیکن چہرے سے بیمار نظر آتا تھا ایک بار کوئی ایسی بات، جسے الفاظ بیان کرنے سے قاصر تھے، اس کے ساتھ ہو چکی تھی۔ وہ میڈرڈ کے سادہ سی رہائش گاہ میں موسیقی کے کاغذات کو ترتیب دینے میں مشغول تھا، میں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ ہمارا دوست ایک بہت عمدہ موسیقار تھا۔ اور پھر کیا ہوا تھا؟ "ایک کار میرے ہوٹل کے دروازے پر رکی۔ پھر میں نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ جو میرے برابر کے کمرے میں چلے گئے اس کے بعد نووارد نے سونا شروع کر دیا۔ یہ ایک سرگوشی سے شروع ہوا۔ پھر ہوا میں پھڑپھڑاہٹ شروع ہوئی۔ الماریاں، دیواریں اس کے خراٹوں سے ہلنا شروع ہو گئیں۔"

یہ کوئی جنگلی جانور ہو گا۔ جب خراٹے ایک طوفانی انداز اختیار کر گئے تو ہمارے دوست کو کسی قسم کا شبہ نہ رہا۔ یہ سینگوں والا سوؤر تھا دوسرے ممالک میں اس کے شور نے سڑکوں پر ٹریفک کو روک دیا تھا بہت سے غضب ناک سمندروں کو ہلا دیا تھا۔ اس سیارے کی اذیت ناک مخلوق آخر کیا چاہتی تھی۔ یہ قابل نفرت درندہ، جس نے سارے یورپ کے امن کو خوفزدہ کر رکھا تھا۔

ہر روز وہ مجھے سینگوں والے سوؤر کے بارے میں سنسنی خیز خبریں سناتا فیڈریکو، میں رافیل

البرتی، مجسمہ ساز البرٹو اس کا بے چینی سے استقبال کرتے اور اضطرابی حالت میں اسے خدا حافظ کہتے۔

پھر ایک دن وہ قہقہہ لگاتے ہوئے اپنا پیٹ ہلاتے ہوئے آیا اور ہمیں بتانے لگا "خطرناک مسئلے کا حل نکل آیا ہے۔ جرمنی کا (Graf Zapplin) اس سینگوں والے سوئر کو منتقل کرنے پر رضامند ہو گیا ہے۔ کہ وہ اسے برازیل کے جنگل میں چھوڑ دے گا۔ وہ دیو قامت درختوں پر زندہ رہے گا۔ اس بات کا خطرہ نہیں کہ وہ ایک ہی سانس میں ایمزون (Amazon) کا پانی پی لے گا۔ یا وہاں وہ اپنے گرجتے ہوئے خراٹوں سے زمین کو بہرہ کر دے گا۔

اسے سنتے ہوئے لورکا اتنی شدت سے ہنسا کہ اسے اپنی آنکھوں کو بند کرنا پڑا۔ تب ہمارے دوست نے ایک اور واقعہ سنایا کہ جب اس نے ایک بار تار دیا تو تار دینے والے کلرک نے اسے اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ آئندہ تار نہیں دے گا۔ بلکہ خط لکھے گا کیونکہ لوگ اس کے ارسال کردہ پیغامات سے ڈر جاتے ہیں، کچھ تو اس کے بھیجے ہوئے تار کھولنے سے پہلے ہی صدمے سے مر گئے تھے۔ اس نے لندن میں گھوڑوں کے ایک نیلام کا ذکر کیا، جس میں اسے جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس نے ایک دوست کو سلام کے لئے ہاتھ اٹھایا اور نیلام کرنے والے نے اس کے حق میں ایک گھوڑا دس ہزار پاؤنڈ کے عوض دے دیا، جس پر آغا خان ساڑھے نو ہزار پاؤنڈ پہلے ہی لگا چکا تھا "مجھے اس روز گھوڑی کو اپنے ہوٹل لے جانا پڑا اور اگلے دن اسے واپس کرنا پڑا" اس نے کہا۔

اب وہ شخص کسی سینگوں والے سوئر کی کہانی یا کوئی اور واقعہ نہیں سنا سکتا۔ وہ یہاں چلی میں مر گیا ہے۔

زندگی میں چلی کے اس باشندے کا نام (Acario Cotapos) تھا بنیادی طور پر ایک موسیقار اور ناقابل بیان قیامتوں کا خالق مجھے اس شخص کے جنازے پر بولنے کا اعزاز حاصل ہے، جس کی یاد کو دفن کرنا ممکن نہ تھا۔

میں نے جو کہا وہ یہ تھا۔

"آج ہم ایک بے حد اچھے انسان کو سایوں کے سپرد کر رہے ہیں، جس نے ہر روز ہمیں ایک ستارہ دیا تھا۔"

عظیم پال ایلوارڈ (Paul Eluard)

میرا دوست پال ایلوارڈ کچھ عرصہ ہوا مر گیا۔

وہ اتنا مکمل اور اس قدر مضبوط شخص تھا کہ اس کی کمی کو قبول کرنا، میرے لئے مشکل ہی نہیں اذیت ناک بھی تھا۔ وہ گلابی رنگت کا نیلاہٹ مائل (Norman) نورمن تھا، دیکھنے میں سخت جان لیکن نازک۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں دوبار گیس نے اسے نقصان پہنچایا تھا، جس کے نتیجے میں زندگی بھر اس کے ہاتھ لرزتے رہے۔ اس کے باوجود پال نے ہمیشہ مجھے آسمان کی رنگت، گہرے نیلے پانی اور اپنی ذاتی شرافت کے بارے میں جو خود اپنی توانائی سے آگاہ ہو، یاد دلایا ہے۔ پال ایلوارڈ کی شاعری کھڑکی کے شیشوں پر پڑنے والی بہار کی بارش کی طرح صاف اور شفاف تھی اور اسے ایک غیر سیاسی شخص تصور کیا جاسکتا تھا۔ ایک ایسا شاعر، جسے سیاست سے کوئی سروکار نہ ہو۔ لیکن ایسا نہ تھا۔

اس کے فرانس کے عوام اور ان کی جدوجہد کے ساتھ گہرے روابط تھے پال ایلوارڈ بے حد سخت انسان تھا۔ ایک قسم کا فرانسیسی مینار جس میں جذباتی لچک بھی ہو۔ یہ اس جذباتی طاقت کی مانند نہ تھی جو کہ عام طور سے نظر آتی ہے۔

میکسیکو میں، جہاں ہم اکٹھے گئے تھے، میں نے پہلی مرتبہ اسے تاریک گڑھے کے کنارے پایا تھا۔۔۔ یہ وہ شخص تھا، جس نے اداسی کے لئے بھی ایک خاموش جگہ بنا رکھی تھی۔ ایک ایسی جگہ جیسی کسی دانائی کے لئے ہوتی ہے۔ وہ تھکا ہوا تھا۔ میں نے اسے رضامند کر لیا تھا اور اس شخص کو جو اندر سے فرانسیسی تھا اس دور دراز سرزمین میں لے آیا جہاں اسی روز ہم نے (Iose Ciemen le) کو دفنایا تھا۔ میں خطرناک مرض فلیبائٹس (PHLEBITIS) (عفونت کے نتیجے میں کسی بھی رگ کی اندرونی جھلی کا ورم) میں مبتلا ہو کر بیمار پڑ گیا تھا، جس نے مجھے چار ماہ تک صاحب فراش رکھا۔ پال بے حد تنہائی محسوس کرتا اور اس تنہائی میں ایک اندھے مہم جو کی طرح بے بس نظر آتا۔ وہ کسی سے واقف نہ تھا۔ اور بیوی کی کمی کا احساس اسے شدت سے تھا، محبت کے بغیر وہ بے حد تنہا محسوس کرتا، وہ مجھ سے کہا کرتا۔

"ہمیں زندگی کو کسی کے ہمراہ دیکھنا پڑتا ہے۔ زندگی کے ہر لمحے میں کسی کو شامل کرنا پڑتا ہے۔ میری تنہائی غیر حقیقی ہے۔ یہ مجھے مار رہی ہے" میں نے دوستوں کو بلایا اور اسے باہر جانے دیا۔ وہ اسے شور مچاتے ہوئے میکسیکو کی سڑکوں پر لے گئے۔ اور انہی سڑکوں پر کسی موڑ پر اس کا پھر محبت سے سامنا ہو گیا۔۔۔

اس کی آخری محبت (Dominique) ڈومینیک میرے لئے پال ایلوارڈ کے بارے میں لکھنا بہت مشکل ہے میں اسے اپنے قریب زندہ، بھرپور اور اس کی آنکھوں میں جلتی ہوئی برقی نیلاہٹ کو مسلسل دیکھے جاؤں گا۔ وہ فرانسیسی سرزمین کو، جہاں انعامات اور جڑیں، خوشبودار

ورثے، میں باہم گندھی ہوئی ہیں، چھوڑ چکا تھا۔ اس کی بلند قامت شخصیت سب پانی اور پتھر تھا، جس پر پرانی انگور کی بیلیں چڑھ رہی تھیں۔ اور ان پر پھول، روشنی کے چھکے اور شفاف گیتوں کے گھونسلے تھے۔ شفافیت ـــــ یہی وہ لفظ ہے اس کی شاعری سخت چٹان کی طرح نقرئی تھی اور اس کی گنگناتی ہوئی موج میں ٹھہرا ہوا پانی پر سکون تھا۔

ارفع ترین محبت کا شاعر سہ پہر جیسی خالص آگ فرانس کے خراب ترین دنوں میں اس نے اپنے دل کو اپنے ملک کے مرکز میں بو دیا تھا اور اس میں سے وہ آگ بر آمد ہوئی، جو جنگ میں فیصلہ کن ثابت ہوئی اور اس طرح کیمونسٹ پارٹی میں اس کی شمولیت ایک فطری بات تھی۔ اشتراکی ہوتے ہوئے بھی پال ایلوارڈ کے لئے انسانیت اور انسانیت سے محبت کرنا اپنی شاعری اور زندگی پر فوقیت دینا تھا۔

کسی کو یقین نہیں کرنا چاہئے کہ ایلوارڈ شاعر ہونے کے مقابلے میں سیاسی کم تھا لیکن اس کی وسیع النظری اور منطقی جدلیاتی فکر مجھے اکثر حیران کر دیتی۔ باہم ہم نے اکثر بہت سی چیزوں، آدمیوں اور اپنے عہد کے مسائل کا معائنہ کیا تھا اور اس کی وضاحت نے ہمیشہ میری مدد کی تھی۔ اس نے کبھی بھی خود کو (Surrealist irrationalism) سرریلسٹ غیر منطقیت میں فراموش نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ نقال نہیں بلکہ ایک تخلیق کار تھا اور یوں اس نے ہمیشہ واضح پن اور ذہانت کی گولیوں کو سرریلزم کے مردہ جسم میں جھونکا تھا۔ وہ روزمرہ زندگی میں میرا رفیق تھا۔ اور اب میں اس کی محبت کو کھو چکا ہوں، جو میری زندگی کا حصہ تھی۔ کوئی بھی مجھے وہ کچھ نہیں دے گا، جو وہ اپنے ساتھ لے جا چکا ہے۔ کیونکہ اس کی فعال برادرانہ روح میری زندگی کی بیش قیمت آسائشوں میں سے تھی۔

فرانس کے مینار ـــــ میرے بھائی!
میں تمہاری بند آنکھوں پر جھکتا ہوں
یہ ہمیشہ مجھے روشنی عظمت، سادگی اور ایمان داری دیتی رہیں گی ـــــ اچھائی اور فطری پن جسے تم نے زمین میں بو یا۔

پیری ریورڈی (Pierre Reverdy)

میں کبھی بھی پیری ریورڈی کی شاعری کو جادوئی نہیں کہوں گا یہ لفظ، عہد کا اہم ترین لفظ، کسی میلے میں بناوٹی جادوگر کے ہیٹ کی طرح ہے، جس میں سے کبھی بھی کوئی جنگلی کبوتر بر آمد نہ ہو گا۔ ریورڈی ایک طبعی شاعر تھا۔ اس نے زمین و آسمان کی ان گنت ہستیوں کو چھوا اور انہیں نام

دیا تھا۔ اس نے دنیا کی بے شمار چیزوں اور بہاروں کو نام عطا کئے تھے۔

اس کی اپنی شاعری (Quartz) کی رگ کی مانند مگر تہہ دار ان تھک اور روشنی سے بھری ہوئی ہے۔ بعض اوقات یہ بے حد چمک دیتی ہے بلکہ کسی سیاہ رنگ کے پتھر کی طرح، جسے زمین کے دبیز استر سے بمشکل جدا کیا جائے اور وہ اچانک ماچس سے پیدا شدہ شعلے کی طرح لپکتی یا سرنگ کی راہ داری میں چھپ جاتی ہے، دن کی روشنی سے کہیں پرے لیکن اپنی سچائی سے وفادار شاید یہ سچائی، جس نے اس کی شاعری کے مواد کی فطرت کے ساتھ شناخت کی۔ یہ ریورڈی کی خوبی۔ یہ مستحکم دیانت، سب بتدریج نامعلوم کی طرف گامزن ہو گئیں۔

آہستہ آہستہ لوگوں نے اسے ایک فطری عمل، ایک گھر، ایک دریا یا آشنا گلی کی طرح سمجھ لیا۔ جو کبھی بھی اپنی ظاہری شکل یا جگہ کو نہیں بدلتے۔

اب جب کہ وہ جا چکا ہے۔ اب جب کہ ایک گمبھیر خاموشی، جو خود اس کی اپنی شرافت اور فخر کی خاموشی سے، جو اسے بدلتی رہی کہیں زیادہ ہے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اب یہاں نہیں ہے۔ اب اس کی انفرادی روشنی غائب ہے۔ جو زمین و آسمان میں دفن ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کسی دن اس کا نام، زندگی کی طرف واپس آتے ہوئے فرشتے کی مانند نامعلوم کے غیر منصف دروازوں پر دستک دے گا۔ بگلوں کی آواز کے بغیر ہی اس کی مستحکم عظیم نغماتی شاعری ایک سکوت کے ہمراہ اس کے گرد ہالے کی مانند موجود ہے۔

ہم اسے روز حشر میں آخری انصاف، اہم انصاف کے ساتھ چمکتا ہوا دیکھیں گے۔

جرزی بورے ژا (Jerzy Borejsza)

جرزی بورے ژا اب پولینڈ (Poland) میں میرا منتظر نہیں ہے قسمت نے اس بوڑھے تارک وطن کو اپنا ملک از سر نو تعمیر کرنے کا موقع دیا تھا۔ جب وہ ایک عرصہ باہر رہنے کے بعد، وہاں ایک سپاہی کی حیثیت سے گیا تو وارسا (Warsaw) ملبے کا ڈھیر تھا۔ نہ وہاں سڑکیں تھیں نہ درخت۔ کوئی بھی اس کا منتظر نہ تھا۔

بورے ژا جو ایک محنتی شخص تھا، اس نے اپنے عوام کے ساتھ مل کر کام کیا۔ عظیم منصوبے اس کے ذہن میں ابھرے۔ اور بے پناہ تحریک دینے کی قوت ــــ چھپی ہوئی دنیا کا گھر ایک ایک کر کے اس کی منزلیں تعمیر کی گئیں۔ دنیا میں سب سے بڑی روٹری چھاپے کی مشینیں پہنچ گئیں۔ اور اب وہاں ہزارہا کتابیں اور رسائل چھپتے ہیں۔

بورے ژا سر سے پیر تک ایک ان تھک انسان تھا۔ جس نے خوابوں کو حقیقت کا روپ

دے دیا۔ اس کے جرات مندانہ پلان خوابوں میں محلات کی مانند پورے ہوئے جو نئے پولینڈ میں ایک ناقابل یقین توانائی کے ساتھ تکمیل کو پہنچے میں اس سے نہیں ملا تھا اور ملاقات کی خاطر میں شمالی پولینڈ کے جھیلوں والے علاقے میں جہاں وہ میرا منتظر تھا، پہنچ گیا جب میں کار سے اترا تو میں نے وہاں بڑھی ہوئی داڑھی والے ایک ناقابل توجہ شخص کو دیکھا، جو معمولی سے نیکر میں ملبوس تھا ایک جنگلی انسان کی توانائی کے ساتھ، کتابوں سے سیکھی ہوئی ہسپانوی زبان میں وہ چلایا، جس کا انگریزی میں کچھ یوں ترجمہ ہو گا۔

("پابلو، تھکے نہیں ہو۔ تمہیں آرام کرنا چاہئے")

درحقیقت، اس نے مجھے بالکل آرام نہ کرنے دیا۔ اس کی گفتگو حیران کن، بھرپور اور تجسس کے اظہار سے لبریز تھی۔

اس نے ایک ہی سانس میں سات مختلف تعمیری پروگراموں کے بارے میں مجھے آگاہ کیا، جن میں بہت سی کتابوں کا تجزیہ بھی شامل تھا اور بہتر حالات کے لئے تاریخ اور زندگی کی مختلف صورتوں کی نئی وضاحتیں بھی موجود تھیں ______

"پابلو اصل ہیرو سانچو پانزا (Sancho Panza) تھا، ڈان کوخوتے نہیں۔"

اس کی دانست میں سانچو پانزا حقیقت نگاری کی آواز تھی۔ اپنی دنیا اور وقت کا اصل مرکز

"جب سانچو کاموں کو سرانجام دیتا، تو وہ صحیح طریقے سے کرتا، کیونکہ یہ کام عوام کر رہے ہوتے ہیں۔"

"وہ علی الصبح مجھے بستر سے گھسیٹ کر اٹھا لیتا اور چیختے ہوئے کہتا تمہیں آرام کرنا چاہئے۔"

پھر وہ مجھے دیودار اور صنوبر کے جنگلات میں اس کونونٹ تک لے جاتا، جس کے مذہبی عقائد کو ماننے والے سو سال پہلے روس سے ہجرت کر کے، یہاں آباد ہو گئے تھے اور ابھی تک انہیں قدیم رسومات سے چمٹے ہوئے تھے۔

اس کونونٹ کی راھبائیں اس کا دعاؤں سے استقبال کرتیں بوڑھے زا ان مذہبی خواتین کے ساتھ بے حد عزت اور احترام سے ملتا وہ ایک فعال لیکن شریف شخص تھا۔

جنگ کی تباہ کاریاں ہولناک تھیں۔ ایک روز اس نے مجھے وہ ریوالور دکھایا، جس سے ایک جنگی مجرم کو عدالت نے مارنے کے لئے استعمال کیا تھا ایک ڈائری بھی ملی، جس میں مجرم نے تمام جنگی جرائم کا اندراج کیا تھا بوڑھے لوگ اور بچے اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ اور چھوٹی بچیو ں

کی عصمت دری کی گئی تھی۔

انہوں نے اسے اسی گاؤں میں، جہاں وہ یہ زیادتیاں کرتا رہا تھا دکھا کر حیران کر دیا تھا جب شہادتیں اس کے پاس سے ہو کر گزریں اس کی اپنی ڈائری سے جرائم اس کے سامنے پڑھ کر سنائے گئے تو اس سنگ دل قاتل نے بس یہ کہا۔

"اگر مجھے دوبارہ موقع مل جائے، تو میں یہ سب کچھ پھر دہراؤں گا"۔ میرے ہاتھوں میں وہ ڈائری اور ریوالور تھا، جس نے اس پتھر دل مجرم کی جان لی تھی۔

وہ لوگ ماسورین کی جھیلوں میں (Eel) ایک قسم کی مچھلی کا شکار کرتے ہیں۔ جو اس وقت تک اپنی تعداد میں اضافہ کرتی رہتی ہیں، کہ آپ اسے کھو نہ دیں۔

بہت جلد ہم ان مچھلیوں کے شکار کے لئے نکل گئے اور پھر ہم سیاہ مچھلیوں کو دیکھ رہے تھے۔ جو کالی پٹیوں کی مانند لرز رہی تھیں۔ میں ان پانیوں اور وہاں کے مچھیروں اور ارد گرد کے مناظر سے آشنا ہو گیا تھا۔ صبح سے لے کر رات گئے تک، میرا دوست کبھی مجھے اوپر لے جاتا کبھی نیچے لے آتا۔ ادھر ادھر دوڑاتا، لوگوں سے ملواتا، جو مجھے درختوں کے بارے میں بتاتے اور ہم سب، اس کی بلند آواز کے ساتھ کہتے تمہیں یہاں آرام ضرور کرنا چاہئے۔ آرام کرنے کے لئے اس سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں ہوگی۔ جب میں نے یہ علاقہ چھوڑا تو اس نے مجھے دھوئیں میں پکائی گئی ایک (Eel) مچھلی دی جو شاید لمبائی میں سب سے زیادہ تھی اس حیران کن لمبی چھڑی نے میری زندگی کو اجیرن کرئے رکھ دیا۔ میں اسے کھانا چاہتا تھا جیسا کہ میں (Smoked eels) کو پسند کرتا تھا اور یہ تو خالص اپنے پانیوں سے ذخیرہ کئے بغیر مجھ تک پہنچی تھی۔ لیکن اس زمانے میں میرے ہوٹل کے کھانے میں صبح اور رات کو باقاعدگی کے ساتھ ایل مچھلی موجود ہوتی اور یوں میں اس ذاتی مچھلی کو نہ کھا سکا تھا۔ لیکن یہ میرے ذھن پر سوار تھی۔

رات کو میں، اسے بالکونی میں تازہ ہوا لگانے کو رکھ دیتا کبھی باتوں کے دوران مجھے یاد آتا کہ وہ ابھی تک باہر پڑی ہے تو میں اس وقت زیر بحث موضوع میں ساری دلچسپی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے باہر بھاگتا اور اسے کسی نسبتاً مناسب جگہ یا الماری میں رکھ دیتا بالاخر مجھے اس کا ایک عاشق مل گیا، جسے میں نے وہ قیمتاً دے دی اب وہ بورڑے زا، سانچو پانزا کا مداح۔ ایک حساس عقلمند توانا خواب دیکھنے والا انسان پہلی بار آرام کر رہا ہے۔ وہ اس تاریکی میں آرام کر رہا ہے، جس سے اسے عشق تھا۔ اس کی آرام گاہ کے قریب، ایک دنیا جسے اس نے اپنی آتش فشانی اور ان تھک آگ پہنچائی تھی، ابھی تک تعمیر کے مرحلے میں ہے۔

گائی اورجی سوملیو (Gyorgy Somlyo)

ہنگری میں، جس طریقہ سے زندگی، شاعری، تاریخ، وقت اور شاعر ایک دوسرے سے آپس میں ملتے ہیں، مجھے اس سے عشق ہے دوسرے ممالک میں، یہ معاملہ کم و بیش یا تو معصومیت کے انداز میں یا پھر یکطرفہ طور پر زیر بحث آتا ہے۔

ہنگری میں ہر شاعر اپنی پیدائش سے پہلے منسوب ہوتا ہے۔ اٹیلا جوزف (Attila Jozef) آندرے آدی (Andre Ady) گویلا ایلاس (Gyulla Iuyes) فرض اور موسیقی، مادر وطن اور تاریکی، محبت اور درد کے مابین ایک عظیم اشتراک اور تبادلے کا فطری حاصل ہیں۔

سوملیو ایک ایسا شاعر ہے، جسے میں نے بیس برس کے عرصے میں اعتماد کے ساتھ بڑھتے ہوئے دیکھا ہے، ایک ایسا شاعر جس کی دھنیں مدھم ہیں، جو وائلن کی دھنوں کی طرح بجتی ہیں جو اپنی ذاتی اور دوسروں کی زندگی سے متعلق ہے — اپنی سرشت میں خالصتاً ہنگری کا شاعر — اپنی فیاضانہ آمادگی میں عوام کے خوابوں اور حقیقت میں حصہ لینے والا وفادار، محبت کرنے والا اور اپنے ارادوں میں ثابت قدم رہنے والا فعال شاعر۔ اس کی بین الاقوامیت، اس کے ملک کی انفرادی چھاپ رکھتی ہے ایک جوان شاعر جو کنبھہ مشق ہے۔

ایک خاموش شاعری، ہماری سنہری ریت سے حاصل کی گئی شراب کی مانند شفاف اور مسحور کن، نشہ انگیز جسے ہمارے عہد کو سننا چاہئے۔

کویسی موڈو (Quasi Modo)

اٹلی کی سرزمین اپنے قدیم شاعروں کی اصل آوازوں کو اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے۔

اس کے پارکوں میں سے گزرتے ہوئے، اس کے کھیتوں میں چلتے ہوئے، جہاں پانی چمکتا ہے، اس کے چھوٹے سمندر کی طرف آوازوں کی سمت جاتے ہوئے مجھے یوں لگا، جیسے میں ہیرے کی قسم کے مواد پر قدم دھر رہا ہوں نقرئی ہیروں کی خفیہ دولت، صدیوں کی جمع شدہ چمک دمک اٹلی نے یورپ کی شاعری کو ہیئت، آواز، حسن اور صوفیانہ مستی عطا کی اس نے شاعری کو اس کی ابتدائی بے ہیئتی سے باہر نکالا۔ جو بدوضع بوری نما کپڑے میں اسلحے کے ساتھ ملبوس تھی۔

اٹلی کی روشنی نے قرون وسطیٰ کے گلوکاروں کے چیتھڑوں اور آہنی شکنجوں کو کٹے ہوئے ہیروں کے بے پناہ بہاؤ میں تبدیل کر ڈالا صدیوں سے ثقافت کی جانب آتے ہوئے، ہم جیسے شاعروں کے لئے جہاں شعری مجموعے ۱۸۸۰ء کے شعرا سے شروع ہوتے تھے۔ اٹلی کے ایسے

شعری مجموعوں کا پایا جانا جن کی تاریخیں ۱۲۳۰ یا ۱۳۱۰ تک پہنچتی تھیں، خاصا حیران کن تھا۔ اور ان زبانوں میں (Dante) دانتے (Cavalcanti) کیوال کانٹی (Petrarch) پیٹرارک اور (Poliziano) پولی زیانو کی فنکارانہ مہارت، گہرائی اور ہیرے جیسی سطح رکھتی ہے۔

ان ناموں اور ان لوگوں نے اپنے فلورنس کی روشنی سے ہمارے توانا اور مدھم سر کے (Garcilas , dela Vega) اور خوش وضع (Bosgan) کو منور کیا۔ انہوں نے گونگورا کے راستے کو درخشاں کیا اور کویڈو (Quevedo) کے المیے کو اپنی تاریکی کا سایہ بخشا۔

انہوں نے انگلستان کے شیکسپیئر کی سائنس کو بدلا اور فرانس کی خوشبوؤں پر روشنی پھینکتے ہوئے (Ponsard) اور (Jubelly) کے گلابوں کو کھلا ڈالا۔

لہٰذا اٹلی میں پیدا ہونے والے شاعر کے لئے ایک دشوار راستہ سامنے ہے۔ اسے ستاروں سے منور شاہراہ پر جو ورثے میں اسے ملی ہے، رہنالازم ہے۔

میں سالواتور کوسی موڈو کو ایک مدت سے جانتا ہوں اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کی شاعری کا ضمیر ہے، جو ہمیں اپنی بے پناہ اور بھرپور شعلگی کے باعث حیران کن نظر آتا ہے۔

کوسی موڈو، یورپ کا باشندہ ہے، جو اپنی علمیت اور توازن کی مد میں اپنی ذہانت کے ہتھیاروں سے اضافہ کرتا ہے۔ اس کے باوجود اطالوی شاعری کے مرکز میں ایک ممتاز ہم عصر شاعر کی حیثیت سے اس کا مقام ابھی اس کو مینار میں قید جنگ جو نہیں بنا سکا کوسی موڈو ایک کائناتی انسان کی عمدہ مثال ہے، جو دنیا کو اسلحے سے مغرب اور مشرق میں تقسیم کرنے کے بجائے اسے اپنا فرض سمجھتا ہے کہ تمام ثقافتیں رکاوٹوں کو توڑ کر اپنی شاعری سچائی، آزادی، امن اور خوشی کے تحائف کو دکھائیں، جو سب کے لئے یکساں ہیں۔ دنیا کی آواز کے رنگ، جو غمگین ہیں۔ لیکن منظم کوسی موڈو کے ہاں یکجا نظر آتے ہیں اس کی آواز میں (Leopardi) کی مایوسی یا غیر یقینیت نہیں بلکہ وہ اس زمین کی نمائندگی کرتی ہے، جو شام کے وقت چیزوں کو بڑھنے دیتی ہے۔ تقدس کا احساس۔ دن کے اس لمحے کا بخشا ہوا، جب خوشبوئیں آوازیں، رنگ اور گھنٹیاں بیجوں کے تخلیقی عمل کی اس وقت نگہداشت کرتے ہیں، جب وہ زیر زمین ہوتے ہیں۔

مجھے شاعر کی گھٹی ہوئی زبان اس کی کلاسیکیت اور رومانویت پسند ہے اور اس سے بھی بڑھ کر مجھے اس بات سے محبت ہے، جسے وہ حسن کی روایت میں خود کو آگے بڑھاتا ہے۔ اور اپنی طاقت کو ایک ایسی زبان میں منتقل کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے، جو متحرک اور سچی ہے۔

میں آراکینیا میں پتوں کا معطر تاج، سمندر اور فاصلے پر اٹھاتا ہوں اور اسے ہوا کے سپرد کرتا ہوں تاکہ ہوا اور زندگی اسے سالواتور کوسی موڈو کی پیشانی تک پہنچا دیں۔ یہ اپولو کی فتح کا تاج نہیں،

جو ہم اکثر و بیشتر (Francesco Petrarca) کی تصاویر میں دیکھتے ہیں۔ یہ ہمارے غیر دریافت شدہ جنگلات کا تاج ہے، جو ان پتوں سے بنا ہے، جن کا ابھی تک کوئی نام نہیں، وہ پتے، جو جنوبی صبحوں کی شبنم میں بھیگے ہوئے ہیں۔

والیجو زندہ ہے (Vallejo)

والیجو ایک مختلف قسم کا انسان تھا۔ میں کبھی بھی اس کے زرد سر کو نہیں بھول سکتا۔ ان سروں کی مانند جو پیرو (Peru) کی پرانی کھڑکیوں میں نظر آتے ہیں۔

والیجو دل کا سچا اور سنجیدہ انسان تھا۔ وہ پیرس میں رہ گیا اسے پیرس کی غلیظ ہوا نے مارا تھا۔ اس غلیظ دریا نے جس میں بہت سے مردہ لوگوں کو مچھلیوں کی طرح باہر نکالا گیا تھا۔

والیجو کی موت بھوک اور گھٹن سے ہوئی تھی۔ اگر ہم اسے پیرو واپس لے آتے اور اسے پیرو کی ہوا میں سانس لینے دیتے تو ممکن ہے، وہ ابھی زندہ ہوتا، اور شاعری کر رہا ہوتا۔

میں نے اپنے اس اچھے ساتھی اور دوست کے لئے دو مختلف موقعوں پر دو نظمیں لکھی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری دوست کی اس کہانی کو جسے وقت اور فاصلہ نہ مٹا سکا سنائیں گی۔

پہلی نظم (سیزر والیجو کی یاد میں) میری کتاب (Odaselementas) کی پہلی جلد میں ہے۔

آخری چند برسوں میں ہونے والی چھوٹی چھوٹی ادبی جنگوں میں جو چھوٹے سپاہیوں کے خوفناک دانتوں کی وجہ سے زندہ رہیں۔ والیجو، سیزر والیجو کا بھوت، سینرر والیجو کی غیر موجودگی سنیزر والیجو کی شاعری، سب میری شاعری اور خود میرے خلاف جنگ میں جھونک دی گئی ہیں۔ یہ کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ جن لوگوں نے محنت کی تھی، انہیں نقصان پہنچایا جائے۔ یہ کہا جائے کہ "فلاں اچھا نہیں بلکہ والیجو بہتر تھا" اگر نرودا مر چکا ہوتا تو وہ نرودا کو زندہ والیجو کے خلاف کھڑا کر دیتے۔

دوسری نظم جس کا عنوان واحد حرف "V" تھا میرے دوسرے مجموعے (Estravagario) میں ہے۔

اس جستجو میں، جسے لفظوں میں بیان نہ کیا جا سکے، نرم شاخ، یا دھاگہ جو ایک انسان کو اس کے کام سے باندھتا ہے، میں ان کی تلاش کرتا ہوں، جن کے پاس کچھ تھا یا میرے لئے بہت کچھ۔ ہم نے اپنی زندگیوں کا کچھ حصہ اکٹھے گزارا ہے اور اب میں اسے جھیل چکا ہوں۔ میرے پاس کوئی

ایسا راستہ نہیں، جس سے میں اس بات کو جسے لوگ شاعری کا راز کہتے ہیں، سمجھا سکوں، میں تو اسے شاعری کا صاف پن کہوں گا یقیناً انسان کے کام میں، اس کے ہاتھوں، اس کی آنکھوں، اس کے اعضا اس کے خون کا اس کے کام سے تعلق رہا ہو گا۔

لیکن میرے پاس کوئی نظریہ نہیں۔ میرے پاس ایسا کوئی فلسفہ نہیں جسے میں کسی کے سر پر دے ماروں۔ میں کسی بھی دوسرے انسان کی مانند ہوں۔ ہر شے مجھے سوموار کے دن کی طرح روشن نظر آتی ہے، منگل کے روز ہر شے مجھے تاریک لگتی ہے۔ اور میرا یقین ہے کہ یہ سال روشن اور تاریک جائے گا اور آنے والا سال خوبصورت نیلے رنگ کا ہو گا۔

گیبریلا مسٹرل (Gabriela Mistral)

میں پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں کہ گیبریلا مسٹرل سے میں اپنے آبائی قصبے ٹی میوکو میں مل چکا ہوں۔ لیکن بعد میں وہ اس قصبے کو خیر باد کہہ گئی تھی۔

گیبریلا اپنی سخت کوشش اور پر مشقت زندگی کے وسط میں تھی اور کسی سخت گیر اسکول کی مدر سپریر کی مانند ایک راہبہ دکھائی دیتی تھی اس زمانے میں، اس نے اپنی ماں اور بچے والی نظمیں لکھیں نظمیں بے حد عمدہ نثر میں لکھی گئی تھیں۔ خوبصورت اور منجھی ہوئی کیونکہ اس کی نثر ہی اکثر و بیشتر اس کی اثر انگیز شاعری تھی۔ گیبریلا زمانہ حمل، پیدائش اور بچے کے بڑھنے کے دنوں کو اپنی نظموں میں بیان کرتی ہے اور کچھ مبہم قسم کی بکواسیات ٹی میوکو میں پھیل جاتی ہے۔ کچھ بے تکے الفاظ، غیر ارادی طور پر بیہودہ، گھٹیا زبان، جس سے اس کنواری خاتون کے جذبات کو ٹھیس پہنچی۔ کوئی افواہ ان ریلوے کے مزدوروں اور لکڑی کاٹنے والے کاریگروں نے پھیلا دی، جنہیں میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ اجڈ اور جذباتی لوگ، جو بس مکھی پر مکھی مارتے تھے۔

گیبریلا بے حد ناراض ہوئی اور اپنی موت کے دن تک ویسے ہی ناراض رہی برسوں بعد اپنی عظیم کتاب کے پہلے ایڈیشن میں اس نے ایک طویل بے کار سانوٹ ان باتوں کے ضمن میں، جو اس کے بارے میں دنیا کے آخری سرے کے پہاڑوں میں سرگوشیوں کا موجب رہا، تحریر کیا۔ نوبل انعام کی یادگار فتح کے وقت اس عزت کو حاصل کرنے کے لئے اسے ٹی میوکو سے گزر کر جانا تھا۔ اسکول کے بچے ہر روز ریلوے اسٹیشن پر اس کا انتظار کرتے۔ اسکول کی لڑکیاں بارش میں بھیگی ہوئی کوپی ہیو کے پھولوں کو لئے ہوئے لرزتی آتیں۔ کوپی ہیو، جنوب کا پھول آراکینا کا حسین جنگلی پھول۔

ایک بیکار انتظار ــــــ گیبریلا نے رات کے وقت، وہاں سے گزرنے کا بندوبست کیا، تاکہ وہ

ئی میوکو کے پھولوں کو قبول نہ کر سکے کیا یہ بات گیبریلا کی برائی ظاہر کرتی ہے ؟

یہ صرف اتنا بتاتی ہے کہ زخم اس کی روح کی گہرائیوں میں ابھی ہرے تھے اور وہ اتنی آسانی سے مندمل نہیں ہوئے۔ اس سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ محبت اور نفرت اتنی عظیم شاعرہ کی سوچ میں باہم بر سرپیکار ہے، بالکل جیسے وہ کسی بھی انسان کی روح میں ہو سکتے ہیں۔ میرے لئے وہ ہمیشہ ایک اچھے دوست کی طرح مسکراتی ہوئی ملی ایک مسکراہٹ، جو اس کے چہرے کے گہرے رنگ کی روٹی پر بکھرے ہوئے آٹے کی طرح نظر آتی۔ لیکن وہ کون سے بنیادی عناصر تھے جو اس کی تخلیق کی بھٹی میں تھے؟ اس کی شاعری کا پراسرار عنصر کیا تھا؟، جو ہمیشہ درد سے بھرا ہوا تھا۔ میں اس کی تفتیش نہیں کرنے جا رہا اور مجھے یقین ہے کہ میں اسے کبھی نہ پا سکوں گا۔ اور اگر میں پا بھی لوں تو اسے نہیں بتاؤں گا۔

ستمبر کے اس مہینے میں یہاں جنگلی سرسوں پھولتی ہے دیہات کے اطراف میں زمین زرد رنگ کا قالین بن جاتی ہے، یہاں ساحل پر جنوبی وحشی ہوا، شان و شوکت سے چار دنوں سے چل رہی ہے رات میں ایک گونج بھری ہے۔ سمندر ایک ہی وقت میں وسیع اور سفید رنگ کا اور کھلا ہوا سبز ہے۔

گیبریلا! یہاں آؤ، ان جنگلی سرسوں کے پھولوں کی محبوب بیٹی، یہ چٹانیں، یہ جناتی ہوا اور ہم سب خوشی سے تمہارا استقبال کرتے ہیں۔

کوئی بھی تمہارے (Hawthorns) (پھولوں کی ایک خاردار جھاڑی جو جنوبی نصف کرے میں ملتی ہے) کے گیتوں اور چلی کی برفوں کے نغمات کو کبھی نہیں بھولے گا۔ تم چلی کی رہنے والی ہو۔ تم یہاں کے عوام سے منسوب ہو۔ کوئی بھی تمہاری ان سطروں کو، جو ہمارے بچوں کے ننگے پیروں سے وابستہ ہیں، نہیں بھولے گا۔

کوئی بھی تمہارے "لعنتی لفظوں" کو نہیں بھولا ہے۔

تم امن کی متحرک دوست ہو، ایسی ہی بہت سی دوسری باتوں کے باعث ہم تم سے محبت کرتے ہیں۔

گیبریلا ___! تم آؤ، چلی کے جنگلی سرسوں کے پھولوں کی طرف، چلی کے ہاتھوں ان کی جانب۔ یہی درست ہے کہ میں تمہاری عظمت اور ہماری کبھی نہ ختم ہونے والی دوستی کو مدنظر رکھتے ہوئے پھولوں اور کانٹوں سے تمہارا خیر مقدم کروں۔ چٹان سے بنے ہوئے ستمبر اور بہار کے موسم کے دروازے تمہارے لئے وا ہیں۔ کوئی بھی شے میرے دل کو وہ خوشی فراہم نہیں کر سکتی۔ جو اس مقدس سرزمین میں تمہیں مسکراتے ہوئے داخل ہوتے دیکھ کر مجھے ملے گی۔ یہ

سرزمین جو چلی کے لوگوں کے لئے پھول کھلانے اور گانے کے لئے بنی ہے۔

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں تم سے سچائی بانٹ رہا ہوں۔ جو ہماری آوازوں اور لفظوں کی وجہ سے عزت پائے گی۔ چاہے تمہارا عظیم دل ہمارے ملک کے پہاڑی سلسلے اینڈیز اور اس کے سمندر میں آرام کرے، زندہ رہے، لڑے، گیت گائے یا اولاد پائے میں تمہاری باعزت پیشانی پر بوسہ دیتا ہوں اور تمہاری کائناتی شاعری کا احترام کرتا ہوں۔

ون سینٹے ہوڈوبرو (Vincente Huidobro)

عظیم شاعر ون سینٹے ہوڈوبرو، جس نے ہر چیز کو شرارت سے دیکھا، مجھے ان گنت لطیفوں سے پریشان کیا، مجھے بچگانہ خطوط لکھے، جن میں مجھ پر حملہ کیا گیا تھا اور ہمیشہ مجھ پر نقالی کا الزام لگاتا رہا۔

ہوڈوبرو ناقابل علاج خود پسندوں کے قبیل میں سے ہے اپنی زمین کا دفاع کرنے کا یہ انداز، جس سے ادیب کو کوئی اہمیت نہیں ملتی، پہلی جنگ عظیم سے بھی پہلے کے برسوں کا خاصا رہا ہے امریکہ میں یہ متشدد نرگیست یورپ کے مصنف (Dannunzio) کے ہاں دوبارہ ابھرتی ہے۔ اس اطالوی مصنف کا جس نے یورپ میں بورژوازی کے بخئے ادھیڑ دیئے تھے امریکہ میں پرجوش مسیحائی طرز فکر کی تحریک کا دھماکہ خیز اختراع کیا تھا، سب سے انقلابی اور سنسنی خیز شاگرد (Varga svila) تھا۔

میرے لئے ہوڈوبرو کے بارے میں برائی کرنا بے حد مشکل ہے۔ جس نے تمام عمر قلم اور روشنائی کی جنگ سے مجھے عزت بخشی۔ اس نے خود کو شاعری کا خدا قرار دیا اور یہ نہ سوچا کہ یہ صحیح ہے کہ میں جو اس سے عمر میں اتنا چھوٹا ہوں اس کی قلمرو کا حصہ بن سکتا ہوں۔ میں کبھی بھی نہ سمجھ سکا کہ وہ (Olympus) آخر تھا کیا؟ ہوڈوبرو کا گروہ پیرس میں جدید ترین فیشن کی ورائے حقیقت پسندانہ تخلیق اور استعمال میں مصروف رہتا۔ میں لامحدود حد تک پست تھا، جنگلات سے متعلق ایک نکما دیہاتی لڑکا۔ بھوسے کا بیج ہوڈوبرو ایک غیر معمولی شاعر ہونے پر بھی۔ جو کہ وہ تھا۔ مطمئن نہ تھا وہ اس کے علاوہ سپرمین بھی بننا چاہتا تھا۔ اس کے لطائف بچگانہ حد تک پرکشش تھے۔ اگر آج وہ زندہ ہوتا، تو اس نے یقیناً اپنی خدمات ایک ماہر رضاکار کی حیثیت سے چاند کے پہلے سفر کے لئے پیش کر دی ہوتیں میں اسے سائنس دانوں پر یہ ثابت کرتا ہوا دیکھتا ہوں کہ واحد اس کی کھوپڑی اس روئے زمین پر ہے، جو ہیت اور لچک کے لحاظ سے خود کو فضائی سفر کے لئے آمادہ کر سکتی ہے۔ لطائف اس کی ایک واضح تصویر دکھاتے ہیں۔

مثلاً جنگ کے بعد جب وہ چلی واپس لوٹا تو خاصا بوڑھا ہو چکا تھا تب وہ ہر ایک کو ایک پرانا زنگ آلود ٹیلی فون دکھا کر کہا کرتا "یہ میں نے خود ہٹلر سے لیا تھا۔ یہ ہٹلر کا پسندیدہ ٹیلی فون تھا" ایک بار اسے ایک خراب سنگ تراشی کا نمونہ دکھایا گیا۔ جسے دیکھ کر اس نے کہا "کس قدر خراب ہے، یہ تو مائیکل انجیلو سے بھی گیا گزرا ہے۔" ایک دلچسپ کہانی، جس میں اس نے پیرس میں ۱۹۱۹ء میں مرکزی کردار ادا کیا بتانے کے قابل ہے۔

ہوڈوبرو نے ایک کتابچہ شائع کیا تھا، جس کا عنوان تھا برطانیہ کو ختم کر دو" اس کتابچے میں اس نے برطانوی سلطنت کے خاتمے کی پیشین گوئی کی تھی جب کسی نے بھی اس پیشین گوئی پر کان نہ دھرے تو شاعر نے غائب ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اخبارات نے خبر لگائی۔

چلی کا سفارت کار پراسرار طور پر غائب ہو گیا۔ "

چند دن بعد اسے اپنے گھر کے باہر دروازے کے قریب لیٹا پایا گیا، اور اس نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے کہا، کچھ انگریز اسکاؤٹ بچوں نے مجھے اغواء کر لیا تھا انہوں نے تہہ خانے میں مجھے ایک ستون سے باندھ کر دباؤ ڈالا کہ میں ایک ہزار بار چلاؤں برطانوی سلطنت زندہ باد" یہ کہہ کر وہ بے ہوش ہو گیا پولیس کو معائنے پر اس کی بغل میں سے ایک پیکٹ ملا۔ یہ پاجامے کا ایک جوڑا تھا، جو تین دن پہلے ہوڈوبرو نے خود پیرس کی ایک دکان سے خریدا تھا۔ ساری کہانی اختتام تک پہنچی اور شاعر کو اپنے مصور دوست (Juan Grin) سے ہاتھ دھونے پڑے۔ وہ شدت سے اغواء میں یقین رکھتا تھا اور چلی کے شاعر کے خلاف شاہی غیض و غضب کو بھگت چکا تھا۔

ہوڈوبرو ایک شفاف شاعر تھا۔ اس کی تخلیق کا ہر پہلو درخشاں تھا، جو ایک سے دوسرے کو لگنے والی خوشی کو پیدا کرتا۔ اس کی شاعری میں ہر جگہ یورپی چمک نمایاں ہے، جسے وہ دانائی اور خوبصورتی سے روشنی کے کھیل میں منعکس کرتا ہے۔

جب، میں اسے دوبارہ پڑھتا ہوں تو جو بات، مجھے اس کے کام کے بارے میں حیران کرتی ہے، وہ اس کے کام کی

یہ ادبی شاعر، جس نے ایک الجھے ہوئے عہد کے تمام رواجوں کی تقلید کی اور فطرت کی عظمت کو رد کرنے کا فیصلہ کیا۔

علاوہ اس کے اس نے بہتے ہوئے پانی کو اپنی نظموں میں بہنے دیا۔ پتوں اور ہوا کی سرسراہٹ اور ایک سنجیدہ انسانیت اس کی آخری نظموں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ فرانسیسی اثر سے متاثر اس کی خوشگوار فنکارانہ شاعری سے ان جان دار قوتوں تک جو اس کی تحریر میں ہیں۔ ہوڈوبرو کے ہاں کھیلنے کی کیفیت اور آگ، قربانی اور فرار میں ایک جدوجہد جاری ہے۔

یہ جدوجہد خاصی ممتاز نظر آتی ہے کبھی بالکل واضح، روشن کر دینے والی وضاحت کے ساتھ لیکن ہمیشہ ہی شعوری کوشش کے ہمراہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سنجیدگی کے حق میں ایک تعصب نے ہمیں اس کی تخلیقات سے پرے رکھا ہے۔ ہمیں اتفاق ہے کہ ونسنٹ ہوڈوبرو کا سب سے خراب دشمن خود ونسنٹ ہوڈوبرو تھا۔ موت نے اس کے ناممکن کھیل کی مانند زندگی سے اس کے تضادات کو ہٹا ڈالا تھا۔ موت نے اس کی ذاتی زندگی پر ایک پردہ ڈال دیا تھا، لیکن ساتھ ہی ایک پردہ اٹھا بھی دیا تھا۔ جس سے ہمیشہ کے لئے اس کی شخصیت کا خیرہ کن پہلو نظر آتا رہے گا۔ میں نے روبن ڈاریو کے مجسمے کے قریب ہی اس کی یادگار کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن ہماری حکومتیں، جب فنکاروں کے مجسمے بنانے کی بات کرتی ہیں تو بخیل ہو جاتی ہیں۔ جب کہ بے کار یادگاروں پر بے دریغ خرچ کرتی ہیں۔ ہم ہوڈوبرو کے بارے میں اس کی انقلابی حدود میں مداخلت کے باوجود سیاسی شخصیت کا تصور نہیں کر سکتے۔

وہ ایک بگڑے ہوئے بچے کی مانند اپنے خیالات کے بارے میں بھی لاپرواہ تھا۔ لیکن شاید اگر ہم بھی اس کی جگہ ہوتے تو ایسا ہی کرتے۔ ہمیں کہنا چاہئے کہ ہوڈوبرو کی انقلاب اکتوبر اور لینن کی موت پر لکھی گئی نظمیں انسانیت کی بیداری میں ایک اضافہ تھیں۔ ہوڈوبرو ۱۹۴۸ء میں ازلانگرا کے قریب (Cartagena) میں چند بھرپور اور بے حد خوبصورت نظمیں لکھ کر مر گیا۔ یہ نظمیں میں نے اس کی زندگی میں پڑھی تھیں۔ اپنی موت سے کچھ دیر پہلے ہوڈوبرو ازلانگرا میرے ایک پبلشر دوست کے ساتھ ملنے آیا۔ ہم دونوں چلی کے باشندوں شاعروں اور دوستوں کی بہت سی باتیں کرتے رہے۔

ادبی دشمن

میرے خیال میں دنیا کے ہر گوشے میں ادیبوں کے مابین چھوٹے بڑے جھگڑے ہمیشہ سے رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ ہمارے براعظم امریکہ میں ادب میں ادبی خودکشیوں کی تعداد خاصی زیادہ ہے۔ انقلابی روس میں حاسدوں نے مایاکووسکی کو سب سے الگ تھلگ کر کے خودکشی پر مجبور کر دیا تھا۔ لاطینی امریکہ میں بھی چھوٹے چھوٹے تعصبات ابھرتے رہے ہیں رقابت بسا اوقات ایک پیشہ بن جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ روش ہمیں نو آبادیاتی اسپین سے ورثے میں ملی ہے یہ سچ ہے کہ کیویڈو کوپی ڈی ویگا اور گونگورا کے ہاں ہمیں وہ زخم نظر آتے ہیں، جو انہوں نے ایک دوسرے پر لگائے ہسپانوی عہد اپنی تمام تر شاندار دانشورانہ چمک دمک کے باوجود ایک خوشگوار عہد تھا۔ جس میں بھوک محلات کے اردگرد منڈلاتی نظر آتی ہے گزشتہ چند سالوں میں ناول کی صنف نے ہمارے

ممالک میں ایک نئی جہت اختیار کی ہے۔ گارسیا مارکیز (Garcia Marquez) جان رلفو (Juan Rulfo) ۔ ورگاس لیوسا (Vargas Liosa) سباتو (Sabato) کورتازار (Cortazar) کارلوس فینٹیز (Carlosfuentes) اور چلین ڈونوسو (Chilean Donso) کے ناموں کو سنا جاسکتا ہے۔ ان کی تحریریں ہر جگہ پڑھی جاتی ہیں ان میں سے کچھ تو اکٹھے ہی مسیحی ہوئے تھے۔ مشترکہ طور پر ہی کہا جاتا ہے کہ یہ ایک ایسا گروہ ہے، جو ایک دوسرے کی تعریف و توصیف کرتا ہے۔ میں ان میں سے بہت سوں سے ملا ہوں اور تقریباً سب ہی کو خاصا فیاض پایا ہے۔

ہر روز مجھ پر یہ واضح ہوتا ہے، کہ کیوں ان میں سے کچھ لوگ اپنے وطن کو چھوڑ کر کام کے لئے زیادہ پرسکون جگہوں کی تلاش کرتے ہیں، جو سیاسی مخصمت اور رقابتوں کی پکڑ سے دور ہوں۔ ان کی خود ساختہ جلاوطنی کی وجوہات ناقابل انکار ہیں۔ ہمارے براعظم امریکہ کے لئے ان کی کتابیں سچائی کی ضمانت بن گئی ہیں۔ رقابت کے معاملے میں، خود میرے اپنے تجربات کے ذکر میں رکاوٹ مانع ہے۔ میں اپنی ذات کے بارے میں خود پسند ظاہر ہونا نہیں چاہوں گا لیکن یہ میری قسمت رہی ہے کہ ایسے مختلف النوع لوگوں سے رقابت رکھنے کی کہانی کو بیان کرنا اچھا ہے۔

ان لوگوں نے کبھی کبھار مجھے خاصا ناراض کیا ہو گا۔ لیکن اس سب کے باوجود یہ سب اپنی مرضی کے برعکس ایک ایسا فرض ادا کر رہے تھے یعنی میری شہرت میں اضافہ کرتے ہوئے، جیسے ان کا واحد مقصد میرے نام کی دوسرے ممالک میں تشہیر تھا۔ ان عزیز دشمنوں میں سے ایک کی موت نے میری زندگی میں ایک قسم کا خلا پیدا کر دیا تھا۔ ان تمام برسوں میں، جو کچھ بھی میں کرتا رہا، مرحوم ساری زندگی اس کی مخالفت میں ذاتی جنگ میں مصروف رہا آج میں اس کی کمی کو محسوس کرتا ہوں۔ چالیس سالہ ادبی مخصمت کی زندگی خاصی غیر متوقع ہے۔

اب جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں، تو اس تنہا فرد کو خود اپنے سائے سے جنگ کرتا دیکھ کر لطف حاصل کر رہا ہوں، کیونکہ میں خود کبھی بھی فعال شریک نہ تھا۔

اس مدیر نے پچیس رسالے شائع کئے تھے (ہمیشہ یہ وہی تھا) محض مجھے بحیثیت مصنف کے تباہ کرنے کے، ہر قسم کے الزامات مجھ پر لگائے گئے مثلاً جرائم، دھوکا دہی، عوامی اور ذاتی گناہ شاعری میں انحطاط، نقالی، سنسنی خیز جنسی سکینڈل وغیرہ کتابچے ان سب کے علاوہ شائع ہوئے۔ اور جان بوجھ کر خود تقسیم کئے گئے۔ اخباری مضامین، جو بسا اوقات خاصے مضحکہ خیز ہوتے اور آخر میں تو ایک کتاب جس کا نام (Nerudaei) تھا لکھی گئی جو رکیک جملوں اور تہمتوں سے بھری تھی۔

میرا دشمن چلی کا ایک شاعر، جو عمر میں مجھ سے بڑا تھا، جنونی اور دوسروں پر حاوی آنے والی شخصیت تھی اور حقیقت میں کہیں زیادہ دھوکے باز انسان تھا۔ امریکہ میں اس وضع کے خود پسند ادیبوں کی کمی نہیں۔ ان کے وسائل اور خود انحصاری مختلف صورتیں اختیار کر سکتی ہیں لیکن ان کی (D,Annauzian) وراثت غمگین حد تک اصل ہے۔

طوفانی صبحوں میں ہمارے غریب عرض الابلد میں، ہم فاقہ کش شاعر چیتھڑوں میں ملبوس، بخشش کی تلاش میں شرابیوں کی الٹیوں پر سے گزرتے۔ اس خراب حال ماحول میں ادب نے زندگی کے دھتکارے ہوؤں میں سے بدمعاش پیدا کئے نطشے کے جھوٹے سنکی رویئے اور فنایت کے بے پناہ رجحان نے ہمارے بہت سے شاعروں کو مجر منہ نقابوں کے پس پشت چھپا دیا تھا۔ ان میں سے کچھ نے اپنی زندگیوں کو جرم اور خود کو تباہ و برباد کرنے کے مختصر راستے پر ڈال دیا۔ میرا روایتی مخالف اسی پس منظر سے ابھرا تھا پہلے اس نے مجھے ورغلانے کی کوشش کی تاکہ اپنے کھیل کے قوانین میں مجھے پھانس سکے۔ یہ بات مجھ دیہاتی بچے کے متوسط طبقاتی مزاج کے خلاف رہی۔

اس کے برعکس ہمارا ہیرو ہر صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا ماہر تھا۔ وہ ایک مسلسل بے تکی دنیا میں رہتا تھا، جہاں وہ خود اپنے آپ کو پیشہ ور بدمعاش اور محافظ کے کردار میں دھوکہ دیتا تھا۔ ایسے کردار کو شناخت کرنے کے لئے یہ مناسب وقت ہے۔ اس کا نام (Joeblow) جوبلو تھا۔ وہ ایک مضبوط انسان تھا، جو لوگوں کو اپنی تقریر اور جسامت سے متاثر کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ ایک بار جب میں صرف اٹھارہ یا انیس برس کا تھا تو اس نے مجھے اپنے ساتھ ایک ادبی رسالہ نکالنے کی پیش کش کی تھی۔

اس ادبی رسالے کے دو حصے ہوں گے۔ ایک حصہ میں وہ نثر اور نظم کے مختلف ٹکڑوں میں یہ ثابت کرے گا کہ میں بے حد توانا اور شاندار شاعر ہوں اور دوسرا حصہ جس میں بہ بانگ دہل اس کے بارے میں، میں اعلان کروں گا کہ وہ لامحدود صلاحیت اور ذہانت کا مالک ہے اور یوں ہر چیز درست ہو گی۔

میں خاصا کم عمر تھا، لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس طرح بات خاصی بڑھ جائے گی۔ پھر بھی مجھے اس سے بحث کرنے میں خاصی دقت ہوئی ادبی رسالے شائع کرنے میں، وہ واقعی ماہر تھا بالکل جس طرح اپنی ناختم ہونے والی کتابچہ مہم کے لئے اس کا فنڈ اکٹھا کرنا ناقابل یقین تھا۔

وہ لائحہ عمل کے لئے الگ تھلگ سرد صوبوں کا انتخاب کرتا پہلے ہی سے اس نے ایک طویل فہرست تیار کر رکھی تھی، جس میں ڈاکٹر، وکیل، دندان ساز، زرعی ماہرین، پروفیسر انجینئر اور اس کے علاوہ عوامی عہدوں پر معمور بڑے لوگ شامل ہوتے وہ خود اپنی ضخیم کتابوں، تخلیقات، رزمیہ اور

غناعیہ کتابچوں کی آڑ میں بین الاقوامی ثقافت کا علمبردار بن کر سامنے آ گیا۔ اور ان تمام گمنام لوگوں کو یہ سب دکھاتا۔ اپنی لفاضی کی توانائی میں وہ اپنے شکار کو ایک چھوٹی سی مکھی میں منتقل کر لیتا۔ اور پھر شکار سے چندہ وصول کر کے، اسے بین الاقوامی ثقافت کی عظمت کی برف میں تنہا چھوڑ جاتا۔

دوسری مرتبہ جوبلو خود کو زرعی اشتہار بازی کا ماہر ظاہر کرتے ہوئے ملک کے دور افتادہ کسانوں کی زمینوں پر شاندار قسم کے مونوگراف تیار کرنے کی پیش کش کر دیتا، جن پر مالکوں کی تصویر میں ان کے مویشی بھی شامل ہوتے۔ اس سب کے لئے وہ برجس میں ملبوس آگ بجھانے والے جوتے پہنے ہوئے ظاہر ہوتا اور پھر خوشامد اور ڈھکی چھپی دھمکیوں کے ذریعے انہیں ورغلاتا اور اس طرح ہمارا سورما رقوم کے چیک لئے ہوئے ان کی زمینوں سے واپس ہوتا۔ زمیندار مسیحی تھے لیکن حقیقت پسند ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے، وہ اسے چیک اور رقوم دے کر اپنا پیچھا چھڑاتے۔ جوبلو کی غیر معمولی صلاحیتوں میں سے ممتاز ترین نطشے کے دبستان کا فلسفی ہونا اور ایک دھانسو ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی دانشورانہ جسمانی غنڈہ گردی بھی تھی چلی کی ادبی زندگی میں، وہ ایک پیشہ ور بدمعاش تھا۔ کئی سال تک اس کا دربار غریب شیطانوں سے بھرا رہا، جو اس کے اشاروں پر ناچتے تھے، لیکن زندگی موقعوں کے بادبانوں سے زبردست ہوا کو نکال لینے پر قادر رہی ہے۔ میرے ناقابل علاج دشمن کا خاتمہ بڑھاپے میں اس کی خودکشی پر ہوا جس نے کافی عرصہ تک ان یادداشتوں کو لکھنے سے مجھے باز رکھا، بالاخر میں یہ لکھ رہا ہوں، کیونکہ میری دانست میں اب یہ مناسب وقت اور صحیح جگہ ہے۔

ہسپانوی زبان بولے جانے والے ممالک میں ایک عجیب قسم کی نفرت موجود رہی ہے۔ یہ نفرت کام کرنے والے ادیبوں کو اضطرابی تجسّس سے کھا جاتی ہے اور اس وضع کی تباہ ناک صورت حال کو ختم کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسے عوام کے سامنے رکھ دیا جائے۔ میرے خلاف سنسنی خیزی اور سیاسی ادبی دھماکے کا ایک سلسلہ ایک اور پراسرار یوراگوئے کے (Yruguay) شخص کی طرف سے ہوا جس کے نام کا آخری لفظ (Cialiciain) تھا۔ یہ بھی سنجیدہ طور پر خاصا پاگل تھا۔ کئی سال تک یہ شخص ہسپانوی اور فرانسیسی زبان میں میرے خلاف کتابچے لکھتا رہا۔

نرودا کی مخالفت میں جاری رہنے والے پروگرام کی حیران کن بات یہ ہے کہ میرے خلاف سیاہ ہونے والے کاغذات کی ادائیگی نہ صرف وہ خود کرتا رہا بلکہ اس نے میری تباہی کو پیش نظر رکھتے ہوئے خاصے مہنگے سفر بھی کئے۔ یہ عجیب و غریب کردار میری اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے اعلان پر آکسفورڈ یونیورسٹی تک بھی پہنچا۔ یوراگوئے کا یہ دشمن اپنے مضحکہ خیز الزامات کے ساتھ

میری ادبی شہرت کے چیتھڑے اڑانے پر تلا ہوا تھا۔ اعزازی ڈگری وصول کرنے کے بعد، میں ابھی عنابی رنگ کا گاؤن پہنے ہوئے تھا کہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے ڈان نے مجھے اس کے الزامات کے بارے میں آگاہ کیا۔ یوراگوئے کے اس باشندے نے ۱۹۶۳ء میں جب میرے بارے میں نوبل انعام کے ملنے کی افواہ تھی۔ سٹاک ہوم تک سفر ہی نہیں کیا بلکہ وہاں پہنچ کر میرے خلاف پریس کو انٹرویو دیئے۔ اور ریڈیو پر یہ بیان دیا کہ دراصل ٹرانسکی (Trotsky) کے قاتلوں میں سے، میں ایک ہوں یہ سب کچھ اس پلان کے تحت کیا جارہا تھا کہ ان الزامات کے بعد مجھے نوبل انعام کے لئے رد کر دیا جائے گا۔

وقت نے ثابت کر دیا کہ قسمت نے اس شخص کے ساتھ یاوری نہ کی اور آکسفورڈ اور سٹاک ہوم دونوں جگہوں پر محض اس کا پیسہ اور وقت ضائع ہوا۔

تنقید اور خود احتسابی

اس بات سے انکار نہیں کہ مجھے بہت اچھے نقاد ملے میں ادبی تقریبات میں موجود ان بہی خواہوں کے بارے میں بات نہیں کر رہا نہ ہی میں ان بے عزتیوں کا ذکر کر رہا ہوں، جن کا میں باعث بنا میں دوسرے لوگوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ ان کتابوں کے بارے میں، جو میری شہرت کے بارے میں لکھی گئیں۔

ان پرجوش نقادوں سے الگ ہو کر مجھے روسی نقاد (Lev Ospovat) کا ذکر کرنا ہو گا، جو بہت عمدہ نقادوں میں سے ایک تھا۔

اس نوجوان نقاد نے تو یہاں تک کیا کہ پہلے تو باقاعدہ ہسپانوی زبان میں عبور حاصل کیا اور پھر میری شاعری کا بغور معائنہ کیا۔ اس نے میری شاعری کو مستقبل کے تناظر میں دیکھا اور اسے اپنی دنیا کی شمالی روشنیوں پر منطبق کیا اول درجے کے ایک نقاد (Emir Rodriguez Monegac) نے میری شاعری پر ایک کتاب شائع کی، جس کا نام ہسپانوی زبان میں (Elviazeno inmouil) یعنی (The Motionless Traveler) تھا۔ آپ ایک نظر میں اندازہ لگا سکتے تھے کہ یہ دانشور کوئی بیوقوف نہ تھا۔ اس نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا تھا، کہ میں اپنے گھر سے نکلے بغیر اپنے ملک کو چھوڑے بغیر بلکہ اپنی ذات سے باہر نکلے بغیر سفر کا شوقین تھا اس پراسرار شاندار ناول (The Moonstone) کی ایک کاپی میرے پاس ہے، جس کی ایک تصویر مجھے بے حد پسند ہے، اس میں ایک عمر رسیدہ انگریز معزز شخص کو دکھایا گیا ہے، جو بے حد دبیز فرکوٹ میں ملبوس آتش دان کے سامنے بیٹھا ہے، اس کے ہاتھ میں ایک کتاب، دوسرے میں پائپ ہے اور دو کتے

اس کے پیروں پر سو رہے ہیں۔ میں بھی ہمیشہ کے لئے یہی چاہوں گا۔ سمندر کے نزدیک آتش دان کے سامنے پائپ پیتے دو کتوں کی فرقت میں ان کتابوں کو پڑھتے ہوئے جنہیں میں نے مشکل سے جمع کیا۔

آمانڈوالانسو (Amando Alonso) کی کتاب (Poetry style of Pablo neruda) بہت سے لوگوں کی نظر میں بے حد موقر کتاب ہے۔ اس کی جذباتی کوشش سایوں میں گھسنے، لفظوں اور پھسلواں حقیقت کے درمیان مختلف پرتوں کی جستجو، خاصی دلچسپی کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ (Alonso) کا مطالعہ، ہماری زبان کے ہم عصر شاعر کے کام کا ایک سنجیدہ جائزہ بھی مرتب کرتا ہے اور یہ میرے لئے عزت افزائی کی بات ہے۔ میری شاعری کی وضاحت اور مطالعے کے لئے بہت سے نقاد میرے پاس آئے، جن میں (Amando Alonso) بھی تھا وہ سوالات کی بوچھار میں مجھے وضاحت کی دیوار کے پاس جا کھڑا کرتے۔ جہاں میں اس وقت اس کو نہ سمجھ سکتا۔

کچھ کی دانست میں، میں سرریلسٹ شاعر تھا، بعضوں کی نظر میں، ایک حقیقت نگار تھا اور بہت سے یہ کہتے تھے کہ میں شاعر ہی نہیں ہوں۔ یہ سب جزوی طور پر صحیح اور جزوی طور پر غلط ہیں۔ (Residencia enla tierca) اور (Tentalivia del bonbre infinito) دونوں کتابیں اس زمانے میں لکھی گئی، جب سرریلیزم (Surralism) کا دور دورہ تھا، لیکن ہم تاریخوں پر تو یقین نہیں کر سکتے۔

دنیا کی ہوا، شاعری کے ننھے ذرات کو جو زرگل سے بھی ہلکے اور سیسے سے وزنی ہیں، منتشر کرتی ہے...... اور یہ بیج درزوں میں یا لوگوں کے سروں پر اترتے ہیں، ہر شے کو موسم بہار یا جنگ کی نوید دیتے ہوئے پھولوں کے ساتھ ساتھ راکٹ پیدا کرتے ہوئے۔

جہاں تک حقیقت نگاری کا تعلق ہے، تو میں خود اپنی دلچسپی کے لئے یہ کہوں گا کہ شاعری میں حقیقت نگاری سے مجھے نفرت ہے اس کے علاوہ شاعری کو سرریلسٹ یا اس سے بھی کوئی نچلی سطح کی چیز نہیں ہونا چاہئے۔ بیشک وہ حقیقت نگاری کی ضد ہو سکتی ہے اور حقیقت نگاری کی یہ ضد، تمام تر منطق کے ساتھ سارے بے تکے پن۔ یعنی تمام شاعری کے ساتھ ہے۔

مجھے کتابوں سے عشق ہے۔ شاعری کا ٹھوس مواد، ادب کا جنگل مجھے یہ سب پسند ہے، حتیٰ کہ کتابوں کے پشتے تک لیکن دلبستانوں کے لیبل پسند نہیں۔ میں کتابوں کو دلبستانوں کے بغیر چاہتا ہوں زندگی کی مانند کسی تقسیم کے بغیر۔ میں والٹ وھٹمین (Walt Whitman) اور مایا کوواسکی (Mayakivsky) میں "مثبت سورما" کو پسند کرتا ہوں، جسے وہ کسی فارمولے اور

زندگی میں تکلیف پہنچائے بغیر لے آئے اور اسے ہمارے ساتھ ہمارے خواب اور خوراک میں شریک بنا دیا۔

سوشلسٹ معاشرے کو رفتار کے عہد کی دیو مالا کو ختم کرنا ہو گا. جس میں اشتہارات. اجناس سے زیادہ قیمتی ہیں. جس میں ضروریات کو ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے۔ لیکن ایک ادیب کی گہری خواہش اچھی کتابوں کو تحریر کرنا ہے۔ مجھے والٹ وھٹمن کے ہاں موجود "مثبت سورما" جو خانہ جنگی کے مدوجزر سے ابھرتا ہے. پسند ہے۔ اور مایا کووسکی کو بھی میں پسند کرتا ہوں۔ لیکن میرے دل میں (Lautreamont) کی سوگواری کے نقاب میں چھپے ہوئے سورما کے ساتھ ساتھ (Laforgue) کے آہیں بھرتے ہوئے جنگ جو اور (Baudelair) کے منفی سپاہی کے لئے بھی جگہ ہے۔

تخلیق کے سیب کو دو حصوں میں منقسم کرنے سے خبردار رہیں. کیونکہ ہم دلوں کو چیر کر زندگی کو ختم کر سکتے ہیں. اس لئے چوکنے رہیں ہمیں اس شاعر کو مانگنا ہو گا. جو سڑک پر اور لڑائی میں. روشنی اور تاریکی میں اس کی جگہ لے لے۔

شاید تاریخ میں شاعر کی ہمیشہ سے اس قسم کی مجبوریاں رہی ہیں یہ شاعری کا امتیاز ہے. کہ وہ گلیوں میں جائے اور لڑائیوں میں حصہ لے۔ شاعر کو جب باغی کہا گیا تو وہ بالکل نہیں گھبرایا انہوں نے کہا شاعری بغاوت ہے. شاعر تب بھی نہیں گھبرایا جب انہوں نے اسے تخریب کار کے نام سے یاد کیا۔ زندگی تمام ہستیوں سے اوپر نکل جاتی ہے اور روح کے لئے اخلاق کے نئے ضابطے ہیں بیج کہیں بھی پھوٹ پڑتا ہے۔ سارے خیالات فکر انگیز ہیں ہر روز ہم بے شمار تبدیلیوں کے منتظر رہتے ہیں۔ ہم انسانی ترتیب کی تبدیلی میں شوق سے زندہ رہتے ہیں۔ — بہار باغی ہے میرے پاس جو کچھ بھی تھا. وہ میں دے چکا. میں نے اپنی شاعری کو حلقے میں ڈال دیا اکثر اس کے باعث میں دکھوں کو سہتے ہوئے لہولہان ہوا۔ اور فتح کے لمحات کی تعریف کرتے ہوئے. جنہیں میں نے دیکھا تھا اور جن سے میں گزرا ایسا اوقات مجھے کسی ایک بات پر یا دوسری وجہ سے غلط سمجھا گیا اور یہ سب کچھ زیادہ برا نہیں۔

ایکواڈور (Ecuador) کے ایک نقاد نے کہا تھا کہ میری کتاب (Las uvos yelvi میں چھ صفحات سے زیادہ شاعری نہیں ہے ایکواڈورین نے اتفاق سے میری کتاب کو کسی جذبے کے بغیر پڑھا تھا۔ کیونکہ یہ ایک سیاسی کتاب تھی. بالکل جیسے بڑے سیاسی نقادوں نے میری کتاب (Residencia en la tierra) سے نفرت کا اظہار کیا. کیوں کہ ان کی دانست میں یہ بے حد داخلیت پر مبنی اور اداس کر دینے والی کتاب تھی حتیٰ کہ (Juan Marinello) جیسے ممتاز

ادیب نے اس کتاب کو اخلاقی نقطہ سے رد کر دیا تھا۔ میرے خیال میں دونوں ایک ہی غلطی کے لئے قصور وار ہیں، جس کا منبع مشترک ہے۔

بعض مرتبہ، میں نے بھی اس کتاب کے بارے میں سخت کلمات کہے ہیں، لیکن ایسا کرنے میں میرے ذھن میں اس کی شاعری کے بجائے قنوطیت کی وہ فضا تھی، جو میری اس کتاب میں موجود ہے میں کبھی بھی اس بات کو نہیں بھول سکتا. جب چند سال پہلے سانتیاگو کے ایک لڑکے نے ایک درخت تلے خود کو مار ڈالا تھا۔ اور میری کتاب کو وہاں اس نظم پر کھلا چھوڑ دیا تھا جس کا نام (It means shadows) تھا۔ میرے خیال میں دونوں کتابیں (Residincia enla tierr..ایک تاریک اور اداس لیکن میری تخلیقات میں ایک اہم کتاب اور دوسری (Las uvas yel viento)روشنی سے بھرپور اور وسیع جنگوں کی کتاب دونوں کو کہیں اور زندہ رہنے کا حق ہے۔ اور جب میں یہ کہتا ہوں تو اپنی بات کو رد نہیں کرتا۔

درحقیقت اپنی کتاب (Las uvas yel uiento) کے لئے میرے ہاں ایک نرم گوشہ ہے، شاید اس لئے کہ یہ میری سب سے غلط سمجھی جانے والی کتاب ہے یا پھر اس لئے کہ اس کے صفحات میں، میں نے دنیا بھر کی اپنی آوارگی کو جمع کر دیا ہے—— اس میں دریاؤں کے پانیوں کے ساتھ سڑکوں کی خاک بھی شامل ہے۔ اس میں حشرات، سمندروں سے دور پرے کی، جگہوں جنہیں میں اس وقت تک نہ جان سکا. جب تک میں نے انہیں اپنے مختلف سفروں میں نہ دیکھا اور ایک تسلسل موجود ہے۔ میں دہراتا ہوں کہ یہ وہ کتاب ہے. جسے میں سب سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔

اپنی تمام کتابوں میں سے (Estravagerio) وہ واحد کتاب نہیں جو گنگناتی ہے بلکہ یہ وہ کتاب ہے، جس میں سب سے بہتر شعر موجود ہیں اس کی نظمیں، امتیاز، توقیر، باہمی حفاظت، استحکام، ان مجبوریوں کو جو بے عزتی کو عزت میں تبدیل کرتی ہیں، سے گزر جاتی ہیں کیونکہ اپنی بے توقیری کے باعث، یہ میری سب سے زیادہ ذاتی کتاب ہے اپنی حدود کی وجہ سے یہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ میرے مزاج کے مطابق یہ ایک شاندار کتاب ہے. جس میں نمک کی تلخی موجود ہے، جو سچ میں ہمیشہ ہوتی ہے۔

اپنی کتاب (Odas Elementales) میں، میں نے چیزوں سے ان کی ابتداء سے نمٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پیدائش کے فوراً بعد سے ابتدائی حالت سے شروع کرتے ہوئے۔ میں بہت سی ان باتوں کے بارے میں، جو بار بار گائی گئیں، بیان کرنا چاہتا ہوں میرا ارادہ اس لڑکے کی مانند تھا. جو اس مضمون کو شروع کرنے سے پہلے جو اسے لکھنے کے لئے دیا گیا ہے۔ اپنی پنسل کو چباتا

ہے اور مماپی پر سورج، تختہ سیاہ، کلاک یا خاندان کے بارے میں لکھتا ہے۔

میرے دائرہ کار سے کسی بھی بات کو چھوڑا نہیں جائے گا۔ پیدل چلتے ہوئے یا اڑتے ہوئے، مجھے ہر شے کو چھونا ہو گا۔ اپنی ذات کے بارے میں اتنی وضاحت اور تازگی کے ساتھ جتنا ممکن ہے۔

یوراگوئے کا ایک نقاد محض اس بات پر پریشان ہو گیا تھا کہ میں نے کچھ پتھروں کو چھوٹی بطخوں سے مشابہ کر دیا تھا۔ اس نے وضاحت کی تھی کہ چھوٹی بطخیں اور دوسری وضع کے چھوٹے جانور شاعری کا مواد نہیں ہیں ـــــ ادبی نفاست اس قسم کی بے پروائی تک پہنچ گئی ہے ـــــ

یہ لوگ تخلیقی فنکاروں پر محض لطیف موضوعات سے نمٹنے پر زور دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن یہ غلطی پر ہیں۔ ہم ان چیزوں سے بھی شاعری پیدا کریں گے، جسے اعلیٰ ذوق کے لوگوں نے نظر انداز کر دیا ہے۔

بورژوازی ایک ایسی شاعری کی متقاضی ہے، جو حقیقت سے زیادہ سے زیادہ حد تک دور ہے۔ وہ شاعر، جو دو اور دو چار کہنا چاہتا ہے، سرمایہ دارانہ نظام کے لئے خطرناک ہے۔

ہوڈوبرو کے بقول شاعر کے لئے خود کو یہ یقین دلانا کہ وہ "ایک چھوٹا دیوتا ہے" زیادہ آسان ہے۔

یہ یقین، یہ استدلال، حکمرانوں کو مضطرب نہیں کرتا شاعر اپنی ہی آسمانی تنہائی میں نہاتا ہے، اور اسے دبانے یا رشوت دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس نے خود ہی اپنی ذات کو اپنی جنت میں محدود کرنے کی رشوت دے رکھی ہے۔ اس اثنا میں، زمین اس کے راستے میں اور اس کی خیرہ کن روشنی میں لرزتی ہے۔

ہمارے لاطینی امریکہ میں لاکھوں افراد جاہل ہیں۔ ثقافتی طور پر یوں پس ماندہ رہ جانا، جاگیردارانہ نظام کے ورثے اور ایک فائدے کی حیثیت سے برقرار رہتا ہے۔ ان سات کروڑ جاہلوں کی موجودگی میں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پڑھنے والے ابھی پیدا نہیں ہوئے۔ ہمیں پیدائش کو بڑھانا پڑے گا، تاکہ ہم سب شاعروں کو پڑھا جاسکے۔ ہمیں امریکہ کے رحم کو کھولنا ہو گا تاکہ وہ اپنی شاندار روشنی کو باہر لاسکے۔

ادبی نقاد عموماً جاگیردارانہ موقف کی خدمت کر کے خوش ہیں مثال کے طور پر ۱۹۶۱ء میں میری تین کتابیں (Cancion de cesta) (Las Piedrasde chile) اور (Cantos ceremoniales) منظر عام پر آئیں، لیکن ان نقادوں نے تمام سال ان کتابوں کا کہیں بھی ذکر نہ کیا جب میری نظم (Altoras de maschu picchu) پہلی بار شائع ہوئی تو

چلی میں کسی کو اس کا ذکر کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ اس کتاب کا پبلشر چلی کے سب سے زیادہ ضخیم اخبار (El Mercurio) کے دفتر میں گیا، جو تقریباً ڈیڑھ سو سال سے وہاں موجود تھا اس کے پاس کتاب کے شائع ہونے کی دی گئی رقم کی اطلاع موجود تھی، لیکن اخبار والے نے اس کو اس شرط پر لینے پر آمادہ ہوئے کہ اس میں میرا نام نہ آئے گا۔

(Neira) نے احتجاجاً کہا "لیکن نرودا تو اس کا مصنف ہے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ بولے

اس نظم کو شاعر کے نام کے بغیر شائع ہونا پڑے گا۔

بھلا اس نظم کو اخبار کے ڈیڑھ سو سال سے وہاں ہونے کا کیا فائدہ ہوا؟ اس تمام زمانے میں یہ اخبار سچائی، حقائق شاعری کی عزت کرنا نہ سیکھ سکا تھا۔

بسا اوقات وہ منفی جذبات، جو میرے خلاف ہو گئے، محض طبقاتی کشمکش کا ایک تلخ عکس نہیں بلکہ دوسری ضروریات کے طابع ہیں میرے حق میں چالیس برس سے زیادہ کا کام اور بہت سے دوسرے ادبی انعامات ہیں۔ اور میری کتابیں بہت سی حیران کن زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں پھر بھی کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ مجھے اپنے گرد موجود چلنے والے رفیقوں سے کوئی دھچکا نہ لگتا ہو۔

میرا گھر اس مسئلہ میں ایک مرکز ہے۔ یہ گھر میں نے ازلانگیرا کے ویران علاقے میں خریدا تھا، جب یہاں نہ پینے کو پانی تھا اور نہ ہی بجلی۔ اپنی کتابوں کے معاوضے سے میں نے اس کی مرمت کی۔ اور اسے از سر نو فرنیچر سے آراستہ کیا۔ میں نے لکڑی کے وہ مجسمے خریدے، جو مجھے بے حد عزیز ہیں پرانے بحری جہازوں سے اتاری گئی شبیہیں، جو طویل سفروں کے بعد میرے گھر میں پناہ اور امان پاتی ہیں۔

لیکن ایسے لوگ موجود ہیں، جو اس خیال کو برداشت نہیں کر سکتے کہ ایک شاعر کو اپنے بے پناہ تخلیقی کام کی بدولت انعام مل گیا ہے جس کا وہ مستحق تھا۔ مادی آسائش جو تمام ادیبوں، موسیقاروں اور مصوروں کا حق ہے۔ رجعت پسند، بھاڑے کے ٹٹو، جو وقت سے پیچھے ہیں اور مسلسل گھٹنے کے لئے عزت و توصیف کے طلب گار ہیں، آج کے عہد کے شاعروں کو جینے کا حق نہیں دینا چاہتے۔ مثلاً میرے پاس کار کی موجودگی انہیں پاگل کر دیتی ہے۔ ان کے بقول کار محض تاجروں، بدمعاشوں، منافع خوروں اور طوائفوں کے دلالوں کے پاس ہونی چاہئے ان سب کو مزید تنگ کرنے کے لئے میں ازلانیگرا کا گھر عوام کے لئے چھوڑ جاؤں گا۔ کسی دن یہ یونین کے جلسوں کے لئے استعمال ہو گا۔ ایک جگہ، جہاں کان کن اور کسان جاکر آرام کر سکیں گے ___ یہی میری شاعری کا انتقام ہو گا۔

ایک اور سال شروع ہوتا ہے

ایک اخباری نمائندہ مجھ سے سوال کرتا ہے۔
"اس شروع ہونے والے سال میں دنیا کے بارے میں آپ کیا خیال رکھتے ہیں؟"
میں جواب دیتا ہوں۔
"آج ۵ر جنوری کو اس لمحے نو بج کر بیس منٹ پر، مجھے ساری دنیا بے حد گلابی اور نیلگوں نظر آتی ہے۔"

اس میں کوئی ادبی، شاعرانہ یا ذاتی تاثرات نہیں ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ میری کھڑکی سے، مجھے گلابی پھولوں کے وسیع و عریض تختے اور ان سے پرے، بحر الکاہل اور آسمان باہم نیلگوں آغوش میں نظر آتے ہیں۔ لیکن مجھے احساس ہوتا ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ دنیا کے منظر نامے میں اور بھی رنگ ہیں۔

خون کے اس رنگ کو، کون بھلا سکتا ہے، جسے ویت نام میں ہر روز بے حسی کے انداز میں بہایا گیا ہے؟

ان دیہاتوں کے رنگ کو، کون فراموش کر سکتا ہے، جنہیں نیپام بموں سے صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا؟

اسی نامہ نگار کے سوال میں سے ایک اور سوال کا جواب، میں دیتا ہوں۔ ان تین سو پینسٹھ دنوں میں، میں ایک کتاب اور شائع کروں گا۔ مجھے اس کا یقین ہے۔ میں اسے سہلاتا ہوں میں اسے بگاڑتا ہوں، ہر روز میں اسے لکھتا ہوں "یہ کس کے بارے میں ہے؟"

میں بھلا کیا جواب دے سکتا ہوں۔ میری کتابیں ہمیشہ ایک ہی بات سے متعلق ہیں۔ میں ہمیشہ ایک ہی کتاب لکھتا ہوں مجھے امید ہے کہ میرے دوست مجھے معاف کر دیں گے۔ کیونکہ اس نئے موقع پر اور اس نئے سال میں مجھے انہیں دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے، سوائے اپنی نظموں کے ــــ وہی نئی نظمیں۔

یہ سال جو ابھی ختم ہوا۔ اس زمین پر ہم سب کے لئے فتوحات لایا باہر فضا میں اور اس کی راہوں پر فتوحات۔ اس سال کے دوران تمام انسانوں نے اڑنا چاہا۔ ہم سب اپنے خوابوں میں خلا بازوں کی مانند سفر کرتے رہے ہیں۔ فضا پر برتری ہم سب کی ہے، چاہے وہ شمالی امریکی ہوں یا روسی، جو چاند پر اور نئے سال کے انگوروں کو چاند پر کھانے والوں میں سب سے پہلے تھے۔

ہم شاعروں کے لئے دریافت شدہ تحائف کا بیشتر حصہ گرنا چاہئے جولز ورنز (Jules

(Verns سے لے کر، جس نے انسان کے خلائی خوابوں کے لئے اپنی کتاب میں اڑنے والی مشینوں کا ذکر کیا، اور جولز لافورگے (Jules Laforgue) ہینرک ہائین (Heinrich Heine) تک (باولیر کو بھولے بغیر، جس نے اپنے شیطانی سحر کو دریافت کیا) زرد سیارے کو ہم شاعروں نے دریافت کیا۔ اس کے گیت گائے اور اس سے پہلے کہ کوئی سبقت لے جاتا ہم اسے تحریر میں لے آئے۔

سال گزرتے ہیں۔ تم تھک جاتے ہو، بچتے ہو، دکھ اٹھاتے ہو، اور زندگی سے لطف اٹھاتے ہو۔ یا برس زندگی چھین لیتے ہیں یا اسے تمہیں بخش دیتے ہیں اکثر و بیشتر جدائیاں ہوتی ہیں۔ دوست یا جیل چلے جاتے ہیں، یا وہاں سے نکلتے ہیں۔ وہ یورپ چلے جاتے ہیں یا واپس آتے ہیں یا پھر مختصراً مر جاتے ہیں۔ وہ جو تم سے بچھڑ جاتے ہیں، جب تم وہاں نہیں تھے، جہاں وہ مرے وہ ایسے نہیں مرتے۔ وہ جیسے تھے ویسے ہی تم میں زندہ رہتے ہیں۔ ایک شاعر، جو اپنے دوستوں سے الگ رہتا ہے، اپنی تخلیقات میں سوگواری کی نظموں کے مجموعے کا اضافہ کرتا ہے۔

مجھے ڈر تھا کہ انسانی دکھ، موت کی شکل میں، شاید اکتا دینے والا بن جائے۔ تم مردہ لوگوں کے رجسٹر میں تبدیل ہونا نہیں چاہتے باوجودیکہ کہ وہ تمارے بہت چاہنے والے تھے۔

۱۹۲۸ء میں، سیلون میں جب میں نے (Absence of Joaqin) اپنے شاعر دوست (Joaqin) کی موت پر نظم لکھی اور بعد میں ۱۹۳۱ء میں بارسیلونا میں جب البرٹ روجاز پر نظم لکھی تو یہ سوچا تھا کہ اب کوئی اور نہیں مرے گا، لیکن بہت سے مر چکے۔ نزدیک ہی (Cordoba) کی پہاڑیوں میں ارجینٹنا کا دوست روڈلفو الفانسو (Rodolfo Alfonso) جس نے ہماری چلی کی دوست مارگریٹا کو بیوہ چھوڑ دیا۔ یہ سال جو ابھی اختتام کو پہنچا۔ ہوا میرے بے حد عزیز دوست سچائی کے محافظ ایلیا ایہرن برگ (Ila Ehrenberg) کے نازک فریم کو اڑا کر لے گئی اسی سال ماسکو میں انہوں نے (Ovadi Savich) شاعر کو دفنا دیا، جس نے گیبریلا مسٹرل کی شاعری کے علاوہ میری شاعری کو بھی دیانت داری سے ہی نہیں بلکہ خوبصورتی اور محنت کے ساتھ ترجمہ کیا تھا۔ یہی ہوا میرے شاعر بھائیوں ناظم حکمت اور (Semyon Kirsanov) کو اڑا لے گئی اور اس کے علاوہ اور بہت سے دوسروں کو بھی ____

غربت کے مارے بولیویا میں چی گویرا کی سرکاری ہلاکت دہلا دینے والی ایک تلخ حقیقت تھی اس کی موت کے اعلان کا برقیہ ساری دنیا میں تقدیس کی ایک سرد لہر کی مانند دوڑ گیا تھا۔ لاکھوں تعزیت نامے اس کی دردناک مگر سورمائی زندگی کو سلام کرنے کے لئے شریک ہوئے۔ نظمیں، جو اس کی موت پر لکھی گئیں ان میں بہت سی جو اس موقع تک نہ پہنچ پائیں بعد میں ساری دنیا سے

آئیں۔

مجھے کیوبا سے ایک برقیہ ملا۔ یہ ایک ادبی کرنل کی طرف سے تھا جس میں مجھ سے میری نظم کی درخواست کی گئی تھی۔ میں نے نظم ابھی تک نہیں لکھی۔ میرا اعتقاد ہے کہ ایسی تعزیتی نظم میں فوری احتجاج ہی نہیں بلکہ اس دردناک کہانی کی گونج بھی ہونی چاہئے۔ میں اس نظم پر اس وقت تک کام کروں گا. جب وہ میرے ذھن میں اور میرے خون میں تیار نہ ہو جائے مجھے اس کا شدت سے احساس ہے کہ میں وہ واحد شاعر ہوں، جس کا اس گوریلا رہنما نے اپنی ڈائری میں ذکر کیا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بارچی گویرا نے مجھ سے سارجنٹ (Retamar) کے سامنے کہا تھا کہ اس نے اکثر (Sierra Maestra) میں، ممتاز ترین نرم خو اور داڑھی والے گوریلوں کے سامنے میرے کینٹوز کو پڑھا ہے۔ اپنی ڈائری میں، اس نے میری نظم (Canto para bou var) سے ایک سطر نقل کی تھی۔

"ایک بہادر کپتان جیسی تمہاری چھوٹی سی لاش......"

نوبل انعام

میرے نوبل انعام کے پس پشت ایک طویل تاریخ ہے۔ کئی سال تک میرا نام بحیثیت امیدوار کے ہمیشہ لیا گیا تھا۔ مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا ۱۹۶۳ء میں حالات سنجیدہ ہو گئے۔ ریڈیو نے بار بار دہرایا کہ سٹاک ہوم (Stockholm) میں میرا نام لیا جا رہا ہے۔ اور اس مرتبہ شاید میں نوبل انعام کا حق دار رہوں گا۔ لہٰذا ممیٹلڈی اور میں نے گھر کے دفاع کا پلان نمبر۳ تیار کر لیا تھا۔ ہم نے خوراک اور سرخ شراب کی بڑی مقدار اکٹھی کر لی تھی۔ اور ازلا نیگرا کے پرانے دروازے پر ایک بہت بڑا تالہ لٹکا دیا تھا۔ کچھ عرصے کے محاصرے کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے کچھ اسرار کو پھیلا دیا تھا۔ اخباری نمائندے بہت تیزی سے وہاں پہنچے لیکن انہیں ہم نے نزدیک نہ آنے دیا۔ وہ لوگ مضبوط بڑے دروازے سے جس پر تانبے کا بڑا تالہ لگا ہوا تھا اندر داخل نہ ہو سکے۔ یہ تالہ جتنا مضبوط تھا۔ اتنا ہی خوبصورت بھی۔

بڑی دیوار کے عقب میں وہ شیروں کی طرح غراتے رہے۔

آخر وہ کیا کرنے کی کوشش میں تھے؟ دنیا میں دوسری طرف سویڈیش اکادمی کے ممبران کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ میں کیا کہہ سکتا تھا اس کے باوجود اخباری نامہ نگاروں نے شلغم سے خون نچوڑنے کی اپنی نیت کو نہ چھپایا۔

بہار بحر الکاہل کے جنوبی ساحل پر دیر سے آئی تھی۔

ان تنہا دنوں نے مجھے سمندر کے ساتھ موسم بہار کو منانے کا حوصلہ بخشا تھا جو باوجود تاخیر سے آنے کے تنہائی کے جشن کی ممکن تیاریوں میں تھا۔

موسم گرما میں بارش کا ایک قطرہ بھی نہیں برستا، زمین خشک، سنگلاخ پھٹی ہوئی جس میں سے گھاس کا ایک پتا بھی نظر نہیں آتا۔ سردیوں میں سمندری ہوا غصے سے نمک اور جھاگ بکھیرتی اور پھر فطرت ان خوفناک قوتوں کا شکار بنی مظلوم دکھائی دیتی۔

موسم بہار ایک وسیع و عریض زرد عمل سے شروع ہوتا ہر شے ان گنت ننھے منے زرد پھولوں سے ڈھک جاتی۔ یہ ننھی طاقتور فصل پہاڑی ڈھلانوں پر پھیلتی۔ چٹانوں پر دائرے بناتی اور سمندر کی طرف بڑھتی اور ہمارے روزمرہ کے راستوں میں اچانک نمودار ہو جاتی۔ بالکل جیسے وہ ہمیں، وہاں اپنے ہونے کے بارے میں مطلع کرنا چاہتی ہو۔

ان پھولوں، کو اتنے طویل عرصے تک ایک نہ نظر آنے والی زندگی کو برداشت کرنا پڑا تھا، بنجر زمین کی جانب سے بے جان افکار نے ان پھولوں کو اتنی مدت تک اندر رکھا کہ اب وہ اپنی زرد کثرت کے لئے مناسب جگہ نہیں پاتے۔

پھر ننھے زرد پھول جل جاتے ہیں اور ہر شے گہرے کاسنی رنگ میں چھپ جاتی۔ موسم بہار کا دل زرد سے نیلا اور پھر سرخ میں بدل جاتا کس طرح ننھے (Corolla) کے پھول ایک دوسرے کی جگہ لیتے ہیں؟ ہوا ایک رنگ کو ایک روز ہلاتی ہے اور دوسرے رنگ کو دوسرے دن، جیسے بہار کے قومی رنگ تنہا پہاڑیوں میں بدلتے رہتے ہیں اور مختلف جمہوریائیں ان کے بڑھتے ہوئے جھنڈوں کی موافقت کرتی ہیں۔ سال کے اس وقت کیکٹس ساحل پر کھل اٹھتا ہے۔

اس علاقے سے بہت دور اینڈیز کی چٹانوں پر کیکٹس کے دیووں جیسے درخت کانٹوں بھری شاخوں کے ساتھ دشمن کی سپاہیوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف ساحل سمندر پر موجود کیکٹس چھوٹے اور گول ہیں۔ میں نے انہیں سرخ کلیوں سے سجے دیکھا ہے بالکل جیسے کوئی ہاتھ وہاں خون کے قطرے چھوڑ گیا ہو۔ ایک جذباتی خراج۔ پھر وہ کھل جاتی ہیں۔ سمندر کی بڑی سفید ٹوپیوں کا سامنا کرتے ہوئے ہزارہا کیکٹس اپنے کھلے ہوئے پھولوں کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ گھر پر قدیم (Centry) کے پودے نے اپنی خودکشی کا اندازہ خود اپنی ذات کے نہاں خانے سے حاصل کیا ہے۔ یہ بھرا ہوا دیوقامت پودا جو نیلے اور زرد رنگ کا ہے، میرے گھر کے دروازے کے نزدیک دس برس سے موجود ہے اور اب میرے قد سے بڑھ گیا ہے۔ اب یہ محض مرنے کے لئے پھول دے رہا ہے۔ اس نے ایک طاقتور نیزہ تیار کیا تھا۔ جس کی بلندی سات میٹر تک پہنچ کر خوش رنگ پھولوں کے گچھوں میں جن پر سنہری گرد جمی تھی۔ پھنس جاتی تھی پھر عظیم

(Agave amenicga) کے پتے مرجھائے اور مر گئے۔ یہاں مرتے ہوئے پھول کے قریب ایک اور دیو قامت پھول پیدا ہونے والا ہے۔ میرے ملک کے باہر کوئی بھی اسے نہ جان پائے گا۔ یہ پھول محض انٹارکٹک کے ساحلوں پر بڑھتا ہے اس کا نام (Chahual) ہے آراکینیا کے باشندے اس قدیم پھول کی پرستش کرتے تھے۔ جواب موجود نہیں خون، موت، وقت اور بعد میں (Alonso de Ercilla) کے رزمیہ گیتوں نے قبیلے کی قدیم تاریخ کو (جو اس مٹی سے بنی تھی، جسے ارضیات کے خوابوں نے اپنے مسخر ملک کے دفاع کو بیدار کرنا تھا) بند کر دیا تھا۔

جب میں صدیوں کے مبہم مردوں اور بھلائے جانے والے خون آلود پتوں میں اس کے پھولوں کو دوبارہ بڑھتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ زمین کا ماضی اس سب کے باوجود کہ جو کچھ ہم ہیں یا جو کچھ ہم بن چکے ہیں، دوبارہ کھل اٹھتا ہے محض زمین خود اپنی فطرت کو محفوظ کئے چلی جاتی ہے لیکن میں اس پھول کو بیان کرنا بھول گیا ہوں یہ (Bromeliacea) کا پھول ہے، جس کے پتے آری جیسے تیز دندانے رکھتے ہیں۔ سڑک کے اطراف میں، اپنی پراسرار زمردی تلواروں کو سجائے ہوئے یہ سبز آگ کی طرح پھیلتا ہے۔ اور اچانک ایک بڑا پھول ایک گچھا اس کی کمر پر پیدا ہوتا ہے۔ ایک عظیم سبز گلاب، ایک آدمی کی قامت کے برابر ــــ یہ واحد پھول جو ننھے ننھے پھولوں سے مل کر ایک بڑے سبز کلیسا میں ڈھلتا ہے اور سنہرے زرگل سے سج کر سمندر کی روشنی میں کھل اٹھتا ہے۔ اپنی جسامت میں اتنا بڑا یہ واحد سبز پھول، جسے میں نے کبھی دیکھا ہے، لہ... کے لئے ایک تنہا یادگار ہے ــــ

میرے ملک کے کسان اور مچھیرے، عرصہ ہوا چھوٹے پودوں کے نام بھول چکے اور یوں ننھے پھولوں کا اب کوئی نام نہیں۔ وہ آہستہ آہستہ ان کے ناموں کو بھول گئے اور پھول بتدریج اپنا افتخار کھو بیٹھے یہ سب باہم اکٹھے ہو گئے اور گمنام بن گئے، ان پتھروں کی مانند، جنہیں دریا انیڈیز کی برف پوش چوٹیوں سے ساحل کے مختلف حصوں تک لے آتے ہیں۔ کسان مچھیرے، کان کن اور سمگلر، اپنی ہار، فرائض کی بجا آوری اور موت کے تسلسل تک اپنی سخت زندگی سے بجے رہے۔ غیر دریافت شدہ علاقوں میں سورما بننا گمنامی میں جانے والی بات ہے۔ یہ علاقے اور ان کے گیت صرف گمنام خون اور ان پھولوں سے روشن ہیں، جن کے ناموں کو کوئی نہیں جانتا ان پھولوں میں سے ایک وہ پھول ہے، جس نے میرے سارے گھر پر حملہ کر رکھا ہے۔ یہ نیلے رنگ کا پھول، جس کی لمبی مغرور ڈالی لچک دار اور سخت ہے۔ اس کی پھننگ پر ننھے ننھے نیلگوں پھول دل کی شکل میں ملتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ کیا تمام انسانوں کو لطیف ترین نیلا رنگ دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

کیا یہ رنگ باقی دوسروں سے چھپا رہتا ہے۔ اور نظر نہیں آتا کیا کسی نیلے دیوتا نے انہیں

اس کے نظارے سے ممنوع رکھا ہے؟ یا یہ صرف میری خوشی ہے، کہ اپنی تنہائی میں مل کر جو فخر میں منتقل ہو چکی ہے۔ کہ اس نے اس جنوبی نیلی لہر اور اس بہار میں نیلے ستارے کو تلاش کر لیا ہے۔

آخر میں، میں (Docas) کا ذکر کروں گا. میں نہیں جانتا کہ یہ پودے کہیں اور بھی وجود رکھتے ہیں۔ لکھو کھا کی تعداد میں یہ اپنی تتلیئی انگلیوں کو ریت پر گھسیٹتے ہیں۔ بہار ان سبز ہاتھوں اور عنابی رنگ کے جواہرات کو بھر دیتی ہے۔ ان پھولوں کا یونانی نام (Aizoaceac) ہے۔

ازلاینگرا کا حسن، بہار کے ان آخری دنوں میں یہی پھول ہیں جو سمندر سے کسی حملے کی مانند، سمندر کے سبز غار سے، بالکل ساگر دیوتا (نیپنون) کے اپنے شراب کے تہہ خانے سے جمع شدہ سرخ گچھوں سے حاصل شدہ عرق کی طرح نکلتے ہوئے بکھر جاتے ہیں۔

ریڈیو نے ابھی کسی یونانی شاعر کے نوبل انعام کو حاصل کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اخباری نامہ نگار جا چکے ہیں۔ منیلڈی اور میں آخر کار امن سے اکیلے رہ گئے ہیں۔ ہم نے پرانے دروازے پر بڑا تالا ہٹا دیا ہے۔ تاکہ کوئی معمول کے مطابق میرے دروازے پر بہار کی مانند اطلاع دیئے بغیر آ سکے۔ سہ پہر کے وقت سویڈن کے سفیر اپنی بیوی کے ہمراہ مجھے ملنے آتے ہیں۔ وہ میرے لئے بوتلوں اور متفرق لوازمات سے بھری ایک ٹوکری لاتے ہیں۔ یہ وہ نوبل انعام کے جشن کے لئے لائے ہیں۔ جو ان کی دانست میں میرے لئے یقینی ہے۔ ہم اداس ہوئے بغیر یونانی شاعر (Seferis) کے نام جام منسوب کرتے ہیں۔ جاتے وقت سفیر نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا کہ مجھے یقین ہے کہ اخبارات میرا انٹرویو لیں گے اور مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں. کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ (Seferis) کون ہے؟

"میں بھی اس کے بارے میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے" میں نے پوری دیانت سے جواب دیا۔

اس زمینی سیارے پر، ہر ادیب کی یہ خواہش ہو گی کہ وہ کبھی نوبل انعام حاصل کرے، چاہے وہ اس کا اعتراف کرتا ہے یا نہیں۔

لاطینی امریکہ میں بطور خاص، مختلف ممالک کے اپنے امیدوار ہوتے ہیں، جو اپنا پلان بناتے ہیں۔ اور ایک لائحہ عمل ترتیب دیتے ہیں۔ بعض ادیبوں کے لئے، وہ انعام کو کھو چکے ہیں، جنہیں حقیقتاً یہ انعام ملنا چاہئے تھا۔

(Romulo Gallegos) مثلاً ایک ادیب ہے، جس کی تخلیقات خاصی اور بہت شاندار ہیں۔ لیکن وینیزویلا تیل پیدا کرنے والا ملک ہے۔ دوسرے لفظوں میں دولت مند

ملک. اس لئے فیصلہ کیا گیا تھا کہ یہ وجہ اس کے انعام حاصل کرنے کے حق میں جانی چاہئے۔

سویڈن میں ایک سفیر کو مقرر کیا گیا تھا. جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ وہ (Gallegos) کے لئے یہ عزت حاصل کر سکے۔ سفیر کو ڈنر کے دعوت نامے دینے کی چھٹی تھی۔ سویڈیش اکادمی کے کارکنان کے کام کو اس نے ہسپانوی زبان میں چھپوا رکھا تھا۔ ان لئے دیئے لوگوں کے لئے یہ سب کچھ ضرورت سے زیادہ اور حساس رہا ہو گا۔

(Romulo Gallegos) کو کبھی پتہ نہ چل سکا کہ وینیزویلا کے سفیر کی بے جا صلاحیتوں نے اس ادبی توقیر کو اس سے چھین لیا تھا. جس کے لئے وہ انتہائی مناسب تھا۔

پیرس میں ایک مرتبہ مجھے کسی نے ایک اداس کہانی سنائی. جس میں ظالمانہ تمسخر موجود تھا۔ اس مرتبہ یہ (Paul Valery) کا معاملہ تھا اس کا نام فرانس کے سارے اخبارات میں نوبل انعام کے اہم ترین امیدوار کی حیثیت سے اچھالا گیا تھا۔ اس اعصابی تناؤ کو. جو اس خبر کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔ صبح کو سٹاک ہوم میں ایک بحث ہو رہی تھی۔ (Valery) علی الصبح اپنی چھڑی اور کتے کے ساتھ دیہاتی گھر سے باہر جا چکا تھا۔ وہ دوپہر کو جب سیر سے واپس گھر کھانے کو پہنچا اور دروازے کو کھولتے ہی اس نے اپنے سیکرٹری سے پوچھا۔

"کیا کسی نے فون کیا تھا؟"

"جناب چند منٹ پہلے سٹاک ہوم سے آپ سے کوئی بات کرنا چاہتا تھا"

"وہ کیا معلوم کرنا چاہتے تھے؟" اس نے یقیناً جذباتی ہوتے ہوئے پوچھا

"یہ ایک سویڈیش نامہ نگار تھا. جو عورتوں کے حقوق رائے دہی کی تحریک کے بارے میں آپ کے خیالات جاننا چاہتا تھا۔"

(valery) خود یہ لطیفہ طنزیہ انداز میں سنایا کرتا تھا. اور سچائی یہ ہے کہ عظیم شاعر کبھی بھی بڑا انعام وصول نہ کر سکا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے. کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں بہت محتاط نہ تھا میں نے ان خطوط کے بارے میں پڑھ رکھا تھا. جو میرے ملک کی اس خاتون نے اس انعام کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں، اپنی فطری خواہش کو بروئے کار لاتے ہوئے. اپنی حیثیت اور مرتبے کا خیال کئے بغیر مختلف سمتوں میں تحریر کئے تھے۔

جونہی مجھے علم ہوا کہ میرے نام کو بھی امیدوار کی حیثیت سے اچھالا جا رہا ہے (مجھے یاد نہیں کہ کتنی مرتبہ ذکر کیا گیا تھا) . میں نے سویڈن نہ جانے کا ارادہ کر لیا. حالانکہ یہ وہ ملک تھا. جو بچپن ہی سے میرے لئے بے پناہ کشش رکھتا تھا. جب میں نے اور (Tomas Lago) نے ایک خارج شدہ شرابی پروٹسٹنٹ وزیر جس کا نام (Costa Berung) تھا کو اپنا گرو مان لیا تھا۔

اس کے علاوہ، میں ہر سال اپنے امیدوار بنائے جانے اور انعام حاصل کرنے کے سلسلے سے تنگ آ چکا تھا۔ خود کو سالانہ مقابلے میں انعام پانے والوں کی فہرست میں دیکھ کر مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا جیسے میں ریس کا گھوڑا ہوں۔ دوسری طرف چلی کے کچھ مقبول ادیب، سویڈش اکادمی کی جانب سے اپنی طرف عدم دلچسپی کے رویئے سے خائف تھے۔ یہ ایک ایسی صورت حال تھی جو خطرناک حد تک بے تکے پن کی جانب، مائل تھے۔

آخر کار جیسا کہ سب کو علم ہے، مجھے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں، میں پیرس میں تھا، جہاں مجھے چلی کے سفیر کا عہدہ دیا گیا تھا ایک بار پھر میرا نام اخبارات میں ظاہر ہونا شروع ہوا، جس پر مجھے اور منیلڈی کو سخت غصہ آیا۔ ہم سالانہ مایوسی کے نتیجے میں بالکل بے حس ہو چکے تھے۔

اس سال اکتوبر کی ایک رات کو ہمارے سفارت خانے کا قونصلر (Jogre Edward) جو خود بھی مصنف تھا، میرے گھر، کھانے کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ شرط لگانے کا عادی تھا، لہٰذا اس نے مجھ سے فوراً یہ شرط لگائی کہ اگر مجھے نوبل انعام ملا تو میں اسے اور اس کی بیوی کو پیرس کے سب سے عمدہ ریستوران میں کھانا کھلاؤں گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو وہ مجھے اور منیلڈی کو کھانا کھلائے گا "مجھے منظور ہے، ہم تمہاری طرف سے ایک شاندار ضیافت کھائیں گے" میں نے کہا۔

جارج ایڈورڈ کی شرط کی خفیہ منطق اگلے دن ظاہر ہونا شروع ہوئی۔ مجھے پتہ چلا کہ اس کی کسی دوست نے جو سٹاک ہوم میں صحافی اور ادیب ہے۔ اس نے فون پر جارج کو بتایا تھا کہ اس مرتبہ پابلو نرودا کے نوبل انعام کو پا لینے کے تمام مواقع ہیں۔ دور دراز سے اخباری نمائندوں نے فون کرنے شروع کر دیئے بیونس آئرز میکسیکو اور سب سے بڑھ کر اسپین سے جہاں یہ ایک اندیشہ دور دراز تھا۔

قدرتی طور پر، میں نے کسی بھی قسم کے بیان دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن ایک بار پھر میرے شکوک نے سر ابھارنا شروع کر دیا۔ اس شام میرا واحد سویڈش دوست (Artur Lundkvist) جو ایک ادیب تھا اور اکادمی میں تین چار سال تک رہ چکا تھا، مجھ سے ملنے آیا وہ سویڈن سے جنوبی فرانس کے دورے پر آیا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد، میں نے اسے اس مصیبت کے بارے میں بتلایا جس سے میں دو چار تھا اور دور دراز کے اخباری نمائندوں کو جو، میرے انعام کے بارے میں پہلے ہی سے تہیہ کر چکے تھے، جواب دینے پڑتے تھے

" آرتر میں تم سے اتنی مدد چاہتا ہوں " میں نے کہا " کہ اگر یہ سچ ہے تو میں اخبارات میں شائع ہونے سے قبل اسے جاننا چاہوں گا میں (Salvador Allende) کو جس سے پہلے ہی میری بہت سی لڑائیاں مشترک رہی ہیں۔ یہ خبر سنانا چاہتا ہوں. جس کو سن کر یقیناً وہ بے حد خوش ہو گا۔

آرتر نے جو ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھا. مجھے سنجیدگی سے دیکھا اور کہنے لگا " میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔ اگر کوئی بات ہے تو سویڈن کا بادشاہ. تمہیں اس کی اطلاع برقیہ سے دے گا یا پھر پیرس میں سویڈن کا سفیر تمہیں یہ خبر پہنچائے گا۔ " یہ اکتوبر کی انیس یا بیس تاریخ تھی۔ اکیس کی صبح کو سفارت خانے کے بیرونی کمرے اخباری نمائندوں سے بھرنے شروع ہو گئے۔ سویڈن جرمنی، فرانس اور لاطینی امریکہ کے ٹیلی ویژن کے عملے میری خاموشی پر بے چین تھے ـــــ یہ سب صحیح اطلاع کے نہ ہونے کے باعث تھا. جس سے صورت حال کے بگڑنے کا اندیشہ تھا۔

ساڑھے گیارہ بجے سویڈن کے سفیر نے مجھے فون پر وجہ بتائے بغیر کہا کہ میں اس کا استقبال کروں گا۔ اس سے صورت حال میں کوئی بہتری نہ ہوئی کیونکہ انٹرویو تقریباً دو گھنٹے بعد تک نہ ہو سکے گا ٹیلی فون کی گھنٹی ہسٹریائی انداز میں بجتی رہی ـــــ

پھر پیرس کے ایک ریڈیو اسٹیشن نے خبر سنائی خبروں کے آخری بلیٹن میں ۱۹۷۱ء کے نوبل انعام کا اعلان کیا گیا تھا جو چلی کے شاعر پابلو نرودا کو دیا گیا تھا۔ میں فوراً ہی نیچے جمع شدہ میڈیا کے نمائندوں سے ملنے چلا گیا خوش قسمتی سے اسی وقت میرے پرانے دوست (Aragon اور (Jean Marcenac) وہاں نظر آ گئے۔ (Marquez) ایک فرانسیسی شاعر نے جو بھائیوں جیسا تھا۔ خوشی کے مارے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ان دونوں حضرات نے اخباری نمائندوں سے میرے مشکل امتحان میں مدد کی۔

میں ان دنوں ایک آپریشن کی بعد کی حالت سے گزر رہا تھا۔ خون کی کمی اور کانپتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ، میں زیادہ حرکت کرنے کا متحمل نہ تھا۔ اس شام کھانے پر میرے دوست موجود تھے۔ اٹلی سے (Matta) میکسیکو سے (Siqueiros) بار سیلونا سے (Garcia Marq uez) - کاراکاس سے (Miguelotero Sigma) خود پیرس سے (Artuso Ramirez اور چلی کا (Carlos vasauo) روم سے یہاں آیا تھا. جسے میرے ہمراہ سٹاک ہوم جانا تھا۔ برقیوں کی تعداد بڑھ کر ایسے پہاڑ بن گئی کہ آج تک میں انہیں نہ دیکھ سکا، نہ ہی ان کے جواب دے سکا ان گنت خطوط جو مجھے ملے. ان میں سے ایک بے حد بے تکا اور بیہودہ تھا۔ یہ خط ہالینڈ سے کسی

سیاہ فام باشندے نے لکھا تھا جس کا اظہار خط سے منسلک ارسال کردہ اخبار کی ایک خبر تھی۔ جس میں تحریر تھا۔

"میں برٹش گنی (جارج ٹاؤن) سے نو آباد کاروں کے خلاف تحریک کا نمائندہ ہوں، میں نے سٹاک ہوم میں ہونے والی نوبل انعام کی تقریب میں شرکت کے لئے اجازت نامے کی درخواست کی تھی مجھے سویڈیش سفارت خانے سے اطلاع ملی ہے کہ اس موقع کے لئے شام کا لباس بے حد ضروری ہے۔ ٹیل کوٹ خریدنے کے لئے میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور کرائے پر لیا ہوا کوٹ میں نہیں پہنوں گا۔ امریکہ کے ایک آزاد باشندے کے لئے کرائے پر لیا ہوا کوٹ پہننا کرشان ہو گا، لہٰذا میں تمہیں مطلع کر رہا ہوں کہ جو تھوڑی بہت رقم میرے پاس ہے اس سے میں سٹاک ہوم تک سفر کروں گا اور وہاں بادشاہت کے خلاف پریس کانفرنس منعقد کر کے اس تقریب کے غیر مقبول کردار کی مخالفت کروں گا۔ باوجودیکہ یہ تقریب دنیا کے سامراج دشمن مقبول شاعروں کی عزت افزائی کے طور پر منعقد کی جا رہی ہے۔"

نومبر میں مینڈی اور میں نے سٹاک ہوم کا سفر کیا کچھ پرانے دوست ہمارے ساتھ تھے۔ پر آسائش گرینڈ ہوٹل میں ہمیں قیام کے لئے ٹھہرایا گیا تھا، ہوٹل کے کمروں کی کھڑکیوں سے ہم خوبصورت سرد شہر اور شاہی محل کو دیکھ سکتے تھے۔ اسی ہوٹل میں سال رواں کی دوسری اہم شخصیات، جنہیں فزکس، کیمسٹری اور میڈیسن میں نوبل انعام ملنا تھا، ٹھہری ہوئی تھیں۔ ان کے علاوہ کچھ دوسری ممتاز شخصیات، جن میں سے کچھ بے حد پر تکلف اور دوسری مکینکوں جیسی سادہ، جنہیں اتفاق نے ان کی ورکشاپوں سے یہاں پہنچا دیا تھا۔ جرمنی کا چانسلر (Willy Brandt) جسے امن کا نوبل انعام ملنا تھا اس ہوٹل میں مقیم نہ تھا۔ نوبل انعام پانے والوں میں وہ واحد شخصیت تھی، جس سے ملنے اور بات کرنے میں مجھے دلچسپی تھی۔ بعد میں میں اسے ایک تقریب میں دیکھ سکا، جہاں ہمارے مابین ہمیشہ تین چار لوگ موجود رہے۔

اس عظیم تقریب کے لئے ہماری مشقوں کے کئی دور رہے اور سویڈش روایت نے ہمیں وہیں مشق کرنے دیا، جہاں تقریب کا انعقاد ہونا تھا۔ یہ دیکھنا واقعی مضحکہ خیز تھا کہ بے حد سنجیدہ قسم کے لوگ اپنے بستروں سے وقت مقررہ پر نکل کر باقاعدگی سے ایک خالی عمارت میں جاتے بہت سی سیڑھیاں کسی قدم پر رکے بغیر چڑھتے دائیں بائیں ہاتھ پر ایک نظم کے تحت مارچ کرتے اور اسٹیج پر موجود ان کرسیوں پر بیٹھ جاتے، جہاں تقریب کے روز ہمیں بیٹھنا تھا یہ سب کچھ ٹیلی ویژن کیمروں کا سامنا کرتے ہوئے ایک بے حد عظیم خالی ہال میں ہو رہا تھا۔ جہاں شاہی خاندان اور بادشاہ کی نشست خالی تھیں۔ یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہ آ سکی کہ آخر کیوں سویڈیش ٹیلی ویژن والے ان

اناڑی ایکٹروں کی کی گئی مشقوں کی فلم بنانے میں مصروف تھے جس روز انعام دیا جانا تھا وہ دن (St.Lucia) کے تہوار کی تقریبات سے شروع ہوا۔ میں ہوٹل کی راہ داریوں میں ہونے والے نقرئی قہقہوں اور آوازوں کے شور سے بیدار ہو گیا تھا____

پھر سنہرے۔ بالوں والی اسکینڈے نیوئین خادمائیں سروں پر پھول سجائے چہروں پر شمعوں کی روشنی میں نہائے میرے کمرے میں چلی آئیں وہ میرے لئے ناشتہ اور ایک تحفہ اپنے ساتھ لائیں تھیں۔ یہ سمندر کی ایک بے حد خوبصورت پینٹنگ تھی۔

کچھ دیر بعد ایسا ہوا، جس نے سٹاک ہوم کی پولیس کو ہوشیار کر دیا میرے لئے ہوٹل کے استقبالیہ پر ایک خط موجود تھا۔ اس پر جارج ٹاؤن کے نو آبادیاتی نظام کے مخالف کے دستخط تھے۔

"میں سٹاک ہوم پہنچ گیا ہوں" اس خط میں تحریر تھا۔ اس کی پریس کانفرنس کے انعقاد کا ناکام ہو چکا تھا، لیکن انقلابی انسان ہونے کے ناطے، وہ کوئی اقدام کرنے والا تھا۔ یہ ممکن نہیں ہو سکتا تھا کہ مظلوم اور دھتکارے ہوؤں کا شاعر پابلو نرودا نوبل انعام ٹیل کوٹ پہن کر وصول کرے بالاخر اس نے قینچی خریدی ہے، جس سے وہ ٹیل کوٹ یا کسی بھی بڑھی ہوئی چیز کو کاٹ دے گا "میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں اور تمہیں متنبہ کرتا ہوں، جب تم کسی سیاہ فام کو ہال کی آخری نشستوں پر قینچی لئے بیٹھا دیکھو، تو تم سمجھ سکتے ہو کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔"

میں نے وہ دلچسپ خط سویڈش مہمان داری کے اس جوان سفارت کار کے حوالے کر دیا، جسے میرے ساتھ منسلک کیا گیا تھا اور وہ میرے کام کا خیال رکھتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس خبطی کا ایک خط میں پہلے ہی پیرس میں وصول کر چکا ہوں اور ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔

جوان سفارت کار نے اس سے اتفاق نہ کیا۔

"اس وقت اس قسم کے جنونیوں سے کچھ بھی ہو سکتا ہے، یہ میرا فرض ہے کہ میں سویڈش پولیس کو مطلع کروں"۔

اس نے کہا اور اپنے فرائض کی بجا آوری کے لئے ہوا ہو گیا۔

مجھے بتا دینا چاہئے کہ (Miguel Otero Silva) ان لوگوں میں سے تھا، جو میرے ہمراہ سٹاک ہوم گیا تھا۔ یہ ایک اہم ناول نگار اور عمدہ شاعر تھا۔ مگوئیل محض امریکی ضمیر کا نمائندہ ہی نہیں بلکہ ایک لاثانی دوست بھی تھا۔ تقریب کے شروع ہونے میں چند گھنٹے رہ گئے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے دوران، میں نے اس واقعے کے بارے میں سویڈش سرگرمی کا ذکر کر دیا۔ مگوئیل

نے جو ہمارے ساتھ کھانا کھا رہا تھا اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا "کیوں میں نے تمہیں وہ خط اپنے ہاتھ سے لکھا پابلو، میں تو تم سے مذاق کر رہا تھا، ہم کیا کریں گے، اس پولیس کے بارے میں، جو ایک حقیقت کو ڈھونڈ رہی ہے اور جس کا کوئی وجود نہیں" کریبین کے اس وحشی شخص کے ضمن میں، پولیس اس مذاق پر تمہیں جیل لے جائے گی" میں نے اس سے کہا اور جارج ٹاؤن کے شخص کے بدلے میں تمہیں سزا ملے گی۔"

اس لمحے جوان سفارت کار حکام کو مطلع کر کے واپس پلٹا اور کھانے کی میز پر ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ میں نے اسے سارے واقعہ کے بارے میں بتایا۔

"یہ محض ایک لطیفہ تھا اور اس کا مصنف اس وقت ہمارے ساتھ دوپہر کے کھانے میں شامل ہے۔"

وہ ایک بار پھر باہر چلا گیا۔

پولیس پہلے ہی سٹاک ہوم کے سارے ہوٹلوں میں جارج ٹاؤن سے آنے والے سیاہ فام کی تلاش میں تھی، اور انہوں نے کسی احتیاط کو ہاتھ سے نہ جانے دیا تھا۔

جب ہم تقریب میں شرکت کے لئے پہنچے اور جو تقریب کے ہال سے باہر نکلے تو مینڈی اور میں نے دیکھا کہ معمول کے نگہبانوں کے بجائے زرد بالوں والے چار پانچ ہٹے کٹے جوان شخص ہماری حفاظت کے لئے ہماری جانب لپکے۔ قینچی کے بچاؤ کے محافظ

نوبل انعام کی رسم میں سارا مجمع بے حد منظم اور پرسکون تھا جو مناسب موقعوں پر خوشی کا اظہار کرتے۔ بوڑھے بادشاہ نے ہم سے مصافحہ کیا، سند، تمغہ اور رقم کا چیک عطا کیا اور ہم اسٹیج پر اپنی مخصوص نشستوں پر واپس آ بیٹھے، جو مشقوں کے وقت کی طرح گندی نہ تھیں بلکہ اب پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھیں وہ کہتے ہیں (یا شاید مینڈی کو متاثر کرنے کے لئے کہا) کہ بادشاہ نے دوسرے انعام پانے والی شخصیتوں کے مقابلے میں مجھے زیادہ وقت دیا تھا اور میرے ہاتھ کو دیر تک اپنے ہاتھ میں دوستی کے جذبے میں تھامے رکھا شاید یہ محل کی جانب سے قدیم مہربانی کی گیارھویں سے تیرھویں صدی کی کوئی یاد تھی۔ بہرطور کسی اور بادشاہ نے میرے ہاتھ سے زیادہ یا تھوڑی دیر کے لئے بھی مصافحہ نہیں کیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تقریب میں، جو سخت روایتی انداز میں منعقد ہوئی ہے بے حد شان دار تھی۔ شاید دنیا میں شان و شوکت اہم موقعوں پر ہمیشہ موجود رہے گی۔ انسانوں کو اس کی ضرورت ہے۔

لیکن مجھے اہم شخصیات کا اس تقریب میں انعام لیتے ہوئے مارچ کرتے دیکھنا، چھوٹے

قصباتی اسکولوں میں، بچوں کی تقریب انعامات سے بے حد مماثل نظر آیا۔

چلی چیکو (Chile Chico)

میں (Puerto Ibanez) سے عظیم جھیل (Carrera) کو دیکھ کر اس کے سحر میں گرفتار واپس لوٹ رہا تھا۔ اس کے دھات جیسے پانیوں سے مبہوت ـــ فطرت کا تشنج جس کا صرف کیوبا میں (Varadero) کے قریب زمردی نیلگوں سمندر سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے یا پھر ہمارے اپنے قصبے (Petrohue) سے

اور پھر وحشی دریائے (Ibanez) کی آبشار اپنی بھرپور سہمناک عظمت کے ساتھ۔ نواحی قصبوں کے لوگوں کی غربت اور تنہائی نے بھی مجھے لرزا کر رکھ دیا تھا، جو توانائی کے دیو قامت منبع کے نزدیک ہونے کے باوجود بجلی کی سہولت کے بغیر لاتعداد بھیڑوں کے درمیان چیتھڑوں میں ملبوس زندگی گزار رہے تھے۔

میں بالاخر چلی چیکو آگیا تھا۔

وہاں دن کے اختتام پر وسیع شفق میری منتظر تھی۔ ہمیشہ موجود رہنے والی ہوا بادلوں کو لہروں کی طرح کاٹ رہی تھی۔ روشنی کے دریاؤں نے ایک بہت ٹکڑے کو جسے ہوا نے آسمان اور زمین کے مابین روکا ہوا تھا تنہا کر دیا تھا۔ مویشیوں کی چراگاہیں اور کھیت کھلیان قطبی دباؤ کے زیر اثر ہوا سے جدوجہد کر رہے تھے۔

زمین ہر سمت سے گھوم کر (Roca Castillo) کے چٹانی مینار میں تبدیل ہو گئی تھی۔ چبھتی ہوئی نوکیں۔ گوتھک مخروطی مینار فطرت کی سنگلاخ فصلیں

(Aysen) کے دائروں جیسے گول پہاڑ بلند اور میز کی مانند مسطح برف کی مستطیلوں اور مثلث کو نمایاں کر رہے تھے۔ اور آسمان اپنی شفق پر ریشم اور دھات سے اثر انداز تھا آسمان میں زردی ایک بڑے پرندے کی طرح فضا میں معلق تھی۔ ہر شے ایک اچانک تبدیلی کے تحت وھیل مچھلی کے منہ میں ڈھل رہی تھی ایک آتشیں چیتا، دھکتی ہوئی مجرد شکلیں۔

مجھے اپنے سر پر وسعت پھیلی ہوئی محسوس ہوئی، جسے مجھے (Aysen) چمکتے ہوئے پہاڑی سلسلے کو دکھانا مقصود ہو۔ اس کی پہاڑیوں کی انمول آبشاریں، لکھوکھا مردہ درخت اپنے قاتلوں کو الزام دیتے ہوئے اور ایک ایسی دنیا جسے ابھی زمین کے لئے پیدا ہونا ہے۔

لیکن کچھ غائب تھا۔ احسان، باہمی تنظیم، گھر، انسان وہ جوان دشوار منطقوں میں رہتے ہیں انہیں ایک مشترک رشتے کی ضرورت ہے اتنی بڑی جتنی ان کے گرد حصار ہے۔

میں چل پڑا کہ شفق کی روشنی مدھم ہو رہی تھی اور رات نیلاہٹ پر چھا رہی تھی۔

ستمبر کے پرچم

لاطینی امریکہ کے جنوبی براعظم میں ستمبر پھولوں کا مہینہ ہے یہ مہینہ پرچموں کا مہینہ بھی ہے۔

گزشتہ صدی کے اوائل (۱۸۱۰) کے ماہ ستمبر میں ہسپانوی اقتدار کے خلاف جنوبی امریکہ کے بہت سے حصوں میں اجتماعی بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔

ستمبر کے مہینے میں، ہم جنوبی امریکہ کے رہنے والے آزادی کا جشن مناتے ہیں اور اپنے سورماؤں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور بہار کا استقبال کرتے ہیں۔

جو دور دراز تک پھیلتی ہوئی آبنائے میگیلان (Strait of Magellan) اور نیچے جنوبی (Patagonia) اور کیپ ہارن تک کھل اٹھتی ہے انقلابات کی باقاعدہ کڑی، جو میکسیکو سے شروع ہوئی اور ارجنٹینا اور چلی تک پہنچی دنیا بھر کے لئے بے حد اہم تھی۔

رہنما مختلف تھے۔ (Bolivar) جنگجو اور درباری، ایک پیغمبر کی سی ذہانت سے نوازا ہوا تھا۔ (San Martin) کسی فوج کے منتظم سے متاثر تھا، جس نے سیارے کے بلند ترین اور سب سے دشوار پہاڑی سلسلے کو عبور کر کے چلی کی آزادی کی جنگیں لڑی تھیں۔

(Jose Miguel Carrera) اور (Bernardo Ohiggins) جنہوں نے چلی کی سب سے پہلی فوجوں کو منظم کیا تھا اور اولین چھاپہ خانوں کے موجد تھے، انہوں نے ہی غلامی کے خلاف پہلے قوانین بنائے۔ غلامی جو چلی میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے پہلے ختم ہو گئی تھی۔

(Bolivar) اور دوسرے آزادی پسند (Carrera) اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طبقے کے مفادات امریکہ میں دوسرے ہسپانویوں سے متصادم ہوئے۔ عوام ایک منظم حیثیت کی بجائے ہسپانوی حکومت کی ملازمت میں مشروط نوکر تھے۔

بولیوار اور کریرا جیسے انسانوں کو، جو انسائیکلوپیڈیا کے پڑھنے والے اسپین کی فوجی اکادمیوں کے طالب علم تھے تنہائی اور لاعلمیت کی دیوار کو گراتے ہوئے قومی ولولے کو انگیخت کرنا تھا۔

کریرا کی زندگی روشنی کی مانند مختصر اور چمکدار تھی (The Unfortonate Hussler) اس کتاب کا نام ہے جو میں نے اس کے بارے میں کچھ سال پہلے شائع کی تھی۔ اس کی دلچسپ شخصیت اس کے سرپر مخالفوں کو ایسے سوار کرتی، جیسے طوفان میں روشنی کا ڈنڈا شعلے بکھیرتا ہے۔ آخر وہ ارجنٹینا کی نومولود جمہوریہ میں حکمرانوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا۔ ہسپانوی استبداد کو الٹ

دینے کی اس کی خواہش نے اسے ارجنٹنا کے (Pampas) کے جنگلی انڈین قبائل کے سر پر بٹھا دیا تھا۔ اس نے بیونس، آئرز کا محاصرہ کر رکھا تھا اور قریب تھا کہ اسے فتح کرے۔ لیکن در حقیقت وہ چلی کو آزاد کرانا چاہتا تھا اور جنون کی حد تک اسی کوشش میں، اس نے قبل از وقت خانہ جنگی اور گوریلا طرز کی لڑائیوں کو شروع کر دیا، جو اس کی موت پر منتج ہوئیں۔ ان متلون برسوں میں انقلاب اپنے عظیم اور بہادر سپوتوں کو کھا گیا تاریخ اس خونی کارنامے کے لئے (Ohiggins) اور (Sa nmartin) کو مورد الزام ٹھہراتی ہے۔

بہرطور ستمبر کے مہینے کی تاریخ ــــ بہار اور پرچموں کا مہینہ ــــ وسیع Pampas اور جنگوں کے لافانی، برفانی تناظر میں اپنے پروں سے تین سورماؤں کی یادوں کو ڈھکتی ہے۔

اوہگنز چلی کا ایک اور جیالا آزادی کا متوالا اور نیک انسان تھا۔ اس کی زندگی پر امن گمنامی میں رہ جاتی اگر وہ لندن کے قیام میں جب وہ خود سترہ برس کا تھا، ایک بوڑھے انقلابی سے نہ مل لیتا جو امریکی آزادی کی خاطر تمام یورپ کے دریاؤں میں پھرتا رہا اس شخص کا نام (Don Franci sco de Miranda) تھا اور بہت سے دوستوں میں سے اسے روس کی ملکہ کیتھرائن کی شفقت حاصل تھی وہ پیرس روسی پاسپورٹ پر پہنچا تھا اور یورپ میں دوسرے تمام سفارتی دروازے اس پر کھلے ہوئے تھے۔

یہ ایک ایسی محبت کی کہانی ہے، جس میں ایک ایسے عہد کی ہوائیں شامل ہے جیسے اوپرا کی آواز اوہگنز ہسپانوی وانسرائے کا حقیقی بیٹا تھا، جو آئرش النسل اور قسمت کے دھنی ہونے کے ساتھ چلی کا گورنر بنا تھا۔ میرانڈا نے اوہگنز کی زندگی کا بغور مطالعہ کرنے کے بارے میں اس وقت سوچ لیا تھا، جب اسے احساس ہوا تھا کہ اس جوان انسان کا امریکہ میں ہسپانوی نو آبادیوں کے خلاف انقلابی تحریکوں میں استعمال کار آمد ثابت ہو گا۔

کسی نے وہ کہانی سنا دی تھی، جس لمحے میرانڈا نے نوجوان اوہگنز کو اس کی پیدائش کے راز سے آگاہ کیا تھا اور اسے مزاحمت کے عمل میں ڈبو دیا تھا۔ نوجوان انقلابی نے اپنے گھٹنوں پر گر کے میرانڈا کے گرد ہتھیار ڈال دیئے تھے اور سسکیوں میں اپنے وطن چلی جانے کا وعدہ کرتے ہوئے عہد کیا تھا، کہ وہاں موجود ہسپانوی طاقت کے خلاف باغیوں کی رہنمائی کرے گا۔

اوہگنز ہی وہ فرد تھا، جس نے نو آبادیاتی حکمرانوں کے خلاف آخری جنگیں جیتیں اور جسے ہماری جمہوریہ کا بانی سمجھا جاتا ہے میرانڈا کو ہسپانویوں نے قید کر لیا تھا، جو Cadiz کی خوفناک جیل (La Carraca) میں مر گیا۔ انقلاب فرانس کے اس سابق جنرل اور انقلابیوں کے استاد کے جسد خاکی کو ایک بوری میں بند کر کے جیل خانے کی بلند دیوار سے سمندر میں پھینک دیا گیا تھا۔

اپنے وطن کے لوگوں سے جلاوطن ہو کر سان مارٹن ایک تنہا بوڑھے انسان کی طرح فرانس (Boulogne-Se-Mel) میں مرا او، ہگنز چلی کو آزادی دلانے والا، پیرو میں ہر اس شے سے دور جسے وہ چاہتا تھا، جاگیردار طبقے (Creole) کے باعث تارک الوطن ہو کر مر گیا اور جلد ہی جاگیردار طبقہ انقلاب پر حاوی آ گیا (Lima) سے جاتے ہوئے پیرو کے تاریخ کے میوزیم میں مجھے جنرل او، ہگنز کی اس کے آخری برسوں کی بنائی ہوئی کچھ تصاویر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان تمام تصویروں کا موضوع چلی نظر آتا ہے۔ اس نے اپنی تصویروں میں چلی میں موسم بہار کو دکھایا تھا۔ ستمبر کے پھول اور پتے اس ستمبر میں، میں ان ناموں کو یاد کرنے بیٹھا ہوں۔ وہ رائیگاں محبتیں اور انقلاب کے عہد کے وہ دکھ اور مصائب

ایک صدی کے بعد عوام پھر اٹھ رہے ہیں۔ غصے اور ہوا کی متلون لہر پرانے پرچموں کو لہرا رہی ہے۔

ان گزرے ہوئے برسوں کے بعد سے ہر شے بدل چکی ہے، لیکن تاریخ اپنے راستے پر گامزن رہتی ہے اور ایک نئی بہار ہمارے امریکہ کی نا ختم ہونے والی فضاؤں کو بھر دیتی ہے۔

لوئیس کارلوس پریسٹیز (Luis Carlos Prestes)

امریکہ میں کسی بھی اشتراکی رہنما کی زندگی اتنی غیر معمولی اور خطرناک نہیں رہی ہو گی۔ جیسی زندگی (Luis Carlos Prestes) نے گذاری یہ برازیل کا سیاسی اور فوجی ہیرو تھا اس کی بچی زندگی اور روایت زمانہ ہوا نظریاتی حدود کو پار کر گئی تھی، اور وہ گزرے ہوئے زمانے کے سورماؤں کی جیتی جاگتی تصویر بن گیا ہے۔ اور اس طرح جب مجھے ازلانگیرا میں برازیل کا دورہ کرنے، اور پریسٹیز سے ملنے کا دعوت نامہ ملا تو میں نے اسے فوراً ہی قبول کر لیا۔ اس کے علاوہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ کوئی اور غیر ملکی وہاں مدعو نہیں کیا گیا تھا، جس سے میں اور بھی خوش ہوا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میں مرنے والوں کے دوبارہ زندہ ہونے کی تقریب میں شرکت کر رہا تھا۔

پریسٹیز کو دس سال کی قید و بند کی صعوبت کے بعد آزاد کر دیا گیا تھا آزاد دنیا میں اس وضع کی طویل قید محض اتفاقی بات نہ تھی۔ میرے شاعر دوست ناظم حکمت نے ترکی کی جیل میں چودہ برس کاٹے تھے جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو چھ یا سات اشتراکیوں کو پیراگوئے میں بیرونی دنیا سے ہر قسم کے رابطے سے کاٹ کر بارہ برس کے لئے قید کر دیا گیا ہے۔ پریسٹیز کی جرمن نژاد بیوی کو برازیل کی استبدادی حکومت نے گسٹاپو کے حوالے کر دیا تھا۔ نازیوں نے اس کو بحری جہاز

میں، جو اسے شہادت کی طرف لے جارہا تھا پابند سلاسل کر رکھا تھا۔ اس خاتون نے ایک بچی کو جنم دیا تھا، جو ناقابل شکست لیڈر کی ماں (Dona Prestes) کی وجہ سے گستاپو کے شکنجے سے بچ سکی اور آج کل اپنے باپ کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔

جیل کے صحن میں بچی کی پیدائش کے بعد لوئس کارلوس پریسٹیز کی بیوی کا سر نازیوں نے کاٹ ڈالا تھا۔ ان تمام شہیدوں کی زندگیوں نے اس بات کی ضمانت دی تھی کہ پریسٹیز اپنی طویل ترین قید و بند کے زمانے میں بھی کبھی نہ بھلایا گیا تھا۔

میں اس وقت میکسیکو میں تھا جب اس کی ماں کا انتقال ہوا وہ خاتون اپنے بیٹے کی آزادی کی خاطر تمام دنیا میں سفر کر چکی تھی میکسیکو کی جمہوریہ کے سابق صدر جنرل (Lazaro Carden as) نے برازیل کے آمر کے برقیے کی صورت میں پریسٹیز کو اپنی ماں کے جنازے میں شرکت کی آزادی کے لئے درخواست کی تھی اور اس پیغام میں صدر نے پریسٹیز کی جیل واپسی کی ضمانت بھی دی تھی لیکن برازیل کے آمر (vargas) نے انکار کر دیا تھا۔

میں نے دنیا بھر کے غصے کی حمایت میں (Dona Leocadia) کے لئے ایک نوحہ لکھا تھا، جس میں اس کے غائب بیٹے کی یاد میں ظالم آمر کی سختی سے برائی کی تھی۔

یہ نوحہ اس شریف خاتون کے مقبرے پر پڑھا تھا، جس نے دنیا کے تمام دروازوں پر اپنے بیٹے کی رہائی کے لئے ناکام دستکیں دی تھیں میری نظم ایک سنجیدہ انداز میں کچھ یوں شروع ہوتی ہے۔

"محترمہ تم نے ہمارے امریکہ کو عظیم تر کر دیا ہے
تم نے اسے ایک شفاف اور پاک دریا عطا کیا ہے
جو پانیوں سے لبریز بہتا ہے۔
ایک دیو قامت درخت جس کی لاتعداد جڑیں ہیں
اپنے مالا مال وطن کے لئے ایک قابل فخر بیٹا"

جیسے جیسے نظم بڑھتی ہے اس کا رخ شدت کے ساتھ برازیل کے آمر کی طرف ہو جاتا ہے۔ میں اس نظم کو ہر جگہ پڑھتا ہوں اور بعد میں یہ نظم کاغذوں اور پوسٹ کارڈوں پر بھی شائع ہو کر براعظم کے تمام حصوں میں پہنچ گئی پانامہ میں قیام کے دوران ایک بار میں نے اپنی محبت کی نظموں کے بعد اسے اپنے پڑھنے کے پروگرام میں شامل رکھا۔ ہال لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور تنگ جگہ کی گرمی سے مجھے پسینہ آرہا تھا۔ (Vargas) کے خلاف میں نے اپنی نظم کو پڑھنا شروع کیا تھا کہ مجھے احساس ہوا کہ میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ نظم کو چھوڑ کر میں نے نزدیک رکھے ہوئے پانی کے

گلاس کو تھاما۔ اسی لمحے میں نے دیکھا کہ کوئی شخص سفید لباس میں ملبوس، تیزی سے ڈائس کی طرف آ رہا تھا۔ ہوٹل کے مدد گار کو سمجھتے ہوئے میں نے گلاس اس کی جانب بڑھایا کہ وہ پانی سے بھر کر مجھے لوٹا دے لیکن سفید لباس میں ملبوس اس شخص نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ کر چلاتے ہوئے مجمع سے کہنے لگا۔

''میں برازیل کا سفیر ہوں۔ میں احتجاج کرتا ہوں ___ پربسنیز ایک عام مجرم کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' ان لفظوں کو سنتے ہی مجمع نے کانوں کو پھاڑتی ہوئی سیٹیوؤں سے اس کی بات کو کاٹ دیا۔ ایک سیاہ فام طالب علم جس کے شانے ایک وارڈ روب جیسے چوڑے تھے، ہال کے وسط میں کھڑا ہوا اور سفیر کے گلے کی طرف اپنے ہاتھوں کو دھمکی کے انداز میں نشانہ لئے ہوئے ڈائس کی طرف اپنا رستہ بنانا شروع کر دیا۔ میں سفارت کار کو بچانے کی خاطر بڑھا، اور خوش قسمتی سے، اس کے منصب کو کوئی نقصان پہنچنے سے پہلے میں اسے اس جگہ سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان تعریفی اسناد کے ساتھ ازلا نیگرا سے مقبول عام جشن میں شرکت کے لئے برازیل کا میرا سفر برازیل والوں کے لئے فطری لگتا تھا (Saopullo) ساؤ پالو کے اسٹیڈیم میں بھرے ہوئے انسانوں کے مجمع کو دیکھ کر میں ششدر رہ گیا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہاں ایک لاکھ بتیس ہزار لوگ موجود تھے۔ اسٹیڈیم کے وسیع دائرے میں ان کے سر بہت چھوٹے لگتے تھے۔

پستہ قامت پربسنیز جو میرے برابر بیٹھا تھا۔ مجھے (Lazarus) دکھائی دیا، جو عمدہ لباس میں اپنی قبر سے اس تقریب کے لئے نکل آیا ہو۔ وہ دبلا تھا اور اس کی رنگت اتنی سفید تھی کہ اس کی جلد بالکل شفاف نظر آتی تھی۔ قیدیوں کی سی حیرت انگیز سفید رنگت، اس کی گہری نظر، آنکھوں کے نیچے پڑے نیلے حلقے بے حد نازک نقوش، سنجیدہ سبھاؤ، ان قربانیوں کی یاد دلاتے تھے جو اس کی زندگی نے دی تھی، اس سب کے باوجود وہ ایک فاتح جنرل کی طرح بولا۔ میں نے چند گھنٹے قبل اس کی تعریف میں لکھی گئی نظم کو پڑھا۔ جارج آماڈو نے محض اینتیں رکھنے والے لفظ کے ہسپانوی مترادف لفظ کو پرتگالی لفظ کی جگہ ادا کیا میرے خوف کے برعکس ہسپانوی زبان میں پڑھی گئی نظم کو سارے مجمع نے سمجھا۔ ہر سطر کے آہستہ پڑھنے کے بعد برازیل کے لوگوں کی جانب سے داد و تحسین کا شور بلند ہوتا۔ میری شاعری میں داد کا گہرا ردعمل ملتا ہے۔

کوئی بھی شاعر جو اپنی نظم ایک لاکھ تیس ہزار لوگوں کے سامنے پڑھتا ہے۔ وہ پہلا سا شخص نہیں رہتا۔ اور اس تجربے سے گزرنے کے بعد وہ اسی انداز میں نہیں لکھ سکتا ___

آخر کار میں خود کو روایتی لوئس کارلوس پربسنیز کے روبرو پاتا ہوں۔ وہ دوستوں کے گھر میں میرا منتظر ہے۔ پربسنیز کے چہرے کے تاثرات۔ پست قامت، دبلا پن، پیاز کی جھلی جیسی

سفید رنگت ایک منی ایچر کی طرح صحیح نظر آتی ہے۔ اس کے لفظ اور شاید اس کی سوچ بھی اس کی جسمانی مسافت سے لگا کھاتی تھی بے حد خاموش طبع ہونے کے باوجود، وہ میرا بہت اچھا دوست ہے میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے اتنی شفقت کے ساتھ پیش آ رہا ہے جو ہم شاعروں کو اکثر دوسرے لوگوں سے ملتی ہے۔ ایک ایسی قوت برداشت، کچھ نازک، کچھ بلاواسطہ۔ بالکل جیسا سلوک بڑے، بچوں کی جانب روا رکھتے ہیں۔

پرسنیز، نے مجھے اگلے ہفتے دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا تھا لیکن پھر ایک ایسا ہنگامہ رونما ہو گیا جسے محض اپنی لاپرواہی یا قسمت سے معمور کیا جا سکتا ہے۔ ہوا یوں کہ پرتگالی زبان میں ہفتہ اور اتوار کے دن تو ہوتے ہیں لیکن ہفتے کے دوسرے دنوں کی طرح اس زبان میں سوموار، منگل، بدھ کو الگ نہیں کیا جاتا بلکہ شیطانی ناموں کی طرح جیسے (qoria-fes) (Segiunda - Fearal) (tercia-leira) (ia) البتہ پہلے (Tesia) چھوڑتے ہوئے۔ میں سب خلط ملط کر گیا تھا اور بھول گیا تھا کہ مجھے کس دن اس کے ہاں جانا ہے۔ اسی دن میں برازیل کی ایک بہت حسین دوست کے ساتھ چند گھنٹے ساحل سمندر پر گزارنے چلا گیا گو ذہنی طور پر مجھے یاد تھا کہ اگلے دن مجھے پرسنیز کے ہاں دوپہر کو کھانے پر جانا ہے مگر (quada feina) کو مجھے معلوم ہوا کہ پرسنیز ایک روز پہلے ہی میز سجا کر مایوسی سے میرا انتظار کرتا رہا تھا جب کہ میں اس روز (Ipanema) کی ہمراہی میں ساحل سمندر پر خوش وقت ہوتا رہا۔ اس نے میرے بارے میں ادھر ادھر معلومات کیں۔ لیکن کسی کو میرے بارے میں اطلاع نہ تھی۔ میرے خصوصی مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے دوست نے بہت عمدہ قسم کی شراب کا آرڈر دے رکھا تھا، جو برازیل میں دستیاب نہ تھی۔ ہم دونوں نے اس دن تنہا کھانا کھانا تھا۔

ہر بار جب مجھے یہ کہانی یاد آتی ہے، تو میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ میں زندگی میں ہر شے کے بارے میں سیکھنے پر قدرت رکھتا ہوں، ماسوائے پرتگالی ہفتے کے دنوں کے نام۔

کوڈوویلا (Codovilla)

جب میں سانتیا گو چھوڑنے والا تھا۔ تو مجھے علم ہوا کہ وکٹوریو کوڈوویلا مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ میں اسے ملنے چلا گیا۔ اس کے مرنے تک ہم دونوں اچھے دوست رہے۔

کوڈوویلا تھرڈ انٹرنیشنل کا رکن رہ چکا تھا اور وقت کی تمام خطاؤں کا مالک تھا۔ وہ مطلق العنان، ذاتیات میں یقین رکھنے والا، خود کو ہمیشہ صحیح سمجھتا تھا۔ دوسروں پر وہ اپنے فیصلے جلدی لاگو کر دیتا، اور ان کی مرضی کو اس طرح منقطع کرتا جیسے چاقو مکھن کو کاٹ دیتا ہے، جب کبھی وہ اجلاس میں

آتا. جلدی میں ہوتا، یہ تاثر دیتے ہوئے کہ اس نے پہلے ہی سے سب کچھ سوچ رکھا ہے اور اس کے ہاں تمام جوابات موجود ہیں، اور دوسروں کی رائے کو محض نرمی لیکن یقینی بے صبرے پن کے ساتھ سنتا اور پہلے سے احکامات صادر کر دیتا۔

اس کی بے پناہ قابلیت اور باتوں کو ختم کرنے کی عادت متاثر کن تھی۔ وہ آرام کئے بغیر کام کرتا اور اس دھن کو اپنے ساتھیوں پر بھی سوار کر دیتا اور مجھے ہمیشہ یہ تاثر دیتا کہ وہ آج کی سب سے بڑی سیاسی سوچ رکھنے والی مشین میں سے ایک ہے اس نے ہمیشہ سوجھ بوجھ کی خصوصی کیفیت اور عزت کے جذبے کو میرے لئے روا رکھا___ یہ بدلا ہوا اطالوی اور عوامی زندگی میں ایک کار آمد شخص۔ خطا کے لئے انسان تھا، بھرپور فنکارانہ احساس کے ساتھ، جس نے اسے غلطیوں اور انسانی کمزوریوں سے واقف بنا دیا تھا۔ لیکن اس سب نے اسے جامد ہونے اور بسا اوقات تو سیاسی زندگی میں مرنے کی حد تک تبدیل نہ ہونے کی صلاحیت سے نہ روکا۔

وہ پرسنیز کے (Peron) کی آمریت کے بارے میں غلط استدلال سے پریشان تھا اس نے اس بارے میں مجھے بتایا تھا کوڈوویلا کی دانست میں پیرون اور اس کی تحریک یورپی فسطائیت کی شاخ تھی۔ فسطائیت کا کوئی بھی مخالف پیرون کو اپنی طاقت میں اضافہ کرتے دیکھ کر یا استبدادی عمل کو دہراتے ہوئے چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

کوڈوویلا اور ارجنٹینا کی کمونسٹ پارٹی کا اس وقت یہ موقف تھا کہ یہ بغاوت ہی دراصل پیرون کا جواب تھی۔ اور وہ پرسنیز سے اس بارے میں بات کرنا چاہتے تھے۔ یہ کوئی مقصد نہ تھا، اس نے بتایا، لیکن اس کے عمومی قطیعت کے انداز کے پیچھے مجھے کسی ذہنی پریشانی کا احساس ہوا۔

(Pacaembu) کی ریلی کے بعد پرسنیز سے میری طویل بات ہوئی تھی ایسے دو افراد کی تلاش کرنا، جو ایک دوسرے کی ضد تھے، بے حد مشکل کام تھا ایک ہٹا کٹا موٹا آدمی، بے حد صحت مند جو اطالوی اور ارجنٹینا کی نسلوں کا مرکب تھا ہمارے کمرے کی ہر شے پر قبضہ کر لیتا۔
دبلا پتلا پرسنیز ہوا کے جھونکے کے لئے بھی، جو اسے کھڑکی سے باہر اٹھا کر پھینک سکتا تھا، نازک نظر آتا۔ اس کے باوجود مجھے معلوم ہوا کہ اپنی وضع قطع کے پیچھے دونوں شخص بے حد توانا تھے پرسنیز نے میرے سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔
ارجنٹینا میں فاسزم نہیں ہے۔ پیرون فاشسٹ نہیں ہے، بھلا جھوری قمیصیں کہاں ہیں؟ فاشسٹ ملیشیا کہاں ہے؟

لینن کہتا ہے کہ بغاوت کو استعمال کرنا چاہئے اور آپ محض رضاکاروں پر بھروسا کرتے

ہوئے سپاہیوں کے بغیر جنگ کا اعلان نہیں کر سکتے۔ اندرونی طور پر یہ دونوں افراد جو ایک دوسرے سے مختلف تھے اپنے اندر لچک نہ رکھتے تھے۔ ان سب میں سے شاید ایک پر بسنیز ان باتوں کے بارے میں صحیح تھا لیکن ان قابل رشک انقلابیوں کے گنٹھل پن نے ان کے گرد ایسی فضا بنا دی تھی جس میں سانس لینا دشوار تھا۔

مجھے یہ کہنا چاہئے کہ کوڈوویلا ایک توانا انسان تھا، میں اس کی اشتراکی عہد کی منافقت اور مذہبی اخلاقیات کی جنگ کے حق میں تھا ہمارے عظیم چلی کا باشندہ، پرانے وقتوں کا پارٹی کارکن (Lafe rrtte) شدت کی حد تک شراب نوشی کے خلاف تھا جو سول رجسٹرار کے دفتر کے باہر پارٹی کے مرد، عورتوں کے مابین معاشقوں اور آنکھ مٹکے کے خلاف بولتا۔

کوڈویلا نے ہمارے محدود استاد کو، خود اپنی محدود توانائی سے ہرا ڈالا تھا۔

اسٹالن (Stalin)

بہت سے لوگوں نے سوچا تھا۔ کہ میں بہت اہم سیاست دان ہوں یا تھا۔ مجھے علم نہیں کہ اس مشہور روایت کا آغاز کہاں سے ہوا ہاں ایک دن میں (Life) رسالے میں دو صفحات پر دنیا بھر کے کمیونسٹ رہنماؤں کی تصویروں میں اپنی ٹکٹ کے سائز کی تصویر کو دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔ مجھے پر بسنیز اور ماؤزے تنگ کے درمیان جگہ دی گئی تھی، جو مجھے خاصی مضحکہ خیز لگی۔ لیکن میں نے کسی کو برا بھلا نہ کہا کیونکہ اعتزار کے خطوط سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی تھی۔

اس سے قطع نظر سی آئی اے (CIA) کے بارے میں، جس کے دنیا بھر میں پچاس لاکھ سے کم ایجنٹ نہ تھے، یہ غلطی لطیفے سے کم نہ تھی۔

سوشلزم کی دنیا میں، میرا طویل ترین رابطہ جن بہت اہم شخصیات سے ہوا وہ میرے پیکنگ کے دورے میں تھا۔

ایک تقریب کے دوران مجھے ماؤزے تنگ کے ہمراہ جام پینا تھا جونہی ہمارے گلاس آپس میں ٹکرائے تو اس نے مجھے مسکراتے ہوئے دیکھا—— ایک مسکراہٹ جو نیم دوستانہ اور کچھ طنزیہ تھی۔ اس نے چند سیکنڈ کے لئے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھاما اور عام سے انداز میں دباتے ہوئے، پھر اس میز کی طرف لوٹ گیا جہاں سے وہ آیا تھا۔

سوویت یونین کے کئی دوروں کے باوجود، میں نے نہ تو (Molotov) کو دیکھا نہ ہی (Vishinsky) اور (Beria) کو، حتیٰ کہ (Mikoyan) اور (Litvirio) کو بھی جو دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ سوشل اور کم پراسرار تھے۔ میں نے اسٹالن کو کئی بار فاصلے

سے ایک ہی جگہ پر بکھا تھا ریڈ اسکوائر میں وہ بلند پلیٹ فارم، جہاں ہر سال یکم مئی اور ہر سات نومبر کو بڑے رہنما جمع ہوتے تھے۔ مجھے کریملن میں جیوری کے رکن کی حیثیت سے اسٹالن کے نام پر دیئے گئے انعامات کے مختلف موقعوں پر خاصی خاصی دیر تک رہنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن کبھی اسٹالن سے براہ راست ملنے، حتیٰ کہ راہ داری میں گزرتے ہوئے بھی ایسا اتفاق نہ ہوا۔ وہ کبھی وونگ یا کھانوں کے دوران ہمیں ملنے نہ آیا اور نہ کبھی سلام دعا کی خاطر ہمیں بلوایا۔

انعامات ہمیشہ متفقہ طور پر دیئے جاتے۔ لیکن ایسے وقت بھی آتے جب جیتنے والے امیدوار کی بحث میں خاصی ردوکد ہوتی مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا کہ آخری فیصلے سے پہلے، جیوری میں سے کوئی شخص اس عظیم آدمی کے ممکنہ نتیجے کے بارے میں اس کی آشیرواد لینے چلا جاتا۔ لیکن مجھے یہ یاد نہیں کہ ایک بار بھی ہمیں اس کی جانب سے کوئی اعتراض وصول ہوا ہو، حالانکہ وہ ہم سے نزدیک ہی تھا۔ لیکن ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ اس نے ہماری موجودگی کا اعتراف کیا ہو کسی شک و شبہ کے بغیر اسٹالن نے اپنی پراسراریت کو ایک باقاعدگی سے ترتیب دیا تھا، یا پھر وہ بے حد شرمیلا انسان تھا ایک ایسا انسان جو خود اپنا قیدی تھا۔ یہ ممکن ہے کہ اس رجحان کی وجہ (Beria) کا اس پر مضبوط اثر ہو۔ (Beria) وہ واحد شخصیت تھی جو کسی اطلاع کے بغیر اسٹالن کے کمرے میں آتا جاتا رہتا۔

پھر بھی ایک موقع پر مجھے ایک غیر متوقع صورت حال کا سامنا ہوا، جو اب بھی کریملن کے پراسرار شخص کے ساتھ میرے لئے انتہائی وقیع لگتی ہے۔

میں (Aragons) (Louis) اور (Elsa) کے ہمراہ سال رواں کے اسٹالن انعام کے فیصلے کے بارے میں اجلاس میں حصہ لینے کی غرض سے جا رہا تھا۔ شدید برفانی طوفان نے ہمیں وارسا (WARSAW) میں روک رکھا تھا۔ وقت پر ہمارا پہنچنا ناممکن لگتا تھا۔ روسیوں میں سے ایک نے جو ہمارے ہمراہ تھا۔ فون پر روسی زبان میں ماسکو کو ان امیدواروں کے ناموں کے بارے میں، جن سے میں اور (Aragons) متفق تھے اطلاع دی، لیکن ایک عجیب بات ہوئی، وہ روسی جسے ماسکو سے فون پر جواب ملا، مجھے ایک طرف لے گیا اور یہ کہہ کر حیران کر دیا____

"کامریڈ نرودا میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں، جب انعام پانے والے امیدواروں کی فہرست کامریڈ اسٹالن کے سامنے رکھی گئی تو اس نے حیرت کے ساتھ پوچھا، اور نرودا کا نام ان لوگوں میں کیوں نہیں ہے؟"

اس سے اگلے برس مجھے امن اور انسان دوستی کے اسٹالن انعام سے نوازا گیا۔ ممکن ہے کہ میں اس انعام کے لئے مناسب تھا، لیکن جب بھی میں خود سے یہ سوال کرتا ہوں تو حیران ہو جاتا

ہوں کہ کس طرح اس لئے دیئے شخص کو میرے وجود کے بارے میں علم ہوا؟

اس زمانے میں میں نے اسٹالن کی اسی وضع کی مداخلتوں کے بارے میں سنا جب بین الاقوامیت کی مہم تیز تر ہو رہی تھی اور کلف زدہ کالروں والے لوگ ایہرن برگ کے سر کے متقاضی تھے ادیب (Juwo Jurenito) کے گھر میں ایک صبح فون کی گھنٹی بجی (Lubya) نے فون کا جواب دیا ایک مبہم سی نامانوس آواز نے دوسری طرف سے پوچھا۔

"کیا ایلیا ایہرن برگ ہیں؟"

"اس کا انحصار اس پر ہے کہ آپ کون ہیں" لوبیا نے جواب دیا دوسری جانب سے آواز آئی۔

"میں اسٹالن ہوں"

ایلیا یہ فون تمہارے لئے ہے، کوئی جوکر بول رہا ہے اس نے ایہرن برگ کو بتایا۔ لیکن جب ایہرن برگ فون پر پہنچا تو اس نے اسٹالن کی آواز کو پہچان لیا۔

"میں رات بھر تمہاری کتاب (The Fall of Paris) پڑھتا رہا ہوں، اور یہ بتانے کے لئے تمہیں فون، کر رہا ہوں کہ عزیز ایسی دلچسپ کتابیں لکھتے رہو۔"

ممکن ہے اس غیر متوقع فون نے عظیم ایہرن برگ کی طویل زندگی کو ممکن بنا دیا ہو۔

ایک دوسرا سلسلہ ـــــ مایاکووا سکی مر چکا تھا، لیکن اس کے رجعت پسند گھٹیا دشمن شاعر کی یاد پر بھی حملہ آور تھے اور اسے سوویت ادب کے نقشے سے باہر نکال پھینکنے کے خواہش مند تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ کسی نے ان کے عزائم کو خاک میں ملا دیا مایاکووا سکی کی محبوبہ (Lili Brik) نے اسٹالن کو مایاکووا سکی کی شاعری سے وفا کرتے ہوئے اس کی ذات پر کئے جانے والے شرمناک حملوں کے بارے میں ایک خط لکھا۔

مایاکووا سکی کے دشمنوں کو، جو اپنے متوسط طبقاتی احساس کے باعث محفوظ ہونے میں خود کو ناقابل شکست سمجھتے تھے۔ زبردست جھٹکا لگا جب للی برک کے خط کو پڑھتے ہی اسٹالن نے اعلان کر دیا "مایاکووا سکی سوویت عہد کا بہترین شاعر ہے"

اس کے بعد مایاکووا سکی کی عزت کے اعتراف میں یادگاریں اور میوزیم کھڑے ہو گئے اور اس کی غیر معمولی شاعری کے بہت سے ایڈیشن شائع ہو گئے اور اس کے دشمن اس اچانک پیش رفت پر دم بخود ہو کر رہ گئے۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ اسٹالن کی موت کے بعد اس کے کاغذوں میں سے ایک فہرست بر آمد ہوئی، جس پر اس کی اپنی تحریر میں لکھا ہوا تھا۔

"انہیں ہاتھ نہ لگاؤ"

اس فہرست میں سب سے بڑے موسیقار (Shostakovich) کا نام سرفہرست تھا۔
اور اس کے بعد کچھ اور بڑے ناموں میں آئن سٹائن بورس پیسٹرناک اور ایہرن برگ کے علاوہ اور بہت سے نام بھی موجود تھے۔

بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ میں اسٹالن کا سرگرم پیروکار ہوں فسطائیوں اور رجعت پسندوں نے تو مجھے اسٹالن کا تمنائی ترجمان تک کہہ ڈالا ہے۔ میں اس سب سے پریشان نہیں ہوں ایسے شیطانی اور غیر مطمئن عہد میں کس قسم کے انصاف کا امکان ہے؟

اس نتیجے نے جو لرز رہا تھا، ہم سب کو ایک اذیت ناک ذہنی صورت حال سے دوچار کر دیا تھا۔ کچھ نے سوچا کہ انہیں دھوکا دیا گیا تھا۔ کچھ مایوسی کی حالت میں دشمن کی منطق کو قبول کرتے ہوئے اس کے ساتھ مل گئے۔ دوسروں نے خیال کیا کہ بیسویں کانگریس کے دوران سامنے لائے جانے والے پریشان کن حقائق نے کیمونسٹ پارٹی کی حیثیت کو ثابت کر دیا تھا۔ جو دنیا کو تاریخی سچائی دکھانے کے لئے اور اپنی ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے زندہ رہی ہے۔

یہ سچ ہے کہ ہم سب اس ذمہ داری کے حصہ دار ہیں۔ ان جرائم کی نفی کرنے کے عمل نے ہمیں خود احتسابی اور تجزیئے کی طرف واپس بھیج دیا تھا۔ ایسے عناصر جو ہمارے نظریئے کے لئے ضروری ہیں اور جنہوں نے ہمیں ایسے خوفناک حالات سے بچاؤ اور دوبارہ ان سے نمٹنے کے لئے ہتھیار فراہم کئے تھے۔

اسٹالن عہد کی تاریکی سے بالاتر، جس سے میں ناواقف تھا۔ یہ میرا مؤقف رہا تھا۔ میری نظروں میں اسٹالن ایک اچھے مزاج کا بااصول انسان تھا، راہب کی مانند سنجیدہ اور روسی انقلاب کا سب سے بڑا محافظ تھا۔ اس کے علاوہ یہ چھوٹا سا شخص، اپنی بہت بڑی مونچھوں کے ساتھ جنگ کے زمانے میں ایک دیو بن گیا تھا ہونٹوں پر اس کے نام کے ساتھ سرخ فوج نے ہٹلر کی طاقت اور اس کی بلاؤں کو تہس نہس کر دیا تھا۔

اس کے باوجود اتنی توانا شخصیت کے نام میں نے صرف ایک نظم منسوب کی تھی اور یہ اس کی موت کے موقع پر۔ کوئی بھی اس نظم کو میرے کلیات میں تلاش کر سکتا ہے۔

کریملن کے سائکلوپس کی موت کا دنیا بھر میں بہت اثر تھا انسانی جنگل لرز اٹھا تھا۔ میری نظم نے زمین پر انتشار کی کیفیت کو اپنی گرفت میں لیا تھا۔

سادگی کا سبق

گیبرئل گارسیا مارکیز (Gabriel Garcia Marquez) نے جو اس بات سے خاصا

پریشان تھا، مجھے بتایا کہ کس طرح اس کے شاندار ناول (One Hundred Years of Solitude) میں سے کچھ شہوت انگیز حصوں کو ماسکو میں حذف کر دیا گیا تھا "یہ بات بالکل درست نہیں تھی" میں نے پبلشروں کو بتایا "کتاب کو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔" انہوں نے جواب دیا۔ اور میں نے دیکھا کہ انہوں نے کسی تعصب کے بغیر وہ حصے کاٹے تھے اب بھی وہ ایسا کرتے ہیں۔

ان باتوں کو کسی طرح ٹھیک کیا جا سکتا ہے؟

میں کم سے کم سوشیالوجسٹ ہوں۔ اپنے عمومی مارکسٹ اصولوں اور سرمایہ داری کے لئے اپنی ناپسندیدگی کو ایک طرف رکھتے ہوئے اور سوشلزم میں اپنے عقیدے کے باوجود میں انسانیت کے مسلسل تضادات کو کم سے کم سمجھ سکا ہوں آج کے عہد کے شاعروں کو فیصلہ کرنا ہو گا اور یہ انتخاب پھولوں کی سیج نہیں۔ خوفناک ناانصافی پر مبنی جنگیں، مسلسل بڑھتے ہوئے دباؤ، دولت کی ہوس، نامہربان رویئے، ہر قسم کی ناانصافیوں نے خود کو شدت کے ساتھ برملا محسوس کرا دیا تھا مضمحل پرانے نظام نے اپنے ہتھ کنڈوں کے ذریعے "مشروط" جنس، تشدد اور مسرت کو ماہانہ اقساط پر خوفزدہ انداز میں خرید لیا تھا۔

آج کے شاعر نے اپنی ناراضگی سے ایک راستے کو تلاش کر لیا ہے کچھ نے تصوف میں راہ فرار اختیار کر لی ہے یا منطق کے خواب میں دوسرے جوانوں کے تباہ کن تشدد سے بھکے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کوئی اندازہ لگائے بغیر فوریت پسند بن گئے ہیں، جب کہ آج کی اس کشت و خون کی دنیا میں ایسا تجربہ ہمیشہ گھٹن اور بانجھ پن پر منتج ہوا ہے۔

اپنی پارٹی (چلی کی کیمونسٹ پارٹی) میں، میں نے سادہ لوح لوگوں کے ایک بڑے گروہ کو دیکھا، جو اپنے ذاتی افتخار۔ اقربا پروری اور مادی مفادات کو پس پشت چھوڑ آئے ہیں۔

میں لوگوں کو دیانت کی دیکھ کر خوش ہوا ہوں، جو مشترک شرافت اور انصاف کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اپنی پارٹی کے ساتھ، باوجودیکہ وہ چھوٹی ہے، مجھے کبھی مشکلات پیش نہیں آئیں۔ لیکن پھر بھی اس پارٹی نے چلی کے عوام کے لئے، میرے عوام کے لئے غیر معمولی فتوحات حاصل کی ہیں۔ اس سے زیادہ میں کیا کہہ سکتا ہوں؟

میری اپنی امید میرے ساتھیوں کی طرح سادہ، مسلسل اور ناقابل فتح ہے۔ ہم تحقیر کے بارے میں مکمل طور پر کبھی نہیں سیکھتے مجھے کبھی انفرادی فخر کے بارے میں نہیں سکھایا گیا تھا۔ جو خود کو تشکیک کی دلدل میں ڈال دیتا ہے تاکہ انسانی مصائب کے باعث نبرد آزمانہ ہوا جا سکے۔

فیڈل کاسترو (Fidel Castro)

ہوانا (Havana) میں داخلے کے دو ہفتوں بعد (Caracas) میں فیڈل کاسترو (Fidel Castro) ایک مختصر دورے پر آیا تھا۔ وہ یہاں وینزویلا کی حکومت اور اس کے عوام کی، جنہوں نے مدد فراہم کی۔ شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ یہ مدد سپاہیوں اور اسلحے پر مشتمل تھی جو حالیہ منتخب صدر بیٹان کورٹ (Betancourt) کی جانب سے نہیں تھی۔ بلکہ اس کے پیش رو ایڈمرل وولف گینگ لیرازبیل (ADM WULFG GANG LARAZABEL) جو وینزویلا کے بائیں بازو میں شامل اشتراکیوں کا دوست تھا اور اس نے کیوبا (Cuba) کے اتحاد کے لئے مدد کی تھی کی جانب سے تھی۔ میں نے ایسے سیاسی استقبال کم ہی دیکھے ہوں گے۔ جیسے وینزویلا کے عوام نے کیوبا کے جوان انقلابی کا استقبال کیا۔

فیڈل کاسترو (El Sielencio) کے چوراہے میں چار گھنٹے تک رکے بغیر بولتا رہا تھا۔ یہ چوراہا (Caracas) کا دل سمجھا جاتا ہے اور میں ان دو لاکھ لوگوں میں سے ایک تھا۔ جو اس طویل تقریر کو ایک لفظ ادا کئے بغیر سن رہے تھے۔ خود میرے اور تمام سننے والوں کے لئے فیڈل کی تقریر میں ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی۔ اسے اتنے بڑے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے سن کر مجھے احساس ہوا کہ لاطینی امریکہ کے لئے ایک نیا عہد شروع ہو گیا ہے۔ مجھے اس کی زبان کی تازگی بہت اچھی لگی سیاست دانوں اور مزدوروں کے رہنما بھی حتیٰ کہ وہی گھسے پٹے فارمولے اپنی زبان میں استعمال کرتے ہیں، جن کے مسلمات بے شک موجود تھے لیکن لفظ تکرار اور استعمال کے باعث کمزور پڑ جاتے ہیں کاسترو کی زبان فطری اور ناصحانہ انداز رکھتی تھی۔

وہ خود بھی بولتے اور پڑھتے ہوئے لگتا تھا۔ جیسے سیکھنے کے عمل سے گزر رہا ہے۔

صدر بٹیان کورٹ وہاں نہیں تھا۔ وہ (Caracas) کے شہر سے جہاں اسے کبھی پسند نہیں کیا گیا تھا، خوف کھاتا تھا۔ ہر بار جب فیڈل نے تقریر میں اس کا ذکر کیا، سیٹیوں اور چیخوں کا شور بلند ہوا جسے فیڈل نے ہاتھوں سے خاموش کرنے کی کوشش کی۔

میرے خیال میں اس روز بٹیان کورٹ اور کیوبا کے انقلابیوں کے درمیان مخاصمت خاصی بڑھ گئی تھی فیڈل کاسترو اس وقت نہ تو مارکسٹ تھا اور نہ ہی اشتراکی اس کے لفظوں کا نظریئے کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ فیڈل کی شعلہ بیانی، شاندار شخصیت، جوش جو وہ اپنے سننے والوں میں پیدا کرتا تھا اور (Caracas) کے عوام کا سکوت، بٹیان کورٹ کو زچ کرتا تھا، جو خود خفیہ اجلاس، تکرار اور کمیٹیوں کے پرانے دبستان سے متعلق تھا۔ اس کے بعد سے بٹیان کورٹ

نے نہ بدلنے والی سنگدلی کے ساتھ ہر اس بات پر جو فیڈل کاسترو یا کیوبا کے انقلاب کو ختم کر سکے عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔

اس دن ریلی کے بعد جب میں دیہات میں اتیورا کی سیر کے لئے گیا تھا تو موٹر سائیکل سوار ہمیں کیوبا کے سفارت خانے میں دعوت دینے کے لئے آئے۔ وہ دن بھر مجھے ڈھونڈتے رہے تھے۔ اور بالاخر انہوں نے میرا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ اس سہ پہر کو دعوت تھی۔ منتیلڈی اور میں وہاں سے سیدھے سفارت خانے پہنچ گئے۔

مہمانوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ ہال کمروں باغ اور ہر جگہ بھرے ہوئے تھے۔ باہر بھی لوگوں کا مجمع تھا اور عمارت تک جانے والی سڑکوں سے ہو کر گزرنا دشوار تھا۔ ہم شراب کے گلاس اٹھائے ہوئے بازوں کی طرح لوگوں سے بھرے ہوئے کمروں میں سے گزرے۔ کوئی ہمیں راہ داریوں میں سے لے کر سیڑھیوں پر سے اوپر والی منزل تک لے گیا۔

فیڈل کاسترو کی قریبی دوست اور سیکرٹری (Celia) گھر کے غیر متوقع کمرے میں ہماری منتظر تھی۔ منتیلڈی اس کے پاس گئی اور مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا یہ کسی نوکر، مالی یا پھر شاید ڈرائیور کا کمرہ تھا۔ اس کمرے میں صرف ایک بستر تھا جس پر سے لگتا تھا کوئی جلدی سے اٹھ کر باہر چلا گیا تھا کیونکہ بستر شکن آلود تھا اور تکیہ فرش پر گرا پڑا تھا۔ کمرے میں کونے میں چھوٹی سی میز تھی اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ میں نے سوچا، کہ یہاں سے مجھے کمانڈانٹ سے ملانے کے لئے کسی آرام دہ کمرے میں منتقل کیا جائے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا اچانک دروازہ کھلا اور فیڈل کاسترو کی بلند شخصیت نے دروازے کے فریم کو بھر دیا۔ وہ مجھ سے قد میں تقریباً ایک سر بڑا تھا۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہ میرے پاس آیا۔

"ہیلو پابلو" اس نے کہتے ہوئے مجھے اپنے گلے سے لگالیا۔ اس کی بچوں جیسی تیز آواز نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اس کی شخصیت میں بھی کوئی بات اس کی آواز سے ملتی جلتی تھی۔ فیڈل کسی بڑے آدمی کا تاثر دینے کے بجائے ایک بڑا لڑکا لگتا تھا جس کی ٹانگیں اس سے پہلے کہ............ اس کا بچوں جیسا چہرہ بلوغت کی چھدری داڑھی میں گم ہوتا، اچانک لمبی ہو گئی تھیں یک دم تیزی سے اس نے مجھے چھوڑا اور مڑتے ہوئے کمرے کے ایک کونے کی طرف چلا گیا۔ میں نے غور نہ کیا تھا، کہ ایک فوٹو گرافر، جو کہیں سے کمرے میں گھس آیا تھا، اپنا کیمرہ ہماری جانب کر کے تصویر بنانے کی کوشش میں تھا، لیکن دوسرے ہی لمحے فیڈل نے اسے دبوچ لیا تھا میں نے دیکھا کہ وہ فوٹو گرافر کو گردن سے پکڑ کر ہلا رہا تھا۔ کیمرہ فرش پر گر پڑا تھا۔ میں نے ننھے سے فوٹو گرافر کی حالت کو دیکھتے ہوئے کاسترو کے بازو کو تھام لیا، لیکن کاسترو نے اسے دروازے کی طرف دھکا دیا اور فوٹو گرافر اس

میں سے نکل کر غائب ہو گیا۔ تب وہ میری طرف مڑا اور مسکراتے ہوئے کیمرے کو فرش سے اٹھا کر بستر پر پھینک دیا۔ ہم میں سے کوئی بھی اس حادثے کے بارے میں نہ بولا۔ علاوہ سارے لاطینی امریکہ کے لئے پریس ایجنسی کے امکان کے بارے میں میرا خیال ہے کہ (Prensa Latin a) نے اس گفتگو کے نتیجے میں جنم لیا تھا۔ اس کے بعد ہم اپنے اپنے دروازے سے نکل کر استقبالئے کی طرف چلے گئے۔ جب میں اور ستلیڈی ایک گھنٹے کے بعد سفارت خانے سے واپس آ رہے تھے تو مجھے فوٹو گرافر کا خوفزدہ چہرہ اور گوریلا لیڈر کی جبلی برق رفتاری یاد آ رہی تھی۔ جس نے مداخلت کرنے والے کے داخلے کو اپنی پشت پر سے محسوس کر لیا تھا یہ میری فیڈل کاسترو سے پہلی ملاقات تھی۔ اس نے آخر اتنے وحشیانہ انداز میں فوٹو گرافر کو فوٹو لینے سے کیوں باز رکھا تھا؟

کیا اس کی مزاحمت کسی معمولی سے سیاسی اسرار کو چھپاتی تھی؟

آج تک میں نہیں سمجھ پایا کہ ہمارے انٹرویو کو آخر اتنا خفیہ کیوں رکھا گیا تھا۔

چی گویرا سے میری پہلی ملاقات بالکل مختلف تھی یہ ملاقات ہوانا (Havana) میں ہوئی۔ رات کے ایک بجے کا وقت تھا، جب میں اس سے ملنے خزانہ یا اقتصادیات کے ادارے میں پہنچا تھا مجھے اب اچھی طرح سے یاد نہیں کہ اس نے ان میں سے کس جگہ اور کس وقت مجھے مدعو کیا تھا۔ اس نے نصف شب کو ملنے کا وقت طے کیا تھا، لیکن میں تاخیر سے پہنچا جیسا کہ اس روز مجھے ایک بین الاقوامی سرکاری تقریب میں شرکت کرنی تھی۔ جہاں مجھے پریزیڈیم میں بیٹھنا تھا۔

چی گویرا فوجی لباس میں ملبوس لمبے جوتے پہنے ہوئے تھا۔ پستول اس کی کمر سے بندھی تھی۔ بینک کے ماحول میں اس کا لباس کچھ بے ربط سا لگتا تھا۔ مدھم آواز میں آہستہ بولنے والا گہرے رنگ کے چی کا لب ولہجہ بلاشبہ ارجنٹینا کا تھا۔ وہ ایسا شخص تھا، جس سے آپ آہستہ روی کے ساتھ کانوں (Mines) میں ایک اور دوسرے کان کن کے درمیان باتیں کر سکتے تھے۔ اس کے جملے مختصر اور ایک مسکراہٹ پر ختم ہوتے، جیسے وہ گفتگو کو ہوا میں چھوڑ رہا ہو۔

جب چی ..نے مجھے بتایا کہ میری کتاب Cantogeneral) اس کے پاس ہے اور رات کے وقت (Sieria Maestra) میں وہ یہ کتاب اپنے گوریلا سپاہیوں کو پڑھ کر سناتا ہے تو میں بے حد خوش ہوا تھا اب برسوں بعد، میں یہ سوچ کر کانپ جاتا ہوں کہ میری نظمیں موت تک اس کے ہمراہ رہیں تھیں۔

(Regis Debray) سے مجھے علم ہوا کہ بولیویا کے پہاڑوں میں اپنے اختتام تک چی کے تھیلے میں محض دو کتابیں تھیں ان میں سے ایک کتاب ریاضی کی تھی اور دوسری

میری (Canto General) کی۔

اس رات چی نے جو کچھ مجھے بتایا، اس نے نہ صرف مجھے حیران کر دیا بلکہ شاید اس کے مقدر کی وضاحت بھی کر دی تھی۔ اس کی نظریں میری آنکھوں سے دفتر کی تاریک کھڑکیوں تک سرگرداں رہیں۔ ہم شمالی امریکہ کے کیوبا پر ممکنہ حملے کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ مجھے ہوانا کی گلیوں میں اہم جگہوں پر ریت کی بوریاں بکھری ہوئی نظر آ گئی تھیں اچانک اس نے کہا "جنگ...... جنگ...... ہم ہمیشہ جنگ کے خلاف ہیں لیکن ایک بار ہم جنگ لڑ لیں تو اس کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ ہم ہمیشہ جنگ کی طرف واپس جانا چاہتے ہیں"

میری خاطر وہ باآواز بلند اپنا اظہار خیال کر رہا تھا۔

اسے سنتے ہوئے ایمان داری کی بات ہے کہ میں پریشان ہو گیا تھا، کیونکہ میرے لئے جنگ ایک مقصد کے بجائے ایک عذاب ہے ہم نے ایک دوسرے کو الوداع کیا اور دوبارہ میں اس سے کبھی نہ ملا اس کے بعد بولیویا کے جنگلات میں اس کی لڑائی شروع ہو چکی تھی جو اس کی دردناک موت پر منتج ہوئی ـــــ لیکن میں یہ کہتا رہتا ہوں کہ اس خیال انگیز انسان چی گویرا نے اپنی ہیروؤں والی لڑائیوں میں بھی اپنے ہتھیاروں کے ساتھ میری شاعری کے لئے بھی جگہ رکھی۔

لاطینی امریکہ لفظ "امید" کا بہت شوقین ہے ہم "امید کا بر آعظم کہلانا پسند کرتے ہیں۔ سینیٹر، صدر، ڈپٹی تمام عہدوں کے امیدوار خود کو امید کے امیدوار کہتے ہیں۔

یہ امید درحقیقت آسمانوں سے ایک وعدے کی مانند ہے، ایک " IOU" جس کا معاوضہ ہمیشہ مؤخر کر دیا جاتا ہے۔ اسے آئندہ ہونے والی دستور ساز مہم کے لئے ٹلا دیتے ہیں، اگلے سال تک، اگلی صدی تک

جب کیوبا کا انقلاب رونما ہوا۔ تو جنوبی امریکہ کے لاکھوں باشندوں کو سخت بیداری کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ تھا یہ ایک ایسے براعظم کے حق میں نہ تھا، جو امید کے خلاف مایوسی کے ساتھ امید کرتا رہا تھا۔

اچانک وہاں فیڈل کاسترو تھا، کیوبا کا باشندہ، جس کے بارے میں کسی نے نہ سنا تھا، اور وہ امید کو اس کے بالوں سے پکڑے ہوئے یا اس کے پیروں کو پکڑے، اسے اڑنے سے روکتے ہوئے اپنی میز پر بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے یعنی امریکہ کے عوام کے گھر میں میز پر اس کے بعد سے، ہم نے امید کی سڑک پر، جو اب ایک حقیقت میں تبدیل ہو گئی ہے، بے شمار لڑائیاں لڑی ہیں۔ لیکن ہم اپنے دلوں کو اپنے منہ میں لے کر جیتے ہیں۔

ایک بہت بڑا طاقتور سامراجی ہمسایہ ملک، کیوبا اور اس کی تمام امیدوں کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔

امریکہ کے عوام دن بھر اخبار پڑھتے ہیں اور رات کو ریڈیو سنتے ہیں اور تسلی سے سانس لیتے ہیں، کیوبا قائم رہتا ہے ــــ ایک اور دن ــــ ایک اور سال اور پانچ سال ہماری امید کا سر تن سے جدا نہیں ہوا، اس کا سر نہیں کاٹا جائے گا ــــ

کیوبا کے باشندوں کی طرف سے ایک خط

پیرو (PERU) کے ادیبوں کی، جن میں میرے کچھ دوست تھے، خواہش تھی کہ مجھے ان کے ملک کی جانب سے سرکاری طور پر انعام سے نوازا جائے۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس وضع کے میڈل مجھے ہمیشہ احمقانہ لگے ہیں کچھ جو قونصل کی خدمات کے طور پر میرے سینے پر کسی محبت کے بغیر لگائے گئے، محض ایک کارروائی یا مجبوری کے لئے۔

ایک بار جب میں (Lima) سے گزرا، تو وہاں کے مشہور ناول نگار (The Starving Dogs) کے خالق (Ciro Alegria) نے جو اس وقت پیرو کے ادیبوں کا صدر بھی تھا، زور لگایا کہ اس کا ملک مجھے انعام سے نوازے ــــ میری نظم (Maccho Piccho) پیرو کی زندگی کا حصہ بن چکی تھی، شاید اس نظم کی وہ سطریں، جن میں، میں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا، کسی یادگار کے خفتہ پتھروں کی مانند پڑی رہی تھیں۔

اس کے علاوہ پیرو کا اس وقت کا صدر فن تعمیر کا ماہر (Belaunde) میرا قاری اور دوست تھا۔

اس کے باوجود کہ بعد میں آنے والے انقلاب نے اسے اتار پھینکا تھا اور یوں پیرو کو جو حکومت ملی، اس نے غیر متوقع طور پر ملک کو تاریخ کے نئے راستوں سے ہمکنار کر دیا تھا۔

میرا اب بھی یقین ہے کہ (Belaunde) بے حد دیانت دار انسان تھا جس کا ذھن، اس وقت بھڑک دار غیر حقیقی مقاصد پر لگا ہوا تھا جس نے بالاخر اسے دہلا دینے والی حقیقت سے پرے کر دیا، اور یوں وہ اپنے عوام سے جنہیں، وہ بے حد چاہتا تھا، جدا ہو گیا۔

میں نے اس بار وہ انعام اپنی قونصلر کی خدمات کے بجائے اپنی نظموں کی خاطر قبول کر لیا، لیکن یہ کچھ بھی تو نہیں، کیونکہ چلی اور پیرو کے عوام کے درمیان ابھی ایسے زخم ہیں جنہیں بھرنا ہو گا صرف کھلاڑی، سفارت کار اور سیاست دان ہی ماضی کے ان زخموں سے بہنے والے خون کے مداوا کے لئے کافی نہیں۔ بلکہ شاعروں کو بھی اس میں تمام منطق کے ساتھ حصہ لینا ہو گا جن کی روحوں کی، عوام کی روحوں کے مقابلے میں کم سرحدیں ہیں۔

اس زمانے میں، میں نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا بھی ایک دورہ کیا تھا، جہاں (P.E.N) کلب کی جانب سے بین القوامی کانگریس کا انعقاد ہونا تھا۔ میرا دوست آرتھر ملر (Arthur Miller) ارجنتینا کا ارنسنو سباتو (Ernesto Sabato) اور وکٹوریہ او کامپو (Victoria Ocampo) - یوراگوئے کا نقاد (Emirodri Guez) میکسیکو کا ناول نگار (Carlos Fusetes) ان میں سے چند تھے، جنہیں مدعو کیا گیا تھا۔ یورپ کے سوشلسٹ ممالک کے تقریباً تمام ہی ادیب وہاں موجود تھے۔

جب میں وہاں پہنچا تو مجھے علم ہوا کہ کیوبا کے ادیبوں کو بھی بلایا گیا ہے (P.E.N) کلب میں جب (Carpentier) نہ آ سکا تو سب حیران ہوئے اور مجھ سے اس کے بارے میں وضاحت کے لئے پوچھا گیا۔

میں نیو یارک میں (Prensa Latina) کے نمائندے سے ملنے گیا تھا جس نے (Carpentier) کو پیغام دینے کے لئے برقیہ بھیجنے کا کہا تھا اس کے جواب میں اس نے اپنے نہ آنے کے بارے میں بتایا کہ چونکہ اسے دعوت نامہ خاصی دیر سے ملا تھا، اور اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ آنے کے لئے ویزا حاصل کر سکے۔

یقیناً کوئی جھوٹ بول رہا تھا۔ ویزے تین ماہ قبل ہی جاری کر دیئے گئے تھے اور تین ماہ پہلے ہی کیوبا والوں کو اس دعوت نامے کا علم تھا، جسے انہوں نے قبول بھی کر لیا تھا۔ یقیناً اس معاملے میں کوئی بالادست تھا، جس نے آخری منٹ میں شمولیت نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا ہمیشہ کی طرح جیسا کہ میں نے کہا تھا، میں نے اپنی نظمیں پہلی بار نیو یارک میں ایک اتنے بڑے مجمع کے سامنے پڑھیں کہ کلوز سرکٹ ٹی وی کو نصب کیا گیا تھا، تاکہ وہ لوگ، جو آڈیٹوریم کے باہر رہ گئے تھے، دیکھ اور سن سکیں۔ شمالی امریکہ کے مجمع میں سامراجیت کے خلاف میں اپنی نظموں کی گونج کی شدت سے متاثر ہوا تھا۔

وہاں مجھے بہت سی باتیں سمجھ میں آئیں۔ واشنگٹن اور کیلی فورنیا میں، جہاں طالب علموں اور عام لوگوں نے سامراجیت کے خلاف میرے لفظوں کا اعتراف کیا تھا، اس جگہ مجھے علم ہوا کہ ہمارے عوام کے دشمن، شمالی امریکی، شمالی امریکہ کے عوام کے بھی دشمن ہیں۔ میں نے کئی انٹرویو دیئے (Life) رسالے کے ہسپانوی زبان کے ایڈیشن نے جس کی ادارت لاطینی امریکی کر رہے تھے، انہوں نے میرے خیالات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا تھا جب میں نے ان سے تصیح کے لئے کہا، تو انہوں نے ایسا نہیں کیا، لیکن یہ ایسی سنجیدہ بات نہ تھی۔ انہوں نے ایک پیراگراف کو، جس میں، میں نے ویت نام کی جنگ کی مخالفت کی تھی اور ایک سیاہ فام رہنما کا جسے قتل کر دیا گیا تھا ذکر کیا تھا،

حذف کر ڈالا تھا کچھ سال بعد اس خاتون نامہ نگار جس نے میرا انٹرویو لیا تھا اعتراف کیا کہ اسے سنسر کر دیا گیا تھا۔

اپنے دورے کے دوران مجھے معلوم ہوا تھا کہ میرے شمالی امریکی ساتھی ادیبوں نے اس بات کے لئے بے حد زور لگایا تھا کہ مجھے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ویزا دیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ (PEN) کلب نے وزارت داخلہ کو ویزا نہ دینے کے ضمن میں کھلی دھمکی دی تھی۔

ایک عوامی مجمع میں شمالی امریکہ کی معمر خاتون شاعر (Marianne Moor) نے سننے والوں کو بتایا تھا کہ وہ میرے قانونی طور پر ملک میں داخلے پر کس قدر خوش ہے اور میرا داخلہ شمالی امریکہ کے شاعروں کے باہمی اتحاد کا نتیجہ ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اس کے متحرک لفظوں نے بے پناہ خراج وصول کیا تھا۔

شرمناک حقیقت یہ ہے کہ میں ابھی اپنے دورے کے بعد چلی واپس پہنچا ہی تھا اور یہ دورہ میری سیاسی لڑائی اور شاعرانہ سرگرمیوں میں سب سے ممتاز تھا، جس کا بڑا حصہ کیوبا کے انقلاب کی حمایت میں صرف ہوا تھا، کہ مجھے کیوبا کے ادیبوں کی جانب سے بے حد تضحیک آمیز خط ملا، جس میں میرے خلاف بغاوت اور خود سپردگی، کے الزامات تھے۔ وہ الفاظ، جو اس وقت میرے عوامی وکیلوں نے استعمال کئے تھے، مجھے اچھی طرح سے یاد ہیں۔ لیکن میں یہ بتا سکتا ہوں کہ انہوں نے خود کو انقلاب کے استادوں اور قواعد و ضوابط سکھانے والوں کی فہرست میں رکھا تھا۔ جس سے بائیں بازو کے لوگوں کو رہنمائی حاصل کرنی چاہئے تھی۔ تکبر، بیہودہ رویئے اور خوشامدانہ لفظوں میں انہوں نے میری شاعری کے ساتھ ساتھ میرے سماجی انقلابی کام، کو بہتر کرنا چاہا (Macchu Picchue) میری نظم پر مجھے انعام سے نوازا جانا اور (PEN) کلب میں میری شرکت، میرے بیانات، لفظوں کا پڑھنا، میرے فعال الفاظ، جن میں، میں نے شمالی امریکہ کے نظام کو برا بھلا کہا تھا، شیر کی کچھار میں بولنے کے مترادف تھا اس سب پر ان ادیبوں نے سوالات کی کیچڑ اچھالی۔ ان میں بہت سے ادیب نئے نئے انقلابی کیمپ میں شامل ہوئے تھے اور بہت سے صحیح یا غلط طور پر کیوبا کی حکومت کے وظیفہ خوار تھے۔ ناانصافیوں کا یہ تھیلا فوری درخواست پر ادیبوں اور مصوروں کی کمیٹیوں کے دستخطوں سے بھرا ہوا تھا۔

ہوانا میں وفود دستخطوں کے حصول کے لئے موسیقاروں، رقاصوں، مصوروں کے گلڈ میں بھاگے بھاگے پھرتے رہے تھے۔ ان فن کاروں سے جو کیوبا سے گزر رہے تھے یا کیوبا میں مدعو کئے گئے تھے اور وہاں کے فیشن ایبل ہوٹلوں میں مقیم تھے، دستخط حاصل کئے گئے اس غیر منصفانہ دستاویز پر جن ادیبوں کے نام چھپے ہوئے تھے، وہ بعد میں مجھے پیغام بھیجتے رہے۔

"خود اپنے نام کو دیکھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ دستخط میرے نہیں ہیں" Juan)
(Marinello کے ایک دوست نے مجھے بتایا تھا کہ ایسی ہی بات اس کے ساتھ بھی ہو چکی تھی،
حالانکہ میں نے اس کی تصدیق نہیں کی تھی لیکن دوسروں کے بارے میں، میں دیکھ ہی چکا تھا۔

یہ معاملہ نظریئے کی اس برف یا اون کے گولے کی مانند تھا، جس کو ہر حال میں بڑا اور مزید بڑا ہونا تھا۔ میڈرڈ، پیرس اور دوسرے دارلحکومتوں میں خصوصی ایجنسیاں بنائی گئی تھیں، جن کا واحد مقصد اس خط کی کثیر تعداد میں نقول بنا کر بھیجنا تھا۔ ہزار ہا خطوط، بطور خاص میڈرڈ سے بھیجے گئے ہر پتہ پر بیس بائیس کی تعداد میں ان خطوط کے لفافوں کو وصول کرنا مضحکہ خیز انداز میں لطف اندوز تھا، کیونکہ لفافوں پر فرانکو کی تصویر والے ٹکٹ چسپاں تھے جب کہ لفافے کے اندر پابلو نرودا کو اس کی غیر انقلابی سرگرمیوں کے لئے مطعون کیا گیا تھا۔ میرے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ اس غصے کے دورے کی وجوہات کو تلاش کروں نظریاتی کمزوری، ادبی بغض، سیاسی شعبدہ بازی اور جلن، اور خدا جانے کیا کیا؟ مجھ تنہا شخص کے خلاف اس جنگ کا موجب تھے۔ بعد میں مجھے بتایا گیا تھا کہ پرجوش مدیران، پروموٹرز اور مشہور خط کے لئے دستخط حاصل کرنے والے شکاری حضرات میں ادیب Pobe)
(Epundo Desno اور rto Fernandez Ratemer) (Lisanadro Otero) -
(s شامل تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ آخری دنوں میں ان سے ذاتی طور پر کبھی ملا ہوں یا ان میں سے کسی کو پڑھا ہو، ہاں البتہ (Ratemer) ہوانا اور پیرس میں مجھ سے ملا تھا، جس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کئی مضامین میری شاعری کی تعریف میں لکھ چکا ہے۔ میں نے کبھی بھی اسے اہمیت نہ دی تھی۔ ہمارے زمانے کے ایک اور سیاسی اور ادبی نووار دان بساط میں سے ایک کا خیال تھا کہ وہ مجھے ایک فعال انقلابی کی حیثیت سے ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

لیکن جب میں سانتیاگو میں (Teatincs St.) میں پہنچا، تاکہ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے مسائل کا مطالعہ کر سکوں تو معلوم ہوا کہ وہ سیاسی طور پر پہلے ہی اپنی رائے قائم کر چکے تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ "یہ چلی کی پارٹی کے خلاف پہلا حملہ ہے"

اس زمانے میں ہم سنجیدہ تضادات میں رہ رہے تھے ـــــ وینزویلا میکسیکو کے اشتراکیوں کے علاوہ دوسرے اشتراکی بھی کیوبا کے ساتھ نظریاتی اختلاف رکھتے تھے۔ بعد میں دردناک حالات میں بلکہ خاموشی سے بولیویا والے بھی ساتھ آ گئے تھے۔ چلی کی کمیونسٹ پارٹی نے مجھے ایک عوامی تقریب میں انعام سے نوازنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس انعام کا نام (Recabarren) میڈل تھا، جو جو حال ہی میں شروع کیا گیا تھا۔ یہ انعام سب سے بہتر فعال کام کرنے والوں کے لئے تھا۔ یہ باعث توقیر رد عمل تھا چلی کی کمیونسٹ پارٹی نے اس عرصے میں عقلمندی سے حالات کو بدلنا تھا اور

تجزیئے کے بعد وہ ہمارے اندرونی اختلافات کو سمجھ گئی تھی۔

وقت کے ساتھ لڑائی کے تمام باقیات ختم ہو گئے تھے۔

لاطینی امریکہ کی دو اہم کیمونسٹ پارٹیوں کے درمیان ایک بہتر مفاہمت اور خوشگوار تعلقات موجود ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اب بھی وہی شخص ہوں، جس نے (Cancion de Cesta) کتاب تحریر کی تھی۔ یہ وہ کتاب ہے، جسے میں اب بھی پسند کرتا ہوں۔ میں نہیں بھلا سکتا کہ اسی کتاب سے میں کیوبا کے انقلاب کی تعریف کرنے والا پہلا شاعر بنا تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ بے شک انقلابات میں اور بطور خاص وہ جو انقلابات میں حصہ لیتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً غلطی اور ناانصافی کے مرتکب ہوتے ہیں انسانی نسل کے غیر تحریر کردہ قوانین انقلابیوں اور غیر انقلابیوں دونوں کے لئے یکساں ہیں۔ خطا سے کوئی بھی مفر نہیں۔ ایک ننھا سا نقطہ انقلابی عمل میں عظیم وجہ کے بڑے پس منظر میں اہم نہیں ہو سکتا۔ میں کیوبا کے انقلاب، اس کے عوام، اس کے شریف سورماؤں کے لئے محبت کے گیت گاتا رہا ہوں۔ لیکن ہر شخص کی اپنی ناکامیاں ہیں۔ مثال کے طور پر میں اپنے لڑنے والے انقلابی کے غیر لچک دار رویئے کے بارے میں اپنے فخر کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ممکن ہے یہ یا کوئی اور کمی میری غراہم سی ذات میں اب تک انکار کرنے پر متمکن رہی ہو اور میں ان لوگوں سے جنہوں نے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اس خط پر دستخط کئے۔ جو میرے لئے بیہودہ تھا۔ کبھی ہاتھ نہ ملا پاؤں گا۔

بارھواں باب

ظالم محبوب وطن

انتہا پسندی اور جاسوس

سابق انتشار پسند ـــ اور یہی کچھ کل کو، آج کے انتشار پسندوں کے ساتھ ہو گا ـــ عموماً ایک آرام دہ صورت حال کی طرف رخ کر لیتے ہیں، انتشار اور سرمایہ دارانہ نظام میں جو سیاسی قاتلوں کی پناہ گاہ ہے، یہی مستقبل کے بائیں بازو کے رکن اور جھوٹے آزاد خیال ہوتے ہیں۔

جبری سرمایہ دارانہ نظام، اشتراکیوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہے اور اس کا نشانہ شاذ ہی چوکتا ہے۔

وہ تمام انفرادیت پسند باغی جو رجعت پسند دسترس اور طاقتور طریقے سے جو انہیں واجب التنظیم اصولوں کا سورما محافظ بناتا ہے، کسی نہ کسی طرح خوش ہیں۔ رجعت پسند جانتے ہیں کہ معاشرے میں تبدیلی ذاتی بغاوت کے بجائے عوام کے اتحاد اور وسیع پیمانے پر طبقاتی شعور میں مضمر ہے۔

میں نے یہ سب کچھ واضح طور پر اسپین کی جنگ میں دیکھا تھا بعض فسطائیوں کے مخالف گروہ، ہٹلر اور فرانکو کی فوجوں کے بالمقابل جو میڈرڈ کی طرف بڑھ رہی تھیں، خفیہ کارنیوال کا ڈرامہ کر رہے تھے۔ میں (Durruti) اور شمالی اسپین کے صوبے (Catalan) کے انتشار پسندوں کو جو بارسیلونا میں بے جگری سے لڑے اس میں شامل نہیں کروں گا۔ جاسوس، انتہا پسندوں کے مقابلے میں ہزار گنا خراب ہوتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً دشمن کے ایجنٹ، جنہیں پولیس کرائے پر حاصل کر لیتی ہے رجعت پسند پارٹیاں یا غیر ملکی حکومتیں فعال انقلابی پارٹیوں میں

داخل ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے کچھ بھڑکانے کے خصوصی مقاصد سرانجام دیتے ہیں باقی ماندہ پرسکون تماشائی ہوتے ہیں (Azev) اس کی کلاسیکی مثال ہے۔ زار (Tsar) کے زوال سے پہلے اس نے بہت سے تخریبی کاموں میں حصہ لیا تھا اور کئی مرتبہ جیل گیا تھا۔ زار کی خفیہ پولیس کے چیف کی یادداشتیں جو انقلاب کے بعد شائع ہوئیں خاصی تفصیل سے بتاتی ہیں کہ کس طرح (Azev) ہمیشہ (Okhrana) کا ایجنٹ رہا تھا۔ تخریب کار اور مخبر ایک ہی خبطی کردار کے ذہن میں موجود تھے، جس کے کرتوت گرینڈ ڈیوک (Grand Duke) کی موت کی وجہ بنے۔

ایک اور دلچسپ واقعہ لاس اینجلس میں ہوا سان فرانسسکو یا کیلی فورنیا کا کوئی اور شہر۔ میکار تھی ازم کے پاگل پن کے دور میں کیمونسٹ پارٹی کے تمام فعال رکن گرفتار کر لئے گئے تھے۔ یہ پچھتر لوگ تھے، سب کو ان کی زندگی پر مکمل فائلوں کے بارے میں بتایا گیا، جس میں ان کی روزمرہ زندگی کی ایک ایک بات موجود تھی۔

فیڈرل بیورو آف انٹیلیجنس (ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا مرکزی جاسوسی ادارہ) ایف بی آئی (F.B.I) نے چھوٹی سی خود ساختہ کیمونسٹ پارٹی بنا ڈالی تھی جس میں ایسے افراد تھے۔ جو ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے، یہ سب اس لئے کیا گیا تھا کہ بعد میں انہیں سزائیں دے کر غیر موجود دشمن پر سنسنی خیز فتوحات کا ڈھونگ رچایا جائے۔ اس قسم کی حرکتوں سے (ایف بی آئی) کو مضحکہ خیز صورت حال کی سند ملی۔ مثلاً ایک صورت میں جہاں چیمبرز نامی ایک شخص (سابق کیمونسٹ) نے، جسے پولیس نے خرید رکھا تھا انتہائی سنسنی خیز بین الاقوامی نوعیت کے رازوں کو کدو میں چھپا رکھا تھا۔

(ایف بی آئی) خوفناک حرکتوں میں بھی ملوث تھی، جس میں قتل کروانا مار دینا شامل تھا، بطور خاص (Rosenbergs) کا مروانا ایک ایسا سانحہ تھا جس نے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ان ایجنٹوں کا چلی کی کیمونسٹ پارٹی میں گھسنا ہمیشہ مشکل ہوتا تھا، کیونکہ یہ پارٹی خالصتاً پرولتاری شناخت کے علاوہ اپنی ایک طویل تاریخ بھی رکھتی تھی دوسری طرف لاطینی امریکہ میں گوریلا لڑائی کے طریقوں نے ہر قسم کے شور مچانے والوں کے لئے سیلابی دروازوں کو کھول دیا تھا۔ ان تنظیموں کے جوانوں اور فوری کردار نے جاسوسوں کو بے نقاب کرنا دشوار بنا دیا تھا اسی لئے گوریلا رہنماؤں کو شکوک کے آسیب تلے رہنے اور انہیں خود اپنے سائے پر بھی نظر رکھنی پڑتی تھی۔ ایک طرح سے خطرے کے اس عقیدے کے گوریلوں کے وحشی نظریات اور رومانوی جذبے نے تقویت بخشی، جو لاطینی امریکہ کو اپنے بہاؤ میں لے گیا۔ یہ عہد ارنسٹو گویرا کے

قتل اور سور ہائی موت کے بعد ختم ہو سکتا تھا لیکن ایک طویل عرصے تک اس طریقہ کار کے مداحوں نے براعظم کو دستاویزات اور مقالوں سے بھرے رکھا اور واقعتاً مستقبل کی مقبول انقلابی حکومت کو سرمایہ داروں کے زیر استعمال طبقات کے بجائے ہتھیاروں سے لیس ہما شما کے ہاتھوں میں دے دیا۔ اس منطقی سوچ میں اس کی سیاسی کمزوری شامل ہے۔ کبھی کبھی ایک توانا سپاہی ذھن اور بڑے گوریلا جنگ جو کا ایک ہی شخصیت میں ہونا ممکن ہے جیسا کہ چی گویرا میں تھا، لیکن وہ محض ایک اتفاق تھا اور گوریلا جنگ کے بچنے والے پرولتاری ریاست کو محض اس لئے نہیں بھلا سکتے کہ وہ بہادر تھے یا یہ کہ وہ موت کے مقابل خوش قسمت رہے یا پھر زندوں کے سامنے وہ بہتر نشانچی تھے۔

اب میں ایک ذاتی تجربے کو دہراؤں گا۔ میں میکسیکو سے چلی واپس آیا ہی تھا جہاں میں نے سیاسی جلسوں میں سے ایک میں شرکت کی اور وہاں ایک شخص مجھے ملنے آیا۔ وہ ادھیڑ عمر کا شخص تھا آج کے عہد کا ایک ماڈل انسان، بے حد سلیقے سے ملبوس، عینک لگائے ہوئے جو دیکھنے میں خاصا باعزت نظر آتا تھا۔ بغیر رم والی عینک، جو بس ناک پر ٹکی ہوتی ہے۔ وہ شخص خاصا باتونی نکلا۔

"ڈان پابلو، میں کبھی بھی تم سے ملنے کی جرات نہ کر سکا، حالانکہ میری زندگی تمہارا قرض ہے، میں وہ مہاجر ہوں، جسے تم نے بیگار کیمپ اور گیس کی بھٹیوں سے بچایا تھا، اور ہمیں چلی کے لئے بحری جہاز (Winnipeg) میں سوار کرایا تھا، میں ایک فری میسن کٹیالان ہوں۔ یہاں میں نے اپنے لئے ایک جگہ بنالی ہے اور میں سینٹری کی فلاں فلاں کمپنی میں سیلز مین کی حیثیت سے کام کرتا ہوں، جو چلی میں اپنی نوعیت کی خاصی اہم کمپنی ہے۔"

اس نے مجھے بتایا کہ وہ سانتیاگو کے مرکز میں ایک فلیٹ میں مقیم ہے اس کا ہمسایہ ایک نامی گرامی ٹینس کا چیمپین تھا۔ جس کا نام (Iglesias) تھا۔ جو میرے اسکول کے زمانے کا ساتھی تھا۔ وہ دونوں اکثر میرا ذکر کرتے بالاخر ایک روز انہوں نے مجھے اپنے گھر پر مدعو کر لیا تھا۔ اسی لئے وہ مجھے ملنے آیا تھا۔ کٹیالان کے فلیٹ میں بورژوا طبقے کی ساری آسائشوں کے نشان موجود تھے۔ شاندار فرنیچر

(Iglesias) کھانے کے دوران ہمارے ساتھ رہا۔ ہم ٹی میو کو کے پرانے اسکول کے زمانے کو یاد کرتے رہے، جس کے تہ خانوں میں چمگادڑوں کے پر ہمارے چہروں کو چھوا کرتے تھے۔ کھانے کے اختتام پر ہمارے میزبان نے ایک چھوٹی سی تقریر کی اور مجھے بادلیر اور ایڈگر ایلن پو کی دو تصویروں کا تحفہ دیا۔ شاعروں کے شاندار چہرے جنہیں بلاشبہ میں اپنی لائبریری میں رکھوں گا۔

ایک روز ہمارے کتیالان کو فالج کا دورہ پڑا، جس نے اسے بستر میں بے حس و حرکت کر کے رکھ دیا اب نہ تو وہ بول سکتا تھا، اور نہ ہی اس کے چہرے پر کوئی تاثر موجود تھا۔ بس اس کی آنکھیں ہلتیں جن میں درد بھرا ہوا تھا۔ جیسے وہ اپنی بیوی سے کچھ کہنا چاہتا ہو یا پھر اپنے ہمسائے ٹینس کے کھلاڑی سے۔

اس کی بیوی ایک اچھی ہسپانوی ری پبلیکن تھی جس کے ماضی تک پہنچ آسان نہ تھی۔ یہ شخص حرکت کئے بغیر یا کچھ کہے بنا چپ چاپ مرگیا ابھی اس کا گھر آنسوؤں آہوں اور دوستوں سے بھرا ہوا تھا کہ اس کے ہمسائے ٹینس کے کھلاڑی نے ایک پر اسرار فون کال وصول کی۔

''ہم مرنے والے کے ساتھ تمہارے قریبی روابط کے بارے میں واقف ہیں، وہ تمہاری تعریف کرتے ہوئے نہیں تھکتا تھا۔ اگر تم اپنے دوست کے لئے ایک اہم خدمت کرنا چاہتے ہو تو اس کا مضبوط صندوق کھولو اور اس میں موجود ایک چھوٹے سے آہنی ڈبے کو نکال لو۔ میں تین دن کے بعد دوبارہ تمہیں فون کروں گا۔''

بیوہ کو ایسی کسی بات کا علم نہ تھا۔ اس کا غم بے پناہ تھا۔ وہ کسی بات کو جاننا نہ چاہتی تھی۔ فلیٹ کو چھوڑ کر وہ سانتوڈومینگو کی ایک گلی میں واقع چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئی جس کا مالک سیاست کا مارا ہوا مزاحمت کی تحریک سے وابستہ یوگوسلاویہ کا ایک باشندہ تھا۔ بیوہ نے اس سے اپنے شوہر کے کاغذات دیکھنے کی درخواست کی۔ اس شخص کو وہ آہنی ڈبہ ہاتھ لگا جسے بمشکل کھولنے پر اسرار کا پردہ اٹھا اور اس میں موجود دستاویز نے یہ مژدہ سنایا کہ مرنے والا کتیالان ایک فسطائی ایجنٹ تھا۔ اس کے خطوط کی نقول سے پتہ چلا کہ درجنوں تارکین وطن خفیہ طور پر اسپین واپس پہنچنے پر یا تو قید کر دیئے گئے یا مار دیئے گئے تھے۔ ان میں فرانکو کا تحریر کردہ ایک خط بھی موجود تھا، جس میں اس کی خدمات کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ کتیالان کی طرف سے ارسال کی جانے والی معلومات نے نازی بحریہ کو چلی سے اسلحہ لے کر جانے والے بحری جہازوں کو ڈبونے میں مدد کی تھی۔ ان میں سے ایک بحری جہاز (Lautaro) بے حد خوبصورت تھا، جسے چلی کی بحریہ کا فخر سمجھا جاتا تھا۔ جنگ کے دوران نائٹریٹ سے بھرے ہوئے اس جہاز کو (Tocopillan) کی بندرگاہ سے نکلتے ہی ڈبو دیا گیا تھا۔ اس کے عملے میں نیوی کے ستره کیڈٹ ڈوبے یا جل کر مرے تھے یہ جرائم تھے اس مسکراتے ہوئے کتیالان کے جس نے ایک روز مجھے اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا تھا۔

اشتراکی

...... بہت سے برس گزر چکے، جب میں پارٹی کارکن بنا تھا...... میں خوش ہوں...... اشتراکی

ایک اچھا خاندان بناتے ہیں...... ان کی کھالیں موسم کی مار کھائی ہوئی اور دل گرم ہوتے ہیں...... ہر جگہ وہ ڈنڈے لے کر جاتے ہیں ڈنڈے بطور خاص ان کے لئے۔ زندہ باد روحانی حضرات، شاہی افراد، پٹے ہوئے لوگ، ہر طرح کے مجرم...... زندہ باد دھویں کے پردے میں ملفوف لیکن ڈھانچوں کے بغیر فلسفہ...... زندہ باد وہ کتا، جو بھونکنے کے ساتھ کاٹتا بھی ہے۔ زندہ باد عیاش ماہر نجوم، فحاشی، قنوطیت...... زندہ باد جھینگے، ہر شخص، علاوہ اشتراکیوں کے زندہ باد۔ زندہ باد پاکیزگی کی کمر بند۔ زندہ باد قدامت پسند، جنہوں نے پانچ سو سال سے اپنے نظریاتی پاؤں نہیں دھوئے......

زندہ باد غریب کی جوں، کمہار کی زمین کا مفت دودھ، انارکیت، سرمایہ داری رلکے (Ril ke) آندرے گائڈ (Andre Gide) اور اس کا ننھا پیارا سا (Corydon) ...... زندہ باد ہر قسم کا تصوف...... سب چلتا ہے...... یہ سب سورما ہیں...... تمام اخبارات کو نکلنا چاہئے...... یہ سب شائع ہو سکتے ہیں۔ علاوہ اشتراکی اخبارات کے...... سانتو ڈومنگو میں سارے سیاست دانوں کو پرندوں کی طرح آزاد رہنے دو۔ ان سب کو خون کے پیاسے (Trujillo) کا موت کا جشن منانے دو، علاوہ ان کے جنہوں نے اس سے سخت جنگ لڑی...... زندہ باد کارنیوال۔ کارنیوال کے آخری دن ہر ایک کے لئے نئے نقاب موجود ہیں۔ مثالی مسیحی نقاب۔ انتہائی بائیں بازو کے نقاب موجود ہیں۔ شریف سنجیدہ خاتون اور خیرات بانٹنے والی میٹرن کے نقاب...... لیکن خیال رکھنا اشتراکی حضرات اندر نہ آنے پائیں دروازے پر تالا لگا دینا...... ہرگز غلطی نہ کرنا...... ان کا کسی شے پر حق نہیں ہے...... آؤ انسان کے داخلی عطر کی بات کریں...... عطروں کا عطریوں ہم سب خوش ہوں گے۔ ہمارے پاس آزادی ہے...... آزادی عظیم ہے! یہ اس کی عزت نہیں کرتے...... یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا چیز ہے؟...... عطر کے بارے میں فکر کرنے کی آزادی...... عطر کی ضروریات کے بارے میں اور اس طرح گزشتہ برس گزر گئے...... جاز ختم ہوا، روح آ گئی ہم نے تجریدی مصوری کے مفروضوں میں غلطیاں سہیں۔ جنگ جاری رہی اور ہمیں مار گئی...... اس جانب ہر شے ایسی ہی رہی...... کیا ایسی نہیں رہی؟ روح کے بارے میں بہت سی تقریروں اور سر پر بہت سے ڈنڈوں کے بعد کوئی بات غلط ہو رہی تھی...... بہت بری طرح سے...... انہوں نے اس کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ لوگ تنظیم بنا رہے تھے...... گوریلا جنگیں اور ہڑتالیں شروع ہو گئی تھیں۔ کیوبا اور چلی نے آزادی حاصل کر لی تھی...... ان گنت مرد اور عورتیں انٹرنیشنل گا چکی تھیں...... کس قدر بے تکا اور لگتا دل شکن...... اب وہ چینی، بلغارین، لاطینی امریکہ کے ہسپانوی زبان میں گاتے ہیں...... اس کے بارے میں ہمیں جلد کچھ کرنا ہو گا۔ ہمیں اس کو ممنوع قرار دینا ہو گا...... ہمیں روح کے بارے میں

مزید کچھ کہنا ہو گا آؤ آزاد دنیا کی تعریفوں میں کچھ اور گیت گائیں۔ ہمیں کچھ اور ڈنڈے اور کچھ ڈالر دینے ہوں گے...... یہ نہیں چل سکتا۔ ڈنڈے دینے کی آزادی اور جرمن (Argniegas) کے خوف کے درمیان اور اب کیوبا...... ہمارے نصف کرے کے وسط میں، ہم سب کے عین درمیان۔ یہ لمبی داڑھیاں، وہی گیت گاتی ہوئی...... اور مسیح ہمارے لئے کس کام کا؟...... پادریوں نے ہمارے لئے کیا اچھا کام کیا؟...... ہم کسی پر بھی مزید بھروسہ نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ پادریوں تک پر بھی نہیں وہ ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھتے۔ وہ نہیں دیکھتے کہ کس طرح ہمارے ذخائر بازار میں اوپر نیچے ہو رہے ہیں۔ اس اثنا میں نظام شمسی میں انسان مائل بہ پرواز ہیں...... جوتے چاند پر راستہ بناتے ہیں...... ہر شے علاوہ بوسیدہ نظاموں کے تبدیلی کے لئے جدوجہد کرتی ہے...... یہ بوسیدہ نظام قرون وسطیٰ کے مکڑی کے جالوں میں پیدا ہوئے تھے مشینی آہن سے مضبوط تر مکڑی کے جالے...... اس کے باوجود لوگ تبدیلی میں یقین رکھتے ہیں۔ لوگ جنہوں نے تبدیلیاں پیدا کی ہیں جنہوں نے تبدیلیوں کو روبہ عمل کیا، جنہوں نے تبدیلیوں کو پھاڑ کر پھول میں تبدیل کیا...... Caramba !...... کوئی بھی بہار کو نہیں روک سکتا۔

شاعری اور سیاست

میں نے ۱۹۶۹ء کا سارا سال ازلانیگرا میں گزار دیا ہے۔ صبح ہوتے ہی سمندر اپنے حیران کن طور پر پھولنے کے عمل کو شروع کر دیتا ہے ایسا لگتا ہے، جیسے وہ ایک لامحدود روٹی کے آٹے کو گوندھ رہا ہے اوپر کو آتی ہوئی جھاگ، گہرائی کے بیچ خمیر سے نکلی ہوئی بالکل آٹے کی طرح سفید ہے۔ سردیوں کا موسم انتہائی سخت انداز میں کہر آلود ہے۔ ہر روز ہم آتش دان میں آگ جلا کر اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں ساحل پر ریت کی سفیدی ہمیں ایک دائمی تنہا دنیا بخشتی ہے۔ بالکل جیسے گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے والے لوگوں سے قبل یہ زمین پر تھی۔ لیکن یہ نہ سمجھیں کہ مجھے گرمیوں کے ہجوم سے نفرت ہے۔ جوں جوں گرمیاں نزدیک آتی ہیں لڑکیاں سمندر کی طرف آتی ہیں۔ مرد اور بچے لہروں کی جانب احتیاط سے بڑھتے ہیں، خطرے سے بچ کر چھلانگ لگاتے ہوئے۔ یہ انسان کے ہزاروں سال قدیمی رقص کا ایک انداز ہے۔ شاید تمام گرمیوں کے ناچوں کا اولین ناچ ــــــ

سردیوں میں ازلانیگرا کے گھر رات کی تاریکی سے ڈھک جاتے ہیں۔ صرف میرا گھر روشن رہتا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ سڑک کی دوسری جانب، گھر میں کوئی ہے۔ مجھے کھڑکی میں روشنی نظر آتی ہے۔ لیکن یہ محض نظر کا دھوکا ہے۔ کپتان کے گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ

میرے اپنے گھر کی روشنی ہے۔ جو اس گھر کی کھڑکی میں منعکس ہوتی ہے۔

میں اپنی خفیہ رہائش میں جہاں میں اپنے کام میں مستغرق رہتا ہوں، سال کے ہر روز لکھتا رہا ہوں۔ یہاں پہنچنا یا رہنا آسان نہیں ہے۔ فی الوقت میرے دو پالتو کتے پانڈا اور چو خود کو خوش وقت رکھنے کے لئے بنگالی شیر کی کھال سے کھیلتے ہیں اس شیر کی کھال کو جسے میں اپنے چھوٹے سے کمرے میں بطور قالین استعمال کرتا ہوں بہت سال پہلے چین سے لایا تھا۔ اب اس کے بال اور پنجے گر چکے ہیں اور اسے کیڑا لگنے کا ڈر ہے، لیکن منیلڈی اور میں اس کا خیال رکھتے ہیں میرے کتے پرانے دشمن پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ وہ فاتحین کی طرح جنگ کے بعد تھک جانے پر دروازے کے سامنے پھیل کر لیٹ جاتے ہیں۔ تاکہ میں اپنا کام کرتا رہوں اور باہر نہ جاسکوں۔

اس گھر میں ہمیشہ سے کچھ ہوتا رہتا ہے۔ میرے لئے اکثر دور دراز جگہوں سے فون کالیں آتی ہیں۔ جواب کیا ہونا چاہئے؟۔ میں گھر پر نہیں ہوں کوئی اور پیغام بھیجتا ہے۔ اس کا جواب کیا ہوتا ہے۔ میں گھر پر ہوں میں گھر پر نہیں ہوں۔ میں گھر پر ہوں۔ میں گھر پر ہوں۔ میں گھر پر نہیں ہوں یہ ایک شاعر کی زندگی ہے، جس کا ازلا ینگرا میں دور دراز خفیہ گھر اب دور دراز نہیں رہا۔

صحافی مجھ سے ہمیشہ یہ سوال کرتے ہیں کہ میں کیا لکھ رہا ہوں، میں کس چیز پر کام کر رہا ہوں۔ اس سوال نے ہمیشہ مجھے پریشان کیا ہے۔ کیونکہ یہ بے حد سطحی سوال ہے۔ جب کہ میں درحقیقت ہمیشہ ہی سے ایک کام کر رہا ہوں اور کبھی بھی میں نے اس کام کو نہیں چھوڑا۔ شاعری؟ اس کام کو کرتے ہوئے مجھے زمانہ بیت گیا ہے۔ اس سے قبل کہ میں یہ اندازہ کر سکتا کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں اسے شاعری کہا جاتا ہے۔ میں کبھی بھی تعریفوں اور اشتہاروں میں یقین نہیں رکھتا۔ جمالیات کی بحثیں مجھے موت کی طرح اکتاتی ہیں۔ میں ان کو حقیر نہیں جان رہا۔ جو یہ سب کرتے ہیں۔ لیکن میں کسی ادبی کام کے پیدائشی سرٹیفکیٹ سے اتنا ہی بے غرض ہوں جتنا کہ میں اس کے پوسٹ مارٹم سے کبھی ہوں گا۔

والٹ وھٹمین نے کہا تھا۔

"اور کوئی بیرونی شے کبھی بھی مجھ پر حاوی نہ آئے گی۔"

اور اپنے تمام مفادات کے باوجود ادب کے ساز و سامان کو برہنہ تخلیق کی جگہ نہیں لینی چاہئے۔ سال میں کئی بار میں نے نوٹس لینے والی کاپیاں بدلیں۔ وہ کاپیاں جو میری تحریر کے سبز دھاگوں سے بندھی ہوئی ہیں، یہیں کہیں ہوں گی۔ میں نے بے شمار کاپیوں کو بھرا، جو کتابوں کا روپ دھار گئیں تبدیلی کے عمل سے گزرتے ہوئے، بے حس و حرکت حالت سے حرکت میں،

روشنی دیتے ہوئے کیروں سے جگنوؤں کی شکل میں۔ سیاسی زندگی بجلی کے کوندے کی طرح مجھے میرے کام سے کھینچ لینے کے لئے آئی۔ ایک بار پھر میں مجمعوں کی طرف پلٹ آیا۔

انسانی ہجوم میری زندگی کا سبق رہا ہے۔ میں اس کی جانب شاعر کے پیدائشی شرمیلے پن کے ساتھ واپس آسکتا ہوں۔ شرمیلے پن کے خوف کے ساتھ لیکن ایک بار جب میں اس ہجوم میں خود کو پاتا ہوں تو یکسر بدلا ہوا ہوتا ہوں۔ میں بڑے ہجوم کا ایک اہم حصہ ہوں۔ میں علم انسان کے درخت کا ایک اور پتا ہوں ـــــ تنہائی اور کثرت ہمارے عہد میں شاعر کی بنیادی ضرورتیں رہیں گی۔ تنہائی میں چلی کے ساحل پر لہروں کی جنگ نے میری زندگی کو بہتر کر دیا ہے۔ میں نے لڑائیاں لڑتے ہوئے پانیوں سے اور ان چٹانوں سے جن سے پانی کی جنگ رہی بے پناہ محبت کی ہے ـــــ زندگی کا بھرپور سمندر آوارہ گرد پرندوں کا معصوم گروہ ـــــ سمندر کے جھاگ کی شان و شوکت لیکن میں نے زندگیوں کی بڑی لہر سے زیادہ سیکھا ہے۔ ان آنکھوں کی نرمی سے، جو مجھے دیکھتی رہیں ـــــ یہ پیغام شاید تمام شاعروں تک نہ پہنچ پائے۔ لیکن جس کسی نے بھی اسے محسوس کیا وہ ہمیشہ اسے اپنے دل میں جگہ دے گا۔ اور اپنی نظموں میں اسے روبہ عمل کرے گا۔

بہت سے انسانوں کو ایک لمحے ہی کے لئے امید کی تجسیم کرنا ایک ناقابل فراموش بات ہے، جو شاعر کے محسوس کرنے کے لئے بھرپور بھی ہے۔

صدارتی امیدوار

۱۹۶۹ء کی ایک صبح کو میری پارٹی کا جنرل سیکرٹری اور دوسرے ساتھی ازلا نیگرا کے میرے سمندری گھر میں آ گئے۔ یہ میرے لئے جمہوریہ کے صدر کے امیدوار کی حیثیت سے مشروط پیش کش لے کر آئے تھے۔ ایک ایسا امیدوار جسے وہ پاپولر فرنٹ کی چھ سات پارٹیوں کے لئے پیش کریں گے۔ ان کے پاس پروگرام، حکومتی وضع، مستقبل کے لئے فوری انتظامات وغیرہ سب کچھ تیار تھا۔ اس لمحے تک ان میں ہر پارٹی کا ایک امیدوار تھا اور ہر پارٹی اسے برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ ہم اشتراکی ہی اکیلے تھے جن کا کوئی امیدوار نہ تھا۔ ہماری صورت یہ تھی کہ بائیں بازو کی جماعتوں کے منتخب امیدوار کی مدد کریں جو پاپولر یونٹی کا امیدوار ٹھہرے گا لیکن یہ سب کچھ ہوا میں تھا اور اسے اس حالت میں زیادہ دیر تک نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ دائیں بازو کے امیدوار دوڑ میں شامل تھے اور ان کی اشتہار بازی کی مہم زوروں پر تھی۔ جب تک ہم مشترک انتخابی مقصد کے لئے متحد نہیں ہوتے تو ہمیں سخت ترین شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کسی بھی قسم کے اتحاد کو حاصل کرنے کے لئے واحد طریقہ اشتراکیوں کے لئے اپنے امیدوار کو نامزد کرنا تھا۔ میرے پارٹی کی نامزدگی کو قبول کر

لینے سے اشتراکیوں کے بارے میں صورت حال واضح ہو گئی تھی۔ ہماری مدد اس امیدوار کے لئے ہو گی، جسے باقی سب کا اعتماد حاصل ہو گا اور اگر ایسا نہیں ہوا، تو میں آخر تک امیدوار رہوں گا۔ دوسروں کے لئے یہ معاہدے تک پہنچنے کا ایک حوصلہ مند انداز تھا۔ اپنی نامزدگی کو قبول کر لینے کے بعد میں نے کامریڈ (Corvalan) کو بتا دیا تھا کہ یہ میں اس شرط پر کر رہا ہوں کہ جب بھی استعفیٰ دوں گا تو اسے قبول کرنا ہو گا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا پیچھے ہٹنا ناگزیر تھا۔ یہ بات بے حد بعید از قیاس تھی کہ ہر شخص اشتراکی کے لئے بھاگے دوڑے۔ دوسرے لفظوں میں دوسری تمام پارٹیوں کو ہماری مدد کی ضرورت تھی (حتیٰ کہ کرسچن ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار بھی) لیکن ان میں کسی کو بھی ہماری مدد نہیں کرنی تھی۔ بہرحال میری امیدواری کا سلسلہ سمندر کے کنارے ازلا نیگرا میں اس صبح کو شروع ہوا اور آگ لگ گئی۔ ہر جگہ میری طلب تھی۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں مردوں اور عورتوں سے جنہوں نے مجھے چوما تھا۔ میں بے حد متاثر تھا۔ سانتیاگو کے مضافات کی غلیظ آبادیوں (Coquimbo) کے وہ کان کن مرد، جو صحرا میں تانبے کی کانوں میں کام کرتے تھے۔ دہقان عورتیں، جو گھنٹوں اپنے بچوں کو بازوؤں میں تھامے میرا انتظار کرتیں (Bio-Bio) دریا کے اطراف اور اس سے دور آبنائے میگلان کے دھتکارے ہوئے غریب عوام۔ میں نے کیچڑ سے لت پت سڑکوں اور گلیوں، جنوب کی سرد لرزا دینے والی ہوا اور برستی ہوئی بارش میں ان سب کے لئے اپنی نظمیں پڑھی تھیں۔ میرا جوش و خروش بڑھ رہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ لوگ میری انتخابی مہم میں حصہ لے رہے تھے۔ زیادہ سے زیادہ عورتیں اس میں شامل ہو رہی تھیں۔ میں گھبرایا ہوا خوش لیکن حیران تھا کہ اگر مسائل میں گھری ہوئی اس غیر سدھائی، قرضوں میں جکڑی ہوئی اور شاید سب سے زیادہ ناشکری جمہوریہ کا صدر، منتخب ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟ اس جمہوریہ کے صدر پہلے مہینے میں پسند کئے جاتے اور پھر منصفانہ یا غیر منصفانہ طور پر باقی کے پانچ سالوں اور گیارہ مہینوں کے عرصے میں شہید بن جاتے۔

آلاندے کی انتخابی مہم

یہ ایک خوشگوار دن تھا، جب خبر ملی تھی۔ آلاندے تمام پاپولر یونٹی کے واحد امیدوار کی حیثیت سے ابھر آیا تھا۔ اپنی پارٹی کی مرضی کے مطابق میں نے فوراً ہی ایک بڑے مجمع کے سامنے اپنا استعفیٰ دے دیا۔ میں نے واپس ہٹنے کا اعلان کیا اور آلاندے نے اپنی نامزدگی کو قبول کر لیا تھا۔ یہ بڑا جلسہ ایک پارک میں منعقد ہوا تھا۔ ہر نظر آنے والی جگہ لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ ان میں درخت بھی شامل تھے۔ ٹانگیں اور سر شاخوں میں نکلے ہوئے تھے [illegible] کے ان زخم

خوردہ باشندوں جیسا کوئی نہیں میں امیدوار سے واقف تھا۔ اس سے قبل میں تین ماہ تک اس کے ہمراہ چلی کے نامختتم علاقے میں نظمیں پڑھتا اور تقریریں کرتا رہا تھا۔ ہر چھ سال کے بعد لگاتار تین بار میرا ڈھیٹ کامریڈ صدارتی امیدوار رہا تھا۔ یہ چوتھی بار ہو گا____

آرنلڈ بینٹ (Arnold Bennett) اور سمرسٹ ماہم (Somerset Maugham) - مجھے یاد نہیں کہ ان میں سے کون ایک بار کا ذکر کرتا ہے۔ جب اسے ونسٹن چرچل (Winston Churchil) کے ہمراہ کمرے میں رہنا پڑا تھا پہلی بات جو اس مشہور سیاست دان کے بارے میں کہی گئی تھی وہ یہ کہ صبح آنکھ کھلتے ہی وہ اپنا ہاتھ بڑھا کر نزدیکی میز سے سگار اٹھا کر جلاتا اور پھر اسے اسی وقت پینا شروع کر دیتا تھا۔

صرف غار میں رہنے والا ایک صحت مند انسان جس کی ساخت پتھر کے دور کی ہو، وہ یہ کر سکتا ہے، ان میں سے کوئی بھی نہیں جو آلاندے کے ہمراہ رہا ہو اس کی قوت برداشت کا ساتھ دے سکے۔ اس کے ہاں بھی ونسٹن چرچل والا سلسلہ تھا۔ وہ جہاں چاہتا سو جاتا۔ بعض اوقات ہمیں شمالی چلی کے صحرائی علاقوں میں سفر کرنا پڑتا۔

آلاندے کار کے ایک کونے میں گہری نیند سویا رہتا۔ اچانک سڑک پر ایک سرخ دھبہ نمودار ہوتا اور جب ہم وہاں پہنچتے تو یہ پندرہ بیس مردوں اور ان کی بیویوں پر مشتمل بچوں کے ہمراہ جھنڈے اٹھائے ہوئے ایک گروہ ہوتا۔ کار رک جاتی۔ آلاندے سورج کا سامنا کرتے ہوئے آنکھیں ملتا اور اس چھوٹے سے گروہ میں شامل ہو جاتا وہ ان سب کے ساتھ مل کر قومی ترانہ گاتا، ان سے بے حد عمدہ زندگی سے بھرپور انداز میں گفتگو کرتا، پھر وہ کار میں واپس آ جاتا اور ہم چلی کی طولانی سڑکوں پر دوبارہ سفر شروع کر دیتے۔ آلاندے اپنی نشست میں دھنس کر دوبارہ کچھ کہے بغیر نیند کے مزے لینے لگتا۔ ہر پچیس منٹ کے بعد یہ منظر دہرایا جاتا۔

گروہ، جھنڈے، گیت، تقریر اور دوبارہ سو جانا۔

چلی کے ہزارہا لوگوں کے ہجوم کا سامنا کرتے ہوئے۔ کار سے ٹرین، ٹرین سے ہوائی جہاز اور ہوائی جہاز سے بحری جہاز۔ پھر بحری جہاز سے گھوڑے تک آلاندے دن کا سخت پروگرام انجام دیتا اور کبھی بھی نہ تھکتے ہوئے ان چھ مہینوں میں سفر کو جاری رکھتا۔

اس کے گروہ کے تقریباً سارے ہی رکن بھٹک کر پیچھے رہ گئے تھے۔ بعد میں جب وہ چلی کا صدر بن گیا تو اس کی معصومانہ صلاحیت اس کے ساتھیوں میں سے چار پانچ کے دل کے دوروں کا موجب بنی تھی۔

پیرس میں سفیر

جب میں پیرس کے سفارت خانے میں اختیارات کی منتقلی کے لئے پہنچا تو مجھے علم ہوا کہ مجھے اپنی خودی کی قیمت چکانی ہوگی۔ میں نے یہ عہدہ بغیر سوچے سمجھے قبول کیا تھا، تاکہ ایک بار پھر زندگی کی لہر میں بہہ جاؤں اتنے برسوں کے بعد متوسط اور غیر مقبول حکومتوں کے ساتھ کام کرنے کے بعد میں پہلی بار مقبول فاتح حکومت کی نمائندگی کرنے پر بے حد خوش تھا۔ شاید دلی طور پر جو بات مجھے سب سے اچھی لگی، وہ چلی کے سفارت خانے میں ایک شان و شوکت کے ساتھ داخل ہونا تھا، وہ جگہ جہاں مجھے ہسپانوی آباد کاروں کو اپنے وطن بھجوانے میں خاصی بے عزتی اٹھانا پڑی تھی میری سزا میں میرے ہر افسر اعلیٰ کا ہاتھ تھا اور ہر ایک نے مجھے دکھ پہنچانے میں مدد کی تھی۔ سزا یافتہ اب سزا دینے والے کی کرسی میں بیٹھے گا اس کی میز پر بیٹھ کر کھائے گا۔ اس کے بستر میں سوئے گا اور کھڑکیوں کو کھولے گا تاکہ دنیا کی تازہ ہوا سفارت خانے میں آسکے۔ سب سے مشکل کام تازہ ہوا کو اندر آنے دینا تھا۔

مارچ ۱۹۷۱ء کی اس رات کو بھڑکیلی سجاوٹ کی بو میری ناک اور آنکھوں میں چھبی تھی ــــ منیلڈی اور میں اپنی خواب گاہ میں آئے اور شاندار بستر میں لیٹ گئے جہاں سفیر اور سفیروں کی بیویاں عذاب اور چین سے مرگئی تھیں۔

یہ ایک اتنی بڑی خواب گاہ ہے کہ اس میں ایک جنگ جو اور اس کے گھوڑے کو با آسانی جگہ دی جا سکتی ہے۔ چھتیں بہت بلند اور نہایت خوبصورتی سے سجائی گئی تھیں۔ فرنیچر میں مخمل کی شمولیت تھی، جس کا رنگ سوکھے ہوئے پتے سے ملتا تھا، جن کے جھالر خاصے بدنما تھے، سجاوٹ، امارت کی علامت کے ساتھ ساتھ زوال پذیر عہد کی باقیات کی تصویر تھی قالین ساٹھ سال پہلے خوبصورت ہوں گے، لیکن اب ان کا رنگ قدموں کے نشانوں کا ہم رنگ ہو چکا تھا اور کیڑا لگنے کی روایتی بو گزری ہوئی گفتگو کے ساتھ موجود تھی۔

اس کے علاوہ وہ اعصابی خادم ہمارا منتظر تھا جس نے اتنی بڑی خواب گاہ کو گرم رکھنے کے علاوہ ہر شے کا خیال رکھا تھا۔ منیلڈی اور میں نے اپنی سفارت کی پہلی سرد رات پیرس میں خاموشی سے گزار دی۔

دوسری رات کو گرمائی نے کام کیا۔ اس نظام نے ساٹھ سال تک کام کیا تھا اور اب اس کے فلٹر بے کار ہو چکے تھے۔ بگڑے ہوئے نظام کی گرم ہوا صرف کاربن ڈائی آکسائیڈ کو گزرنے دیتی تھی۔ ہم گزشتہ سرد رات کی طرح شکایت نہ کر سکے بلکہ اس رات ہم اختلاج قلب اور بے چینی کا شکار رہے اور ہمیں تازہ سرد ہوا کو اندر داخل ہونے کے لئے کھڑکیوں کو کھولنا پڑا۔ ممکن

ہے پرانے وقتوں کے سفیر اس نو دولیتے کے ساتھ، جو انہیں دفتری معیارات یا شجرہ نسب کے اعزازات کے بغیر ہٹانے کے لئے آیا تھا، حساب کتاب لے رہے تھے۔ ہم نے سوچا کہ ہم کوئی ایسا گھر ڈھونڈیں گے، جہاں ہم پتوں، پانی، پرندوں اور ہوا کے ساتھ سانس لے سکیں۔ بتدریج یہ خیال ایک وہم میں تبدیل ہو گیا۔ آزادی کے خیال سے جاگتے ہوئے قیدیوں کی طرح ہم پیرس سے باہر خالص ہوا کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔

ایک سفیر ہونا، میرے لئے ایک نئی اور غیر آرام دہ بات تھی، لیکن یہ ایک چیلنج تھا۔

چلی میں انقلاب آ چکا تھا۔ چلی کے وضع کے انقلاب کی خاصی وضاحت اور تجزیہ ہو چکا تھا۔ دشمن اندر اور باہر سے اسے تباہ کرنے کے لئے اپنے دانت تیز کر رہے تھے۔ ایک سو اسی سال سے ایک ہی قسم کے حکمران مختلف لیبلوں کے تحت میرے ملک میں ایک دوسرے کے بعد آ چکے تھے اور سب نے ایک ہی قسم کی بات کی تھی

چیتھڑے، بے عزت گھر ــــ اسکول اور جوتوں کے بغیر بچے، جیل اور میرے غریبوں کی جہد مسلسل۔ اب ہم سانس لے سکتے تھے۔ اور گا سکتے تھے۔ اپنی موجودہ حالت کی یہی بات مجھے پسند تھی۔

چلی میں سفارتی تقرریاں ایوان بالا (سینیٹ) کی منظوری سے ہوتی تھیں چلی کے دائیں بازو نے ہمیشہ بحیثیت شاعر میری تعریف کی تھی اور مجھے تقریروں سے نوازا تھا۔ بے شک یہ بات واضح ہے کہ انہوں نے میرے جنازے پر تقریریں کرنے کو فوقیت دی ہوگی۔ سینیٹ میں سفیر کی حیثیت سے اپنی تقرری کے لئے میں صرف تین ووٹوں سے جیت سکا تھا۔ دائیں بازو کے لوگوں اور مسیحی منافقوں نے سفید اور سیاہ گیندوں کے راز میں میرے خلاف ووٹ دیئے تھے۔

سابقہ سفیر نے حقیقتاً دیواروں کو اپنے متقدمین کی تصاویر سے سجا رکھا تھا، جن میں اس کی اپنی تصویر بھی تھی۔ یہ متاثر کرنے والی تصاویر کا ذخیرہ تھا جن میں سے دو یا تین کے علاوہ مثلاً (Blest Gana) اور (Chilean Balzal) باقی احمق قسم کے لوگ تھے۔ میں نے ان تصویروں کو ہٹا کر ان کی جگہ چلی کے پانچ سورماؤں کی تصاویر لگانے کا حکم دیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے چلی کے جھنڈے کو بلند رکھا اسے قومیت اور آزادی عطا کی۔ ان میں (Aguirre Lerda) جمہوریہ کا ترقی پسند صدر (Luis Emillo Reca Barren) چلی کی کیمونسٹ پارٹی کا بانی اور (Salvador Allande) کی تصاویر شامل تھیں۔ دیواریں اب پہلے سے کہیں بہتر لگتی تھیں۔

میں نہیں جانتا کہ سفارت خانے کے سیکرٹریوں نے جو سب کے سب دائیں بازو سے متعلق

تھے کیا سوچا ہو گا۔ رجعت پسند جماعتوں نے ملک کو ایک سو سال تک چلایا تھا۔
کسی دربان تک کا تقرر بھی اس وقت تک نہیں ہوتا تھا، جب تک وہ قدامت پسند یا شاہ پسند نہ ہو۔ خود کو آزادی کے انقلاب کے علمبردار کہلانے والے کرسچن ڈیموکریٹس نے جواباً اپنے قدیم رجعت پسندوں کے برابر لالچی پن کا اظہار کیا تھا بعد میں یہ دونوں متوازی پارٹیاں مل گئیں، حتیٰ کہ ایک ہو گئیں۔ سرکاری دفاتر، عوامی عمارتوں کے جزیرے، سب کچھ ابھی تک کونسلروں، انسپکٹروں اور انہی ملازمین سے چل رہے تھے، جو دائیں بازو سے متعلق تھے لگتا تھا آلاندے اور پاپولر یونٹی نے چلی میں انتخاب نہیں جیتا تھا اور حکومتی وزراء نہ اب سوشلسٹ تھے اور نہ کیمونسٹ

اس صورت حال نے مجھے درخواست کرنے پر مجبور کر دیا کہ پیرس کے سفارت خانے میں قونصلر کی جگہ میرے ایک دوست، عمدہ سفارت کار اور ممتاز ادیب جارج ایڈورڈز (Jorge Edwards) کو لگایا جائے، حالانکہ وہ ملک کے بے حد طاقت ور اور رجعت پسند خاندان سے تھا لیکن بذات خود بائیں بازو کا انسان تھا جس کی کسی پارٹی سے ہمدردیاں نہ تھیں۔ میں ایک ذہین اور کام کرنے والا شخص چاہتا تھا، جو اپنے کام سے واقف ہو اور جس پر میں اعتماد کر سکوں۔ اس وقت تک ایڈورڈز ہوانا (Havana) میں ناظم الامور کی حیثیت میں تھا۔ کیوبا میں اس کے مسائل کے بارے میں مبہم سی افواہیں مجھ تک پہنچ چکی تھیں۔ چونکہ میں اسے برسوں سے بائیں بازو کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اس لئے میں نے افواہوں کو اہمیت نہ دی۔

میرا نیا قونصلر کیوبا سے اعصابی حالت میں پہنچا اور اس نے اپنی رام کہانی سنائی، مجھے یہ تاثر ملا کہ دونوں طرف کے لوگ درست تھے اور اس وقت کوئی بھی صحیح نہیں تھا۔ جیسا کہ بسا اوقات زندگی میں ایسا ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ ایڈورڈز نے اپنے منتشر اعصاب پر قابو پایا اور ناخنوں کو چبانا چھوڑ دیا اور اپنی قابلیت ذہانت اور فرماں برداری سے میری معاونت کی۔

سفارت خانے میں دو سال کی سخت محنت کے دوران میرا قونصلر میرا سب سے اچھا ساتھی اور کارکن تھا، شاید اتنے وسیع و عریض دفتر کی عمارت میں واحد شخص، جو سیاسی طور پر معصوم تھا۔

جب شمالی امریکہ کی ایک کمپنی نے چلی کے تابنے پر رکاوٹ لگانے کی کوشش کی تو سارے یورپ میں احساس کی ایک لہر دوڑ گئی۔ صرف اخبارات، ٹیلی ویژن اور ریڈیو ہی نے اس خصوصی دلچسپی کے مسئلے کو نہیں اٹھایا بلکہ ایک بار پھر لوگوں کے ضمیر نے ہماری مدافعت کی فرانس اور ہالینڈ میں، بحری جہازوں سے اسباب اٹھانے والے مزدوروں نے تابنے کو اتارنے سے انکار کر دیا۔ اس شاندار ردعمل نے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اتحاد کی ایسی کہانیاں ہمارے عہد کی تاریخ کے

بارے میں کسی بھی یونیورسٹی کے لیکچر روم سے زیادہ پڑھاتی ہیں۔ زیادہ منکسر المزاج بلکہ زیادہ حساس واقعات بھی ذھن میں آتے ہیں۔ پابندی کے دوسرے دن فرانس کے کسی قصبے کی ایک معمولی حیثیت کی خاتون نے اپنی جمع جتھہ سے سو فرانک کا نوٹ چلی کے تانبے کے دفاع کے لئے بھیجا۔ اس کے ہمراہ اس کا خط تھا جس میں بھرپور مدد کے اظہار کے علاوہ قصبے کے رہنے والوں کے دستخط بھی تھے ان میں مئیر، کلیسا کے پادری مزدوروں، کھلاڑیوں اور طالب علموں کے دستخط شامل تھے۔

چلی سے میرے پاس سینکڑوں دوستوں کے پیغامات آئے۔ ان میں کچھ جانے پہچانے اور کچھ انجان تھے۔ جنہوں نے مجھے بین الاقوامی قزاقوں کے خلاف سخت موقف اختیار کرنے پر مبارک باد دی تھی۔ اس پارسل میں درجن بھر سبز مرچیں (Mate Gourd) کھیرے کی وضع کا بیل میں لگنے والا پھل اور چار عدد (Avocados) ایک قسم کا ٹراپیکل پھل، جو چلی میں بکثرت ہوتا ہے موجود تھے۔ اس وقت چلی کی شہرت میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ ہم ایک ایسے ملک میں تبدیل ہو گئے تھے۔ جو حقیقتاً وجود رکھتا تھا۔ اس سے پہلے ہم بے شمار غیر ترقی یافتہ ممالک میں بھی نہ جانے جاتے تھے۔ پہلی بار ہماری شناخت سامنے آئی تھی اور کوئی بھی اس بڑی لڑائی کی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ جو اس وقت ہم ملک کے لئے لڑ رہے تھے۔

ہمارے ملک میں ہونے والی ہر بات فرانس اور سارے یورپ میں سنسنی پیدا کر دیتی۔ مقبول عام جلسے، طلبا کے اجلاس، تمام زبانوں میں پڑھی ہوئی کتابیں تصویروں کے ساتھ ہم تک پہنچیں۔ ہر روز مجھے صحافیوں کو جو زیادہ سے زیادہ جاننے کے خواہش مند تھے دھکیلنا پڑتا۔ صدر آلاندے دنیا کی ایک شخصیت تھی۔

ہمارے کام کرنے والوں کی سختی اور نظام و ضبط کو سراہا جاتا اور اس کی تعریف ہوتی۔

چلی کے لئے گرم جوشی اور ہمدردی کا احساس، تانبے کے ذخائر کو قومیائے جانے کے تضادات کے نتیجے میں بڑھ گیا تھا۔ ہر جگہ لوگوں کو علم تھا کہ یہ چلی کے لئے آزادی کی نئی شاہراہ پر ایک بہت بڑا قدم تھا۔ کسی بھی قسم کی دھوکہ دینے والی چالبازی کے بغیر مقبول عام حکومت نے ہماری جمہوریہ کے وجود کو، اپنے ملک کے تانبے کے ذخائر کو از سر نو فتح کر کے حقیقی بنا دیا تھا۔

چلی کو واپسی

جب میں چلی واپس لوٹا، تو گلیوں اور پارکوں میں نئے سبزے نے میرا استقبال کیا۔ ہماری

خوبصورت بہار جنگل کے پتوں کو سبز رنگ میں رنگ رہی تھی۔ ہمارے پرانے سرمئی دارالحکومت کو سبز پتوں کی اس طرح ضرورت ہے جیسے انسانی دل محبت کا محتاج ہے۔

میں نے اس جوان بہار کی تازگی کو سونگھا۔ جب ہم اپنے وطن سے دور ہوتے ہیں تو اسے کبھی سردیوں کے موسم میں نہیں دیکھتے۔۔۔۔ فاصلہ سردیوں کی تکالیف کو مٹا دیتا ہے۔

خدا کے پچھواڑے (دور دراز قصبے، سردیوں کے موسم میں ننگے پیر بچے) یاد ہمیں صرف سبز دیہات زرد اور سرخ پھول اور قومی ترانے کا نیلا آسمان سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

اس مرتبہ درحقیقت مجھے خوبصورت موسم ملا تھا، جو دور بیٹھے ہوئے اکثر خواب ہی رہا تھا۔

ایک اور سبزے نے شہر کی دیواروں پر دھبے بنائے ہوئے تھے یہ نفرت کی کائی تھی، جس نے نقش و نگار سے دیواروں کو سجا رکھا تھا اشتراکیوں کے خلاف جھوٹ اور بہتان پر مبنی اشتہارات، کیوبا کے خلاف اشتہارات، سوویت یونین کے خلاف اشتہارات، امن اور انسانیت کے خلاف اشتہارات، خون کے پیاسے اشتہارات جو جکارتا میں اجتماعی کشت و خون کی پیشین گوئی کر رہے تھے۔ یہ نیا سبزہ تھا، جو شہر کی دیواروں کو غلیظ کر رہا تھا۔

اپنے تجربے سے میں اس پراپیگنڈے کے مزاج کو سمجھتا تھا۔ اسی کے ساتھ میں ہٹلر سے پہلے کے یورپ میں رہ چکا تھا اور ہٹلر کے چاہنے والوں کے پروپیگنڈے کی یہی روح تھی، جھوٹ کا بے جا استعمال، جس پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ دھمکیوں اور خوف کی کھلی مہم، مستقبل کے کئے گئے وعدے کے خلاف نفرت کے سارے ہتھیاروں کا جلوس، مجھے احساس ہوا کہ وہ ہماری زندگی کی روح ہی کو بدلنا چاہتے تھے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ چلی کے باشندے کس طرح ہماری قومی روح کی تضحیک کر سکتے تھے۔

جب رجعت پسند دائیں بازو کو تخریب کاری پر انحصار کرنا پڑتا تو وہ اسے بلا سوچے سمجھے استعمال کرتا۔ جنرل شنائیڈر (Schneider) آرمی چیف آف اسٹاف، ایک باعزت انسان کو جس نے جمہوریہ کے صدر آلاندے کا تختہ الٹنے سے انکار کر دیا تھا۔ قتل کر دیا گیا۔ اس کے گھر کے قریب بدمعاشوں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے اسے مشین گن سے بھون ڈالا تھا۔ یہ آپریشن فوج کے ایک سابق جنرل کے کہنے پر ہوا تھا، جسے فوج سے نکالا جا چکا تھا جوانوں پر مشتمل یہ پیشہ ور مجرموں اور سماجی تخریب کاروں کے ایک جتھے کا کام تھا۔

جرم ثابت ہونے کے بعد فوجی عدالت نے اس شخص کو، جس نے اس پروگرام کو بنایا تھا، جیل میں بتیس برس کے لئے ڈال دیا۔ سپریم کورٹ نے یہ مدت کم کر کے دو سال کر دی۔ چلی

میں ایک غریب انسان اگر بھوک کے باعث مرغی چرا لے تو اسے اس سے دگنی سزا ملتی ہے۔ جتنی آرمی چیف آف سٹاف کے قاتل کو ملی تھی۔ حکمران طبقے کی جانب سے، قانون کے حوالے سے یہ طبقاتی شعور کے اطلاق کی وضاحت تھی۔

آلاندے کی فتح حکمران طبقے کے لئے ایک چونکا دینے والے صدمے کی طرح تھی۔ پہلی مرتبہ یہ خیال ان کے ذھنوں میں گزرا کہ ان کے بے حد احتیاط سے بنائے گئے قوانین پلٹ کر انہی کے منہ پر طمانچہ مار سکتے ہیں۔ وہ امان کی تلاش میں اپنے ذخائر، جواہرات، بینک نوٹس اور سونے کے سکوں سمیت کہیں غائب ہو گئے۔ وہ ارجنٹینا کیا اسپین حتیٰ کہ دور دراز ملک آسٹریلیا تک چلے گئے۔

عوامی غیض و غضب کا خوف انہیں مختصر ترین وقت میں قطب شمالی بھی لے جا سکتا تھا۔

بعد میں وہ واپس آ جائیں گے۔

فیری (Feri)

چلی کی سڑک تمام زمانوں میں ہر جانب سے قانون اور بدمعاشی کی رکاوٹوں کے باعث سخت ترین دستور کے مطابق تھی۔ اسی اثنا میں حکمران طبقے نے ایک بوسیدہ کپڑے میں پیوند لگا کر خود کو فسطائی گروہ میں تبدیل کر لیا تھا۔ تانبے کو قومیائے جانے کے بعد شمالی امریکہ کی پابندی مزید سخت ہو گئی تھی۔

سابق صدر فیری کے اتحاد میں (I.T.T) نے کرسچن ڈیموکریٹس کو نئے فسطائی گروہ کے بازوؤں میں دھکیل دیا تھا۔

آلاندے اور فیری کی بالکل متضاد شخصیات نے ہمیشہ سے چلی کو اپنے قبضے میں رکھا تھا۔ شاید اسی وجہ سے کہ وہ اتنے مختلف لوگ تھے، ہر شخص اپنی جگہ ایک مضبوط رہنما وہ بھی ایک ایسے ملک میں، جہاں مضبوط رہنماؤں کی کوئی روایت نہ تھی ـــــ ہر ایک کا اپنا رستہ اور ایک مقصد جو خاصا واضح تھا۔

میرا خیال ہے کہ میں آلاندے کو اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اس کے کردار کے بارے میں کوئی پراسراریت نہ تھی ـــــ جہاں تک فیری کا تعلق ہے، ہم اس وقت سینیٹ (ایوان بالا) میں تھے، جو ایک عجیب و غریب فکر سے پہلے کا انسان تھا، آلاندے کے فطری پن سے کہیں دور کی چیز اس کے باوجود وہ اکثر شدید قہقہوں میں پھٹ پڑتا۔ میں ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہوں، جو بے تحاشا قہقہے

لگا کر ہنستے ہوں (مجھے یہ وصف نہیں ملا) لیکن قہقہے قہقہے میں فرق ہے۔ فیری کے پریشان سنجیدہ چہرے پر، جو سوئی دھاگے سے اپنی سیاسی زندگی کو سیتا نظر آتا ہو، اچانک قہقہے لگانا ایسا ہی حیران کن ہے جیسے رات کو کسی پرندے کا اچانک چیخ اٹھنا۔ اس سے ہٹ کر اس کا عمومی رویہ محتاط اور پرخلوص ہے۔ مجھے اکثر اس کی سیاست اس سے پیشتر کہ اس نے مجھے مکمل طور پر مایوس کر دیا ہو، مایوس کن نظر آئی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار وہ مجھے سانتیاگو میں میرے گھر ملنے آیا تھا۔ اس وقت اشتراکیوں اور کرسچن ڈیموکریٹس میں سمجھوتے کا امکان نظر آتا تھا۔ اس وقت تک وہ کرسچن ڈیموکریٹس نہ کہلاتے تھے بلکہ (Falange Nacional) تھے۔ ایک خوفناک نام، جسے اس وقت اپنایا گیا تھا، جب وہ جوان ہسپانوی فسطائی رہنما (Primode Rivera) کے زیر اثر تھے۔ لیکن ہسپانوی جنگ کے خاتمے پر وہ (Mari Tain) کے اثر میں آ گئے اور فسطائیوں کے مخالف بن گئے اور ایک نام رکھ لیا۔

ہماری گفتگو دوستانہ مگر غیر رسمی تھی۔ ہم اشتراکی کسی قسم کی تفہیم میں تمام انسانوں اور اچھائی کے سارے حلقوں سمیت یقین رکھتے ہیں۔ بذات خود ہم کہیں بھی نہیں پہنچیں گے۔ فیری حالانکہ فطرتا لیت و لعل کرنے والا انسان تھا، لیکن اس نے مجھے، بائیں بازو کے بارے میں اپنے خیالات کو جو سب اس کے تھے، جاننے دیا۔ جدا ہوتے وقت اس نے ایک قہقہہ لگایا، جو اس کے منہ سے پتھروں کی مانند گرا۔

"ہم ایک بار پھر بات کریں گے۔" اس نے کہا۔

لیکن دو دن کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ہماری بات چیت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی تھی۔

آلاندے کی فتح کے بعد فیری ایک جاہ طلب اور سرد سیاست دان یقین رکھتا تھا کہ دوبارہ طاقت میں آنے کے لئے اسے رجعت پسند اتحاد کی ضرورت ہے۔ یہ محض ایک پائپ کا خواب تھا___ سیاسی مکڑی کا منجمد خواب۔

تختہ الٹنے کے منصوبے کا اس کا جال، جس میں پشت پناہی اس نے کی۔ اس کے لئے فائدہ مند نہ ہو گا۔ فسطائیت سمجھوتوں پر ختم نہیں ہوتی۔ یہ اطاعت چاہتی ہے فیری کا وجود ہر سال مبہم ہوتا جائے گا اور ایک روز اس کی یاد کو جرم کے لئے ذمے داری کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ٹومک (Tomic)

اپنی ابتدا سے، جس لمحے کرسچن ڈیموکریٹک پارٹی نے (Falange Nacional) کا ناقابل قبول نام چھوڑا تھا، مجھے وہ خاصی دلچسپ لگی۔ یہ اس وقت معرض وجود میں آئی تھی جب

کیتھولک دانشوروں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے (Maritain-Thomist Elite) کی تشکیل کی۔ اس فلسفے نے مجھے متاثر نہ کیا تھا میں ان لوگوں سے، جو شاعری، سیاست اور جنس کے بارے میں محض نظریہ ساز ہوتے ہیں، فطری بے رخی کا اظہار کرتا ہوں، لیکن اس چھوٹی سی تحریک کے سیاسی مضمرات غیر متوقع اور خصوصی طور پر محسوس کئے گئے میڈرڈ سے واپسی پر، جو ابھی تک لڑائی کے شعلوں میں گھرا تھا، بڑے جلسوں میں، جن کا اہتمام میں نے کیا تھا، ہسپانوی جمہوریہ کے لئے بولنے کی خاطر بہت سے جوان رہنماؤں کو اکٹھا کیا تھا۔ یہ شمولیت بے مثال تھی جسے قدامت پسندوں نے کچوکے دیئے تھے۔ پرانے کلیسا کے ارباب اقتدار نے نئی پارٹی کو تقریباً توڑ دیا تھا، محض ایک دور اندیش پادری کی مداخلت نے اسے سیاسی خودکشی سے بچایا۔

(Talca) کے بشپ کے ایک بیان نے اس گروہ کو بچالیا تھا۔ جو بتدریج چلی کی سب سے بڑی پارٹی بن جاتی۔ گزرتے ہوئے برسوں نے اس کے نظریئے کو یکسر بدل دیا تھا۔

فیری کے بعد کرسچن ڈیموکریٹس میں سب سے اہم نام (Rodomiro Tomic) کا تھا۔ میں اس سے اپنے سینیٹ (ایوان بالا) کے دنوں میں ملا تھا۔ اس زمانے میں ہڑتالیں جاری تھیں۔ اور شمالی چلی میں انتخابات کا زور تھا تب کرسچن ڈیموکریٹس ہم اشتراکیوں کے جلسوں میں جگہ لینے کی خاطر پیچھے پیچھے پھرتے تھے۔ ہم تب بھی مقبول تھے اور اب بھی سب سے زیادہ مقبول لوگ ہیں ــــ پوٹاشیم نائٹریٹ کے صحراؤں میں اور تانبے کی کانوں میں میرا مطلب امریکی براعظم کے سب سے زیادہ استحصال شدہ لوگوں میں مقبول ہیں (Reca Barren) وہیں سے آیا تھا، مزدوروں کے چھاپے خانے اور پہلی یونین نے یہیں جنم لیا تھا۔ یہ سب اشتراکیوں کے بغیر ممکن نہ ہوتا۔

اس وقت ٹومک صرف ایک باصلاحیت کرسچن ڈیموکریٹ ہی نہیں بلکہ ان کا سب سے بہترین مقرر اور ایک پرکشش شخصیت تھی ۱۹۶۴ء میں حالات بدل گئے تھے۔ جب کرسچن ڈیموکریٹس نے انتخاب جیت لیا اور اس کے نتیجے میں فیری کو جمہوریہ چلی کے ایوان صدارت تک پہنچایا گیا اس امیدوار کی مہم کا انحصار جس نے آلاندے کو شکست دی ان بے مثال اشتراکیوں کے خلاف حملوں پر تھا، جو اخبارات، ریڈیو سے ارادتاً لوگوں کو ڈرانے کے لئے کئے گئے۔

یہ پراپیگنڈہ کسی کو بھی خوفزدہ کرنے کے لئے کافی تھا ــــ راھباؤں کو گولی مار دی جائے گی۔ فیڈل کاسترو جیسے داڑھیوں والے آدمیوں کی سنگینوں کے سامنے ننھے بچے بھاگتے ہوئے مر جائیں گے۔ ننھے بچوں کو ان کے ماں باپ جدا کر کے سائبیریا بھیج دیا جائے گا۔

اس کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی سینیٹ کی خصوصی کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی ایک شہادت سے ہمیں پتہ چلا کہ (سی آئی اے) نے خوف کی اس وحشیانہ مہم پر بیس ملین ڈالر خرچ کئے تھے۔

ایک بار صدر بننے کے بعد فیری نے اپنے مدمقابل کو ایک پارٹی میں یونانی تحفے سے نوازا۔ اس نے ٹومک کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں چلی کا سفیر مقرر کر دیا تھا۔ فیری جانتا تھا کہ اس کی حکومت امریکہ کی تانبے کی کمپنیوں سے بات چیت کرے گی۔ اس وقت سارا ملک قومیائے جانے کے مطالبات کر رہا تھا۔ ایک ماہر فنکار کی طرح فیری نے اس اصطلاح کو بدل کر (Chilanizati on) کر دیا اور نئے سمجھوتوں کے ساتھ ہماری بڑی قومی دولت کو (Kennecott) اور (Ana conda) کے طاقت ور کنسور شیم کے ہاتھوں میں سونپنے کی ضمانت دے دی۔ اقتصادی نتائج چلی کے لئے تباہ کن اور ٹومک کے لئے حوصلہ شکن ثابت ہوئے اور فیری نے ٹومک کو نقشے سے غائب کر دیا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں چلی کا سفیر، جس نے تانبے کو امریکہ کے ہاتھوں میں دینے کی سازش کر لی تھی۔ چلی کے عوام کی مدد نہ پا سکے گا آئندہ انتخابات میں تین امیدواروں میں سے ٹومک تیسرے نمبر پر رہا ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اپنی سفارت کے عہدے پر مستعفی ہونے کے بعد وہ مجھ سے ملنے ۱۹۶۵ء میں ازلانیگرا میں آیا تھا۔ وہ حال ہی میں شمال سے واپس آیا تھا اور ابھی تک سرکاری طور پر صدارت کے لئے امیدوار نہ تھا۔ ہماری دوستی سیاسی طوفانوں میں بھی مضبوط رہی تھی اور اب بھی ہے لیکن اس بار ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں خاصی دقت پیش آئی وہ چاہتا تھا کہ ترقی پسند قوتوں کا وسیع اتحاد عوام کے اتحاد کے نام کے تحت پاپولر یونیٹی کی جگہ لے لے۔ یہ پیش کش ناممکن تھی۔ تانبے کے سمجھوتوں میں اس کی شرکت نے اسے بائیں بازو کی سیاست سے ختم کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ مقبول تحریک کی دو بڑی پارٹیاں کمیونسٹ اور سوشلسٹ اتنی پرانی ہو چکی تھیں کہ وہ با آسانی ایوان صدارت تک اپنا امیدوار لے جا سکیں۔

ہمیشہ کی طرح ناامید ٹومک نے میرے گھر کو چھوڑتے ہوئے کہا تھا کہ (Andres Zald iva) کرسچن ڈیموٹیک پارٹی کے وزیر خزانہ نے اسے وہ دستاویزات دکھائی تھیں، جن سے ثابت ہوتا تھا کہ ملک کی اقتصادیات پہلے ہی دیوالیہ ہو چکی ہے ٹومک نے مجھے بتایا تھا کہ ہم تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ صورت حال بقول اس کے مہینوں سے زیادہ کی متحمل نہیں۔ یہ تباہ کن ہے (Zaldivar) نے اسے جو تفصیلات بتائی تھیں اس کے مطابق ہمارا دیوالیہ ہونا اٹل ہے۔

آلاندے کے منتخب ہونے کے ایک ماہ بعد، لیکن اس سے پیشتر کہ وہ ایوان صدارت میں جاتا، کابینہ کے اسی وزیر (Zaldivar) نے عوامی طور پر ملک کی اقتصادی بدحالی کے بارے میں

اعلان کر دیا، لیکن اس بار اس نے اسے آلاندے کے انتخاب کے باعث بین الاقوامی سطح پر مرتب ہونے والے اثرات کو موجب ٹھہرایا تھا۔

اور اس طرح تاریخ لکھی جاتی ہے۔ کم از کم اس مرتبہ تاریخ (Zaldivar) جیسے ابن الوقت سیاست دانوں کے ہاتھوں توڑ مڑور کر لکھی گئی۔

آلاندے (Allende)

ہمارے عہد میں میرے ملک کو کسی بھی دوسرے ملک کی نسبت زیادہ بار دھوکہ دیا گیا ہے۔

نائٹریٹ کو صحراؤں سے، سطح سمندر سے نیچے کوئلے کی کانوں سے، تکلیف دہ بلندیوں سے جہاں تانبا دفن ہے، اور غیر انسانی مشقت کے ذریعے ہمارے عوام کے ذریعے نکالا جاتا ہے، آزادی کی ایک عظیم تحریک ابھری تھی۔

اس تحریک نے چلی کی صدارت کے لئے ایک نام آلاندے کالیا تھا تاکہ وہ انصاف کے حصول کے لئے اصلاحات کر سکے جنہیں التوا میں نہ ڈالا جائے اور اس طرح غیر ملکیوں کے ہاتھوں سے ہماری قومی دولت کو لٹنے سے بچا سکے دور دراز کے دیہات میں، جہاں کہیں بھی وہ گیا، عوام نے ہمارے صدر کی تعریف کی اور ہماری حکومت کے غیر معمولی اشتراک کو سراہا اقوام متحدہ کی تاریخ میں نیو یارک میں کبھی بھی دوسرے ملکوں کے وفود سے اتنی داد و تحسین کسی کے حصے میں نہ آئی جتنی چلی کے صدر آلاندے کو حاصل ہوئی۔

یہاں چلی میں بے پناہ تکالیف کی موجودگی میں ایک سچے اور انصاف پر مبنی معاشرہ تخلیق ہوا تھا جس کا انحصار ہماری مملکت کے وجود، قومی افتخار اور چلی کے عوام کے اعلیٰ درجے کا ہیروازم تھا۔ ہماری جانب چلی کے انقلاب کی طرف دستور، قانون جمہوریت اور امید تھی۔

وہ جو کچھ چاہتے تھے ان کی طرف تھا___ بھانڈ، نٹ، بے شمار مسخرے، تخریب کار، جن کے پاس پستولیں، زنجیریں، جعلی راہب اور فوج کے دھتکارے ہوئے لوگ تھے۔

وہ سب کے سب بغض کے حقیر چکر کھانے والے جھولے پر سوار تھے۔ فسطائی (Jar pa)

اپنے بھتیجوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، کسی کے سر یا روح کو کچلنے کے لئے آمادہ (Father Land Freedom)، کہتا ہوا آگے بڑھا اس وقت تک جب تک وہ اپنے لئے ایک بہت بڑا (Hacienda) ہسپانوی لاطینی امریکہ کے ممالک میں "جاگیر" کا مترادف جسے وہ چلی کہتے تھے،

ان کے ساتھ اس کھیل میں ایک بڑا بینکار اور خون میں جھینک چھیں ایک رقاص بھی موجود تھا (Gonzalez Videla) رمبا کا بادشاہ جس نے رقص کرتے کرتے عرصہ ہوا، اپنی پارٹی کو عوام دشمنوں کو دے دیا تھا۔

اب یہ فیری تھا، جو اپنی کرسچن ڈیموکریٹک پارٹی کے ساتھ عوام کے دشمنوں کے سامنے اس دھن پر رقص کرتے ہوئے، جسے دشمن بجا رہے تھے منک رہا تھا اور سابق کرنل (Viaux) بھی اس کے ہمراہ تھا، جس کے غلیظ کام میں وہ شریک کار تھا اس طریقے میں یہ اہم کردار تھے۔ ان کے پاس ضرورت کے مطابق خوراک تھی، جسے وہ ذخیرہ اندوز کر چکے تھے۔ ڈنڈے، گولیاں ایک ایسی اختراع جسے کسی میگوئل نامی شخص نے ایجاد کیا تھا اس میں کیل کے دونوں سروں کو تیز کر کے اور اسے موڑ کر سڑک پر ڈال دیا جاتا تھا جس سے آگے جانے والی گاڑیوں کے ٹائر پنکچر ہو جاتے تھے۔ (Miguelitos) ایسے ہتھیار تھے۔ جن سے وہ ہماری عوام پر Ran (Oquique) quil) (Salvador) (Ruerto Montt) (Josemaria Caro) (Frutillar) (Puente Alto)اور اس کے علاوہ بہت سی دوسری جگہوں میں زخم لگا چکے تھے (Hernan Mery) کے قاتل ان لوگوں کے ہمراہ، جنہیں اس کی یاد کا دفاع کرنا چاہئے تھا محو رقص تھے۔ وہ ایسے مدھم انداز میں ناچتے رہے، جیسے وہ کسی مکھی کو بھی تکلیف نہ پہنچا سکتے ہوں۔ اور ان احمقانہ چھوٹی جزیات کے ذکر کرنے پر وہ غصے میں آ جاتے تھے۔

چلی کی ایک طویل تہذیبی تاریخ ہے، جس میں کچھ انقلابات اور بہت سی مستحکم حکومتیں ہیں جو سب کی سب قدامت پسند اور متوسط صدور پر مشتمل رہیں علاوہ دو بڑی شخصیات (Balmaced a)اور آلاندے کے حیرت ناک حد تک دونوں ایک ہی وضع کے پس منظر سے آئے تھے مالدار طبقہ جو خود کو اشرافیہ کہلاتا ہے۔

اصولوں کے علمبرداروں کی حیثیت سے دونوں ملکوں کو متوسط حکمرانی کے ختم ہوتے ہوئے نقطے سے بڑا بنانا چاہتے تھے، دونوں کو موت کے ایک ہی رستے پر دھکیل دیا گیا۔

(Balmaceda) کو غیر ملکی کمپنیوں کو نائٹریٹ کی دولت فراہم نہ کرنے پر خودکشی کرنی پڑی تھی۔

آلاندے کو قتل کر دیا گیا، کیونکہ اس نے چلی کی زیر زمین دولت تانبے کو قومیا لیا تھا۔ دونوں حالتوں میں چلی کے حکمران طبقے نے خونی انقلاب کو رواں رکھا۔ دونوں حالتوں میں فوج نے شکاری کتوں کا کردار ادا کیا (Balmaceda) کے عہد میں انگریزی کمپنیوں نے اور

آلاندے کے زمانے میں شمالی امریکیوں نے ان فوجی کارروائیوں کو مہمیز دی اور دولت فراہم کی۔
دونوں حالتوں میں صدور کے گھروں کو ہماری ممتاز اشرافیہ کے احکامات پر تباہ کر دیا گیا۔

(Balmaceda) کے کمروں کو کلہاڑیوں سے تہس نہس کیا گیا آلاندے کے گھر کو دنیاوی ترقی کے شکریئے کے ساتھ ہمارے ہوائی سورماؤں نے بموں سے تباہ کر دیا۔

اس کے باوجود یہ دونوں شخص بہت مختلف تھے۔

(Balmaceda) ایک مسحور کر دینے والا مقرر تھا۔ اس کی شاہانہ طبیعت زیادہ سے زیادہ اسے خود پر بھروسہ کرنے کو مائل کرتی۔ وہ اپنے ارادوں کے بلند مقاصد کے بارے میں مطمئن تھا۔ تمام وقت وہ دشمنوں سے گھرا رہتا تھا۔ اس کی اپنے ارد گرد رہنے والوں پر برتری اتنی عظیم تھی اور اس کی تنہائی اتنی وسیع کہ اس نے خود کو اپنی ذات میں سمیٹ لینے پر ختم کر لیا۔ عوام جنہیں اس کی مدد کو جانا چاہئے تھا بحیثیت طاقت کے وجود نہ رکھتے تھے۔ یعنی ان میں کوئی تنظیم نہ تھی صدر ایک خواب دیکھنے والے صاحب الکشف کی حیثیت سے پیش آنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کی عظمت کا خواب محض ایک خواب رہ گیا اس کے قتل کے بعد حریص غیر ملکی تاجر اور ہماری Cre) (oleاسمبلی کے اراکین نے نائٹریٹ کے ذخائر پر قبضہ کر لیا۔

غیر ملکیوں کے لئے جائیداد اور مراعات اور (Creole) کے لئے رشوت کا پیسہ۔ ایک بار جب چاندی کے تیس ٹکڑوں کا تبادلہ ہو گیا تو ہر شے نارمل کی طرف واپس آ گئی۔

چند ہزار انسانوں کا خون جلد ہی میدان جنگ میں خشک ہو گیا چلی کے شمالی علاقوں کے سب سے زیادہ استحصال کا شکار ہونے والے دنیا کے مزدور لندن کے لئے بے پناہ سٹرلنگ پاؤنڈ کی مقدار پیدا کرنے سے کبھی نہ رک سکے۔

آلاندے کبھی بھی ایک بڑا مقرر نہ تھا۔ اور بحیثیت ایک مدبر کے اس نے کبھی اپنے مشیروں کے صلاح مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھایا تھا۔ معمولی باتوں میں بھی وہ آمر کی ضد اور اصولوں کا جمہوریت پسند تھا۔ جو ملک اس کے عوام کو ملا وہ (Balmaceda) کے ناتجربہ کار لوگوں کا ملک نہ تھا اسے ایک مضبوط محنت کش طبقہ ملا تھا جو اس سب کے مطلب سے واقف تھا۔

آلاندے ایک اجتماعی رہنما تھا۔ گو وہ مقبول طبقوں کی نمائندگی نہیں کرتا تھا لیکن وہ استحصال کرنے والوں کی بداعمالیوں اور فالج کے خلاف جدوجہد کرنے والے طبقات کا ماحاصل تھا۔ یہ بات آلاندے کے کام کو اس کے مختصر سے وقت میں (Balmaceda) سے برتر کرتی ہے اس سے بڑھ کر یہ چلی کی تاریخ میں سب سے اہم معرکہ ہے صرف تانبے کے ذخائر کا قومیایا

جانا ہی ایک عظیم کارنامہ تھا جہاں تک دور اندیش زرعی اصلاحات، نجی دولت کا خاتمہ اور بہت سے دوسرے مقاصد جو اس کی حکومت میں تکمیل تک پہنچے ان سب کی اہم فطرت اجتماعی تھی۔

آلاندے کی کارروائیوں اور کام نے جن کی قدر و قیمت کو قوم کے لئے کبھی بھی نہیں روکا جا سکتا ہماری آزادی کے دشمنوں کو ناراض کر دیا تھا۔ اس خراب صورت حال کی المیہ علامت نگاری سرکاری محل پر بمباری سے واضح ہو گئی۔ یہ بمباری ذھن میں نازی ہوائی طاقت کی غیر ملکی غیر محفوظ، ہسپانوی، برطانوی اور روسی شہروں پر بمباری کی یاد دلاتی ہے۔ یہی جرم اب دوبارہ چلی میں دہرایا گیا تھا۔

چلی کے ہواباز اس محل پر، جو صدیوں سے شہر کی تہذیبی زندگی کا مرکز رہا تھا، نیچے آ کر بمباری کر رہے تھے۔

میں یہ سطور اپنی یادوں سے محض تین دن بعد ان نہ کہنے والے واقعات کے بعد قلم کر رہا ہوں، جنہوں نے کل میرے کامریڈ صدر آلاندے کو مار دیا تھا۔

آلاندے کے قتل کو چھپا دیا گیا۔ اس کی لاش کو خفیہ طور سے دفن کر دیا گیا۔ بس اس کی بیوہ کو اس لافانی جسد کے ساتھ جانے کی اجازت دی گئی تھی۔

زیادتی کرنے والوں کے مطابق انہوں نے اس کے بے جان جسم پر خودکشی کے واضح نشانات دیکھے تھے۔ لیکن جو بیان غیر ممالک میں چھپا، وہ مختلف تھا۔

ہوائی بمباری کے فوراً بعد ٹینک حرکت میں آ گئے تھے۔ بہت سے ٹینک سورمائی انداز میں ایک تنہا شخص کے خلاف لڑ رہے تھے۔ جمہوریہ چلی کے صدر کے خلاف۔ سیلواڈار آلاندے کے خلاف جو کسی بھی مدد کے بغیر تنہا وسیع القلبی کے ساتھ دھوئیں اور شعلوں میں گھرے ہوئے اپنے دفتر میں ان کا انتظار کر رہا تھا وہ اتنے خوبصورت موقع پر آگے نہ بڑھ سکے۔

اسے مشین گن سے بھوننا پڑا، کیونکہ وہ اپنے دفتر سے استعفیٰ ہرگز ہرگز نہ دیتا۔ وہ جسم خفیہ طور پر ایک انجان جگہ دفن کر دیا گیا۔ اس کی لاش کے ساتھ قبر تک دنیا بھر کا غم اٹھائے بس ایک تنہا عورت تھی اور وہ شاندار مردہ جسم، جسے چلی کے سپاہیوں نے اپنی مشین گنوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا ــــ چلی کے وہ سپاہی، جنہوں نے ایک بار پھر چلی کو دھوکہ دیا تھا ــــ

عفراء پبلیکیشنز کی دیگر مطبوعات

کتاب کانام	مصنف	قیمت
1۔پاکستان اور پاکستانیت (قومی وملی جدوجہد کے اثرات نتائج اور مقاصد)	پروفیسر محمد اکرام ہوشیارپوری	225/=
2۔عالمی داستان (تحقیقی وتنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر آرزو چوہدری	180/=
3۔پیغمبر تعلیم (سیرت رسول پاک)	پروفیسر ملک رب نواز	زیر طبع
4۔کشمیر کی کہانیاں (افسانے)	کرشن چندر	100/=
5۔میرالڑکپن (ٹیگور کی آپ بیتی)	رابندرناتھ ٹیگور	75/=
6۔نجات (منتخب افسانے)	سیدہ عفراء بخاری	زیر طبع
7۔تابوت ساز (روسی کلاسیکی ادب)	الیگزینڈر پشکن	زیر طبع
8۔مورس (ناول)	ای۔ایم فارسٹر (ترجمہ:عامر فراز)	زیر طبع
9۔درد جب جاگتا ہے (شاعری)	شفیق احمد	125
10۔جلا جل جاں (گیت، نظمیں، غزل)	ڈاکٹر آرزو چوہدری	125
11۔پھول پھول منظر (شاعری)	صبیحہ اعجاز	90/=
12۔پہلا جھونکا (شاعری)	محمد اجمل خان	زیر طبع
13۔فیض کی یاد میں	مرتب:نوید خان	زیر طبع

عصری حسیت کے ممتاز کہانی کار، منفرد نظم گو شاعر محقق اور ترجمہ نگار انور زاہدی نے تخلیقی عمل کے حوالے سے جہاں ۱۹۸۵ء میں اپنی نظموں "سنہرے دنوں کی شاعری" اور ۱۹۹۱ء میں اپنی کہانیوں کا مجموعہ "عذاب شہر پناہ" پیش کیا وہیں عالمی شہرت یافتہ شاعروں اور افسانہ نگاروں پر تحقیقی مضامین بھی لکھے جن کا ایک مجموعہ "بازیافت" کے نام سے مکمل ہو چکا ہے۔

زاہدی کی نظموں کا نیا مجموعہ "مری آنکھیں سمندر" طباعت کے مراحل میں ہے اور نئی کہانیوں کا مجموعہ "موسم جنگ کا کہانی محبت کی" زیر ترتیب ہے تخلیقی سفر کے دوران زاہدی نے ترجمہ نگاری کے فن کو بھی تخلیقی سطح پر برتتے ہوئے بے حد کام کیا ہے۔ ایران کے قیام کے دوران زاہدی نے فارسی زبان و ادب پر عبور حاصل کرتے ہوئے "دریچوں میں ہوا" کے نام سے جدید فارسی شاعری کے منظوم و منثور تراجم کیے جس کا نیا ایڈیشن جدید فارسی شاعری پر ایک طویل مقالے کے ہمراہ عنقریب منظر عام پر آرہا ہے۔

ہرمن ہیسے کی شاعری اور فلسفیانہ افکار کا ترجمہ "بارشوں کا موسم" کے نام سے کئی برس پہلے شائع ہوا۔ جس کا دوسرا ایڈیشن جلد شائع ہونے والا ہے۔ نفسیات کے حوالے سے یونگ کی کتاب (Approaching the Unconscious) کا ترجمہ "لاشعور تک رسائی" مقتدرہ کے ہاں اشاعت کا منتظر ہے۔ جدید عرب شاعری کے تراجم کا ایک مجموعہ "فی النار جنہم" مکمل ہو چکا ہے جب کہ جدید ترکی شاعری پر کام جاری ہے۔ "رقص کے بعد" کے نام سے عالمی شہرت یافتہ افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے تراجم کا مجموعہ زیر ترتیب ہے۔ لاطینی امریکی ادب پر کام اس کے علاوہ ہے۔

نوبل انعام یافتہ شاعر پابلو نرودا کی خود نوشت (Memoirs) کا ترجمہ سہل کام نہ تھا لیکن انور زاہدی نے جس کمال خوبی سے زبان و بیان پر قدرت رکھتے ہوئے اس کا خوبصورت ترجمہ کیا ہے وہ نہ صرف لاطینی امریکی ادب کے قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث بنے گا بلکہ اردو زبان و ادب کے لئے بھی یقیناً ایک گراں قدر اضافہ ہوگا۔

سیدہ عفریٰ بخاری

UFRA PUBLICATIONS

20-F Shama Plaza 72-Feroze Pur Road Lahore Pakistan

Ph: (042) 7572643